امیر تیمور گورگان
حصہ دوم
الماس
ایم۔ اے

جادوگرنوں کی بستی

پتھریلے راستے پر آہٹ ہوئی۔ فراتو عنبر نے چونک کر کمان میں تیر جوڑ لیا۔ وہ تاتاری سردار تیمور کا قابلِ اعتماد پہرے دار تھا۔ اس کا نام فراتو تھا لیکن اسے خوشبویات کا بہت شوق تھا۔ ہر وقت کوئی خوشبودار پھول اس کے سینے پر مسکراتا رہتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کے ساتھی، اس کے نام کے ساتھ عنبر کا لفظ لگا دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ پورے لشکر میں فراتو عنبر کے نام سے مشہور ہو گیا۔

تیمور کو بھی اس کے اس شوق کا علم تھا لیکن اس نے عنبر کو سختی سے منع کر رکھا تھا کہ پہرے کے اوقات میں وہ کسی پھول سے اپنا سینہ نہ سجائے کیونکہ اس طرح اس کی پوشیدگی کی خبر، دشمن کو بھی ہو سکتی تھی۔

اس وقت فراتو عنبر کا سینہ پھول سے محروم تھا۔ . . . اور وہ کچھ افسردہ سا تھا۔

راستے پر دوبارہ آہٹ ہوئی۔

عنبر آہستہ آہستہ آہٹ کی جانب بڑھا۔ گھُپ اندھیرا، چمکتی دمکتی کہکشاں میں بھی ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دے رہا تھا۔ اس کے کان آہٹ کی طرف لگے ہوئے تھے مگر اس طرف خاموشی طاری تھی۔

عنبر کا پہرہ، مغلوں اور تاتاریوں کی سرحد کے شمال میں مشہور میدان قبچاق کی مغربی پہاڑیوں پر تھا۔ جس ابھری ہوئی چٹان کے پہلو میں وہ کھڑا تھا وہاں سے مغلوں کے خیموں کے آگے جلتے الاؤ سے اٹھتی ہوئی چنگاریاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ تاتاریوں کا لشکر جنوبی حصے میں تھا اور چٹان کی وجہ سے اس کی نظروں سے

اوجھل تھا۔ صبح دونوں لشکروں کے ٹکرانے کا امکان تھا۔ رات کو بھی شب خون مارا جاسکتا تھا اس لیے عنبر زیادہ چوکنا تھا۔

راستے پر پھر آہٹ ہوئی۔ کوئی اوپر آرہا تھا۔

عنبر نے چلّا ڈھیلا کر کے تیر نکالا۔ کمان کندھے پر اور تیر ترکش میں ڈال کر تلوار کھینچ لی۔ اسی وقت ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ خوشبو کی لپٹیں آئیں اور عنبر کے مشامِ جاں کو معطر کرتی چلی گئیں۔ عنبر ہر پھول کی خوشبو پہچانتا تھا۔ اسے معلوم ہوگیا کہ یہ خوشبو ان جنگلی پھولوں کی ہے جو اس علاقے میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

مگر اس خوشبو کو لانے والا کون ہے؟

عنبر تلوار سیدھی کیے آنے والے کی پشت پر پہنچ گیا۔

"خبردار۔ نہ کوئی قدم آگے بڑھے اور نہ کوئی آواز ہی نکلے" عنبر نے تلوار کی نوک اس کی پشت سے لگاتے ہوئے سرگوشی کی۔

چلنے والا رک گیا۔

"تلوار میرے حوالے کر دو۔ اگر خنجر ہے تو وہ بھی" عنبر نے حکم دیا۔

"میں خالی ہاتھ ہوں" جواب میں ایک نرم و نازک آواز سنائی دی۔

عنبر نے تلوار ہٹالی۔

"کیا تم عورت ہو؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"کیا آواز سے میں مرد معلوم ہوتی ہوں"

عنبر اس برجستہ جواب پر شرمندہ سا ہوگیا۔

"کیا تم مغل ہو؟" اس نے دوسرا سوال کیا۔

"یہی سوال میں تم سے کرنا چاہتی ہوں؟" نووارد کی آواز میں ستار کی جھنکار تھی۔

"میں صورت سے تمہیں کیا معلوم ہوتا ہوں؟"

عنبر نے بھی اسی انداز میں جواب دیا لیکن فوراً ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ .... جب وہ خود عورت کو نہ پہچان سکا تھا تو عورت کو اس کا چہرہ کیا نظر آتا۔ ... پھر وہ بات بنانے کے لیے جلدی سے بولا:

"میرا مطلب ہے کیا تم مغلوں کی ہمدرد ہو۔"

"میرا باپ مغل ہے" عورت نے بے دھڑک جواب دیا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے سر کو جنبش دی اور سر کے بالوں میں سجے گجرے سے خوشبو کا ایک بھپکا اٹھا۔ عنبر جھوم کر رہ گیا۔

"میں تمہیں گرفتار کرنے پر مجبور ہوں اے خوشبودار عورت" عنبر نے تلوار کی نوک پھر اس کی پشت سے لگا دی۔

"میں خوشبودار ہوں" عورت ہنسی۔

"ہاں تمہارے جسم سے پھولوں کی خوشبو آرہی ہے" عنبر نے کہا:

"اور مجھے پھول بہت پسند ہیں"۔

"میں نے بالوں میں گجرا لگا رکھا ہے تاتاری پہرے دار" عورت نے کہا:

"تمہیں خوشبو پسند ہے تو میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں پھولوں سے لاد دوں گی"۔

"مجھے بہکانے کی کوشش مت کرو" عنبر ذرا سختی سے بولا:

"میں سمجھ گیا، تم مغلوں کی جاسوس ہو۔ اب تم میری حراست میں ہو۔ تمہیں میرے ساتھ میرے خیمہ میں چلنا ہوگا"۔

"میں تمہاری شکرگزار ہوں، تم نے میری مشکل آسان کر دی ...." عورت نے کہا:

"مجھے اپنے سردار کے پاس لے چلو۔ میں انہیں ایک اہم پیغام پہنچانا چاہتی ہوں"۔

"پیغام؟ ...." عنبر نے حیرت سے کہا:

"تم مغلوں کا پیغام لے کر آئی ہو"۔

"تم بہت بھولے ہو پہرے دار" عورت نے کہا:

"مغل عورتوں پر بھروسہ نہیں کرتے۔ میں اپنی ماں کا پیغام تاتاری سردار کو پہنچانا چاہتی ہوں .... اگر تمہارے سردار نے میری ماں کے مشورے پر عمل کیا تو شاید بچ جائے ورنہ اسے شکست ہوگی اور بڑی تباہی پھیلے گی"۔

"کیا کہہ رہی ہو تم؟" عنبر کو غصہ آگیا:

"تو تاتاریوں کی شکست کی پیش گوئی کر رہی ہے۔ کیا پیغام لائی ہے تو؟"

"میں تمہیں نہیں بتا سکتی" عورت نے جواب دیا۔

"اچھا۔ میں کچھ نہیں جانتا" عنبر پریشان ہوگیا:

"مگر تجھے چھوڑوں گا نہیں" عنبر نے عورت کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میرا ہاتھ چھوڑو پہرےدار۔ میرے قبیلے میں دستور ہے کہ اگر کوئی مرد کسی لڑکی کا ہاتھ پکڑ لے تو اسے اسی لڑکی سے شادی کرنا پڑتی ہے۔"

"تمہاری ابھی شادی نہیں ہوئی"۔ عنبر نے رک کر پوچھا۔

"نہیں.... ہمارے ہاں شادی شدہ عورتیں گلے میں ہار ڈالتی ہیں اور کنواری لڑکیاں بالوں میں گجرے پہنتی ہیں.... ہم جادوگروں کا یہی دستور ہے۔"

"تم.... تم جادوگرنی ہو"۔ عنبر نے گھبرا کر پوچھا۔

لڑکی کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

"میرا باپ جادوگر ہے مگر میری ماں جادو پسند نہیں کرتی...."

لڑکی اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولی:

"لیکن میں تمہیں یہ سب کیوں بتا رہی ہوں میں تو تمہارا نام بھی نہیں جانتی۔"

"عنبر...." عنبر نے جلدی سے کہا:

"اور تمہارا نام؟"

"تورکینہ...." لڑکی نے بتایا۔

"تمہاری باتیں بڑی دلچسپ ہیں تورکینہ.... کیا میں تمہارا ہاتھ پکڑ سکتا ہوں۔"

"اب تم میرا ہاتھ پکڑو گے تو مجھے اپنے گجرے اتار کر تمہارے گلے میں ڈالنا ہوں گے اور پھر...."

تورکینہ نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"پھر کیا ہوگا؟"

"پھر تم میرے شوہر ہو جاؤ گے"۔ تورکینہ نے بے جھجک کہا۔

"لیکن.... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

عنبر کی گرفت بالکل ڈھیلی ہو گئی:

"ہمارے یہاں پہلے نکاح ہوتا ہے پھر دلہن رخصت ہو کر گھر میں آتی ہے۔"

"تو میں کب تمہارے گلے پڑ رہی ہوں۔"

تورکینہ نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا:

"میں تو اپنے قبیلے کا دستور بتا رہی تھی۔ میں صورت شکل کی بھی ایسی بری نہیں ہوں کہ لوگ مجھے پسند نہ کریں۔"

"پھر شادی کیوں نہیں کی؟ کسی مرد کا ہاتھ پکڑ لیا ہوتا"۔ عنبر نے اسے چھیڑا۔

"میں کیوں کسی کا ہاتھ پکڑنے لگی۔"

وہ مصنوعی غصے سے بولی:

"ہاتھ تو مرد پکڑتے ہیں۔ سب مجھے حاصل کرنا چاہتے ہیں.... لیکن ماں نہیں مانتی۔"

"ہوں.... وہ تمہیں کسی بڑے مغل سردار کے حوالے کرنا چاہتی ہوگی"۔ عنبر نے پھر طنز کیا۔

"اسے مغلوں سے نفرت ہے عنبر! میری ماں ایک خدا کو مانتی ہے۔ میرا باپ اسے اٹھا لایا تھا اور زبردستی اس سے شادی کر لی تھی۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے پہاڑی کے دوسری طرف پہنچ گئے۔ اُدھر تاتاری لشکر خیمہ زن تھا۔ جگہ جگہ پہرے دار سوار عنبر کو روک کر کہتے۔ عنبر اپنا نام بتاتا اور تورکینہ کو ساتھ لیے آگے بڑھتا رہا۔ تاتاری لشکر کے خیموں کی قطاریں شروع ہو گئی تھیں۔

ایک خیمے کے آگے بڑا الاؤ روشن تھا۔ اس کی روشنی میں عنبر نے تورکینہ کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا وہ حقیقتاً دو شیزہ بے حد خوبصورت تھی۔

"کیا دیکھ رہے ہو عنبر؟"

تورکینہ مسکرائی:

"میں نے کہا تھا کہ میں اتنی بری نہیں ہوں۔"

"تم تو شبنم سے دھلی ہوئی پاکیزہ کلی ہو۔"

عنبر نے کہا اور تورکینہ کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ بولا:

"تورکینہ! لشکری تمہیں عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ اب میں تمہیں کسی کے حوالے کیے دیتا ہوں۔ وہ تمہیں سردار کے پاس پہنچا دے گا۔"

"تم کیوں نہیں چلتے میرے ساتھ۔"

تورکینہ نے ٹھٹک کر پوچھا:

"کیا میں بری لگتی ہوں۔"

"یہ بات نہیں تورکینہ۔ اگر سردار نے پوچھا کہ میں نے اپنی جگہ کیوں چھوڑی تو میں کیا جواب دوں گا۔"

عنبر نے وضاحت کی۔

"ہاں۔ یہ بات تو ہے.... لیکن وعدہ کرو کہ ایک بار میرے پاس ضرور آؤ گے۔"

"تمہارے پاس؟ مگر کس جگہ؟" عنبر کے دل میں شوقِ ملاقات نے انگڑائی لی۔

"جس جگہ تم نے مجھے پکڑا تھا اس کے نیچے ایک خشک نالہ ہے۔ نالے کے اس پار ایک اور پہاڑی ہے۔ اس کے دونوں جانب پتھریلا راستہ ہے۔ اس پہاڑی کے پیچھے ہماری جھونپڑیاں ہیں۔ کسی سے بھی پوچھ لینا۔ سب مجھے جانتے ہیں۔ کل یا پرسوں ضرور آنا۔"

"کل یا پرسوں۔۔۔۔"

عنبر سوچ میں پڑ گیا۔ جنگ سر پر کھڑی تھی۔ وہ وعدہ کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔

"عنبر۔۔۔۔"

تورکینہ مسکرائی:

"تم ضرور آؤ گے۔ تمہیں آنا ہی پڑے گا۔ جب تمہارے لشکر کو شکست ہو جائے اور تمہیں کہیں پناہ نہ ملے تو میرے پاس آ جانا۔"

"شکست۔۔۔۔"

عنبر تھرا اٹھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تورکینہ اس قدر اعتماد سے بار بار شکست کا ذکر کیوں کر رہی ہے۔ اس نے اپنی تسلی کے لیے پوچھا:

"تورکینہ۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ تاتاریوں کو شکست نہ ہو۔"

"اگر تمہارے سردار نے میری ماں کی بات مان لی تو شاید شکست سے بچ جائے۔"

تورکینہ نے اسی اعتماد سے کہا:

"لیکن بارش تو ضرور ہوگی۔۔۔۔ موسلا دھار بارش۔۔۔۔ اور یہی بارش تاتاریوں کو شکست دے گی۔"

"بارش کیوں ہوگی۔ یہ بارشوں کا موسم تو نہیں۔"

"بارش کو مغلوں کے ساحر اپنے جادو کے زور سے بلا لیں گے۔"

تورکینہ نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"اور آسمان سے اتنا پانی برسے گا کہ تاتاریوں کے گھوڑے پانی اور خون میں آدھے آدھے ڈوب جائیں گے۔"

تورکینہ اس طرح کہہ رہی تھی جیسے کتابِ تقدیر اس کے سامنے کھلی رکھی ہو اور وہ اس کے اوراق الٹ رہی ہو۔

عنبر پر خوف سا طاری ہو گیا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا:

"تورکینہ۔ اگر بارش تاتاریوں کی شکست کا باعث ہے تو کیا اس بارش کو روکا نہیں جا سکتا۔ جو بارش بلائی جا سکتی ہے اسے روکنے کا بھی تو کوئی طریقہ ضرور ہوگا؟"

"ہاں۔ ہے کیوں نہیں۔۔۔۔ ہر سحر اور جادو کا توڑ ہوتا ہے۔"

تورکینہ نے فوراً جواب دیا:

"ہماری بستی کا ہر مرد ساحر ہے۔ وہ سب مل کر جادو جگائیں گے۔ بارش کا طوفان برپا ہوگا۔ اس دوران میں اگر کوئی ان میں سے کسی ایک ساحر کو بھی قتل کر دے تو سحر ٹوٹ جائے گا۔۔۔۔ اور آسمان بالکل صاف ہو جائے گا۔"

عنبر پھٹی پھٹی آنکھوں سے تورکینہ کو دیکھ رہا تھا۔ تورکینہ کی باتیں اس کی فہم سے بالا تھیں۔ اس نے خود کو سنبھالا اور قریب سے گزرتے ہوئے ایک پہرے دار کو روک کر تورکینہ کو اس کے حوالے کر دیا۔

"اسے فوراً سپہ سالار کے پاس لے جاؤ۔ یہ مغلوں کے بارے میں کوئی پیغام لائی ہے۔"

اس نے پہرے دار کو سمجھا کر تورکینہ اس کے ساتھ کر دیا اور پھر خود اپنی پہرے والی جگہ پر واپس پہنچ گیا۔ یہ سب کچھ اسے ایک خواب سا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اگر اسے موقع ملا تو وہ ایک بار ضرور تورکینہ سے ملنے جائے گا۔

○

یہ مغلوں اور تاتاریوں کی دوسری بڑی جنگ تھی۔

پہلی جنگ میں تاتاریوں کی تعداد صرف آٹھ ہزار تھی لیکن تیمور نے اپنی شجاعت اور حکمتِ عملی سے مغلوں کے تیس ہزار کے عظیم لشکر کو شکست دی تھی۔ مغلوں کا سردار بیکیچک اور کچھ مغل سردار اور اس کا بیٹا گرفتار کر لیے گئے تھے۔

تیمور کے سالے امیر حسین نے اس جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا لیکن جب گرفتار ہونے والے مغلوں کے فیصلے کا وقت آیا تو وہ تیمور کو مشورہ دینے آ گیا۔

"سردار تیمور۔ ان مغل سرداروں کو فوراً قتل کر دینا چاہیے۔" امیر حسین نے بڑے رعب سے تیمور کو مشورہ دیا۔

"میں نے تم سے کب مشورہ طلب کیا ہے امیر حسین۔" تیمور نے بگڑ کر پوچھا۔ "یہ جنگ میں نے خود

جیتی ہے۔ گرفتار شدگان کا فیصلہ بھی میں خود کروں گا۔"

امیر حسین کو یہ جواب بڑا شاق گزرا مگر تیمور کی طاقت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ اسے خاموشی اختیار کرنی پڑی۔

تیمور نے امیر حسین کے مشورے کی کوئی پروا نہ کی۔ اس نے فوجی امیروں کو طلب کیا۔ تیمور کے حکم سے مغل سرداروں کو دوسرے قیدیوں کی طرح باندھ کر نہیں رکھا گیا تھا۔ انہیں کھانے کو بھی اچھا دیا گیا تھا۔ مغل سپہ سالار بیک جک دوسرے سرداروں کے ساتھ تیمور کے بڑے خیمے میں داخل ہوا تو اس کا سر شرم سے جھکا ہوا تھا۔

"بیک جک! سر اٹھا کر بات کرو۔"

تیمور نے اسے اپنے سامنے قالین پر بیٹھنے کا اشارہ کیا:

"تم جنگی قیدی ہو کوئی اخلاقی مجرم نہیں۔ ہم بہادروں کی قدر کرتے ہیں بیک جک۔"

بیک جک شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا لیکن اس کی نظریں اب بھی نیچی ہی تھیں۔ امیر حسین جل بھنا جا رہا تھا۔ وہ مغلوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"بیک جک! تم شکست کھا گئے لیکن تم نے بہادری سے مقابلہ کیا۔"

تیمور نے کہا:

"تم نے بلادِ شمال کے خانِ اعظم اور شاہ سمرقند الیاس خواجہ کا حقِ نمک بھی ادا کر دیا۔ اب بتاؤ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ ہم اس کا فیصلہ تم پر چھوڑتے ہیں۔"

بیک جک نے قدرے بے اطمینانی اور حیرت سے سر اٹھا کر تیمور کو دیکھا اور بولا:

"فاتح سردار۔ ہم جنگی قیدی ہیں ہم نے آپ کے خلاف تلوار اٹھائی اور دست بدست لڑائی میں شکست کھائی ہے آپ کو حق پہنچتا ہے کہ ہمارے بارے میں جو چاہے فیصلہ کریں۔ ہم آپ سے کسی رعایت کی قطعاً درخواست نہیں کریں گے۔"

"سردار تیمور!"

امیر حسین نے پھر دخل دیا:

"میرا مشورہ ہے کہ ....."

"مجھے تمہارا مشورہ نہیں چاہیے امیر حسین۔"

تیمور نے اس کی بات کاٹ دی:

"گفتگو فاتح اور مفتوح کے درمیان ہو رہی ہے۔ مجھے کسی کے مشورے کی ضرورت نہیں۔"

امیر حسین اپنا سا منہ لے کر رہ گیا!

"ہاں بیک جک!"

تیمور پھر مغل سردار سے مخاطب ہوا:

"فیصلے سے پہلے ہم تمہاری رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔"

"فاتح سردار....."

مغل سپہ سالار نے تیمور سے آنکھیں ملاتے ہوئے کہا:

"آپ ہمیں قتل کر کے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کر لیں گے۔ ہمارے قبیلے کے بہت سے لوگ بدلہ لینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے اور اگر آپ ہمیں زندہ چھوڑ دیں گے تو ہمارے اہل قبیلہ آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں گے۔ آپ کو نئے حلیف مل جائیں گے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو ہمارے لیے موت اور زندگی یکساں ہے۔"

تیمور بیک جک کے جواب سے بہت خوش ہوا:

"تم اور تمہارے ساتھی درحقیقت بہادر انسان ہیں۔"

پھر تیمور نے سردار ایلچی بہادر کو حکم دیا:

"مغل سرداروں کے لیے گھوڑے لائے جائیں..... اور ان کا تمام اسلحہ واپس کر دیا جائے۔"

مغل امیروں کے لیے سجے ہوئے گھوڑے لائے گئے۔ اسلحہ واپس کیا گیا جو انہوں نے اپنے جسموں پر سجا لیا۔ تیمور نے مزید مہربانی کرتے ہوئے انہیں بیش قیمت تحائف دے کر رخصت کیا۔ آئندہ چل کے اس کے بہت اچھے نتائج برآمد ہوئے۔ اور تیمور کو بہت سے مغل قبائل کا تعاون حاصل ہو گیا۔

O

مغلوں کو شکست دینے کے بعد تیمور اپنی بیوی الجائی خاتون اور بیٹے جہانگیر کو لے کر اپنے شہر، شہر سبز کی طرف بڑھا۔ شہر سبز پر بیک جک کے دوسرے بیٹے کا قبضہ تھا۔ اسے اپنے باپ کی شکست کا علم نہ تھا۔ اس کے پاس کچھ مغل فوج تھی۔

تیمور کی آمد کی اطلاع پا کر اس نے مقابلے کی تیاری کی اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔

تیمور اپنے خوبصورت شہر کو تباہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی یہ خواہش تھی کہ شہر سبز، بغیر خون بہائے
نقصان اٹھائے اسے حاصل ہو جائے۔ اس کے لیے اس نے "تاتاری جنگ" کا ایک پرانا طریقہ اختیار کیا۔ اس نے
شہر سبز کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے ساتھ صرف چند دستے تھے۔ وہ پورا لشکر، مغلوں سے مقابلے کے لیے تو
آیا تھا۔ مغل اگرچہ شکست کھا کر دریائے اسمو اور دریائے سیر کا پورا علاقہ خالی کر گئے تھے لیکن ان کی دا
متوقع تھی۔

محاصرہ کرتے وقت تیمور نے فصیل کے چاروں طرف گھوڑے دوڑا کر اس قدر گرد اڑائی کہ گرد کے بادل
سے سورج تک چھپ گیا۔

مغلوں نے فصیل پر چڑھ کر دیکھا تو قلعے کے تین اطراف میں گرد ہی گرد دکھائی دی۔ مغلوں کو یہ غلط فہمی ہوئی
کہ تیمور بے شمار لشکر کے ساتھ آیا ہے۔ تیمور ان کو یہی باور کرانا چاہتا تھا۔ اس نے ان کے بھاگنے کے لیے
ایک راستہ کھلا رکھا تھا۔ مغل رات کے وقت، اسی راستے سے بڑی خاموشی کے ساتھ قلعہ چھوڑ کر نکل گئے اور
کا بغیر کسی خون خرابے کے شہر سبز پر قبضہ ہو گیا۔

مغل بادشاہ الیاس خواجہ خان، تاتاریوں کا علاقہ خالی تو کر گیا لیکن سرحد سے کچھ دور جا کر ٹھہر گیا اور
وہاں اپنا لشکر اکٹھا کیا۔ ابھی وہ جوابی حملے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ اس کے باپ کے مرنے کی اطلاع آ گئی۔ اس
باپ، بلاد یتیمان کا خان اعظم، تغلق تیمور اپنے مرکز حصار المالیق میں مرا تھا۔

مغلوں کا دستور تھا کہ وہ خانِ اعظم کے مرنے کے بعد دوسرا خان منتخب کرتے تھے۔ اس کے لیے ا
مجلس ترتیب دی جاتی تھی جس میں تمام سردار اور بزرگ شرکت کرتے تھے۔ انتخاب کے اس طریقے کو مغل قر
کہتے تھے۔

الیاس خواجہ ولی عہد سلطنت تھا لیکن قرولتائی سے تصدیق سے پہلے وہ خان اعظم کا لقب اختیار نہیں کر
تھا اس لیے اسے مجبوراً حصار المالیق جانا پڑا۔ وہ بڑی تیزی سے حصار المالیق پہنچا اور قرولتائی کی تصدیق کے بعد
لشکر سے آن ملا۔ اور پھر پوری رفتار سے تاتاری علاقے کا رخ کیا۔ . . . . لیکن تیمور اس سے بے خبر نہ تھا
شہر سبز سے چل کر اپنے لشکر میں آ پہنچا۔

○

پہلی جنگ کے برخلاف اس وقت فوجی توازن تیمور کے حق میں تھا۔ اب اس کے لشکر کی تعداد مغلوں

کہیں زیادہ تھی۔ امیر حسین بھی اپنے غوری قبائل، کابل کے گٹھیلے جوانوں اور ایرانی شہ سواروں کے ساتھ اس سے آ
ملا۔ تیمور بہت پُر امید تھا۔

پھر ایک دن مغل لشکر میں، ہل چل ہوئی۔ انہوں نے صفیں ترتیب دیں۔ تیمور نے بھی صفوں کو درست کرایا۔
اس کے لشکر کی تعداد زیادہ تھی اس لیے وہ کھلے میدان میں لڑنا چاہتا تھا۔ اس کے دستے آبِ بادام تک پھیلے ہوئے
تھے۔ تیمور نے میمنہ (دایاں بازو) امیر حسین کے سپرد کیا اور اس میں زیادہ لشکر رکھا۔ میسرہ (بایاں بازو) خود
سنبھالا۔

مغلوں نے لشکر ترتیب دینے کے بعد بھی پیش قدمی شروع نہیں کی۔ یہ امر تیمور کے لیے باعثِ حیرت تھا
اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ مغل آگے کیوں نہیں بڑھتے؟ وہ کس بات کا انتظار کر رہے ہیں؟! اس نے یہ ضرور محسوس
کیا کہ مغل، گھوڑے کھڑے کر آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

معاً مطلع ابر آلود ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا آسمان بادلوں میں چھپ گیا۔

ایک لمحے کے لیے تیمور کے چہرے پر خوف کی ایک لکیر سی آ کر گزر گئی۔ اس کے دل میں وسوسے پیدا
ہونے لگے اور اس کی نگاہوں کے سامنے تورکینہ کا چہرہ گھوم گیا جو گزشتہ رات اس کے پاس اپنی ماں کا پیغام
لے کر آئی تھی:

"مغل ساحروں کے جادو سے موسلا دھار بارش ہو گی۔ گھوڑے زمین میں دھنس جائیں گے۔ اپنی لشکر گاہ
میں پانی کی نکاسی کے لیے نالیاں کھود لینا۔ گھوڑوں پر چمڑے کی جھولیں ڈال دینا۔ کمانوں کو بھیگنے سے بچانا۔ میدان
چھوڑ کر اونچی جگہ پر لشکر جمانا۔"

چھما چھم پانی برسنے لگا۔

تیمور گم صم کھڑا آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے تورکینہ کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی تھی اور اس کی ماں کا
شکریہ ادا کر کے اسے واپس بھیج دیا تھا لیکن اس وقت تورکینہ کی باتیں سچ معلوم ہو رہی تھیں۔

وہ انہی خیالوں میں گم تھا کہ مغلوں کا لشکر حرکت میں آ گیا۔ تیمور کا لشکر بھی حرکت میں آ گیا۔ تیمور اپنے ریزرو
سواروں کے ساتھ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اس کے باقی دستوں نے کمانیں سنبھالیں اور تیر برساتے ہوئے آگے بڑھے
مگر کمانیں بارش میں بھیگ کر بے کار ہو گئیں اور سواروں کو تلواروں کا سہارا لینا پڑا۔

تیمور کے دستوں نے بڑا طوفانی حملہ کیا تھا لیکن مغلوں نے روک کر انہیں پیچھے دھکیل دیا۔ تاتاری دستوں
میں افراتفری پھیل گئی۔ اور ان کے قدم اکھڑ گئے۔

تیمور نے فوراً ریزرو دستوں کے ساتھ حملہ کر دیا۔ . . . . اور مغلوں کو دور تک دھکیلتا چلا گیا۔ . . . مگر

نرم زمین میں گھوڑوں کے پیر دھنسنے لگے..... تاتاری بڑی مشکل میں پھنس گئے تھے مگر تیمور نے کمال جرأت کا مظاہرہ کیا۔ اس نے اپنے سرداروں کے ساتھ مغل پرچم بردار شگرم زبان پر حملہ کر دیا۔ وہ ایک بھاری بھرکم مغل تھا۔ اس نے حملہ روک کر تیمور پر تبر سے جوابی حملہ کر دیا۔ تیمور نے گھوڑا موڑ کر خود کو بچایا۔ اسی وقت جاکو برلاس نے نیزہ مار کر شگرم زبان کو گرا دیا۔ مغلوں کا پرچم سرنگوں ہو گیا اور وہ گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

تیمور نے اپنا گھوڑا ایک پہاڑی پر چڑھا دیا اور میدانِ جنگ پر نظر ڈالی۔ امیر حسین شکست کھا کر پیچھے آیا تھا۔ اور مغل اسے گھیرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

تیمور نے واپس آ کر اپنے سرداروں کو جمع کیا اور مغلوں پر پشت سے حملہ کر کے ان کی صفوں میں گھس گیا۔ مغل بادشاہ الیاس خواجہ اپنے محفوظ دستوں کے لیے الگ کھڑا مغلوں کو لڑا رہا تھا۔

تیمور نے امیر حسین کو پیغام بھیجا کہ:

"یہ جوابی حملے کا بہترین موقع ہے۔ فوراً سنبھل کر حملہ کر دو۔"

امیر حسین اس پیغام پر جھنجھلا اٹھا اور بولا:

"کیا میں بزدل ہوں جو تیمور ایسا پیغام بھیج کر میرے آدمیوں کے سامنے مجھے ذلیل کر رہا ہے۔"

پیغام لے جانے والے نے واپس آ کر تیمور کو امیر حسین کا جواب سنا دیا۔ تیمور دانت پیس کر رہ گیا۔ تاتاریوں میں ابتری پیدا ہو گئی تھی۔ امیر حسین نے کوئی پیش رفت نہیں کی۔

تیمور نے ایک بار پھر کوشش کی اور امیر حسین کے پاس دو ایسے سرداروں کو پیغام دے کر بھیجا جو اس کے قریبی عزیز تھے..... مگر امیر حسین کے کان پر جوں نہیں رینگی۔ اس نے بگڑ کر کہا:

"تیمور بار بار مجھے آگے بڑھنے کا حکم کیوں دے رہا ہے؟ میرے سوار منتشر ہو گئے ہیں۔ مجھے انہیں اکٹھا کرنا ہے۔"

پیغام لانے والے سردار کو غصہ آ گیا۔ اس نے بگڑ کر کہا:

"یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن غور کیجیے کہ اس وقت سردار تیمور اپنے محفوظ دستوں کے ساتھ مغلوں میں گھر گئے ہیں۔ اگر آپ نے بڑھ کر حملہ نہ کیا تو اس کا نتیجہ بڑا خطرناک ہو سکتا ہے۔"

امیر حسین نے کوئی معقول جواب نہیں دیا اور نہ ہی آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ اس کی اس بے التفا لوگوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ امیر حسین نے جان بوجھ کر حملہ نہیں کیا۔ شاید وہ چاہتا ہے کہ تیمور مارا جائے تاکہ اس کے لیے میدان صاف ہو جائے۔

تیمور جس طرح لڑتا بھڑتا مغلوں میں داخل ہوا تھا اسی طرح ان کا گھیرا توڑ کر صاف نکل آیا لیکن اب

جما نہ جم سکے۔ اور اسے پسپا ہونا پڑا۔ اندھیرا ہو جانے کی وجہ سے لڑائی رک گئی تھی۔

تیمور کو امیر حسین پر سخت غصہ تھا۔ اس نے رات کے وقت اپنی فوج کو اکٹھا کر کے کھیتوں میں قیام کیا۔ صبح کی جنگ میں اس کے کئی ہزار سوار اور بہت سے سردار کام آ گئے تھے۔

تمام رات تیمور بے چین رہا۔ اس نے کسی سے بات نہ کی۔ امیر حسین نے بھی کئی آدمی بھیجے مگر تیمور نے ان سے ملنے سے انکار کر دیا۔

رات بھر اسے ساحروں کا خیال ستاتا رہا اور تور کینہ کی باتیں یاد آتی رہیں۔ تیمور نے لشکر میں طغر کو تلاش کروایا لیکن وہ کہیں نہ مل سکا۔ شاید وہ بھی لڑائی میں کام آ گیا تھا۔

وہ رات تیمور پر بہت بھاری گزری۔ سب سے زیادہ اسے امیر حسین کی بدمزاجی اور بے وفائی کا دکھ تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ آئندہ کبھی امیر حسین کے ساتھ مشترکہ کمان میں جنگ نہیں کرے گا۔

رات بھر بجلی کڑکتی اور بادل گرجتے رہے لیکن صبح ہوتے ہی پھر بارش نے آ گھیرا۔ تیمور کو ہر صورت مقابلہ کرنا تھا۔ اس نے ہمت نہیں ہاری اور بچا کھچا لشکر لے کر میدان میں اتر آیا۔ مگر بارش کی وجہ سے میدان جھیل کا منظر پیش کر رہا تھا۔ گھوڑوں کے پیر نرم زمین میں دھنستے جا رہے تھے۔ بعض گھوڑے تو گھٹنوں گھٹنوں زمین میں دھنس گئے تھے۔ سواروں کو پیدل لڑنا پڑا۔

مغلوں کے مقابلے پر آج صرف تیمور کا لشکر تھا۔ امیر حسین کو نہ تو اس نے بلایا اور نہ ہی وہ خود آ کر جنگ میں شریک ہوا۔ شدید بارش کی وجہ سے اس کی کوئی حکمت عملی کام نہ آ رہی تھی۔ مغلوں کے گھوڑوں پر چمڑے کی جھولیں پڑی تھیں یا کمبل ڈھکے ہوئے تھے۔ انہیں بارش کی آدھی کلفت بھی برداشت نہ کرنا پڑی۔ ساری قیامت تیمور کے لشکر پر گزری۔ ہزاروں تاتاری کھیت رہے۔ مغلوں نے چاروں طرف سے یلغار کر دی۔ تیمور کو مجبوراً پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس نے منظم پسپائی اختیار کی اور اسے شکست فاش ہوئی۔

تیمور میدانِ جنگ سے ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ امیر حسین کا ایک سوار گھوڑا اڑاتا ہوا تیمور کے پاس آیا لیکن تیمور نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ خود ہی بولا:

"سردار تیمور۔ شاہِ کابل نے پیغام بھیجا ہے کہ آپ سمرقند کے بجائے ہندوستان کی طرف نکل جائیں۔"

تیمور نے کوئی جواب نہ دیا۔ سوار واپس چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد دوسرا پیغام آیا:

"شاہِ کابل کا مشورہ ہے کہ آپ سمرقند کا رخ نہ کریں۔ ہندوستان میں آپ کو امن و سکون ملے گا۔ میں بھی ہندوستان جا رہا ہوں۔"

تیمور نے گھوڑا روک کر سوار کو گھورا اور کہا:

"امیر حسین سے کہنا کہ تم ہندوستان جاؤ یا جہنم میں۔ مجھے کیا..... میں جانتا ہوں کہ مجھے اب کیا کرنا ہے؟"

تیمور نے اتنی گرجدار آواز میں کہا کہ سوار خوفزدہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔

تیمور نے گھوڑا بڑھایا مگر ذرا دور چل کر ٹھٹھک گیا۔ بارش رک گئی تھی اور آسمان بادلوں سے صاف ہوتا رہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں سورج پوری تمازت سے چمکنے لگا۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔

تیمور کو نورکینہ کے الفاظ یاد آ گئے:

"تاتاری سردار۔ اگر تم نے بارش سے بچاؤ کا انتظام نہ کیا تو بارش تمہیں میدان سے بھگا دے گی اور طوفان اس وقت تھمے گا جب تاتاریوں کو شکست ہو جائے گی!"

○

نورکینہ جب اپنی ماں کا پیغام تیمور کو دے کر واپس آئی تو فوراً تو عنبر اسی پہاڑی پر پہرے داری کر رہا تھا۔ عنبر نے قدموں کی چاپ سے نورکینہ کو پہچان لیا اور لپک کر اس کے پاس پہنچ گیا:

"سردار کو پیغام پہنچا دیا نورکینہ؟" عنبر نے پوچھا۔

"ہاں....." نورکینہ رک کر بولی۔

عنبر کو نورکینہ کی آواز میں تھکن اور دھیما پن محسوس ہوا۔ اندھیرے میں وہ اس کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اس نے پوچھا:

"نورکینہ، کیا سردار نے تمہیں ڈانٹا ہے؟"

نورکینہ خاموش رہی۔

"نورکینہ!"

عنبر نے بڑے پیار سے کہا:

"کوئی خاص بات ضرور ہوئی ہے۔ اگر تم مجھ پر اعتماد کر سکتی ہو تو بتا دو۔"

"نہیں عنبر۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔"

نورکینہ دبی دبی آواز میں بولی:

"لیکن مجھے اندازہ ہے کہ تمہارے سردار کو میری ماں کی بات کا اعتبار نہیں آیا۔ انہوں نے میری باتوں پہ کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ حالانکہ ماں نے جو کچھ کہا ہے وہ ضرور پورا ہوگا۔ عنبر! میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں۔ میں..... میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ....."

اس کی آواز بھرا گئی اور وہ آگے نہ بول سکی۔

"میں جانتا ہوں تم کیا چاہتی ہو نورکینہ!"

عنبر نے کہا:

"تم چاہتی ہو کہ میں موت سے ڈر کر جنگ سے دور رہوں..... نورکینہ! ملک کو آزاد کرانا سب سے بڑا جہاد ہے۔ ہم مسلمان ہیں..... مغل بے دین۔ میں شہید ہو جاؤں گا لیکن میدان نہیں چھوڑوں گا۔"

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں عنبر!"

نورکینہ الجھتے ہوئے بولی:

"جان سب سے پیاری چیز ہے۔ جان کی حفاظت جانور تک کرتے ہیں..... پھر تم خود کو بچانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے..... بادشاہوں کی لڑائی میں سپاہیوں کو کیا ملتا ہے؟"

"تم سمجھو یا نہ سمجھو مگر میں میدان نہیں چھوڑ سکتا۔"

عنبر نے زور دے کر کہا:

"کچھ بھی ہو جائے میں مغلوں کا مقابلہ کروں گا۔"

"تمہاری مرضی عنبر!"

نورکینہ نے ہار مان لی:

"لیکن اگر تمہیں میری مدد کی ضرورت پڑے تو میری جھونپڑی میں چلے آنا۔ میں تمہاری حفاظت کروں گی۔"

"تمہارا خیال ہے کل جنگ ضرور ہوگی؟"

"کل بارش ضرور ہوگی۔"

نورکینہ بولی:

"تمام جادوگروں نے یقین دلایا ہے۔ ان کی کوئی بات جھوٹی نہیں ہوتی۔ اگر بارش ہوگی تو جنگ بھی ہوگی۔ جب تک بارش نہیں ہوگی مغل جنگ شروع نہیں کریں گے۔"

"تم نے بتایا تھا کہ بارش رک بھی تو سکتی ہے۔" عنبر کو ایک دم یاد آیا۔

"ہاں..... اگر ایک جادوگر بھی مار ڈالا جائے تو بارش رک جائے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ بس اب تم جاؤ۔"

"کیا ٹھیک ہے؟"

تورکینہ نے پوچھا:

"کیا تم میرے پاس آؤ گے؟"

"میں ایک بار تم سے ملنے کی کوشش ضرور کروں گا۔" عنبر نے اسے یقین دلایا۔

تورکینہ نے خوش ہو کر عنبر کو پھولوں کا ایک گجرا دیدیا:

"اسے اپنے پاس رکھ لو۔ یہ تمہیں میری یاد دلاتا رہے گا۔"

"یہ پھول تو صبح تک مرجھا جائیں گے۔" عنبر نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"پھول مرجھانے کے بعد بھی کسی نہ کسی کام آجاتے ہیں..... اگر مرجھائی ہوئی ایک پتی بھی تمہارے پاس رہ جائے تو میری یاد دلانے کے لیے کافی ہو گی۔"

عنبر نے گجرے میں سے ایک پھول نکال لیا اور باقی گجرا اسے واپس کرتے ہوئے بولا:

"بس ایک پھول کافی ہے۔ گجرے میں خوشبو زیادہ ہے جو کسی بھی وقت میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔"

تورکینہ واپس چلی گئی۔

پھر تو عنبر رات بھر خیالوں سے الجھتا رہا۔

صبح دم مغلوں کے لشکر میں جنگ کے آثار پیدا ہوئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ حملہ کرنے والے ہوں۔ تاتاری بھی تیار ہو گئے۔ عنبر کی پہاڑی پہ تیر اندازوں کا ایک تازہ دم دستہ بھیج دیا گیا..... لیکن دوپہر تک کسی طرف سے پہل نہیں ہوئی۔

عنبر کو تورکینہ کی باتیں خیالی معلوم ہوئیں۔ وہ ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ ایک دم بادل گھر آئے..... اور پھر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی مغلوں نے بڑھ کر حملہ کر دیا۔

تاتاری تیر اندازوں نے اپنے ترکش خالی کرنے شروع کر دیے لیکن کمانیں بھیگ کر بیکار ہو گئیں۔ تیر اندازوں کو تلواریں نکال کر آگے بڑھنا پڑا۔ عنبر حیرت سے آسمان سے برستے پانی کو دیکھ رہا تھا اور بار بار اس کی نظر اس پہاڑی کی طرف اٹھ جاتی جس کے دوسری طرف تورکینہ کے قبیلے والے رہتے تھے۔

مغل یلغار کرتے پہاڑی کے چاروں طرف پھیل گئے۔ عنبر کے بھاگنے کے تمام راستے مسدود ہو گئے۔ اسے

مجبور ہو کر ایک چٹان کے پیچھے پناہ لینی پڑی۔

جنگ زوروں پر تھی۔ گھوڑوں کے ہنہنانے، سپاہیوں کی چیخ و پکار اور نقارے بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور عنبر پہاڑی پر محصور ہو کر رہ گیا تھا۔

رات ہونے پر جنگ رک گئی۔

عنبر اپنی پناہ گاہ سے باہر آیا..... بارش تقریباً رک گئی تھی۔ اس نے اپنے لشکر کی طرف نگاہ دوڑائی۔ وہاں بالکل سناٹا تھا۔ مغل سوار ہر طرف بھاگتے پھر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے خیمے آگے بڑھ کر لگا لیے تھے اور جگہ جگہ الاؤ روشن تھے۔

عنبر کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ سمجھ گیا کہ تاتاری شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ تورکینہ نے سچ کہا تھا..... بارش ہو گی تو جنگ ہو گی اور تاتاریوں کو شکست ہو گی۔

وہ سوچنے لگا۔ ساحر..... جادو..... یہ سب کیا ہے؟ جادوگر بھی جنگ لڑتے ہیں؟ عنبر رات بھر انہی خیالوں میں کھویا رہا۔

اگلی صبح بھی بارش شروع ہو گئی۔

کچھ دور تاتاریوں کے نقارے بھی بجتے سنائی دیے۔ عنبر خوش ہو گیا۔ تاتاری واپس آ رہے تھے۔ عنبر میں جوش پیدا ہو گیا۔ اس نے سوچا وہ اپنے لشکر میں شامل ہو کر زبردست حملہ کرے گا اور..... داد شجاعت دے کر سردار تیمور کی خوشنودی حاصل کرے گا..... لیکن عنبر کے ارمان دل ہی میں رہے جا رہے تھے۔ کمان تو پہلے ہی بیکار ہو چکی تھی اب اسے تلوار یا خنجر بھی چلانے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ وہ چوہے کی طرح بل میں چھپ کر بیٹھنا بزدلی سمجھتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

جنگ شروع ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے لیکن تاتاری ابھی تک پہاڑی کے قریب نہیں پہنچے تھے۔ بارش زور و شور سے جاری تھی۔

"اگر یہ طوفانی بارش رک جائے تو؟....." عنبر نے سوچا۔

"لیکن کیسے رکے؟ ہاں۔ اگر ایک بھی جادوگر کو ہلاک کر دیا جائے تو یہ طوفان رک سکتا ہے۔" تورکینہ نے یہ بات بڑے وثوق سے کہی تھی..... پھر..... پھر..... میں ایک جادوگر کو ہلاک کر دوں گا اور یہ بارش رک جائے گی۔

عنبر ایک عزم کے ساتھ اپنی پناہ گاہ سے باہر آیا۔ اس نے جنگ کی طرف کان لگائے۔ تاتاریوں کے نقارے کی آوازیں اور زیادہ دور ہو گئی تھیں۔ "تاتاری شکست کھا کر شاید اور پیچھے ہٹ گئے ہوں۔" وہ سوچتے ہوئے پہاڑی

کے دوسری طرف اترنے لگا۔ تیز بارش کی وجہ سے اسے اترنے میں سخت دشواری ہو رہی تھی۔

وہ سنبھل سنبھل کر اترتے ہوئے نیچے پہنچ گیا۔ مغل لشکر تاتاریوں سے الجھا ہوا تھا اور مغل لشکر گاہ کے محافظ خیموں میں دبکے بیٹھے تھے۔ اس لیے عنبر کو اترتے کسی نے نہ دیکھا۔

عنبر اس پہاڑی کی طرف چل پڑا جس کے دوسری طرف جادوگروں کی بستی تھی۔ عنبر کے دل و دماغ سے اس وقت تورکینہ اور اس کی محبت کا خیال نکل گیا تھا۔ اس کی جگہ جذبۂ حب الوطنی نے لے لی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ایک جادوگر کو ضرور قتل کرے گا۔ خواہ اس میں اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

عنبر دریا کے کنارے پہنچ گیا۔ اس وقت دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ عنبر دریا میں اترا۔ دریا کی گہرائی کم تھی لیکن روانی بہت تیز تھی۔ عنبر کے پیر نہ جمتے تھے۔ اوپر سے بارش۔ پہاڑیوں کا تمام پانی اسی راستے سے بہہ رہا تھا۔ بہر حال وہ دھارے کو کاٹتا ہوا کسی نہ کسی طرح دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ اب وہ دوسری پہاڑی کے دامن میں تھا۔

وہ چکر کاٹ کر دوسری طرف پہنچا تو ساحروں کی جھونپڑیاں اس کے سامنے تھیں۔ ہر جھونپڑی ایک ہی وضع قطع کی تھی اور ہر جھونپڑی سے دھواں نکل رہا تھا جیسے اندر آگ جل رہی ہو۔

عنبر کا دل زور سے دھڑکا۔ کہیں تورکینہ سے آمنا سامنا نہ ہو جائے۔ اس نے دل مضبوط کیا اور چٹانوں کی آڑ میں بڑھنے لگا۔ بڑھتے بڑھتے وہ ایک جھونپڑی کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ تمام جھونپڑیوں کے دروازے سامنے کی طرف تھے۔

عنبر جھونپڑیوں کی پشت پر پہنچا اور ایک جھونپڑی میں جھانکنے کی کوشش کی لیکن اسے جلتے ہوئے الاؤ کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ عقب سے جھونپڑی میں داخل ہونا مشکل تھا۔ سوائے سامنے کے دروازے کے، جھونپڑی کے اندر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔

اس نے خنجر نکال کر منہ میں دبایا۔ تلوار ہاتھ میں لی اور جھونپڑی کے دروازے پر لٹکے ہوئے چمڑے کے پردے کو ذرا سا ہٹا کر جھانکا۔

الاؤ سے دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے اور الاؤ کے دوسری طرف ایک تنومند جادوگر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کی جٹائیں شانوں سے گزرتی ہوئی فرش پر آ رہی تھیں۔ کانوں میں بڑے بڑے بالے تھے۔ اس کے نیم برہنہ جسم پر رنگ برنگی دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔ اس کے دائیں اور بائیں لکڑی اور پتھر کی کنڈالیاں رکھی تھیں جن میں سے وہ کوئی چیز نکال کر الاؤ میں جھونک رہا تھا اور ساتھ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

عنبر کے جھونپڑی میں داخل ہوتے ہی اس کی بند آنکھیں کھل گئیں۔ ایک لمحے کے لیے اس کے بھیانک چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے لیکن پھر فوراً ہی اس نے قریب پڑا برچھا اٹھا کر عنبر پر دے مارا۔ عنبر ایک طرف

ہٹ گیا۔ برچھا دروازے میں اٹک گیا۔ دونوں کے درمیان الاؤ کے علاوہ اور بہت سی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ عنبر آگے بڑھا تو ایک بڑا سا برتن اس کی ٹھوکر سے الٹ گیا۔ اس میں شاید کوئی روغن بھرا ہوا تھا۔ روغن بہہ کر الاؤ میں گر گیا۔ جس سے ایک زبردست شعلہ بلند ہوا اور گھاس کی چھت نے آگ پکڑ لی۔ پوری جھونپڑی میں دھواں بھر گیا۔

ساحر نے عنبر پر جست لگائی اور اپنے بھاری بدن کے ساتھ عنبر سے ٹکرایا۔ عنبر کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی اور منہ میں دبا ہوا خنجر بھی گر گیا۔

جھونپڑی نے آگ پکڑ لی تھی اور ساحر اس سے لپٹا ہوا تھا۔ عنبر نے پوری طاقت سے ساحر کو دھکا دے کر خود سے الگ کیا اور لپک کر اپنا خنجر اٹھایا۔ پھر اس نے خنجر سے ساحر پر حملہ کر دیا۔ ساحر نے اس کی کلائی پکڑ لی مگر عنبر نے جھٹکا دے کر کلائی چھڑائی اور خنجر ساحر کے سینے میں پیوست کر دیا۔ ساحر لڑکھڑایا اور بھڑکتے ہوئے الاؤ میں جا گرا۔

عنبر نے اطمینان کی سانس لے کر خنجر کمر میں اڑسا۔ تلوار اٹھائی اور تیزی سے جھونپڑی سے نکل آیا۔ باہر اب تک بارش ہو رہی تھی۔ عنبر نے ایک نظر جلتی ہوئی جھونپڑی پر ڈالی۔ پھر بھاگتا ہوا دریا کے پاس گیا اور تیرتا ہوا دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔

ابھی وہ اپنی پہاڑی کے پاس بھی نہ پہنچا تھا کہ بارش ایک دم رک گئی۔ بادل پھٹ گئے اور سورج نکل آیا۔ عنبر دوڑتا ہوا پہاڑی پر پہنچ گیا۔ اسے خطرہ تھا کہ سورج کی روشنی میں اسے کوئی دیکھ نہ لے۔ پھر اپنی پناہ گاہ میں پہنچ کر وہ اپنے گیلے کپڑے نچوڑنے لگا۔

"بارش رک گئی ہے"۔۔۔۔ وہ سوچنے لگا۔ اب تاتاریوں کو شکست نہیں ہوگی۔ وہ مغلوں کو شکست دے دیں گے۔ اس نے چٹان کی اوٹ سے جھانک کر مغل خیموں کی طرف دیکھا۔ مغل اطمینان سے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ اس نے کان اس طرف لگا دیے جدھر جنگ ہو رہی تھی۔ وہ تاتاریوں کے نقاروں کی آواز سننے کے لیے بے چین تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بارش رکتے ہی تاتاریوں نے جوابی حملہ کیا ہوگا اور وہ جلد ہی مغلوں کو پسپا کرتے ہوئے ایک بار پھر اس میدان میں آ جائیں گے کیونکہ اس نے ساحروں کا سحر توڑ دیا ہے۔

عنبر دیر تک نقاروں کی آواز پر کان لگائے رہا مگر کوئی آواز نہ آئی۔

دوپہر ڈھل گئی۔

سہ پہر آ گئی۔

مگر عنبر کے کانوں میں کوئی آواز نہ آئی۔ اس کی پریشانی بڑھ گئی۔ تاتاریوں نے جوابی حملہ کیوں نہیں کیا؟ اس کا ذہن ماؤف ہونے لگا۔ پھر اسے میدانِ جنگ کی طرف سے کچھ سوار تیزی سے آتے دکھائی دیے۔ اس کے چہرے پہ رونق

آ گئی۔ یقیناً یہ مغل سوار ہیں، جو میدانِ جنگ سے بھاگ کر آ رہے ہیں۔ ان کے پیچھے مغلوں کا شکست خوردہ لشکر بھی آ تا ہو گا۔

ابھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ مغل سوار خیموں کے پاس پہنچ گئے۔ لشکر گاہ کے مغلوں نے انہیں گھیر لیا۔ آن کے درمیان کچھ باتیں ہوئیں۔ پھر تمام مغل خوشی سے نعرے لگانے لگے۔ انہوں نے شراب کے قدح لنڈھانا شروع کر دیے۔ وہ شراب پیتے اور اندر باہر بھاگتے پھر رہے تھے۔

عنبر کا دل بیٹھ گیا۔

مغلوں کو فتح حاصل ہوئی تھی اور تاتاری شکست کھا گئے تھے۔ اسی وقت فاتح مغلوں کا لشکر واپس آنا شروع ہو گیا۔ وہ ڈھول پیٹتے، نقارے بجاتے آ رہے تھے۔ مغل بادشاہ الیاس خواجہ کا گھوڑا آگے آگے تھا۔ کئی مغل سردار اس کے گھوڑے کی لگام پکڑے پیدل چل رہے تھے۔ مغل لشکر، جلوس کی شکل میں، میدانِ جنگ سے شادکام واپس آ رہا تھا۔

عنبر نے ایک پتھر سے ٹیک لگا لی۔ احساسِ شکست سے اس کے جسم پر لرزہ طاری تھا۔

○

تیمور نے سمرقند کی طرف پسپائی اختیار کی۔ مغل بہت محتاط تھے۔ انہوں نے تیمور کا تعاقب نہیں کیا۔ وہ اس کی شجاعت اور جنگی مہارت سے بخوبی واقف تھے۔ انہیں خطرہ تھا کہ اگر انہوں نے تیمور کا تعاقب کیا تو وہ کہیں پہاڑوں اور دروں میں گھیر کر ان پر حملہ نہ کر دے۔

الیاس خواجہ خان اپنی خیمہ گاہ میں واپس آ گیا۔ وہ تازہ دم ہو کر زیادہ عسکری طاقت کے ساتھ سمرقند کی طرف جانا چاہتا تھا۔ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ یہ فتح اسے صرف بارش کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اگر ساحر اس کی مدد نہ کرتے تو وہ تیمور کو شکست نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ سمرقند پر حملہ کرتے وقت ان ساحروں سے پھر کام لے گا۔

تیمور کی شکست کی خبر اس سے پہلے سمرقند پہنچ گئی تھی۔ اہلِ سمرقند سخت پریشان تھے۔ مغلوں کا سمرقند کی طرف بڑھنا یقینی تھا۔ اس لیے سمرقندیوں نے تیمور کے پہنچنے سے پہلے ہی سمرقند کے قلعے کو مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ فصیلوں کو درست کیا گیا۔ سامانِ خورد و نوش کا وافر ذخیرہ کر لیا گیا۔

جب تیمور کا شکستہ دل اور تھکا ہارا لشکر سمرقند میں داخل ہوا تو اہلِ سمرقند نے آنکھیں بچھا دیں اور تیمور کو اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ وہ جانتے تھے کہ سوائے تیمور کے مغلوں کی یلغار کو کوئی نہیں روک سکتا۔ ان کی تمام امیدیں صرف تیمور سے وابستہ تھیں۔

تیمور کو مغلوں کے ہاتھوں پہلی بار اتنی زبردست شکست اٹھانا پڑی تھی۔ اس کے باوجود اس نے ہمت نہ ہاری۔ مغلوں کا اس کا تعاقب نہ کرنا یہ ظاہر کرتا تھا کہ فتح کے باوجود وہ تیمور سے خائف تھے اور سمرقند کی طرف بڑھنے سے گھبرا رہے تھے۔

تیمور کچھ دن سمرقند میں ٹھہرا رہا۔ اس نے فصیلوں کا معائنہ کیا۔ فوج کا حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ آدھی سے زیادہ فوج برسات کی اس جنگ میں ماری جا چکی ہے۔ تیمور کے کئی با اعتماد اور بہادر سردار بھی اس جنگ میں کام آ گئے تھے۔ اسے فوج کی سخت ضرورت تھی۔ سمرقند میں اتنی فوج موجود نہ تھی کہ قلعے سے نکل کر مغلوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔ اس نے پہلے مدافعتی جنگ کا فیصلہ کیا۔ اس کے جاسوس سوار روز کی خبریں اس تک پہنچا رہے تھے۔

مغلوں نے میدانِ قتیِ ملتن سے اب تک قدم آگے نہ بڑھائے تھے۔ وہ اپنے مستقر حصار المالیق سے مزید کمک کا انتظار کر رہے تھے۔ مغلوں کا جانی نقصان کم ہوا تھا لیکن وہ جانتے تھے کہ سمرقند میں مقابلہ سخت ہو گا اس لیے وہ پوری تیاری سے آگے بڑھنا چاہتے تھے۔

ایک ماہ گزر جانے کے باوجود جب مغل سمرقند نہ پہنچے تو تیمور کی رگِ شجاعت نے جوش مارا۔ اسے قلعہ بند ہو کر بیٹھنے سے شرم آنے لگی۔ کچھ ہی دن پہلے وہ مغلوں کو اپنی سرحدوں سے پرے دھکیل چکا تھا اور اب خود اسے ان کے حملے کا انتظار تھا۔

تیمور نے تازہ دم فوج بھرتی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے مدافعتی نظام کو درست کیا۔ پھر سمرقند کے قاضی کو قلعے کی باگ ڈور سپرد کر کے اپنے شہر شہرِ سبز کی طرف چل پڑا۔

○

تیمور شہرِ سبز پہنچا تو اس کے مرشد مولانا زین الدین، شہر کے چند معززین کے ساتھ سرحد پر اس کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ تیمور نے گھوڑے سے اتر کر مولانا کو سلام کیا۔ مولانا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دینے کے بعد جو پہلا جملہ ان کے منہ سے ادا ہوا، وہ تھا:

"انا للہ و انا الیہ راجعون۔"

تیمور نے حیرت سے مولانا کی طرف دیکھا۔

"تیمور ....." مولانا نے گردن نیچی کر کے کہا:

"خدا کے کاموں میں کسی کو دخل نہیں۔ صبر کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔"

"کیا جہانگیر ....." تیمور اپنا جملہ مکمل نہیں کر سکا۔

"جہانگیر خیریت سے ہے لیکن الجائی خاتون آغا اب ہم میں موجود نہیں۔" مولانا نے دوبارہ تیمور کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

تیمور کے منہ سے ایک ہلکی سی سسکی نکلی جسے کوئی دوسرا نہ سن سکا۔ الجائی خاتون ایک دم بیمار پڑی اور تیسرے دن بڑی خاموشی سے اس دنیا کو چھوڑ گئی۔ طبیب اس کی بیماری کی تشخیص نہ کر سکا۔ الجائی خاتون کو انتقال کیے پانچ دن ہو گئے تھے۔ مولانا کو معلوم ہو چکا تھا کہ تیمور شہر سبز کی طرف چل پڑا ہے۔ لہٰذا انہوں نے یہ ناخوش گوار فرض خود ادا کرنے کی ذمے داری قبول کر لی تھی۔

تیمور پہلے ہی خاموش طبیعت اور تنہائی پسند تھا۔ الجائی خاتون کی موت نے اسے حقیقتاً تنہا کر دیا۔ اس کی خاموشی پہلے سے زیادہ بڑھ گئی۔ وہ دن بھر نئی فوج کی بھرتی کے سلسلے میں خود کو مصروف رکھتا لیکن رات کی تنہائی اسے کاٹنے کو دوڑتی۔

تیمور شہر سبز میں فوج بھرتی کرنے میں مصروف تھا کہ مغل بڑھ کر سمرقند کے مضافات میں پہنچ گئے۔ امیر حسین اگر چاہتا تو مغلوں کو کچھ دن روک سکتا تھا لیکن اس نے مغلوں کے سامنے آنے کی جرأت نہ کی بلکہ سمرقند سے کچھ اور دور چلا گیا۔

اہل سمرقند مغلوں کی آمد سے بہت پریشان ہوئے۔ قاضی شہر نے بلخ کے مفتی سے امداد طلب کی۔ مفتی فوراً بلخ کے دستوں کے ساتھ سمرقند چل پڑا۔ راستے میں تاتاری بھی اس کے لشکر میں شامل ہو گئے۔

مفتی نے اپنے قلیل لشکر کے ساتھ مغلوں کا مقابلہ کیا اور انہیں سمرقند کے مضافات ہی میں روک لیا۔ مغل فاتح ہونے کے باوجود خائف تھے۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ تمام تاتاری ایک جھنڈے تلے جمع ہو گئے ہیں۔ انہیں یہ بھی بتایا گیا کہ ان کے مقابل ایک نیا لشکر ہے جس میں امیر تیمور یا امیر حسین موجود نہیں ہے بلکہ وہ ایک نئے تازہ دم لشکر کے ساتھ سمرقند کے قلعے میں مقیم ہیں۔ اس خبر نے مغلوں کو پریشان کر دیا۔

ادھر مفتی بلخ نے مغلوں کے رسد کے ذخائر پر شب خون مار کر انہیں تباہ کر دیا۔

تیمور کو شہر سبز میں مغلوں کے بارے میں جو پہلی خبر دی گئی وہ بڑی حیرت انگیز تھی۔ تیمور فوج جمع کر کے

سمرقند کی طرف کوچ کا ارادہ کر رہا تھا کہ سمرقند کے عالموں کا ایک وفد اس کے پاس پہنچا۔ تیمور انہیں دیکھ کر سمجھا کہ وہ اس سے کمک حاصل کرنے آئے ہیں۔ اس نے گفتگو میں خود پہل کی۔

"اے سمرقند کے علمائے کرام!" تیمور گمبھیر آواز میں بولا۔

"میں نے یہاں آ کر ایک دن بھی آرام نہیں کیا۔ رات دن تازہ فوج اکٹھا کرنے میں مصروف ہوں۔ خدا کے فضل سے اب میرے پاس اتنی فوج ہو گئی ہے کہ میں قلعہ بند ہونے کے بجائے کھلے میدان میں مغلوں کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔"

"اے تاتاریوں کے سچے رہنما!" ایک عالم نے اسے بڑی عزت سے مخاطب کیا:

"خدا نے تاتاریوں اور آپ پر اپنا فضل کیا۔ اب مغلوں سے کھلے میدان میں بھی مقابلہ کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔"

"کیوں ..... ؟ کیا مغلوں نے سمرقند کے محاصرے کا خیال ترک کر دیا؟" تیمور نے حیرت سے پوچھا۔

"مغل سمرقند آئے تھے اور منہ کی کھا کر چلے گئے۔" دوسرے عالم نے بتایا۔

"کیا مغل شکست کھا گئے؟" تیمور کو یقین نہیں آیا۔

"ہاں معزز سردار۔ مغل لشکر سمرقند کے مضافات تک پہنچ گیا تھا لیکن بلخ کا مفتی ہماری مدد کو آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک بڑا لشکر لایا تھا۔ اس نے مغلوں کو روک لیا اور شب خون مار کر ان کا ناک میں دم کر دیا۔ پھر اللہ کا ایک فضل اور ہوا۔ آسمانی بلاؤں نے مغلوں کو گھیر لیا۔ ان کے گھوڑوں میں کوئی ایسی بیماری پھیلی کہ ایک ایک دن میں کئی کئی سو گھوڑے مرنے لگے۔ چاروں طرف بدبو پھیل گئی اور راستے بند ہو گئے۔ مغل گھبرا کر پسپا ہو گئے۔"

دوسرے دن تیمور کے چند سردار سمرقند سے آ گئے۔ انہوں نے مغلوں کے بارے میں مزید انکشافات کیے۔ ایک سردار نے بتایا:

"اے امیر! اللہ کی بھیجی ہوئی وہ بیماری ایسی تھی کہ مغلوں کا ایک گھوڑا بھی زندہ نہ بچا۔ سب پیدل ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہاں تک کہ ان کے بادشاہ الیاس خواجہ خان تک کو گھوڑا نصیب نہیں ہوا۔ ہم نے ان کا تعاقب کیا اور جس قدر مغل مار سکتے تھے مار ڈالے۔ باقی اپنی جانیں بچا کر نکل گئے۔"

تیمور کے لیے یہ مژدہ جانفزا تھا۔ اس نے فوج کو سمرقند کی طرف کوچ کا حکم دیدیا۔

امیر حسین نے عملاً مغلوں کی خلاف دو جنگوں میں حصہ نہیں لیا تھا لیکن جب اسے مغلوں کی شکست اور مراجعت کی اطلاع ملی تو فوراً اپنے لشکر کے ساتھ سمرقند پہنچ گیا۔ سمرقند والوں کو تیمور اور امیر حسین کے اختلافات کی کوئی خبر نہ تھی۔ انہوں نے امیر حسین کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ لوگ خوشی سے دیوانے ہو رہے تھے۔ انہوں نے محلوں اور بازارو

کو خوب سجا رکھا تھا۔ انہوں نے امیر حسین کا شاہانہ استقبال کیا۔ امیر حسین کا دادا امیر قزغن سمرقند کا حاکم تھا۔ اس لیے وہ سمرقند کی حکومت پہ اپنا حق سمجھتا تھا۔ عوام کو بھی اس کی حاکمیت پر کوئی اعتراض نہ تھا۔

تیمور اب تک سمرقند نہ پہنچا تھا۔ اور دونوں کے اختلافات کھل کر عوام کے سامنے نہیں آئے تھے۔ اس لیے امیر حسین کو سمرقند کا حاکم تسلیم کر لیا گیا۔ امیر حسین نے فوراً چنگیز خان کے خاندان کے ایک شخص کو جس کا نام ادغلن بردورچی تھا، اپنی طرف سے بادشاہ نامزد کر دیا۔ . . . . . ایک رنگا رنگ محفل میں اس نام نہاد بادشاہ کی شاہانہ رسومات ادا کی گئیں اور امیر حسین نے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کسی وقت مغلوں اور تاتاریوں کے بزرگوں میں یہ معاہدہ ہوا تھا کہ بادشاہت مغل کریں گے اور تاتاری مغلوں کے نام پر اپنے اپنے علاقوں کے حاکم ہوں گے اور سپہ سالار کہلائیں گے۔ امیر حسین کا دادا امیر قزغن بھی اسی معاہدے کے تحت مغلوں کے نام پر سمرقند کا حاکم تھا جس پر اب اس کا پوتا قابض تھا۔

تیمور جب سمرقند پہنچا تو وہاں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سمرقند کے لوگوں نے تیمور کی بھی دل کھول کر پذیرائی کی اور اس کا شایانِ شان استقبال کیا لیکن تیمور کو وہ مقام نہ مل سکا جو امیر حسین اس کی عدم موجودگی میں حاصل کر چکا تھا۔ اس کا درجہ امیر حسین سے کم تھا۔ گو کہ اس کا لشکر زیادہ تھا لیکن امیر حسین نے اسے زمین کی تقسیم، مالیہ کی وصولی اور دیوانی مقدمات کے فیصلے کرنے کا اختیار تفویض کر دیا۔ یہ فرائض تیمور کے مرتبے سے بہت کم تھے اور یہیں سے دونوں کے اختلافات میں شدت پیدا ہوئی۔

امیر حسین کو خطرہ تھا کہ اگر تیمور کی طاقت کو کمزور نہ کیا گیا تو وہ ایک دن سمرقند پہ قابض ہو جائے گا۔ تیمور کے پاس لشکر بھی زیادہ تھا اور وہ جنگی حکمتِ عملی میں بھی امیر حسین سے زیادہ ماہر تھا۔ وہ امیر حسین کی ماتحتی میں کام کرنے پر کسی طرح آمادہ نہ تھا۔ امیر حسین نے صرف تیمور ہی کو دھوکا نہیں دیا تھا بلکہ اپنی بہن الجائی خاتون جو کہ تیمور کی بیوی تھی، کے ساتھ بھی اس کا رویہ انتہائی تحقیر آمیز تھا۔ اس نے کئی بار تیمور کے سامنے الجائی خاتون کی توہین کی تھی جسے تیمور رنجیدگی کی وجہ سے برداشت کر گیا تھا۔ لیکن اب اس رشتے کے خاتمے کے بعد تیمور کو سب پرانی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ غرض کہ دونوں ایک دوسرے کے مخالف بن گئے۔

امیر حسین کا سپہ سالار امیر موسلی، اس کا سب سے بڑا مشیر تھا۔ موسلی ہر وقت تیمور کے خلاف امیر حسین کے کان بھرتا رہتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب علاقوں کی تقسیم کا سوال ہوا تو جھگڑے بڑھ گئے . . . . . امیر حسین تیمور کو کچھ بھی نہیں دینا چاہتا تھا لیکن تیمور کو اپنی کارگزاریوں کا صلہ درکار تھا۔ امیر حسین نے بلخ اور شادمان کے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ ملک تاتار کے بہترین صوبے تھے۔ تیمور نے اس کی مخالفت کی لیکن اس کے امیروں نے بیچ میں پڑ کر معاملہ رفع دفع کرا دیا۔ تیمور نے بلخ اور شادمان کا مطالبہ ختم کر دیا۔

اسی دن، امیر موسلی کے بہکانے پر امیر حسین نے قرشی کا قلعہ، تیمور سے طلب کیا۔ قلعہ قرشی پورے تاتار میں سب سے زیادہ مستحکم اور مضبوط قلعہ تھا۔ اس قلعے کی ملکیت کے سلسلے میں بہت جھگڑا ہوا۔ اگر بزرگ امیر اور سردار بیچ میں نہ پڑتے تو تیمور اور امیر حسین میں جنگ ہو جاتی۔

قلعہ قرشی کو کچھ ہی مہینے قبل تیمور نے زیادہ پختہ اور مستحکم کرایا تھا اور اسے ناقابلِ تسخیر بنا دیا تھا۔ وہ قلعہ ہاتھ سے نکلنے کا اسے بے حد ملال ہوا مگر وہ پھر بھی طرح دے گیا اور اس جھگڑے کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھا۔

دراصل تیمور مہلت چاہتا تھا۔ وہ تمام تاتاری سرداروں اور امیروں کے تعاون کا خواہاں تھا۔ اگر اس وقت وہ خانہ جنگی شروع کر دیتا تو ملک تاتار کئی حصوں میں تقسیم ہو جاتا۔ تاتاریوں کے تمام قبائل اپنے اپنے علاقوں کے خود مختار بن بیٹھتے جبکہ تیمور کی خواہش تھی کہ وہ تمام امیروں کو ایک جھنڈے تلے اکٹھا کر کے ایک مضبوط حکومت کی بنیاد رکھے تاکہ مغل پھر اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ کر سکیں۔

امیر حسین ماوراء النہر کے تخت پر بیٹھ کر تنہا حکومت کرنا چاہتا تھا اس لیے وہ مختلف حیلوں بہانوں سے ایک دن میں کئی کئی بار جھگڑے کھڑے کر دیتا تھا۔ تیمور نے اس کی صورت یہ نکالی کہ ایک دن وہ امیر حسین کو خواجہ شمس الدین تبریزی کے مزار پہ لے گیا۔ جہاں اس نے پہلے اپنی دوستی کی قسم کھائی۔ پھر امیر حسین سے سچا دوست رہنے کا قول و قرار لیا۔

امیر حسین نے قسم کھائی اور قول و قرار بھی کر لیا لیکن اسے تیمور کا یہ عمل بالکل پسند نہ آیا اور بجائے قول و قسم پر عمل کرنے کے اس نے اور زیادہ مخالفت شروع کر دی۔

○

عنبر شام تک بے حس و حرکت پڑا رہا۔ شدتِ غم سے اس کا جسم نڈھال ہو رہا تھا۔ دن بھر اس نے کچھ بھی نہیں کھایا پیا تھا۔ اس نے خورجی سے خشک غذا نکال کر کھائی۔ دو گھونٹ پانی پیا۔ جسم میں ذرا طاقت آئی تو اس نے پناہ گاہ سے نکل کر ادھر ادھر دیکھا۔

اس نے اتنی محنت کی۔ ساحر کو مارا۔ بارش روکی مگر تدبیر کند بندہ اور تقدیر کند خندہ کے مصداق، اس کی تقدیر کے سامنے ایک نہ چلی۔ شکست تاتاریوں کی قسمت میں لکھی تھی۔ پیشانی کا لکھا سامنے آیا۔

عنبر کو اب اپنی فکر ہوئی۔ پہاڑی چاروں طرف سے مغلوں میں گھری ہوئی تھی۔ الاؤ کی روشنی میں مغل پہرہ دار ادھر اُدھر گھومتے نظر آ رہے تھے۔ اسے راستوں کا صحیح اندازہ بھی نہ تھا اس لیے اس نے رات کے وقت وہاں سے نکلنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ راستوں کا تعین کیے بغیر مغلوں کے ہاتھوں سے بچ نکلنا ممکن نہ تھا اس لیے وہ صبح کے انتظار میں پھر پناہ گاہ میں جا کر پڑ رہا۔

صبح اٹھ کر دیکھا تو ہر طرف مغل ہی مغل نظر آئے۔ دور دور تک ان کے خیمے پھیلے ہوئے تھے۔ طرف پشت اور سامنے کی طرف مغلوں کے خیمے نہ تھے لیکن وہ راستہ مغلوں کی بستی کی طرف جاتا تھا اور اس طرف جانا خود موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

تورکینہ نے اسے حفاظت کا یقین دلایا تھا لیکن یہ اسی وقت ممکن تھا جب اس نے ساحر کو قتل نہ کیا ہوتا۔ تورکینہ کے قبیلے کے ایک ساحر کو قتل کرنے کے بعد اس کی پناہ میں جانا کوئی عقلمندی نہیں تھی۔ اسے ساحر کو قتل کرتے کسی نے نہیں دیکھا تھا یہ بھی تو ممکن تھا کہ اسے جھونپڑی سے نکلتے ہوئے کسی نے دیکھ لیا ہو اور تورکینہ کے پاس پہنچتے ہی اسے پہچان لیا جائے۔ اگر پہچانا نہ جائے تو بھی وہ تاتاری تھا، مغلوں کا دشمن۔ تمام ساحر مغلوں کے حلیف تھے اور مغل عقیدہ رکھتے تھے۔ کوئی صورت اس کے بچنے کی نظر نہ آتی تھی۔ دن میں پکڑے جانے کا خدشہ، رات کو راستوں سے ناواقفیت۔ عنبر سخت پریشانی میں گھر گیا تھا۔ خشک غذا اور پانی بھی اس کے پاس قریب الختم تھا۔ اگر ایک دو دن میں وہ یہاں سے نہ نکل سکا تو بھوک اور پیاس بھی اس کے خلاف ایک نیا محاذ کھول لے گی۔ . . . اور وہ سسک سسک کر مر جائے گا۔

تین دن بعد کھانے کی خورجی اور پانی کی چھاگل بھی ختم ہو گئی۔ . . . اور پھر وہ دن بھی آ گیا کہ اس کے لیے اٹھ کر بیٹھنا بھی مشکل ہو گیا۔ بھوک اور پیاس نے اسے بالکل لاغر کر دیا تھا۔ آنکھیں بھی مشکل ہی سے کھلتی تھیں دن رات کا احساس ختم ہو گیا تھا۔ اسے اپنی اس بے بسی کی موت پر بار بار رونا آتا تھا۔ وہ سوچتا کہ شاید اس نے ساحر کو قتل کر کے گناہ کیا ہے جس کی سزا خدا اسے دے رہا ہے لیکن پھر اس کا دل اسے اطمینان دلاتا کہ میدانِ جنگ میں دشمن کو مارنا، قتل نہیں بلکہ فرض کی ادائیگی ہے۔ ساحر، مغلوں کے حلیف تھے اُن کے لیے جادو کرتے تھے۔ اگرچہ وہ جنگ میں شریک نہیں تھے لیکن ان کا عمل بھی ایک طرح کی جنگ تھی۔ . . . اس نے جو کچھ کیا ملک و قوم کے لیے کیا۔

پتہ نہیں اسے موت کا انتظار کرتے ہوئے کتنے دن ہو گئے۔ . . . رات کا وقت تھا۔ غنودگی کے عالم میں اسے کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ آواز، اس کی پناہ گاہ کے قریب آتی جا رہی تھی۔ پھر وہ آواز رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی ہوا کا ایک مہکتا ہوا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا تو اس کے جسم میں جیسے جان آ گئی۔ ہوا کے اس جھونکے

میں یہاں جنگلی پھولوں کی مہک تھی جن کا گجرا، تورکینہ اپنے بالوں میں لگاتی تھی۔

عنبر بے جان پڑا موت کی گھڑیاں گن رہا تھا لیکن اس خوشبو نے اس کے لیے اکسیر کا کام کیا۔ اس نے پوری طاقت لگا کر خود کو چٹان کے عقب سے گھسیٹنا شروع کیا۔ چٹان کے عقب سے نکل کر اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے کی چٹان پر کوئی بیٹھا دکھائی دیا۔ عنبر کو اندھیرے میں اس کی شکل تو نظر نہیں آئی لیکن اس طرف سے آنے والی خوشبو اسے یقین دلا رہی تھی کہ وہ تورکینہ ہے۔

عنبر کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔

اس نے یہ سوچ کر تورکینہ کو آواز دینے کا فیصلہ کیا کہ اگر وہ تورکینہ کی بجائے کوئی مغل ہوا بھی تو اسے کوئی افسوس نہ ہوگا۔ وہ اس خود ساختہ قید سے تنگ آ چکا تھا اور چاہتا تھا کہ سسک سسک کر مرنے کے بجائے اسے اگر کوئی مغل قتل کر دے تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔

"تورکینہ . . . . " اس نے آہستہ سے پکارا۔

چٹان پر بیٹھا ہوا ہیولا اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی . . . .

"عنبر . . . . کیا تم عنبر ہو؟" یہ تورکینہ کی آواز تھی۔

عنبر نے پہچان کر فوراً جواب دیا:

"ہاں تورکینہ۔ میں عنبر ہوں۔ ادھر میرے پاس آؤ۔"

تورکینہ کے قدم آواز کی سمت اٹھنے لگے۔ وہ اندھیرے میں ٹٹولتی ہوئی اس چٹان تک پہنچ گئی۔ عنبر نے اٹھنے کی کوشش کی تو تورکینہ کا پیر اس سے ٹکرایا۔

وہ بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا تمہیں عنبر۔ کیا تم زخمی ہو؟"

"نہیں تورکینہ۔" عنبر نحیف آواز میں بولا۔

"میں تین دن سے بھوکا پیاسا ہوں۔"

"میرے پاس کیوں نہیں آ گئے؟"

تورکینہ نے سہارا دے کر اسے بٹھا دیا۔

"میرے ساتھ چلو گے؟"

"ہر طرف مغل پھیلے ہوئے ہیں اور پھر مجھ سے چلا بھی نہیں جائے گا۔"

"مجھے پکڑ کر چلو۔ میں تمہیں سہارا دوں گی۔"

تورکینہ نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔

"مغلوں کی پروانہ کرو۔ میں تمہیں ایسے راستے سے لے چلوں گی کہ کسی کی نظر نہ پڑے گی۔ انہوں نے دیکھ بھی لیا تب بھی میں کوئی بات بنالوں گی۔ تم بالکل نہ گھبراؤ۔"

عنبر تورکینہ کے سہارے پہاڑی سے اترنے لگا۔ اس کے لیے چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ اس کے قدم بار بار لڑکھڑا رہے تھے پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح چلتا رہا۔ ساتھ ہی اسے یہ خیال بھی ستا رہا تھا کہ اگر کسی نے اسے پہچان لیا تو کیا ہوگا؟

تورکینہ اسے کیسے بچائے گی؟

اور پھر جب تورکینہ کو معلوم ہوگا کہ اس نے ایک ساحر کو قتل کر دیا ہے تو وہ کیا سوچے گی؟

شرم کے احساس نے اس کے قدم روک دیے:

"تورکینہ! پہلے یہ بتاؤ کہ اگر کسی نے مجھے پہچان لیا تو تم کیا کرو گی؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

"چلتے رہو عنبر۔" تورکینہ نے تسلی دی۔

"میں جس راستے سے جا رہی ہوں اس پر کسی کے ملنے کا امکان نہیں۔ ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔"

"راستے میں نہیں بلکہ تمہاری جھونپڑی میں اگر کسی نے پہچان لیا تو کیا ہوگا؟"

"تم چلو تو سہی۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ جھونپڑی میں میرے علاوہ اور کوئی نہیں رہتا۔"

"تمہارے ماں باپ؟"

"کوئی نہیں ہے۔" تورکینہ جھلا کر بولی۔ "جھونپڑی میں پہنچ کر بتاؤں گی۔"

عنبر خاموش ہو گیا۔ وہ تورکینہ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔

آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ ساحروں کی بستی کے قریب پہنچ گئے۔ تورکینہ اسے لیے ہوئے ایک جھونپڑی میں داخل ہوئی۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ تورکینہ چراغ جلانے کے لیے چقماق ڈھونڈنے لگی۔

عنبر بولا:

"کیا کر رہی ہو تورکینہ؟"

"چراغ جلا رہی ہوں۔"

"چراغ نہ جلاؤ۔ دوسروں کو ہماری موجودگی کا علم ہو جائے گا۔" عنبر نے خوفزدہ سی آواز میں کہا۔

"یہاں کوئی نہیں ہے عنبر۔" تورکینہ نے کہا۔

"تمام جھونپڑیاں خالی ہیں۔ میرے قبیلے والے آگے چلے گئے ہیں۔"

"تم بالکل تنہا ہو یہاں؟" عنبر نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں..... بالکل اکیلی۔"

"اور تمہارے ماں باپ؟" عنبر نے اپنا سوال دہرایا۔

"پہلے کچھ کھا پی لو۔ پھر اطمینان سے بتاؤں گی۔"

"میں اندھیرے ہی میں کھالوں گا۔" اس نے لجاجت سے کہا:

"روشنی مت کرو۔ روشنی دیکھ کر کوئی مغل ادھر آ سکتا ہے۔"

"اچھا بھئی تم تو خواہ مخواہ ڈر رہے ہو۔"

تورکینہ نے اندھیرے ہی میں تلاش کر کے کھانا نکالا۔ اور لکڑی کی ایک کنڈلی میں رکھ کر کنڈلی عنبر کے ہاتھ میں پکڑا دی۔

"اس وقت تو کھانے کو یہی کچھ ہے۔ صبح تمہارے لیے کچھ پکاؤں گی۔"

تورکینہ اس کے برابر بیٹھ گئی۔

"لیکن تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟" عنبر نے پوچھا۔ اسے اس بات پر تعجب تھا کہ اگر تمام ساحر یہاں سے چلے گئے ہیں تو تورکینہ کیوں یہاں موجود ہے۔

"پہلے پیٹ بھر لو۔ پھر بتاؤں گی۔" تورکینہ نے ٹالا۔

عنبر کنڈلی میں ہاتھ ڈال کر کھانے لگا۔ پتہ نہیں کھانے میں کیا تھا۔ وہ تو بس جلدی جلدی نوالے بنا کر منہ میں ٹھونس رہا تھا اور ہر نوالے کے بعد پانی کا گھونٹ بھر رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں اس نے کنڈلی خالی کر دی لیکن اب اس کے ہاتھ پیر سنسنانے لگے تھے۔ خالی پیٹ میں غذا پہنچی تو اس پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔

"تم کہاں سوؤ گی تورکینہ؟ مجھے نیند آ رہی ہے۔" عنبر نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"یہ میری جھونپڑی ہے میں یہیں سوؤں گی۔" تورکینہ نے معصومیت سے جواب دیا۔

"تورکینہ! سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں مسلمان ہوں۔"

"مسلمان ہو تو کیا ہوا..... تم جھونپڑی کے ایک کونے میں اس طرف منہ کر کے لیٹ جاؤ۔ میں دوسرے کونے میں اس طرف منہ کر کے لیٹ جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔" عنبر نے حامی بھر لی اور ہاتھ سے ٹٹول کر کھسکتا ہوا ایک کونے میں چلا گیا..... پھر چند ہی لمحوں میں وہاں اس کے خراٹے گونجنے لگے۔

عنبر صبح دیر تک سوتا رہا۔ کئی روز بعد اطمینان کی نیند سویا تھا۔ شاید اب بھی اس کی آنکھ نہ کھلتی لیکن

جھونپڑی کی پتھر اور لکڑی کی دیواروں سے دھوپ چھن چھن کر اندر آ رہی تھی آنکھ کھلتے ہی اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔

اس کے سامنے ایک کچی قبر بنی ہوئی تھی اور عنبر کے پیر قبر تک پہنچے ہوئے تھے۔ اس نے جلدی سے پیر سمیٹ لیے۔ نظر گھما کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ رات بھر وہ جس تودے سے سر لگا کر اطمینان سے سوتا رہا تھا وہ بھی ایک قبر ہے۔

"کیا یہ قبرستان ہے؟"

عنبر گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ یہ جھونپڑی بھی بالکل اسی جھونپڑی کی مانند تھی جس میں داخل ہو کر اس نے ساحر کو قتل کیا تھا فرق صرف یہ تھا کہ اس جھونپڑی کی گھاس پھونس کی چھت پرانی تھی اور اس جھونپڑی کی چھت نئی معلوم ہوتی تھی۔ اس میں قبریں بھی نہ تھیں۔

عنبر، دونوں قبروں کے درمیان کھڑا سوچ ہی رہا تھا۔ . . . کہ تورکینہ مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اچانک عنبر کی نظر، دونوں قبروں کے درمیان ایک جگہ رک گئی۔ اسے ایک گڑھا نظر آیا جس کے گرد پتھر رکھے ہوئے تھے جیسے وہاں کوئی الاؤ موجود رہا ہو۔

"میں جانتی تھی تم قبریں دیکھ کر حیران ہو گے"۔ تورکینہ نے کہا۔

وہ اس کے لیے کھانے کے لیے باہر سے کچھ لائی تھی۔

"میں بہت سویرے اٹھ گئی تھی۔ تمہارے کھانے کا انتظام جو کرنا تھا"۔ تورکینہ نے لکڑی کی تھالی زمین پر رکھ دی۔ عنبر گم صم کھڑا تھا:

"بیٹھ جاؤ عنبر"۔ تورکینہ نے اسے پریشان دیکھ کر کہا:

"کیا قبروں کو دیکھ کر ڈر گئے ہو؟"

عنبر نے کوئی جواب نہ دیا لیکن تورکینہ کے کہنے پر بیٹھ گیا۔ اس کی گھبرائی ہوئی نظریں اب بھی جھونپڑی کا جائزہ لے رہی تھیں۔ دو کچی قبریں۔ ٹوٹا ہوا الاؤ اور جھونپڑی کا پردہ . . . . .

"بڑے بزدل ہو۔ قبروں سے ڈرتے ہو"۔ تورکینہ نے ہنستے ہوئے اس کا مذاق اڑایا۔

"یہ قبریں کن لوگوں کی ہیں؟" عنبر نے چونک کر پوچھا۔

"یہ قبر میری ماں کی ہے"۔ تورکینہ نے ایک قبر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم نے تو بتایا تھا کہ تمہاری ماں زندہ ہے۔ . . . تم نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ تاتاری ہے اور مسلمان ہے"۔

"میں نے ٹھیک بتایا تھا۔ اس وقت میری ماں زندہ تھی"۔

تورکینہ افسردہ ہو گئی۔

"تمہاری ماں کو کیا ہوا تھا"۔ عنبر نے رسمی سی ہمدردی کرتے ہوئے پوچھا۔

"میرے قبیلے والوں نے اسے قتل کر دیا تھا"۔ تورکینہ کے آنسو چھلک پڑے۔

"قبیلے والوں نے"۔ عنبر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں:

"مگر کیوں؟"

"میری ماں تاتاری تھی اس لیے برداشت نہ کر سکی۔ اس نے میرے باپ کو مار ڈالا"۔ تورکینہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بتایا۔

عنبر کا ذہن اب تک قبروں میں الجھا ہوا تھا۔ اس کی ماں کے قتل کی وجہ تو سمجھ میں آتی تھی لیکن اس کی ماں نے اپنے شوہر کو کیوں قتل کیا۔ یہ معمہ اب تک حل نہ ہوا تھا۔

"تورکینہ! تم بہت دکھی ہو"۔ عنبر نے سلسلۂ کلام پھر شروع کیا۔

"لیکن میں اب تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ تمہاری ماں نے اپنے شوہر کو کیوں قتل کیا؟ جبکہ تمہاری پیدائش سے اب تک وہ اسے ہر حالت میں برداشت کرتی آئی تھی"۔

"بس میں کیا بتاؤں . . . . میری ماں اور باپ میں اکثر لڑائی ہو جاتی تھی لیکن میں بیچ میں پڑ کر میل کرا دیتی تھی۔ مجھے ان دونوں سے بہت محبت تھی اور وہ بھی مجھے بہت چاہتے تھے . . . . پھر جب مغلوں اور تاتاریوں کی فوجیں لڑائی کے لیے میدان میں اکٹھا ہوئیں تو میری ماں میرے باپ سے خوب لڑی۔ میری ماں کہتی تھی کہ تم مغلوں کے لیے تاتاریوں کے خلاف جادو نہ کرو لیکن میرا باپ مغلوں کا ساتھ دے رہا تھا وہ کسی طرح نہ مانا۔ ماں کا جب کوئی بس نہ چلا تو اس نے مجھے تمہارے سردار کے پاس بھیجا لیکن تمہارے سردار نے میری باتوں پر کان نہ دھرے اور انہیں پہلے ہی دن کی جنگ میں پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس رات پھر میری ماں میرے باپ سے خوب لڑی۔ میرے باپ نے مجھے اور میری ماں کو جھونپڑی سے نکال دیا۔ ہم ماں بیٹی دوسری جھونپڑی میں چلی گئیں۔ دوسرے دن دوپہر کے وقت میری ماں چپکے سے اپنی جھونپڑی میں پہنچ گئی۔ وہاں میرا باپ جادو کر رہا تھا۔ ماں نے وہاں جا کر میرے باپ کے سینے میں خنجر گھونپ دیا۔ اس کے مرتے ہی بارش رک گئی"۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہارے باپ کو تمہاری ماں نے ہی قتل کیا ہے"۔ عنبر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"ہاں عنبر۔ سوائے میری ماں کے، میرے باپ کا اور کوئی دشمن نہ تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ جس وقت میرا باپ مارا گیا

اس وقت تک تاتاری شکست کھا کر میدان چھوڑ چکے تھے ورنہ ساحروں کی شامت آجاتی مغل بادشاہ ان سب کو قتل کرا دیتا۔"

"پھر کیا ہوا تورکینہ؟" عنبر نے مردہ سے لہجے میں پوچھا۔ وہ اس وقت خود کو ایک بھاری بوجھ تلے محسوس کر رہا تھا۔

"پھر جیسے ہی بارش رکی، تمام ساحر اپنی جھونپڑیوں سے نکل آئے۔ انہیں یقین تھا کہ ضرور کوئی ساحر قتل ہوا ہے۔ جب بوڑھے ساحر نے سب کی گنتی کی تو پتہ چلا کہ میرا باپ موجود نہیں ہے۔ سب لوگ میرے باپ کی جھونپڑی پر پہنچ گئے۔ میں اور میری ماں بھی ساتھ تھی۔ ایک ساحر اندر گیا اور میرے باپ کی لاش کھینچ کر باہر لے آیا۔ لاش دیکھ کر بوڑھا ساحر جو سب کا سردار ہے، آگے بڑھا اور میری ماں کا ہاتھ پکڑ کر اعلان کیا کہ تورکینہ کے باپ کو تورکینہ کی ماں نے قتل کیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ میری ماں دہائی دیتی رہی۔ چلاتی رہی کہ وہ بے گناہ ہے لیکن انہوں نے میرے سامنے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ سب کو معلوم تھا کہ میری ماں تاتاری ہے اور تاتاریوں کے خلاف جادو کرنے کی مخالفت کرتی تھی۔"

تورکینہ سسکیاں لینے لگی۔ عنبر نے اسے سہارا دیا:

"تمہاری ماں واقعی بے گناہ تھی تورکینہ! اس پر بڑا ظلم ہوا ہے۔ تمہارے باپ کا قاتل کوئی اور ہے۔ میں اصل قاتل کو تمہارے حوالے کروں گا۔"

"نہیں عنبر!" تورکینہ بولی۔ "میرے باپ کو میری ماں نے ہی مارا ہے۔ مجھے بھی اس بات کا یقین ہے!"

عنبر نے جھونپڑی کے دروازے پر پڑے ہوئے پردے کو دیکھ کر پوچھا:

"جس دن تمہارا باپ قتل ہوا، کیا یہی پردہ دروازے پر پڑا ہوا تھا؟"

"ہاں۔ یہی پردہ تھا۔ یہی جھونپڑی تھی۔ اس کی چھت جل گئی تھی۔ میں نے دوسری ڈال لی ہے۔ میں نے بوڑھے ساحر سے اجازت لے کر، اپنے ماں باپ کی قبریں اسی جھونپڑی میں بنالی ہیں۔ اب میں یہاں اکیلی رہتی ہوں۔ مغل تمام ساحروں کو ساتھ لے کر تاتاریوں کے پیچھے سمرقند گئے ہیں۔"

عنبر کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ اس نے چاہا کہ وہ چیخ کر تورکینہ کو بتادے کہ تیرے باپ کو تیری ماں نے نہیں بلکہ میں نے مارا ہے لیکن میں بھی قاتل نہیں ہوں۔ میں نے ساحر کو اس لیے مارا تھا کہ تیرے کہنے کے مطابق بارش رک جائے اور تاتاری فتح حاصل کرلیں مگر میں تقدیر کا لکھا نہ مٹا سکا۔ بارش رکنے سے پہلے ہی تاتاری شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئے۔ ۔ ۔ ۔

لیکن وہ یہ کہہ نہ سکا۔ اس کی زبان کو تالا لگ گیا۔ پتہ نہیں کیوں؟

اس طرح عنبر کو تورکینہ کے ساتھ رہتے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ وہ دونوں دن بھر ایک ساتھ رہتے۔ رات گزارنے کے لیے عنبر دوسری جھونپڑی میں چلا جاتا۔ تمام جھونپڑیاں خالی پڑی تھیں۔

ساحروں کو مغل اپنے ساتھ سمرقند لے گئے تھے تاکہ سمرقند کو بھی وہ جادو کے زور سے فتح کرلیں۔ عنبر نے تورکینہ کو اس بات پر آمادہ کرلیا تھا کہ جب تک ان کی شادی نہیں ہوجاتی وہ علیحدہ علیحدہ جھونپڑیوں میں سوئیں گے۔ تورکینہ کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ تو عنبر کے اس وعدے سے خوش تھی کہ حالات درست ہوتے ہی دونوں سمرقند پہنچیں گے اور وہاں شادی کرکے آرام سے زندگی گزاریں گے۔

تورکینہ نے عنبر کو مغلوں کا لباس پہنا دیا تھا تاکہ اگر کوئی پوچھ گچھ ہو تو وہ عنبر کو اپنا رشتہ دار ثابت کرسکے۔

مغلوں نے سمرقند کی طرف کوچ کرتے وقت تمام ساحروں کو مع اہل و عیال لشکر کے ساتھ چلنے کا حکم دیا تو تورکینہ نے مغل سردار سے التجا کی کہ اسے اس کی جھونپڑی ہی میں چھوڑ دیا جائے۔ وہ ماں باپ کی قبروں کے پاس رہ کر اپنا غم ہلکا کرنا چاہتی ہے۔ مغل سردار نے اسے جھونپڑی میں رہنے کی اجازت دے دی۔ اسے یہ رعایت بھی دی گئی کہ وہ اپنا راشن مغل خیمہ گاہ سے حاصل کرسکتی ہے۔

ساحروں کے جانے کے بعد، اس خالی بستی میں دو تین دن تک تو تورکینہ گھبرائی گھبرائی اور خوفزدہ سی رہی لیکن پھر وہ اس کی عادی ہوگئی۔ پھر جب وہ عنبر کو ساتھ لے کر آئی تو اس کے دن عید اور رات شب برات ہوگئی۔ عنبر کے لیے تورکینہ کی چاہت بڑھتی رہی۔ عنبر بھی روز بروز اس کے قریب آتا گیا۔ یہاں تک کہ ان میں شادی کے عہد و پیمان ہوگئے لیکن انہوں نے اپنے درمیان فاصلے کی جو حد مقرر کی تھی، اسے دونوں میں سے کسی نے بھی پھلانگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

انہیں اچھے دنوں کا انتظار تھا۔ مگر اچھے دن انہیں صرف سمرقند ہی میں حاصل ہوسکتے تھے اور سمرقند کے راستے میں قدم قدم پر مغل موجود تھے۔ خیمہ گاہ کے مغل، اس کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ مغلوں میں جادوگروں کو ایک اہم مقام حاصل تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جادوگر، دنیا والوں اور آسمانی دیوتاؤں کے درمیانی رابطے کا کام کرتے ہیں۔

مغل سواروں اور پہرے داروں کو جادوگروں کی جھونپڑیوں کی طرف آنے کی ممانعت تھی لیکن ایک دن ایک

مغل اتفاقیہ ہی تورکینہ کی جھونپڑی کی طرف آنکلا۔ اس وقت تورکینہ اور عنبر، جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

مغل تورکینہ کے ساتھ ایک جوان کو دیکھ کر چونکا۔ اسے یہ معلوم تھا کہ ساحر کی بیٹی، تنہا اس بستی میں رہتی ہے۔

ادھر مغل کو اپنے سامنے دیکھ کر عنبر پریشان ہو گیا۔ اس نے گھبرا کر تورکینہ کو دیکھا۔ تورکینہ نے آنکھوں ہی آنکھوں ہی اشاروں میں اسے تسلی دی اور خود مسکراتی ہوئی مغل کی طرف بڑھی۔

"میں مغل سردار کو خوش آمدید کہتی ہوں"۔ اس نے مغل کو سردار کہہ کر مخاطب کیا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ یہ مغل، خیمہ گاہ کا ایک ادنیٰ ملازم ہے۔

مغل مشکوک نظروں سے عنبر کو دیکھ رہا تھا۔ عنبر لباس اور صورت سے مغل ہی لگتا تھا۔ اس کے تاتاری ہونے کے بارے میں وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا لیکن تورکینہ جیسی خوش شکل اور تنہا لڑکی کے پاس ایک مرد کی موجودگی اسے مشکوک بنا رہی تھی۔

"یہ کون ہے؟" مغل نے کڑک کر پوچھا۔

"تمہارے خیال میں کون ہو سکتا ہے؟" تورکینہ نے اس کے سخت لہجے کی پروا نہ کرتے ہوئے الٹا اسی سے سوال کر ڈالا۔

"میں نہیں جانتا۔ تم بتاؤ یہ کون ہے؟" مغل نے تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور آہستہ آہستہ عنبر کی طرف بڑھنے لگا۔

عنبر کے پاس صرف ایک خنجر تھا۔ پھر بھی وہ چوکنا ہو گیا۔ تورکینہ لپک کر عنبر اور مغل کے درمیان آ گئی۔

"ٹھہرو مغل سردار"۔ وہ تیوریاں چڑھا کر بولی۔

"یہ میرا شوہر ہے۔ تم اس پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے"۔

"شوہر۔۔۔۔" مغل کے قدم ایک دم رک گئے۔

"یہ تمہارا شوہر ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔۔ اس کے علاوہ میرے قریب اور کون آ سکتا ہے؟" تورکینہ نے سختی سے جواب دیا۔

"مگر میں نے تو سنا تھا کہ تم یہاں اکیلی رہتی ہو"۔ مغل نے نرم لہجے میں کہا۔

"مجھے اکیلا سمجھ کر تم یہاں آئے ہو"۔ تورکینہ چیخ پڑی:

"میں بڑے سردار سے تمہاری شکایت کروں گی!"

"نہیں نہیں۔۔۔۔" مغل گھبرا گیا: "میں تو بھولے سے ادھر آ گیا تھا۔ آسمانی دیوتاؤں کی قسم! میں کسی برے ارادے سے یہاں نہیں آیا تھا"۔

"اچھا تو آؤ میرے ساتھ۔۔۔۔" تورکینہ نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"کہاں؟۔۔۔۔" مغل کا رنگ اڑ گیا۔

"میں تمہاری بات کا اس وقت یقین کروں گی، جب تم میری جھونپڑی میں چل کر قسم کھاؤ گے"۔

مغل انکار نہ کر سکا۔ اور اس کی جھونپڑی کی طرف چلنے لگا۔

تورکینہ نے آگے بڑھ کر جھونپڑی کا پردہ الٹ دیا۔ مغل کی نظر اندر قبروں پر پڑی تو وہ خوف سے کانپنے لگا۔ توہم پرست مغلوں کو قبروں سے بہت ڈر آتا تھا۔ میدانِ جنگ میں خون کی ہولی کھیلتے۔ انسانی سروں کے مینار کھڑے کر دیتے لیکن قبر کے پاس سے گزرتے ہوئے ان کی جان نکلتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ قبروں میں بد روحیں رہتی ہیں جو باہر نکل کر چمٹ جاتی ہیں۔

"یہ میرے باپ اور ماں کی قبریں ہیں"۔ تورکینہ بتانے لگی:

"اگر تم سچے ہو تو قبروں کے درمیان بیٹھ کر قسم کھاؤ۔ جھوٹ بولو گے تو بد روحیں تمہیں چمٹ جائیں گی"۔

تورکینہ بڑی بے تکلفی سے اپنے والدین کی روحوں کو بد روحیں کہہ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ مغل صرف بد روحوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ مغل کے ہونٹ کانپ رہے ہیں۔ تورکینہ کا مقصد محض مغل کو بری طرح سے خوف زدہ کرنا تھا۔

"جاؤ۔ میں نے تمہیں معاف کیا"۔ تورکینہ کے چہرے پر فاتحانہ نشان پیدا ہو گئی۔ "اب ادھر آنے کی کوشش نہ کرنا"۔

مغل نے تشکر آمیز نظروں سے تورکینہ کو دیکھا۔ پھر پلٹ کر بے تحاشا بھاگا۔ کچھ دور جا کر اس نے پلٹ کر دیکھا پھر دوڑتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

"تورکینہ! اب یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں"۔ عنبر نے خدشہ ظاہر کیا: "مغلوں کو میری موجودگی کا علم ہو گیا ہے، کہیں مصیبت نہ آ جائے"۔

"میں بھی یہی سوچ رہی ہوں لیکن میں ایک اور بات سے بھی پریشان ہوں عنبر!"

"اور کیا بات ہے تورکینہ؟" عنبر نے چونک کر پوچھا۔ "یہ سب میرے آنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا"۔

تورکینہ، عنبر کا ہاتھ پکڑ کر جھونپڑی میں آ بیٹھی اور محبت سے بولی:

"عنبر! اب تمہاری مصیبت میری مصیبت ہے۔ جو مصیبت بھی آئے گی ہم دونوں اسے مل کر برداشت کریں گے۔ فی الحال تو کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ ہمارے قبیلے کا کوئی ساحر واپس آ جائے۔ اس وقت بھانڈا پھوٹ سکتا ہے۔"

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آج ہی میں یہاں سے کسی طرف نکل جاؤں گا۔" عنبر نے کہا۔

"تو میرا بھی فیصلہ سن لو۔" تورکینہ ایک عزم سے بولی۔

"مرنا ہے تو ہم ایک ساتھ مریں گے۔ تم مغلوں کے اتنے سخت پہرے سے نکل کر نہیں جا سکتے۔ وہ تمہیں پکڑ لیں گے ..... پھر میں بھی کیوں نہ تمہارے ساتھ چلوں؟"

"تورکینہ!"

عنبر اسے محبت سے دیکھ کر رہ گیا۔ پھر ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد بولا:

"میں تمہاری بے پناہ محبت کے بوجھ تلے دبا جا رہا ہوں۔ میں نے تمہیں بہت تکلیف دی ہے۔ میں اتنا اچھا نہیں ہوں جتنا تم مجھے سمجھ رہی ہو۔ میں نے ایک ایسا کام کیا ہے جو اگر تمہارے علم میں آ جائے تو تم مجھ سے نفرت کرنے لگو گی۔ ہو سکتا ہے تم مجھے قتل کر دینے کے درپے ہو جاؤ۔ میں نے ..... میں نے تمہاری زندگی میں تنہائی بھر دی ہے۔"

"تمہارے ملنے سے پہلے یہ دنیا میرے لیے تاریک تھی ....." تورکینہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "تم نے تو مجھے روشنی دی ہے ..... میری زندگی دکھوں سے بھری تھی، میرے ماں باپ کے دن رات کے جھگڑوں نے مجھے دنیا سے بیزار کر دیا تھا۔ اب تم ملے ہو تو میری زندگی میں بہار آ گئی ہے۔ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔"

عنبر بے چین ہو گیا۔ اس نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا:

"میں جاؤں گا تو تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔ میں بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

عنبر نے فیصلہ کر لیا کہ وہ آج کسی وقت تورکینہ کو اصل واقعات سے آگاہ کر دے گا۔ دراصل وہ تورکینہ کا ردِ عمل دیکھنا چاہتا تھا ..... اگر تورکینہ حقیقت معلوم ہو جانے کے بعد بھی اس سے محبت کرتی رہی تو پھر اسے بھی تورکینہ کو اپنانے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔

سورج غروب ہوا تو تورکینہ کھانا پکانے کے لیے دوسری جھونپڑی میں چلی گئی اور عنبر، تورکینہ کو سب کچھ بتا دینے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد تورکینہ کھانا لے کر آ گئی۔

اس نے چراغ روشن کیا اور دونوں قبروں کے درمیان کھانا رکھ کر عنبر کے سامنے بیٹھ گئی ..... لیکن

عنبر کی نظریں کھانے کے بجائے تورکینہ کے چہرے پر جمی تھیں۔

"تم مجھے گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو؟" تورکینہ نے شرماتے ہوئے کہا:

"کیا میں آج زیادہ اچھی لگ رہی ہوں؟"

"ہاں تورکینہ! تم مجھے آج سب دنوں سے زیادہ خوبصورت لگ رہی ہو۔" عنبر نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں جی بھر کر دیکھنا اور تمہاری تصویر کو دل میں اتار لینا چاہتا ہوں۔"

"عنبر ....."

تورکینہ پریشان ہو گئی:

"یہ تمہیں بیٹھے بیٹھے کیا ہو جاتا ہے؟ کیا تم مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے جانا چاہتے ہو؟"

"نہیں تورکینہ!" عنبر نے اداسی سے کہا:

"میں تمہیں نہیں چھوڑنا چاہتا مگر ممکن ہے تم خود مجھے چھوڑ دو۔ مجھ سے نفرت کرنے لگو۔"

"ایسا نہ کہو عنبر ....." تورکینہ تڑپ کر بولی:

"میں جیتے جی ....."

اچانک باہر بہت سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ عنبر نے گھبرا کر جھونپڑی کے دروازے کی طرف دیکھا

"کون لوگ ہیں یہ؟"

تورکینہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔

"ٹھہرو تورکینہ! میں دیکھتا ہوں۔"

عنبر بھی اس کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا۔

دروازے پر دس بارہ مغل تلواریں کھینچے اور مشعلیں لیے کھڑے تھے۔ ان کے بھیانک چہرے نفرت اور قہر کی تفسیر بنے ہوئے تھے۔

"تم دونوں ہمارے ساتھ چلو۔" ایک مغل نے گرجدار آواز میں آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"مگر کیوں؟ ہم نے کیا جرم کیا ہے؟" تورکینہ نے بھی اتنی ہی سختی سے پوچھا۔

"چپ رہو۔" مغل نے کہا۔ اور کئی تلواریں تورکینہ اور عنبر کی طرف اٹھ گئیں۔

"جو کہنا ہے سردار سے کہنا۔"

اسی وقت تورکینہ کی نظر اس مغل پر پڑی جو دوپہر کو ان کے پاس آیا تھا۔ تورکینہ چیخ کر بولی:

"تو، تُو نے شکایت کی ہے سردار سے۔ چل میں بھی سردار سے تیری سب باتیں کہہ دوں گی۔" تورکینہ کا ہاتھ تھام کر بڑی لاپروائی سے چلنے لگی۔

تورکینہ اور عنبر کو خیمہ گاہ کے سردار کے سامنے پیش کیا گیا۔ سردار نے تورکینہ کو قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا:

"تُو جادوگر کی بیٹی ہے؟"

"میں جادوگر کی بیٹی تھی۔ اب نہیں ہوں۔" تورکینہ نے بے خوفی سے جواب دیا۔

"کیا بک رہی ہے؟" سردار کو غصہ آ گیا: "کیا تو جادوگر کی اولاد نہیں ہے؟"

"میرا باپ جادوگر تھا لیکن مغلوں کے لیے جادو کرتے ہوئے وہ قتل کر دیا گیا۔"

"تیرے ساتھ یہ کون ہے؟" سردار نے عنبر کی طرف اشارہ کیا۔

"میرا شوہر ہے۔" تورکینہ نے بلا جھجک کہا۔ "لیکن نہ تو یہ جادوگر ہے اور نہ جادو جانتا ہے۔ میرے ماں باپ کے قتل ہونے کی خبر سن کر یہ میرے پاس آ گیا ہے۔ میرا باپ مغل تھا۔"

"سب جادوگر مغل تھے۔"

سردار اٹھ کر ٹہلنے لگا:

"لیکن انہوں نے خانِ اعظم کو دھوکہ دیا۔ خانِ اعظم نے سب کو قتل کرا دیا۔ ایک بچے کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔ تجھے بھی قتل کیا جائے گا۔"

"کیا کہہ رہے ہو سردار؟" تورکینہ حیرت سے بولی: "جادوگروں نے تو بارش برسا کر تاتاریوں کو شکست دی۔ میرا باپ تمہارے لیے جادو کرتا ہوا مارا گیا۔ پھر تم انہیں دھوکے باز کیوں کہتے ہو؟"

"تجھے خبر نہیں عورت! خانِ اعظم نے جب سمرقند پر حملہ کیا تو تمام جادوگر ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے فتح کے لیے جادو تیار کیا لیکن پھر وہ تاتاریوں سے مل گئے اور جادو الٹا کر دیا۔ ہمارے لشکر کے تمام گھوڑے مر گئے۔ اب ہمارا لشکر سمرقند سے پیدل واپس آ رہا ہے۔"

تورکینہ کے لیے یہ خبر بڑی تشویش ناک تھی لیکن عنبر کو اس سے بڑی خوشی ہوئی کہ مغل سمرقند پر قبضہ نہ کر سکے تھے۔

"ہم نے لشکر گاہ کے تمام گھوڑے ان کے لیے بھیج دیے ہیں۔ . . . لیکن تجھے ابھی قتل نہیں کیا جائے گا۔

تُو اور تیرا شوہر قید میں رہیں گے۔ خانِ اعظم ایاس خواجہ واپس آ کر تیرے لیے جو فیصلہ کریں گے اس پر عمل کیا جائے گا۔"

"لیکن سردار۔ یہ تو سراسر ظلم ہے۔"

تورکینہ نے احتجاج کیا:

"اگر جادوگروں نے دھوکہ دیا تو انہیں سزا مل گئی۔ میرا اور میرے شوہر کا کیا قصور ہے۔ ہم دونوں تو سمرقند میں نہیں تھے؟"

سردار نے جواب دینے کے بجائے انہیں لانے والوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے بڑھ کر دونوں کو پکڑ لیا اور گھسیٹتے ہوئے ایک خیمے میں لے گئے۔ وہاں پہنچ کر ان کے خنجر چھین لیے گئے اور خیمے پر پہرہ لگا دیا گیا۔ اس نئی مصیبت سے عنبر اور تورکینہ پریشان ہو گئے۔

رات ذرا گہری ہوئی تو عنبر نے آہستہ سے پوچھا:

"کیا سوچ رہی ہو تورکینہ؟"

"سوچ رہی ہوں کہ اب ان کم بختوں کے ہاتھوں سے بچنا مشکل ہے۔"

"ہاں۔ انہوں نے تمام ساحروں، عورتوں اور بچوں کو مار ڈالا ہے تو پھر ہمیں کیوں بخشیں گے۔" عنبر نے کہا: "تم موت سے ڈرتی تو نہیں ہو؟"

"موت تو ایک دن آنی ہے عنبر! لیکن تمہارے ساتھ مرنے میں مجھے خوشی ہو گی۔"

"تورکینہ! تم تاتاری عورتوں کی طرح بہادر اور حوصلہ مند ہو۔" عنبر نے اس کی تعریف کی: "کاش میں تمہیں اپنی ماں اور بیوہ بہن کے پاس لے جاتا۔ وہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوتیں۔ خیر، جو قسمت میں ہے پورا ہو گا۔ لیکن میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں جو مجھے کھائے جا رہا ہے۔"

"عنبر . . . ." تورکینہ اضطراب سے بولی۔ "زندگی کے جو لمحے ہیں انہیں ہنس بول کر گزارو۔ کسی بوجھ کا ذکر مت کرو۔"

"نہیں تورکینہ! دل کا بوجھ ہلکا کرنے سے ہی مجھے سکون ملے گا۔ مجھے خوشی حاصل ہو گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میری بات سننے کے بعد تم اپنا خیال بدل دو۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو عنبر۔ جلد کہو۔" تورکینہ نے پریشانی سے کہا۔

"میں تمہارے ساتھ ہی مرنا چاہتی ہوں۔ میرا ارادہ نہیں بدل سکتا۔"

"سنو تورکینہ! اگر میں یہ کہوں کہ تمہارے باپ کو تمہاری ماں نے نہیں مارا تھا تو کیا تم یقین کر لوگی؟"

"اب یہ باتیں بیکار ہیں عنبر!" تورکینہ بے دلی سے بولی۔

"تورکینہ! میں کہتا ہوں کہ تمہاری ماں قاتل نہیں تھی۔ تمہاری ماں تو تمہارے باپ کی جھونپڑی میں [illegible] نہیں گئی تھی۔"

"تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے اس وقت تم وہاں موجود تھے۔" تورکینہ چڑ کر بولی۔

"ہاں۔ ۔ ۔ یہ حقیقت ہے کہ تمہارے باپ کو میں۔ ۔ ۔ میں۔ ۔ ۔" عنبر کے حلق میں آواز اٹک گئی۔

"کک۔ ۔ ۔ کیا کہہ رہے ہو عنبر!؟" تورکینہ گھبرا کر بولی۔

"تورکینہ۔ ۔ ۔" عنبر نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ۔ ۔ "تم نے بتایا تھا نا، کہ اگر ایک ساحر کو مار ڈالا جائے تو بارش بند ہو جائے گی۔ ۔ ۔ اس دن تاتاریوں کو شکست ہو رہی تھی۔ وہ پیچھے ہٹتے جا رہے تھے۔ میں پہاڑی پر موجود تھا۔ مجھے تمہاری بات کا یقین تھا اس لیے میں اس طوفانی بارش میں تمہاری بستی میں پہنچا اور جو پہلی جھونپڑی سامنے آئی اس میں گھس گیا اور ساحر کو قتل کر دیا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے ہاتھوں مارا جانے والا ساحر تمہارا باپ تھا۔ تم نے مجھ پر احسان کیے۔ ۔ ۔ مجھے کھلایا پلایا اور موت کے منہ سے بچایا۔ میں تمہارے احسانات کے بوجھ تلے دبا ہوا ہوں تورکینہ! میں تمہارا مجرم ہوں۔ میں اپنے ضمیر سے نہیں، صرف تم سے شرمندہ ہوں تورکینہ!"

تورکینہ خاموشی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

عنبر تھوڑی دیر خاموش رہ کر اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ ۔ ۔ پھر اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر بولا:

"تورکینہ! بولو، تم اپنے مجرم کے لیے کیا سزا تجویز کرتی ہو؟"

تورکینہ کا لرزتا ہوا ہاتھ عنبر کے کندھے سے ٹکرایا۔ پھر اس کا سر عنبر کے شانے سے ٹک گیا اور وہ سسکتی ہوئی بولی:

"میں تمہیں معاف کرتی ہوں عنبر!"

"تورکینہ! تم نے مجھے معاف کر کے میرا بوجھ ہلکا کر دیا۔" عنبر کے لہجے میں خوشی کا تاثر تھا۔

اسی وقت خیمے کے باہر گھوڑے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ دونوں نے اٹھ کر پردے کی اوٹ سے جھانکا۔ مغل خیمہ گاہ میں مشعلیں روشن تھیں اور بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے خیمہ گاہ خالی ہونا شروع ہو گئی۔

مغل اس طرح بھاگ رہے تھے جیسے کسی نے ان پر حملہ کر دیا ہو۔ جس وقت انہیں خیمے میں قید کیا گیا تھا اس وقت

خیمہ گاہ میں گھوڑا کوئی موجود نہیں تھا۔ اس سے عنبر نے اندازہ لگایا کہ یہ گھڑسوار اس لشکر کے ہیں جو سمرقند سے ناکام واپس آیا ہے لیکن یہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ مغل بدحواسی کے عالم میں خیمہ گاہ چھوڑ کر اس طرح بھاگ کیوں رہے ہیں؟

خیمے پر پہرہ دینے والے پہرے دار بھی پہرہ چھوڑ کر بھاگنے والوں میں جا ملے تھے۔ ۔ ۔ ۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے لشکر گاہ خالی ہو گئی۔

تورکینہ اور عنبر خیمے سے نکل آئے۔ اب وہ آزاد تھے۔

"اب ہم آزاد ہیں عنبر!" تورکینہ خوشی سے بولی: "آؤ اب بھاگ چلیں۔"

عنبر بھی یہی سوچ رہا تھا۔ وہ تورکینہ کو لیے ہوئے خیمے سے کچھ فاصلے پر جا کر رک گیا:

"اب ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے تورکینہ!" عنبر مسرت آمیز لہجے میں بولا:

"غیبی مدد اسی کو کہتے ہیں۔"

"ہاں عنبر! اب شاید ہم سمرقند پہنچ سکیں۔"

"ضرور تورکینہ!"

عنبر نے اس کے خیال کی تائید کی:

"میری ماں اور بہن تم سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔"

عنبر اور تورکینہ رات بھر سمرقند کی طرف چلتے رہے۔

صبح دم، انہیں پہاڑیوں کے دامن میں ایک لشکر کا پڑاؤ نظر آیا۔ عنبر کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔ یہ تاتاری لشکر تھا جو مغلوں کا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک آیا تھا۔

تاتاری لشکر میں بہت سے سوار عنبر کو پہچانتے تھے اس لیے عنبر کو اپنی شناخت کرانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

جب تاتاری لشکر کو معلوم ہوا کہ مغل یہاں سے بھی بھاگ نکلے ہیں تو وہ سمرقند کی طرف واپس ہو لیے۔

عنبر کی ماں اور بہن سمرقند ہی میں تھیں۔ تورکینہ کو دیکھ کر وہ دونوں نہال ہو گئیں۔ ۔ ۔ ۔ پھر تورکینہ دلہن بن کر ہمیشہ کے لیے عنبر کی ہو گئی۔

جب سردار تیمور، شہر سبز سے سمرقند پہنچا تو عنبر حسب سابق پھر اس کے لشکر میں شامل ہو گیا۔

⊙

مرغزاروں کا فریب

اس کے ریشمی بال رخساروں سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے، بائیں شانے پر چڑھی ہوئی ہلکی ڈھال، ا کر ا
طرف لٹکتی تلوار، دوسری طرف اڑسا ہوا خنجر، پشت پر ترکش اور کمان!

وہ بڑی بے نیازی سے گھوڑے پر بیٹھی قافلہ سالار کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اس سے قبل دا
قافلے چھاؤنی کے سامنے سے گزر چکے تھے۔ وہ تیسرے قافلے کے ساتھ تھی۔ اس کا قافلہ بھی آہستہ آ
چھاؤنی کے خیموں کے سامنے سے گزر گیا۔

مسلح سوار، سڑک کے دونوں طرف کھڑے قافلے کو گزرتا دیکھ رہے تھے لیکن ایک خیمے کے
سی مچی تھی۔ شاید اس کے حسن بے محابہ کو دیکھ کر خیمے والے حیران تھے اور ایک دوسرے سے گفتگو کرنے
قافلہ بغیر کسی روک ٹوک کے چھاؤنی سے نصف فرسنگ آگے بڑھ گیا۔

گرمیاں شروع ہو چکی تھیں اور دھوپ میں تمازت پیدا ہو گئی تھی۔ آفتاب نصف النہار کی طرف بڑھ
قافلے والوں کے چہروں پر پسینہ موتی بن کر چمک اٹھا تھا۔ اسی وقت پیچھے سے گھوڑے دوڑنے کی
قافلہ سالار نے گھوڑا روکا اور ڈرتے ڈرتے پلٹ کر دیکھا۔ پچاس سا ٹھ سوار گھوڑے اڑاتے قافلے کی ا
آ رہے تھے۔

ادھیڑ عمر قافلہ سالار گھبرا گیا۔ آنے والے سوار وہی تھے جنہوں نے قافلے کو بغیر پوچھ گچھ کے گزا
تھا..... پھر اب وہ کیوں آ رہے تھے؟

اس کی پریشانی بجا تھی۔ قافلے میں ستر مرد، دس عورتیں اور بیس محافظ سوار تھے۔ بار بردار
اور گاڑیاں الگ تھیں۔

سوار قریب پہنچے۔ قافلے کو گھیر لیا گیا۔ سواروں کا سردار، گھوڑا بڑھا کر قافلہ سالار کے قریب آ گیا۔ قافلہ
سالار پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"قافلہ آگے نہیں جائے گا۔" سردار نے حکم دیا۔

قافلے والے سہم گئے۔ قافلہ سالار نے احتجاج کرنا چاہا لیکن اس کی آواز نہیں نکل سکی۔

حسن کو جلال آ جائے تو اس میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ قافلہ سالار کے ساتھ والی لڑکی کی تیوری چڑھ گئی۔
ابرو کھنچ گئے۔ دور ہی سے بولی:

"کیوں نہیں جائے گا؟"

پھر وہ گھوڑا بھگا کر سردار کے سامنے آ گئی۔

"بس، نہیں جائے گا۔ چھوٹے امیر کا حکم ہے۔" سردار جواب دے کر لڑکی کو گھورنے لگا۔

"ہم کسی چھوٹے امیر کے پابند نہیں ہیں۔" لڑکی نے قبضۂ شمشیر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

قافلہ سالار نے دیکھا کہ بات بگڑ رہی ہے تو اس نے دخل دیا:

"بیٹی تم چپ رہو۔ شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ابھی وضاحت کیے دیتا ہوں۔"

"یہ تمہاری بیٹی ہے؟" سردار نے بجائے وضاحت سننے کے دوسرا سوال کر دیا۔

"ہاں، میری بیٹی ہی سمجھیے۔" قافلہ سالار نے بڑے مہذب طریقے سے کہا: "قافلے میں شامل خواتین قافلہ
سالار کی ماں، بہن اور بیٹیاں ہوا کرتی ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ یہ تمہاری بیٹی نہیں۔ اس کے وارث کہاں ہیں؟" سردار کے لہجے میں تلخی آ گئی۔

"تم کون ہوتے ہو میرے وارثوں کو پوچھنے والے؟"

لڑکی جھنجھلا اٹھی:

"ہم نے علاقے کے حاکم سے راہداری کی اجازت حاصل کر لی ہے۔ یہ قافلہ ان کی پناہ میں ہے۔ اگر تم
نے ہمیں روکنے کی کوشش کی تو یہ حاکم علاقہ کے حکم کی خلاف ورزی ہوگی۔ اس کی تمہیں سخت سزا ملے گی۔"

پتہ نہیں، سردار نے لڑکی کی بات سنی یا نہیں۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ لڑکی کے حسن نے شاید
اس پر محویت طاری کر دی تھی۔

لڑکی خاموش ہوئی تو قافلہ سالار نے اپنی صفائی پیش کی:

"دیکھیے سردار، دریائے آمو کے اس طرف تک سردار تیمور کی سرحد تھی۔ انہوں نے بحفاظت تمام قافلوں کو
دریا تک پہنچوا دیا۔ دریا کے اس پار کا علاقہ حاکم قرشی امیر موسیٰ کا ہے۔ ہم نے اپنا سوار بھیج کر ان سے بھی

اجازت حاصل کر لی تھی۔"

"میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ قافلہ سالار کی بات سنو۔" لڑکی نے سردار کو ڈانٹ پلائی۔

سردار بوکھلا گیا اور ہاں، ہوں کرنے لگا۔

"ہم نے امیر موسیٰ سے بحفاظت گزرنے کی باقاعدہ اجازت حاصل کی ہے۔" لڑکی نے قافلہ سالار کی بات دہرائی۔ "تم ہمیں روکنے کے مجاز نہیں ہو۔"

"دیکھیے سردار!" قافلہ سالار نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا:

"ہم سے پہلے بھی دو قافلے اس علاقے سے گزر چکے ہیں۔ انہیں نہیں روکا گیا۔ ہم سے کیا خطا ہوئی کہ ہم روکا جا رہا ہے۔ ہم نے اجازت حاصل کی ہے۔ اگر اس طرح قافلے روکے جانے لگے تو تجارتی قافلے جہاں کے تہاں رک جائیں گے۔ تجارت بند ہو جائے گی اور سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں جا سکے گا۔ اس کا یہ ہوگا کہ ......"

"یہ سب ٹھیک ہے لیکن قافلہ آگے نہیں جائے گا!" سردار نے تمام وضاحتیں رد کرتے ہوئے فیصلہ سنا دیا۔

"ہم تمہارے حکم کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔" لڑکی چیخ کر بولی۔ "قافلے، حاکم کی پناہ میں چلتے ہیں۔ ہمیں صرف امیر موسیٰ ہی حکم دے سکتے ہیں۔ تمہارا حکم ہم نہیں مانیں گے۔"

لڑکی نے تلوار کھینچ لی اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئی۔

قافلہ سالار نے اپنے محافظوں کی طرف دیکھا۔ بیسیوں محافظ اگرچہ اس کے قریب آ گئے تھے لیکن کسی کا ہاتھ تلوار تک نہیں پہنچا تھا۔

قافلہ سالار نے بات بنانے کی کوشش کی:

"سردار! کم از کم ہمیں قصور تو بتایا جائے۔"

"اور یہ بھی بتایا جائے کہ امیر موسیٰ کے اجازت نامے کے باوجود قافلے کو روکنے کا حکم کون شخص دے رہا ہے؟" لڑکی نے کڑک کر پوچھا۔

"یہ لڑکی بہت تیز طبیعت ہے۔" سردار نے قافلہ سالار کو مخاطب کیا۔ "اس کو روکو ورنہ ......"

"ورنہ تم اپنے پچاس سواروں کو حکم دو گے کہ قافلے کے بیس محافظوں کو قتل کر کے ہمیں گرفتار کر لیں۔" لڑکی نے تیز لہجے میں سردار کی بات کاٹ دی۔ "تجارتی قافلوں پر صرف ڈاکو حملہ کیا کرتے ہیں لیکن اب اس علاقے میں

یہ نئی بات ہوگی کہ سرکاری فوج اپنے امیر کے حکم کے خلاف قافلے پر حملہ کرے۔"

"نہیں۔ ایسی بات ہرگز نہیں ہے!" سردار چیخ اٹھا:

"ہم امیر کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے لیکن جس حاکم نے تمہیں اجازت دی ہے اب اسی کا حکم ہے کہ قافلے کو آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔"

"امیر موسیٰ ...... کیا یہ ان کا حکم ہے؟" قافلہ سالار نے حیرانی سے سردار کو دیکھا۔

"امیر موسیٰ کا ہی حکم سمجھو۔" سردار نے کہا۔ "دریائے آمو سے قلعہ قرشی تک کا تمام علاقہ امیر موسیٰ نے اپنے بیٹے امیر محمد بیگ کو دے رکھا ہے۔ یہ حکم امیر محمد بیگ کا ہے۔"

"آخر اس غلط حکم کی کوئی وجہ تو ہونی چاہیے۔" لڑکی نے پھر دخل دیا۔

"وجہ بھی ہے۔" سردار بے دلی سے بولا:

"پوچھنا ہی چاہتے ہو تو سنو۔ ہمارے سپہ سالار محمد بیگ کو مخبروں نے اطلاع دی ہے کہ اس قافلے کے ساتھ کئی جاسوس مرد اور عورتیں سفر کر رہی ہیں۔ اس سلسلے میں پوری چھان بین کی جائے گی۔ اس کے بعد ہی قافلے کو آگے بڑھنے کی اجازت مل سکے گی۔"

"سردار ...... !" قافلہ سالار چونک کر بولا:

"یہ بات آپ نے پہلے ہی بتا دی ہوتی تو اتنی بک بک جھک جھک کیوں ہوتی۔ ہمارے قافلے پر جو الزام لگایا گیا ہے ہم اس کی صفائی پیش کریں گے اور اگر واقعی ہم میں سے کوئی جاسوس گھس آیا ہے تو ہم اسے خود پکڑ کے آپ کے حوالے کر دیں گے۔"

بات معقول تھی۔ قافلہ سالار اپنے سر یہ الزام لینے کے لیے ہرگز تیار نہ تھا کہ اس کے قافلے میں کوئی جاسوس موجود ہے۔

تاجروں کو تاتاریوں کی خانہ جنگی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ان کا کام تو تجارتی سامان کو ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچانا اور اس کو فروخت یا تبادلہ کرنا تھا۔

چھ سال پہلے جب یہ خانہ جنگی شروع ہوئی تھی تو تجارتی قافلے بڑے بڑے شہروں میں رک کر رہ گئے تھے۔ اس وجہ سے بازار سرد پڑ گئے تھے اور اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ تاتاریوں کی یہ خانہ جنگی شہر سبز کے سردار تیمور اور اس کے سالے امیر حسین کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی تھی۔ پورا ملک تاتار دو گروہوں میں بٹ گیا تھا۔ کچھ قبائل تیمور کی طرف تھے اور کچھ امیر حسین کی حمایت کر رہے تھے۔

جب گرانی بہت بڑھ گئی اور تاجروں کو منڈیوں میں سامان لانے پر زور دیا گیا تو انہوں نے اپنے تحفظ

کی ضمانت مانگی۔ دونوں متحارب گروپ تجارت کے ٹھپ ہو جانے سے پریشان تھے۔ آخر یہ طے ہوا کہ ہر گروہ اپنے
علاقے میں تاجروں کو تحفظ فراہم کرے گا۔ اس ضمانت کے بعد تجارتی قافلے پھر رواں دواں ہو گئے۔

تیمور اور امیر حسین دونوں ہی اپنے اپنے علاقوں میں قافلوں کی حفاظت کے ذمے دار تھے۔ یوں ایک طرف
تو جنگ جاری تھی، دوسری طرف تجارت بے روک ٹوک ہو رہی تھی۔

یہ پہلا قافلہ تھا جس میں جاسوسوں کی شمولیت کا شبہ کیا گیا تھا اور اسے امیر حسین کے علاقے میں روک
لیا گیا تھا۔ امیر حسین کا معتمد خاص امیر موسیٰ تھا۔ امیر حسین کو اس کی کمزوریاں معلوم تھیں اس کے باوجود وہ اسے
برداشت کر رہا تھا۔ قلعہ قرشی پر اس نے امیر موسیٰ کو قلعہ دار مقرر کر دیا تھا۔ قافلے کو روکنے کا یہ واقعہ دریا
آمو کے شمال میں قرشی کی سرحد پر پیش آیا۔

قافلہ سالار اپنے قافلے کو فوجی چھاؤنی پر واپس لے آیا۔ سڑک سے ایک طرف کچھ فاصلے پر قرشی کے فوجیوں
کے خیمے نصب تھے۔ قافلہ سالار نے اپنے قافلے کے خیمے سڑک کے دوسری جانب، درختوں کے سائے میں نصب
کرنے کا حکم دیا۔ قرشی کے سواروں کی تعداد اور بڑھ گئی تھی..... خیموں سے بہت سے لوگ آ کر ان میں شامل
ہو گئے تھے۔

قافلہ سالار، لوگوں کو کھانا پکانے، کھانے اور ہر طرح کی تسلی دے کر، قرشی سردار کے پاس آیا۔ قرشی سردار
اپنے سواروں کے ساتھ ایک جگہ کھڑا خیمے نصب ہوتے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں قافلے والوں کے درمیان پھر
رہی تھیں، جیسے وہ کسی کو تلاش کر رہا ہو۔ ممکن ہے وہ اس منہ زور لڑکی کو تلاش کر رہا ہو جس نے اسے سخت
جواب دیے تھے۔

"ہاں تو سردار.....!"

قافلہ سالار نے اسے چونکا دیا:

"فرمائیے۔ جاسوسوں کو تلاش کرنے کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔"

"ہاں.....!" سردار اپنی خفت مٹاتے ہوئے بولا:

"چھوٹے امیر سے پوچھ کر ابھی بتاتا ہوں لیکن یہ خیال رہے کہ اگر کسی نے بھاگنے کی کوشش کی تو وہ جان
سے ہاتھ دھو بیٹھے گا اور تمہیں بھی اس کی سزا دی جائے گی۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

قافلہ سالار نے اسے حیرت سے دیکھا:

"جو بھاگے گا وہ خود مارا جائے گا۔ میرے پاس تو صرف بیس مسلح آدمی ہیں۔ اگر کوئی بھاگ نکلا تو

آپ کی چھاؤنی کے ڈیڑھ دو سو سواروں کا ہو گا سبھی کیوں سزا ملے گی۔ میں نے تو اپنا قافلہ آپ کے حوالے
کر دیا ہے۔"

"اچھا اچھا..... زیادہ باتیں نہ بناؤ۔" سردار لاجواب ہو کر بولا۔

"محترم سردار.....!"

قافلہ سالار نے کچھ کہنا چاہا تو سردار نے اسے ڈانٹ دیا:

"چپ چاپ جا کر بیٹھو۔"

پھر وہ اپنا گھوڑا موڑ کر خیموں کی طرف چلا گیا۔

قافلہ سالار اسے دیکھتا ہی رہ گیا..... پھر واپس آ کر وہ بھی اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ
جب یہ سردار اس قدر اکھڑ اور احمق ہے تو اس کا مالک کس طرح کا ہو گا۔ اگر بدقسمتی سے وہ بھی ایسا ہی نامعقول ہوا
تو پھر قافلے کو یہاں سے صحیح سلامت نکال لے جانا مشکل ہو جائے گا۔

دوپہر کے بعد قافلے والوں نے رات کا کھانا بھی پکا کر کھا لیا لیکن جاسوسوں کی تلاش کا سلسلہ شروع نہ ہوا۔
رات ہوتے ہی قافلے کے گرد پہرہ سخت کر دیا گیا۔ قافلہ سالار سخت پریشان تھا۔ پورے قافلے میں سراسیمگی پھیل
گئی تھی۔

قافلے کے ساتھ والی گھڑ سوار لڑکی، اس وقت قافلہ سالار کے خیمے میں بیٹھی اس سے گفتگو کر رہی تھی۔
لڑکی چونکہ تنہا تھی اس لیے قافلہ سالار اسے اپنے خیمے ہی میں رکھتا تھا۔ لڑکی کا باپ ایک بڑا تاجر اور قافلہ سالار کا گہرا
دوست تھا۔ خانہ جنگی کے پیش نظر لڑکی کے باپ نے اسے بہت روکا کہ اس پُرخطر زمانے میں وہ تنہا سفر نہ کرے
لیکن لڑکی نے باپ کی بات نہ مانی۔ مانتی بھی کیسے! اس کا شوہر ایک سال سے لاپتہ تھا۔ وہ شمال میں سامانِ تجارت
کے ساتھ گیا تھا لیکن واپس نہ آیا۔

لڑکی کو کسی ذریعے سے معلوم ہوا تھا کہ اس کا شوہر قلعہ قرشی میں موجود ہے۔ بس ایک موہوم امید کے
سہارے وہ قرشی سے گزرنے والے اس قافلے کے ساتھ ہو لی تھی۔

"بیٹی تو یہ.....!" قافلہ سالار نے لڑکی کو مخاطب کیا۔ "قرشی کے ان فوجیوں کے ارادے کچھ اچھے نہیں

معلوم ہوتے پتہ نہیں یہ کیا چاہتے ہیں۔ قافلے کے تمام لوگوں کو میں جانتا ہوں اُن میں کوئی بھی جاسوس نہیں ہے۔"

"چچا جان! آپ نے ایک بات پہ غور نہیں کیا۔" ثوبیہ بولی۔ "دشمن قبیلے کا ہر آدمی جاسوس سمجھا جاتا ہے۔ قرشی والوں کی سردار تیمور سے جنگ ہو رہی ہے۔ تیمور کا تعلق برلاس قبیلے سے ہے اس لیے آپ کے قافلے میں جو لوگ برلاس قبیلے کے ہیں وہ سب قرشی والوں کی نظر میں جاسوس ہیں۔"

"میری بیٹی نے بڑی سمجھداری کی بات کی ہے۔" قافلہ سالار خوش ہو کر بولا۔ "یہی بات اس وقت بھی ہمارے پیش نظر تھی جب ہم قافلہ ترتیب دے رہے تھے۔ میں نے اور تمہارے باپ نے قبیلہ برلاس کے تمام تاجروں کو قافلہ میں شریک ہونے سے روک دیا تھا۔ ہم نے اعلان کر دیا تھا کہ اگر کوئی برلاس تاجر ہمارے ساتھ گیا تو اس کے جان و مال کے ہم ذمے دار نہ ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت ہمارے قافلے میں کوئی بھی برلاس قبیلے کا تاجر موجود نہیں ہے۔"

"آپ کا میرے بارے میں کیا خیال ہے۔" ثوبیہ مسکرائی۔

"تم تو میری بیٹی ہو۔" قافلہ سالار اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "تمہارے بارے میں کوئی سوال ہوگا تو میں کہہ دوں گا کہ ثوبیہ میری بھتیجی ہے اور میرے ساتھ تاشقند جا رہی ہے۔"

"چچا جان! میرا خیال ہے کہ ہم کسی بڑی مصیبت میں پھنسنے والے ہیں۔" ثوبیہ نے بڑی متانت سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ کو اس بات سے آگاہ کر دوں جو میں نے اب تک آپ سے چھپا رکھی ہے۔"

قافلہ سالار نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کونسی بات ہے جو تم نے مجھ سے چھپائی ہے۔ اگر تمہارا اشارہ اپنے شوہر کی طرف ہے تو میں اس کی تفصیل سے آگاہ ہوں۔ تمہارے باپ نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"یہ ٹھیک ہے چچا جان!" ثوبیہ اطمینان سے بولی۔ "آپ کو ابا جان نے بتایا ہوگا کہ ایک سال پہلے میری شادی ہوئی تھی اور پھر دو ماہ بعد میرا شوہر قافلے کے ساتھ شمال میں چلا گیا۔ اس کے علاوہ تو آپ کو اور کچھ نہ معلوم ہوگا۔"

"مجھے تمہارے اس سفر کا مقصد بھی معلوم ہے۔" قافلہ سالار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم تاشقند میں اپنے شوہر کو ڈھونڈنے جا رہی ہو۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"نہیں چچا جان۔ میں تاشقند نہیں جا رہی ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے تمہارے باپ نے میرے ساتھ غلط بیانی کی ہے۔" قافلہ سالار نے تاسف سے کہا۔

"غلط بیانی نہ کہیے چچا جان۔ انہیں جھوٹ بولنے پر میں نے مجبور کیا تھا۔ دراصل بات یہ ہے کہ مجھے علم ہوا ہے کہ میرے شوہر فہید، قرشی کے قلعے میں موجود ہیں۔ وہ بھی برلاس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے انہیں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ لیکن انہوں نے اپنے برلاس ہونے سے انکار کر دیا اور بڑی مشکل سے جان بچائی۔۔۔۔ اب وہ قلعہ قرشی میں موجود ہیں لیکن ان کی نگرانی ہوتی ہے۔ میں فیصلہ کر کے آئی تھی کہ جب قافلہ قرشی کے قریب سے گزرے گا تو میں آپ کو اصل حالات سے آگاہ کر کے قافلے سے علیحدہ ہو جاؤں گی تاکہ کسی طرح قلعے میں داخل ہو کر اپنے شوہر کی رہائی کی کوئی صورت پیدا کر دوں۔ میں نے ابا جان کو منع کر دیا تھا کہ وہ آپ کو اس وقت حقیقت نہ بتائیں ورنہ آپ مجھے شاید ساتھ لانے پر آمادہ نہ ہوتے۔"

"میری اچھی بیٹی!" قافلہ سالار محبت سے بولا۔ "خدا تیری عمر دراز کرے اور تجھے اپنے شوہر سے ملائے۔ خوش قسمت ہے وہ شوہر جسے تجھ جیسی چاہنے والی بیوی ملی۔"

ان کی گفتگو جاری تھی کہ ایک آدمی نے آ کر اطلاع دی، قافلہ سالار کو امیرِ قرشی نے اپنے خیمے میں طلب کیا ہے۔

قافلہ سالار جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ جلد از جلد اس جھگڑے کو نمٹا کر آگے بڑھ جانا چاہتا تھا۔

"چچا جان۔" ثوبیہ آہستہ سے بولی۔ "آپ پہ پورے قافلے کی ذمہ داری ہے۔ نرم رویہ اختیار کیجیے گا۔"

"بیٹی! یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔ میں تو یہاں تک تیار ہوں کہ امیرِ قرشی مجھے یرغمال کے طور پر اپنی قید میں رکھ لے اور قافلے کو آگے جانے کی اجازت دے دے۔"

"چچا جان! آپ واقعی ایک مخلص قافلہ سالار ہیں۔" ثوبیہ نے کہا۔ "اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ میں آپ کے لیے دعا کرتی رہوں گی۔"

امیرِ قرشی جو دراصل قرشی کے حاکم امیر موسیٰ کا نوجوان بیٹا محمد بیگ تھا، اس کا خیمہ ایک بلند جگہ پر نصب تھا۔ قافلہ سالار، محمد بیگ کے ہرکارے کے ساتھ اس کے خیمے پر پہنچا۔ باہر مسلح پہرے دار موجود تھے جو کامدار وردیاں پہنے ہوئے تھے جو رات کے اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔

یہ وردیاں عام طور پر شاہی محلات کے پہرے دار استعمال کرتے تھے۔ حاکمِ قرشی محض ایک امیر تھا اور ان کا بیٹا محمد بیگ تو ابھی کچھ بھی نہ تھا۔ اس کے باپ کی نسبت سے لوگ اسے "چھوٹا امیر" کہتے تھے۔ اس کے یہ ٹھاٹ باٹ دیکھ کر قافلہ سالار بہت حیران ہوا۔

قافلہ سالار کو اندر طلب کیا گیا تو وہ اندر کی شان دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ بہترین قالینوں کا فرش تھا خیمے کی

دیواروں پر غالیچے آویزاں تھے۔ تاتاریوں کے رسم و رواج اور طور طریقے مغلوں سے کچھ مختلف تھے۔ . . .
محمد بیگ نے اپنے خیمے کو مغل امیروں کی طرح آراستہ کروایا تھا۔

قافلہ سالار نے جھک کر ادب سے سلام کیا۔

"تم اس قافلے کے سالار ہو؟" محمد بیگ نے نہایت خشک اور کرخت لہجے میں دریافت کیا۔

"جی ہاں۔ امیرِ محترم!" قافلہ سالار نے ضبط سے کام لیتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

"تمہیں معلوم ہے قافلے کو کیوں روکا گیا ہے؟"

"جی امیرِ محترم!" قافلہ سالار نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن جو کچھ ہوا ہے وہ حاکمِ قریشی جا[illegible] کے یقینی دہانی کے خلاف ہوا ہے۔ ہم لوگ تاجر ہیں۔ خانہ جنگی سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔ . . . دونوں فریق[illegible] قافلے کے تحفظ کی ذمے داری قبول کی ہے۔ اس کے باوجود . . . ."

"قافلہ ہمارے حکم سے روکا گیا ہے۔" محمد بیگ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تمہارے قافلے میں جاسوس موجود ہیں۔ خلاف ورزی پہلے تمہاری طرف سے ہوئی ہے۔ ہم نے [illegible] اٹھایا ہے۔"

"امیرِ محترم! ہمارا قافلہ دو پہر سے یہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ اگر اس میں جاسوس موجود ہیں تو ان کی نشان دہ[illegible] اگر ہم صفائی پیش نہ کر پاتے تو قصور ہمارا تھا۔"

"دریا کے اس پار تیمور نے تمہارے قافلے کو ایک ماہ تک روکے رکھا اس وقت تم نے کوئی احتجا[illegible] ہم نے ایک دن روکا ہے تو چیخ رہے ہو۔" محمد بیگ نے بڑے تند لہجے میں کہا۔

"احتجاج تو ہم نے اس وقت بھی کیا تھا۔" قافلہ سالار نے جواب دیا۔ "لیکن سردار تیمور نے ہر قافلے[illegible] کھانے پینے کا انتظام خود کیا تھا۔ . . . جبکہ یہاں ایسا کوئی انتظام نہیں ہے۔"

"یہ سب فضول باتیں ہیں۔" محمد بیگ گرجا۔ "قافلے کو صرف ایک شرط پر رہائی مل سکتی ہے۔"

"ہم ہر شرط پوری کرنے کے لیے تیار ہیں امیر! آپ حکم دیجیے۔"

"تیمور کے جاسوسوں کو ہمارے حوالے کیا جائے۔" محمد بیگ اسے گھورتے ہوئے بولا۔ "اگر تم [illegible] کیا تو پورے قافلے کو قتل کر کے سامان لوٹ لیا جائے گا۔"

"امیرِ محترم! ہم نے کب انکار کیا ہے۔ جن لوگوں پر آپ کو شبہ ہے ان کے نام بتائے جائیں۔ اگر [illegible] صفائی پیش نہ کر سکے تو بے شک انہیں گرفتار کر لیا جائے۔"

"وہ لڑکی کون ہے جو قافلے کے ساتھ سفر کر رہی ہے؟"

"وہ لڑکی نہیں امیر! میری شادی شدہ بھتیجی نوبیہ ہے۔" قافلہ سالار نے بے جھجک کہا۔ "اس کا شوہر تاشقند میں ہے۔ وہ اپنے شوہر کے پاس جا رہی ہے۔"

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ وہ برلاس خاندان سے تعلق رکھتی ہے! . . . " محمد بیگ بولا۔ "صرف برلاس قبیلے کی عورتیں جسم پر اسلحہ سجا کر اتنی بے باکی سے مردوں کے ساتھ سفر کر سکتی ہیں۔"

"امیرِ محترم! گستاخی معاف! میری عمر آپ سے زیادہ ہے۔"

"اس بات کا عمر سے کیا تعلق؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" محمد بیگ نے بڑے ناگوار انداز میں اسے دیکھا۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں امیر! عورت خواہ برلاس قبیلے کی ہو یا جاغو قبیلے کی . . . . تاتاری عورتیں ہر دور میں مردوں کے شانہ بشانہ سفر ہی میں نہیں بلکہ جنگ میں بھی شریک ہوتی رہی ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے شاہ کابل امیر حسین کی ملکہ دلشاد آغا بیگم کو میدانِ جنگ میں تیر پھینکتے اور تلوار چلاتے دیکھا ہے۔"

"یہ لڑکی ضرور برلاس ہے۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔" محمد بیگ غصے سے بولا۔ "جب تیمور نے تمہیں سفر کی اجازت دی تھی تو اس وقت، اس لڑکی کو جاسوسی کے لیے تمہارے قافلے میں شامل کر دیا گیا تھا۔ . . . ہمیں پورا یقین ہے کہ وہ جاسوس ہے۔"

"میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں امیر؟" قافلہ سالار فکرمند لہجے میں بولا۔ "نوبیہ پر شبہ کرنے کا مطلب ہے کہ آپ کو مجھ پر بھی شبہ ہے اور مجھ پر شبہ کرنے سے پورا قافلہ مشکوک ہو جائے گا۔ کیا اس کی بہتر صورت یہ نہیں ہو سکتی کہ آپ مجھے حاکم علاقہ امیر موسیٰ کے پاس بھیج دیں۔ میں ان کے سامنے خاندانی حوالے دے کر انہیں مطمئن کر دوں گا۔"

"قریشی قلعے کا بیرونی علاقہ ہمارے سپرد ہے۔" محمد بیگ گردن تان کر بولا۔ "فیصلہ ہمیں کرنا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ وہ لڑکی جاسوس ہے۔"

قافلہ سالار کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ محمد بیگ کو وہ کس طرح مطمئن کرے۔

"لڑکی کو حاضر کیا جائے۔" محمد بیگ نے اپنے ایک آدمی کو حکم دیا۔

"دیکھیے امیرِ محترم۔" قافلہ سالار گھبرا گیا۔ "بغیر جرم ثابت کیے، کسی خاتون کو رسوا کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔"

محمد بیگ نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی اور نوبیہ کو بلانے کے لیے ایک آدمی بھیج دیا۔ قافلہ سالار بہت پریشان تھا۔ اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ کہیں قافلے والے بگڑ نہ جائیں اور مزاحمت پر آمادہ ہو جائیں۔ اس سے خواہ مخواہ خون خرابہ ہو گا۔

"اس کی اور بھی صورت ہو سکتی ہے امیر"۔ قافلہ سالار بولا۔

"نوبیہ کو یہاں بلانے سے بدمزگی پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر آپ کو اس پر شبہ ہے تو آپ مجھے یرغمال کے طور پر یہاں روک لیں۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ میں بدلباس ہوں تو مجھے قتل کر دیا جائے"۔

"جرم کی سزا مرف مجرم کو ملے گی"۔ محمد بیگ شرارت سے بولا:

"تمہیں یرغمال بنا کر ہمیں اچار نہیں ڈالنا ہے۔ لڑکی کو آنے دو۔ ابھی معلوم ہو جائے گا کہ کون سچا اور کون جھوٹا ہے"۔

قافلہ سالار کو نوبیہ کی عقل و دانش پر اعتبار تھا۔ پھر بھی خدشہ تھا کہ وہ گھبرا نہ جائے اور اس کے منہ سے کہیں ایسی ویسی بات نہ نکل جائے جس سے وہ گرفت میں آ جائے۔ اس کے پکڑے جانے سے قافلہ سالار لپیٹ میں آ جاتا۔ بڑی الجھن پیدا ہو گئی تھی۔ اب وہ نوبیہ کو ساتھ لا کر پچھتا رہا تھا۔

نوبیہ واقعی بڑی عقلمند تھی۔

جس وقت قافلہ سالار خیمے سے چلا تھا اسی وقت اس کی چھٹی حس جاگ اٹھی تھی۔ اس کا ذہن کہہ رہا تھا "جاسوس" کا تو محض بہانہ ہے۔ قافلے کو روکنے کی وجہ کچھ اور ہی ہے۔

وہ اٹھی اور اپنے جسم پر اسلحہ سجانے لگی۔ جیسے وہ میدانِ جنگ میں جا رہی ہو۔ پوری طرح مسلح ہونے کے بعد اس نے اپنا گھوڑا منگوایا اور اسے خیمے کے دروازے پر بندھوا دیا۔

وہ ان کاموں سے فارغ ہو کر بیٹھی ہی تھی کہ محمد بیگ کا آدمی آ گیا۔ اس نے اندر پیغام بھجوایا کہ امیر محمد بیگ نے اسے اپنے خیمے میں طلب کیا ہے۔

نوبیہ جواب دینے کے بجائے خود خیمے سے باہر آ گئی۔ محمد بیگ کا آدمی اسے مسلح دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"اپنے امیر سے جا کر کہہ دو کہ نوبیہ ایک تاتاری عورت ہے۔۔۔۔"۔ اس نے بڑے پُروقار انداز میں کہا: "تاتاری عورت رات کے وقت سوائے اپنے شوہر کے خیمے کے کسی غیر مرد کے خیمے میں نہیں جایا کرتی اور یہ بھی کہہ دینا کہ اگر نوبیہ کو زبردستی بلایا گیا تو امیر کے پاس صرف اس کی لاش ہی پہنچے گی"۔

محمد بیگ کا آدمی، نوبیہ کے وقار اور انداز گفتگو سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے جھک کر نوبیہ کو سلام کیا اور واپس چل دیا۔

"ٹھہرو۔۔۔۔"۔ نوبیہ نے کچھ سوچتے ہوئے قاصد کو روکا:

"امیر سے کہہ دینا کہ نوبیہ کو ان کے حکم کی تعمیل سے انکار نہیں لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ اس کی عزت و ناموس کے تحفظ کا وعدہ کریں"۔

قاصد محمد بیگ کے خیمے میں داخل ہوا اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

"چپ کیوں کھڑا ہے، بولتا کیوں نہیں؟" محمد بیگ نے اسے گھورا۔ "کیا اس نے یہاں آنے سے انکار کر دیا؟"

"ہاں امیر۔ وہ آنے پر آمادہ نہیں"۔ قاصد نے جواب دیا۔

"ذلیل کتے۔ تو اکیلا کیوں آیا"۔

محمد بیگ غصے سے کانپتا ہوا کھڑا ہو گیا:

"اسے چوٹی سے پکڑ کے گھسیٹتا ہوا کیوں نہیں لایا؟ اس کے انکار پر تو نے اس کی زبان کیوں نہ کھینچ لی"۔

"امیر سردار۔۔۔۔"۔ قاصد نے سر اٹھائے بغیر کہا:

"لڑکی نے کہا ہے کہ میں تاتاری عورت ہوں اور تاتاری عورت رات کے وقت کسی غیر مرد کے خیمے میں نہیں جایا کرتی۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر مجھے لے جانے کی کوشش کی گئی تو تمہارے ہاتھ میری لاش ہی آئے گی۔ وہ تو اپنے سینے میں خنجر گھونپنے پر بھی آمادہ ہو گئی تھی"۔ قاصد نے آخری جملہ اپنی بچت کے لیے خود ہی شامل کر لیا۔

نوبیہ کے اس دلیرانہ جواب نے محمد بیگ کو بہت متاثر کیا۔ اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ قافلہ سالار دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ نوبیہ نے خود کو بچانے کا بڑا اچھا اور معقول طریقہ اختیار کیا تھا۔

قاصد نے محمد بیگ کو خیالوں میں گم دیکھا تو دوبارہ بولا:

"اس نے کہا ہے کہ اگر اس کی عزت و ناموس کے تحفظ کا وعدہ کیا جائے تو اسے آنے میں کوئی عذر نہ ہو گا"۔

"ہم وعدہ کرتے ہیں"۔

محمد بیگ ایک دم بول پڑا:

"تم جاؤ اور اسے کہو کہ اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو گی۔ ہم اسے کسی بات پر مجبور نہیں کریں گے"۔

قاصد جانے لگا تو محمد بیگ بولا:

"دیکھو۔ اس لڑکی کو عزت و احترام سے لانا"۔

قافلہ سالار کو نوبیہ کی یہ بات بالکل پسند نہ آئی۔ اسے کسی شرط پر بھی محمد بیگ کے پاس نہیں آنا چاہیے تھا۔۔۔۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ جو شخص حاکم قرشی کے تحفظ دینے کے باوجود قافلے کو روکنے پر قادر تھا، وہ نوبیہ کو بھی کسی نہ کسی طرح اپنے خیمے میں بلا سکتا تھا۔

نوبیہ پوری طرح مسلح تھی۔

محمد بیگ کے خیمے پر پہرے داروں نے اسے روک کر اسلحہ اتارنے کا حکم دیا۔ نوبیہ نے انکار کر دیا۔ تکرار بڑھ گئی۔

ایک محافظ نے اندر جا کر محمد بیگ کو اطلاع دی کہ لڑکی مسلح ہے اور اسی طرح اندر آنا چاہتی ہے۔ محمد بیگ نے نوبیہ کو معہ اسلحہ اندر آنے کی اجازت دیدی۔

نوبیہ بڑی شان سے خیمے میں داخل ہوئی۔ محمد بیگ نے اسے قریب سے دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔

"چھوٹے امیر کے حضور ...... نوبیہ سلام پیش کرتی ہے"۔ نوبیہ نے بڑے ادب سے کہا۔

"تیرا نام ..... کیا ہے ..... لڑکی؟" محمد بیگ نے اٹک اٹک کر پوچھا۔

"میں لڑکی نہیں، شادی شدہ ہوں امیر! آپ مجھے خاتون کہہ کر مخاطب کر سکتے ہیں"۔ نوبیہ نے محمد بیگ کو ملائمت سے ٹوکا۔

محمد بیگ شرمندہ سا ہو گیا:

"اچھا خاتون ..... تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام نوبیہ ہے اور میرے شوہر کا نام فہمید قلی چاپ ہے"۔ نوبیہ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"ہم تمہارے شوہر کے بارے میں نہیں پوچھ رہے"۔

محمد بیگ چڑ گیا:

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم برلاس قبیلے سے تعلق رکھتی ہو ..... اور تیمور نے تمہیں جاسوسی کی غرض سے اس قافلے کے ساتھ بھیجا ہے۔ اس سلسلے میں تم کیا صفائی پیش کر سکتی ہو؟"

نوبیہ، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ..... اس کے دل کا حال معلوم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے محمد بیگ کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک سے اندازہ ہو گیا تھا کہ قافلے کو روکنے کی وجہ خود اس کی ذات ہے اور محمد بیگ جاسوسی کا الزام لگا کر اسے روکنا چاہتا ہے۔

نوبیہ جس وقت، باپ کی مرضی کے خلاف گھر سے اس قافلے کے ساتھ چلی تھی، اسے اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ شوہر تک پہنچنے کے لیے اسے صدہا مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا ..... اور لوہے کے چنے چبانے ہوں گے۔

"چھوٹے امیر!" نوبیہ نے سنبھل کر کہا: "اگر گستاخی معاف کی جائے تو میں عرض کروں گی کہ الزام لگانے والے کو پہلے الزام ثابت کرنا ہوتا ہے۔ صفائی کا مسئلہ تو بعد میں آتا ہے۔ اگر میں برلاس ہوں تو اس کے ثبوت میں آپ کے پاس ضرور کوئی شہادت ہو گی"۔

"کیا ہماری زبان کسی شہادت سے کم ہے"۔ محمد بیگ بگڑ کر بولا۔ "تم بہت چالاک معلوم ہوتی ہو"۔

"چھوٹے امیر! ..... نوبیہ بے خوفی سے بولی:

"اگر آپ کی زبان ہی سب کچھ ہے تو پھر میرے صفائی پیش کرنے سے کیا ہو گا۔ حکم دیجیے۔ میں سزا کے لیے تیار ہوں"۔

"یوں نہیں ..... " محمد بیگ نے غصے سے کہا۔ "پہلے تمہیں اپنے جرم کا اقبال کرنا ہو گا"۔

"اگر یہ بات ہے تو میں اپنے اوپر لگائے گئے جرم سے صاف انکار کرتی ہوں۔ جب تک مجھ پر جرم ثابت نہ ہو جائے گا، میں خود کو آپ کے فوجی دستے کے حوالے نہیں کروں گی"۔

"اے عورت!" محمد بیگ کے قریب کھڑے اس کے نائب سردار دلوران نے کہا۔ "تو اپنے آپ کو حوالے کرنے کی کیا بات کر رہی ہے۔ تو تو اس وقت بھی ہمارے قبضے میں ہے"۔

دلوران کی زبان سے الفاظ ادا ہوئے ہی تھے کہ نوبیہ کا ہاتھ بجلی کی طرح اپنے خنجر پر گیا اور اس نے خنجر محمد بیگ کے نائب پر کھینچ مارا۔ خنجر، دلوران کے آہنی خود سے ٹکرا کر نیچے گر پڑا۔ یہ سب کچھ اتنی سرعت سے ہوا کہ ہر شخص ہکا بکا رہ گیا۔

دلوران نے فوراً تلوار کھینچ لی اور نوبیہ کی طرف بڑھا۔ نوبیہ بھی اس وقت تک تلوار نکال چکی تھی۔

"خبردار ..... دلوران"۔ محمد بیگ چیخا۔

دلوران کے قدم رک گئے۔ اس نے تلوار نیام میں ڈال لی۔ نوبیہ نے بھی مسکراتے ہوئے اپنی تلوار غلاف میں رکھ لی۔

"نوبیہ! تم نے ہمارے نائب پر قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ ہم تمہیں پہلے اس جرم کی سزا دیں گے"۔ محمد بیگ نے بظاہر غصے سے کہا لیکن اس کے رویے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ نوبیہ کی پھرتی اور دلیری سے بے حد متاثر ہوا ہے۔

"یہ قاتلانہ حملہ نہیں تھا چھوٹے امیر!" نوبیہ لاپروائی سے بولی:

"اگر میرا قتل کا ارادہ ہوتا تو یہ خنجر سیدھا اس کے سینے میں پیوست ہو چکا ہوتا۔ میں تو اس پر یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ ہر تاتاری مرد اور عورت اس وقت تک آزاد ہے جب تک اس کے جسم پر اسلحہ موجود ہے۔ آپ کے نائب کے خود سے ٹکرانے والا یہ خنجر کسی کے بھی سینے میں داخل ہو سکتا تھا۔ آپ کی طرف سے زیادتی کی صورت میں یہ خنجر میرے سینے میں بھی پیوست ہو سکتا ہے۔ کیا آپ اب بھی اسے جرم کہیں گے؟"

"اچھا خیر۔۔۔" محمد بیگ پہلو بدل کر بولا۔

"ہم تمہیں اس جرم سے بری کہتے ہیں اور تمہارا یہ مطالبہ بھی قبول کرتے ہیں کہ تمہیں مجرم ثابت کرنے کے لیے ثبوت فراہم کیا جائے۔"

"میں چھوٹے امیر کے اس منصفانہ انداز کے لیے شکر گزار ہوں۔"

نوبیہ نے اس طرح مسکرا کر کہا کہ محمد بیگ جھوم اٹھا۔

"تمہارے قافلے کو قرشی میں اس وقت تک ٹھہرنا ہوگا جب تک تمہارے بارے میں تحقیقات مکمل نہ ہو جاتی۔ اگر الزام غلط ثابت ہوا تو ہم قافلے کا خسارا پورا کر دیں گے۔"

"مگر دیکھیے امیر!" قافلہ سالار گھبرا کر بولا۔ "قافلے کے رکنے سے ہمارا بھاری نقصان ہوگا اور۔۔۔"

"تم چپ رہو۔" محمد بیگ ترشی سے بولا۔ "نقصان ہوگا تو ہوتا رہے۔ مکمل تحقیقات سے پہلے قافلہ نہیں بڑھ سکے گا۔"

"چھوٹے امیر۔۔۔" نوبیہ نے دخل دیا۔ "الزام مجھ پر لگایا گیا ہے اور سزا قافلے والوں کو دی جا رہی ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔"

نوبیہ نے کچھ اس طرح اٹھلا کر کہا کہ محمد بیگ کے عیاش ذہن میں گدگدی سی پیدا ہونے لگی۔

"نوبیہ! ہمیں قافلے والوں سے کوئی دشمنی نہیں۔" محمد بیگ عالم سرمستی میں بولا۔ "ہمیں تو صرف اور صرف تم سے مطلب ہے۔"

"جی۔۔۔ کیا فرمایا چھوٹے امیر نے؟" نوبیہ نے پھر اس کی گرفت کی۔

"ہمارا مطلب ہے۔" محمد بیگ سنبھل کر بولا۔ "قافلے والے اگر جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں لیکن تمہیں تحقیقات کے اختتام تک یہیں ٹھہرنا ہوگا۔"

"اور اگر میں انکار کر دوں تو آپ کیا قدم اٹھائیں گے امیر۔۔۔؟" نوبیہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

"اگر آپ مجھے گرفتار کرنے کی کوشش کریں گے تو میں خود ہی قید زندگی سے آزادی حاصل کر لوں گی! صرف میری لاش ہی مل سکے گی۔"

"ہم تمہاری موت کے خواہاں نہیں ہیں نوبیہ۔" محمد بیگ جلدی سے بولا۔ "ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ جب تک تم قرشی میں رہو گی، تمہاری حفاظت کی جائے گی۔ تمہارے خیمے پر بھی خواتین کا پہرہ لگایا جائے گا۔"

"اگر میں ان شرائط پر قرشی میں قیام پر رضامند ہو جاؤں تو کیا آپ قافلے کو آگے جانے کی اجازت دے دیں گے۔"

"نہیں نوبیہ!"

قافلہ سالار نے فوراً مخالفت کی:

"تمہاری حفاظت کا ذمہ میں نے اٹھایا ہے۔ میں واپس جا کر تمہارے باپ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟"

"چچا جان۔۔۔" نوبیہ مستقل مزاجی سے بولی۔ ۔۔۔ "آپ میری فکر نہ کریں۔ میں اپنی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔ ممکن ہے میں اپنے اوپر لگائے گئے الزام کو غلط ثابت کر کے آپ سے پہلے گھر پہنچ جاؤں۔ اس طرح آپ کو میرے باپ کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔"

"تم دخل مت دو۔"

محمد بیگ نے قافلہ سالار کو روک دیا:

"اگر نوبیہ یہاں ٹھہرنے پر آمادہ ہے تو قافلہ جب چاہے یہاں سے آگے جا سکتا ہے۔"

"قافلے کو جانے کی اجازت دی جائے۔" نوبیہ نے کہا۔ "تحقیقات کے لیے جب تک امیر چاہیں گے میں یہاں مقیم رہوں گی۔"

"قافلے کو جانے کی اجازت ہے۔" محمد بیگ نے خوشی سے کہا۔

"آپ قافلے کو لے کر ابھی آگے بڑھ جائیے چچا جان۔" نوبیہ نے قافلہ سالار سے درخواست کی۔ "مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے۔ میں اپنی ایک جان کے لیے پورے قافلے کو مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتی۔"

قافلہ سالار کو مجبوراً نوبیہ کی بات ماننا پڑی:

محمد بیگ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب نوبیہ کچھ دن اس کے قریب رہے گی تو آہستہ آہستہ مانوس ہو جائے گی اور وہ اپنی ہر خواہش پوری کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

نوبیہ اپنی جگہ مطمئن تھی۔ اس کی اصل منزل قرشی ہی تھی۔۔۔۔ اگر اس کا شوہر فہید، قرشی میں موجود ہے تو وہ کسی نہ کسی طرح اس تک رسائی حاصل کر لے گی اور اگر وہ یہاں موجود نہیں ہے تو پھر اس کے لیے محمد بیگ کی قید سے فرار ہونا کچھ زیادہ مشکل نہ تھا۔

⊙

قرشی کا قلعہ، اس علاقے کا عظیم ترین قلعہ تھا۔ اس قلعے کی پہلی تعمیر، نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے

حکیم مقنع نے کی تھی جو اپنی نبوت کے ثبوت میں ایک کنویں سے دھات کا چاند نکالتا تھا۔ اس چاند کی روشنی بارہ میل تک جاتی تھی۔ یہ چاند ایک کنویں سے نکلتا اور رات بھر اصل چاند کی طرح کچھ بلندی پر سفر کرتا ہوا صبح کے وقت دوسرے کنویں میں داخل ہو جاتا تھا۔ اس جھوٹے نبی کا جھوٹا معجزہ "ماہِ نخشب" کے نام سے مشہور ہے۔ آخر مسلمانوں نے اس جھوٹے نبی کا جنازہ نکال دیا اور مقنع اپنے چھ ہزار پیروکاروں کے ساتھ آگ میں کود گیا۔ قلعے کا بیشتر حصہ آگ کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔

تیمور نے جب قرشی کے علاقے پر قبضہ کیا تو اس جگہ کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے پرانے قلعے کی مرمت کرائی اور اس میں کئی ترامیم اور اضافے کیے۔

تیمور اس قلعے کو بہترین پناہ گاہ سمجھتا تھا۔ خصوصاً موسمِ سرما میں تو یہ قلعہ ناقابلِ تسخیر ہو جاتا تھا لیکن تیمور کی بدقسمتی کہ اس قلعے کو اس کی بیوی الجائی خاتون کے بھائی امیر حسین نے اس سے مانگ لیا۔ ۔ ۔ ۔ پھر الجائی خاتون کا انتقال ہو گیا۔ تیمور اور امیر حسین کی اقتدار کی خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اب تیمور کو اپنی غلط بخشش پر افسوس ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی بہادری اور جنگی صلاحیت کے زور پر امیر حسین کو پے در پے شکست دے کر اس سے بہت سے علاقے چھین لیے تھے۔ ۔ ۔ ۔ پھر بھی امیر حسین کے پاس بہت سے اہم علاقے موجود تھے جن کے زور پر وہ تیمور کو لڑائیوں میں الجھا کر پریشان کرتا رہتا تھا۔ قرشی کا قلعہ ان سب میں اہم تھا۔

امیر حسین نے قرشی کے علاقے اور قلعے پر اپنے نائب امیر موسیٰ کو حاکم مقرر کیا تھا جس کے پاس بارہ ہزار فوج ہر دم تیار رہتی تھی۔ تیمور اس قلعے کو ہر طور حاصل کرنے پر تُلا ہوا تھا لیکن کوئی ترکیب نظر نہیں آتی تھی۔

تاتاریوں کی مسلسل خانہ جنگی نے امیر حسین اور تیمور کی فوجی طاقت پر بڑی کاری ضرب لگائی تھی۔ مغل شکست کھا کر حصار المالیق بھاگ گئے تھے۔ اب ان میں تاتاری علاقوں پر یلغار کرنے کی ہمت نہ تھی۔ پھر بھی اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اکثر وہ لوٹ مار کرنے تاتاری علاقوں میں گھس آتے تھے۔

اس تمام صورتِ حال کے پیشِ نظر تیمور چاہتا تھا کہ پورے ملکِ تاتار پر ایک شخص کی حاکمیت ہو تاکہ ایک مضبوط ریاست قائم ہو سکے۔

تیمور نے اپنے تمام بڑے سرداروں کو جمع کیا۔ امیر جاکو، امیر داؤد، مویدارلات اور ایلچی بہادر جیسے سردار اب تک اس کا ساتھ دے رہے تھے۔

"ساتھیو اور دوستو!"

تیمور نے انہیں مخاطب کیا:

"قرشی کا علاقہ اور قلعہ حاصل کیے بغیر نہ تو امیر حسین کی طاقت کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور نہ خانہ جنگی ہی رک سکتی ہے۔"

تیمور کے سردار اور امیر گھبرا گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا اور سر جھکا لیے۔ وہ سمجھ گئے کہ تیمور قرشی پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ قرشی کو فتح کرنے کا تصور ہی عبث ہے۔ تیمور کا لشکر بہادروں اور جانبازوں پر مشتمل اور ناقابلِ شکست تھا مگر اس کی تعداد قرشی میں موجود لشکر کے مقابلے میں چوتھائی سے بھی کم تھی۔ لہٰذا انہوں نے جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کر لی۔

تیمور کو سرداروں کی اس خاموشی پر غصہ آ گیا۔ اس نے امیر داؤد سے مخاطب ہو کر کہا:

"داؤد! تم تو خطر پسند اور نڈر مشہور ہو۔ تمہاری خاموشی میرے لیے ناقابلِ فہم ہے۔"

"محترم امیر!" داؤد نے سر اٹھا کر جواب دیا:

"ان دنوں شدید گرمی پڑ رہی ہے۔ میرے خیال میں یہ موسم، قرشی پر حملے کے لیے موزوں نہیں ہے۔ پھر ہمارے بیوی بچے بھی ساتھ ہیں۔ ان کی حفاظت ضروری ہے۔ بہتر ہے کہ اس مہم کو کچھ دنوں کے لیے اور ملتوی رکھا جائے۔"

"امیر داؤد!" تیمور بڑے رعب سے بولا: "تمہارے اہل و عیال کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے۔ پھر تم کیوں فکر کرتے ہو؟"

"مگر سردار۔ یہ تو غور فرمایئے، ہمارے اہل و عیال لشکر کے ساتھ کھلے میدان میں ہیں۔ اگر شہر پناہ کے اندر ہوتے تو کچھ مضائقہ نہ تھا۔ ۔ ۔ ۔" امیر داؤد نے شائستگی سے کہا۔

"اسی شہر پناہ کے حصول کے لیے تو میں قلعہ فتح کرنا چاہتا ہوں۔" تیمور مسکرایا:

"قرشی کے گرد بڑی مضبوط فصیل ہے۔ ذرا غور کرو۔ اگر قرشی ہمارے قبضے میں آ جائے تو ہمیں کتنا فائدہ ہوگا تمہارے اہل و عیال کے لیے ایک ناقابلِ شکست اور انتہائی محفوظ جگہ حاصل ہو جائے گی۔"

سرداروں اور امیروں کی سمجھ میں یہ بات تو آ گئی لیکن قرشی کی فتح ناممکن معلوم ہوتی تھی۔ امیر داؤد تو خاموش رہا لیکن امیر جاکو نے سر ہلاتے ہوئے کہا:

"سردار۔ میرے خیال میں ہمیں پہلے کافی طاقت جمع کر لینی چاہیے۔ اس کے بعد قرشی کے بارے میں سوچیں۔ امیر حسین بچہ نہیں ہے۔ اس کی پوری زندگی انہی معرکوں میں گزری ہے۔ وہ کوئی محل نشین عورت تو نہیں ہے جس پر ہم قابو پا لیں گے۔"

امیر جاکو کے الفاظ کی ترشی صاف ظاہر کر رہی تھی کہ وہ قرشی پر حملے کے خلاف ہے۔ تیمور بھی آج جھلایا ہوا تھا۔ بولا:

"اچھا، تو پھر تم عورتوں کے پاس جا کر پہلے سبق پڑھو پھر واپس آنا۔ میں اپنے ساتھ ان لوگوں کو
لوں گا جو پُل کی لڑائی میں شامل تھے"۔

یہ اشارا مویدارلات اور ایلچی بہادر کی طرف تھا جو مغلوں سے پہلی جنگ کے موقع پر سنگین پل کی حفاظت
پر مامور تھے۔ ۔ ۔ ۔ سنگین پل کے دوسری جانب مغل سپہ سالار بیک جک پڑاؤ ڈالے پڑا تھا اور اس کا حملہ کسی
وقت بھی متوقع تھا۔ ایسے موقعے پر تیمور نے اس کی حفاظت کے لیے مویدارلات، ایلچی بہادر اور امیر موسیٰ کو منتخب
کیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ وہی امیر موسیٰ جو اس وقت قرشی پر قابض تھا۔

سنگین پل کا نام آیا تو تیمور کے کچھ دوسرے سردار بھی ہم زبان ہو کر بولے:

"سردار۔ اس جنگ میں تو ہم بھی آپ کے ساتھ تھے۔ ہم نے بھی دریا پار کر کے مغلوں کو مار بھگایا تھا"۔

"مگر اب تم وہیں جاؤ۔ جہاں تمہارے اہل و عیال ہیں"۔ تیمور بگڑ کر بولا:

"جاؤ اور جو تمہارا جی چاہے کرو۔ میں نے قرشی پر قبضے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ میری منزل
قرشی ہے"۔

"ذرا ٹھہریے سردار"۔ امیروں میں سے ایک بولا: "ہمیں چند منٹ سوچنے کا موقع دیجیے"۔

سب سردار اٹھ کر دوسرے خیمے میں چلے گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ تیمور کا فیصلہ اٹل ہوا کرتا ہے۔ وہ مانیں
دیں یا نہ دیں، اس نے جو طے کر لیا ہے اس سے وہ باز نہیں آئے گا۔

امیر اور سردار اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے، آخر فیصلہ یہی ہوا کہ تیمور کا ساتھ ضرور دیا جائے گا۔ خواہ اس کا
نتیجہ کچھ بھی نکلے۔

جب وہ باہم مشورہ کر کے واپس آئے تو امیر جاکو کے ایک ہاتھ میں کلام اللہ تھا اور دوسرے ہاتھ میں تلوار۔
امیر جاکو نے واضح الفاظ میں کہا:

"اے سردار! ہم نے قرآن حکیم پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی ہے کہ ہم سب آپ کا ساتھ دیں گے اور اگر نافرمانی کریں
تو ہم پر خدا کا عذاب نازل ہو اور اس تلوار سے آپ ہمارے سر قلم کر دیں"۔

تیمور مسکرایا اور اس نے اٹھ کر سب سرداروں کو باری باری گلے لگایا۔ ۔ ۔ ۔ پھر وہ سب سر جوڑ کر بیٹھ
گئے۔ تمام امیر کسی ایسی تدبیر پر غور کر رہے تھے جس کے ذریعے امیر موسیٰ کو قلعے سے باہر نکالا جا سکے۔ تیمور
بڑی خاموشی سے ان کی گفتگو سنتا اور مسکراتا رہا۔

"آپ بھی تو کچھ بولیے سردار"۔ امیر داؤد نے اس سے کہا۔

"بالفرض تم نے امیر موسیٰ کو کسی تدبیر سے قلعے سے باہر نکلنے پر مجبور بھی کر دیا تو اس کے پاس دس ہزار

لشکر ہوگا۔ تم اس کا کیا بگاڑ لو گے"۔ تیمور نے مسکرا کر کہا:

"تمہاری بہادری اپنی جگہ لیکن جنگ کا انجام کسے معلوم ہوتا ہے۔ خدانخواستہ ہمیں شکست ہو گئی تو ہماری یہ
طاقت بھی ختم ہو جائے گی۔ ۔ ۔ ۔ پھر امیر موسیٰ اور امیر حسین دریائے آمو پار کر کے پورے ملک پر قابض ہو
جائیں گے اور ہمیں کہیں پناہ بھی نہ مل سکے گی"۔

تیمور کے جواب سے سب لاجواب ہو گئے۔

جب وقت قلعہ قرشی پر حملے کی تیاری ہو رہی تھی اس وقت امیر حسین اور امیر موسیٰ کے پاس دریائے آمو کے
شمال کا علاقہ تھا اور تیمور دریا کے جنوب میں خیمہ زن تھا۔ امیر حسین باوجود ایک بڑا لشکر رکھنے کے دریا عبور کرتے
ہوئے ڈرتا تھا۔ اس نے امیر موسیٰ کو تاکید کر رکھی تھی کہ وہ قلعہ قرشی پر مدافعتی جنگ لڑے۔ دریا عبور کرنے کی چنداں
ضرورت نہیں۔

تیمور بھی اپنی جگہ محتاط تھا اور دریا عبور کر کے کھلے میدان میں جنگ کرنے سے گریز کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد تیمور پُرخیال انداز میں بولا:

"اگر میں، امیر موسیٰ کو یہ پیغام بھیجوں کہ اس سخت گرمی کے زمانے میں قلعہ بند ہو کر حبس کا شکار ہونا کہاں کی
عقلمندی ہے۔ میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ قلعے سے نکل کر دریا کے کنارے آؤ اور درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں
میں بیٹھ کر بزم عشرت برپا کرو تو کیا امیر موسیٰ قلعہ چھوڑ کر باہر آ جائے گا؟"

جب امیروں اور سرداروں نے یہ سنا تو سب اس کا جواب سوچنے لگے۔ تیمور نے قلعہ قرشی کو موسم سرما کی
ضروریات کو سامنے رکھ کر بنوایا تھا۔ گرمی کے موسم کے لیے یہ قلعہ بالکل موزوں نہ تھا۔ امیر موسیٰ باہر نکلنے کے لیے واقعی
بے چین تھا لیکن ایک طرف امیر حسین کا حکم تھا کہ وہ قلعے سے باہر نہ آئے۔ دوسرے تیمور سے کھلے میدان میں مقابلہ
کرنے کی خود اسے ہمت نہیں پڑتی تھی۔

انہی باتوں کو سوچتے ہوئے امیر داؤد نے کہا:

"گرمی تو اس قیامت کی پڑ رہی ہے کہ امیر موسیٰ آنے کا قصد کرے گا لیکن آئے گا نہیں"۔

تیمور نے یہ بات مذاق میں کہی تھی لیکن مذاق کی اس بات سے اس کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اس کے دل میں ایک
خیال آیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ اور اس کی تصدیق امیر داؤد نے کر دی تھی۔

جس وقت تیمور نے قرشی پر حملے کا ارادہ ظاہر کیا تھا تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بس دو چار روز ہی
میں حملے کے لیے آگے بڑھے گا لیکن پھر اس نے کچھ ایسی خاموشی اختیار کی کہ اس کے سردار اور امیر حملے کی بات ہی
بھول گئے۔ انہیں اطمینان ہو گیا کہ تیمور نے خود ہی اپنا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔

ہفتے ڈیڑھ ہفتے بعد، تیمور اپنے لشکر کو شاہراہِ خراسان پر اس جگہ لے آیا جہاں سے ہرات کو راستہ جاتا تھا۔ اس نے چاہِ اسحاق کے پاس اپنے خیمے نصب کرائے اور قاصد کو تحفے تحائف دے کر والیِ ہرات کے پاس روانہ کیا۔ اب سرداروں کو یقین ہو گیا کہ تیمور قرشی پر حملہ کرنے کی بجائے ہرات کی طرف پسپائی اختیار کرنا چاہتا ہے۔

قاصد کو ہرات بھیجنے کے بعد تیمور نے شمال کی طرف جانے والے قافلوں کو روکنا شروع کر دیا۔ اس نے اعلان کرا دیا کہ فی الحال شمال کا راستہ محفوظ نہیں ہے اس لیے قافلے اس وقت تک یہیں پڑاؤ ڈالیں جب تک محفوظ سفر کی ضمانت حاصل نہیں کر لی جاتی۔ قافلوں والے خوف زدہ ہو گئے اور انہوں نے وہیں پڑاؤ ڈال دیے کر دیے۔

اس طرح ایک ماہ گزر گیا۔

دریا پار قرشی کے دستے محمد بیگ کی سرکردگی میں موجود تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ قافلوں کا آنا بند کر دیا ہے تو انہیں فکر لاحق ہوئی۔ محمد بیگ نے اپنے جاسوسوں کو شمال میں بھیجا۔ جاسوسوں نے آ کر اطلاع دی کہ تیمور نے دریا کے دوسری طرف قافلوں کو روک لیا ہے اور خود چاہِ اسحاق کے قریب خیمہ زن ہے۔

اسی دوران، تیمور کا والیِ ہرات کے پاس بھیجا ہوا پیامبر واپس آ گیا۔ والیِ ہرات نے بھی تیمور کو تحفے بھیجے تھے اور اسے ہرات آنے کی دعوت دی تھی۔ تیمور نے فوراً ہرات جانے کی تیاری شروع کر دی۔

تیمور نے جن قافلوں کو روک رکھا تھا ان کے سالار بہت پریشان تھے۔ وہ اکٹھا ہو کر تیمور کے پاس آئے۔ تیمور نے انہیں بڑی عزت سے بٹھایا اور ان کی تواضع کی۔ وہ ان کے آنے کا مقصد جانتا تھا لیکن اس انتظار میں تھا کہ ان کی طرف سے بات شروع ہو۔

"شہرِ سبز کے سردارِ محترم!"

ایک قافلہ سالار نے بات شروع کی؛

"ہم نے سنا ہے آپ ہرات جانے کی تیاری کر رہے ہیں؟"

"ٹھیک ہی سنا ہے۔" تیمور لاپروائی سے بولا؛

"والیِ ہرات نے ہمیں اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی ہے۔ ہم کچھ عرصے کے لیے اس کے پاس جا رہے ہیں۔"

"پھر ہمارے لیے کیا حکم ہے امیرِ محترم!"

دوسرے قافلہ سالار نے پوچھا؛

"ایک ماہ سے یہاں پڑے پڑے ہم تنگ آ گئے ہیں۔"

"آپ لوگوں کی جو مدد ہو سکتی تھی وہ ہم نے کی۔"

تیمور نے جواب دیا:

"کیا ہم نے آپ کے راشن کی کمی کو پورا نہیں کیا؟ کھانے پانی کی ہم نے آپ لوگوں کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دی۔"

"ہم اس مہربانی کے لیے آپ کے شکر گزار ہیں۔"

کسی اور سالار نے کہا:

"لیکن آپ کے ہرات جانے کے بعد تو ہم بالکل غیر محفوظ ہو جائیں گے۔ آپ ہماری حفاظت کا بھی تو کوئی بندوبست کیجیے۔"

"دیکھیے، یہ تو نا ممکن ہے کہ میں ہرات جانے کا ارادہ ملتوی کر دوں۔ آپ لوگوں کے محفوظ سفر کے لیے میں نے قرشی والوں سے ضمانت طلب کی تھی۔ انہوں نے حفاظت کا وعدہ کر لیا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ آپ لوگوں کے ساتھ اپنے کچھ فوجی دستے بھیجوں گا جو آپ کو قرشی کی سرحد تک پہنچا دیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اب میں خود ہرات جا رہا ہوں اس لیے آپ کی حفاظت کا مزید کوئی بندوبست نہیں کر سکتا۔ آپ لوگ چاہیں تو سفر کر سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ قرشی والے وعدہ کرنے کے بعد کوئی بدعہدی نہیں کریں گے۔"

"تو پھر آپ کی طرف سے ہمیں آگے جانے کی اجازت ہے؟"

"بالکل ۔ ۔ ۔ ۔"

تیمور نے فوراً کہا:

"مجھے افسوس ہے کہ میں اب یہاں اپنا ایک سپاہی بھی نہیں چھوڑ سکتا۔"

دوسرے روز صبح ہی صبح تیمور نے اپنے لشکر کو کوچ کا حکم دے دیا ۔ ۔ ۔ ۔ اور دوپہر سے پہلے پہلے تیمور کا لشکر ہرات کی سڑک پر رواں دواں ہو گیا۔

قافلے والوں نے بھی اپنے خیمے ڈیرے اکھاڑے اور ایک ایک کر کے شمال کی طرف روانہ ہوئے۔ انہوں نے دریا پار کیا اور قرشی کے علاقے میں داخل ہو گئے۔

پورے قرشی میں یہ بات پھیل گئی کہ تیمور والیِ ہرات کے بلاوے پر ہرات چلا گیا ہے۔ یہ خبر اس لیے مصدقہ تھی کہ اس کے راوی آنے والے قافلوں کے لوگ تھے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے تیموری لشکر کو ہرات کی طرف جاتے دیکھا تھا۔

تمام قافلے، محمد بیگ کی چوکی سے کسی پریشانی کے بغیر گزر گئے سوائے اس قافلے کے جس میں نو یہودی

تھی۔ ... پھر جب نوبیہ نے خود کو رضاکارانہ طور پر محمد بیگ کے لشکر کے حوالے کر دیا تو اس کے قافلے کو بھی آگے جانے کی اجازت دے دی گئی۔

○

نوبیہ کو ایک عالی شان آراستہ خیمے میں رکھا گیا تھا۔ اسے اچھے سے اچھا کھانا دیا جاتا۔ اس کے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھا جاتا۔ خدمت کے لیے ایک کنیز دی گئی تھی جو چوبیس گھنٹے اس کی خدمت میں حاضر رہتی اور ہر حکم بے چون و چرا بجا لاتی۔ لیکن وہ نوبیہ سے بہت کم گفتگو کرتی تھی۔ نوبیہ خود بھی اس سے بلا ضرورت بات نہ کرتی تھی۔ اس کے قافلے کو روانہ ہوئے تین دن ہو چکے تھے لیکن ابھی تک اس سے پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔

نوبیہ نے دیکھا کہ کنیز اس سے کچھ کھنچی کھنچی رہتی ہے تو ... ایک دن وہ خود بولی:

"سربالی! کیا تم مجھ سے ڈرتی ہو؟ میں نے محسوس کیا ہے کہ ضرورت کے وقت بھی تم اکثر گفتگو سے گریز کرتی ہو۔"

"محترم خاتون ...!" سربالی نے بڑے مہذب طریقے سے کہا:

"کنیز کا فرض ہے کہ وہ اپنے مالک کے مزاج کے مطابق خدمت انجام دے۔ جب میں نے دیکھا کہ آپ زیادہ گفتگو کرنا پسند نہیں کرتیں تو میں بھی محتاط ہو گئی ورنہ آپ سے بہت سی باتیں پوچھنے کو دل چاہتا ہے۔"

"سربالی ...!"

نوبیہ نے ذرا ڈھیل دی:

"مجھے تمہاری عادتیں بہت پسند ہیں ... چونکہ میری حیثیت یہاں ایک قیدی کی ہے اس لیے میں گفتگو میں احتیاط کرتی ہوں۔ مبادا میرے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو میری قید کی مدت میں اضافہ کر دے۔ میں جلد از جلد اس عذاب سے چھٹکارا پانا چاہتی ہوں۔"

"محترم خاتون ...!"

سربالی نے کچھ کہنا چاہا ... تو نوبیہ نے اسے ٹوک دیا:

"ٹھہرو سربالی ... میرا نام نوبیہ ہے۔ تم مجھے اسی نام سے مخاطب کرو۔"

"نوبیہ خاتون ...!"

سربالی نے اسے نئے انداز سے مخاطب کیا:

"آپ کا یہ خیال درست نہیں کہ مجھے آپ کی جاسوسی پر مقرر کیا گیا ہے۔ میرا کام صرف آپ کی خدمت اور آپ کے حکم کی تعمیل کرنا ہے ... جہاں تک آپ کی قید کا تعلق ہے تو یہ قید نہیں ہے اور نہ کوئی اس کی مدت مقرر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک آپ سے کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوئی اور نہ آئندہ ہونے کا امکان ہے۔ آپ کو تو بس آپ کے قافلے سے جدا کرنا مقصود تھا۔ یہ کام ذرا مشکل تھا لیکن آپ کی رضاکارانہ سپردگی نے اسے آسان بنا دیا۔ اب تو نوجوان محمد بیگ اس بات کے منتظر ہیں کہ آپ اس تنہائی سے گھبرا کر کب ان کی رفاقت قبول کرتی ہیں۔"

"لیکن یہ نہیں ہو سکتا سربالی!"

نوبیہ کو طیش آ گیا:

"تمہارے سردار نے میرے متعلق غلط اندازہ لگایا ہے۔ میں قید میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گی لیکن ...!"

"نوبیہ خاتون ...!"

سربالی نے بزرگانہ انداز اختیار کیا:

"غصہ انسان کی عقل پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ آج آپ نے محبت سے مخاطب کیا تو میں وہ باتیں کہہ گئی جو مجھے نہیں کہنا چاہیے تھیں۔ میں محمد بیگ کی با اعتماد کنیز ہوں۔ اس بات کا آپ کو بھی علم ہے۔ ظاہر ہے آپ میری کسی بات کا اعتبار نہیں کریں گی اور نہ ہی میرے کسی مشورے پر کان دھریں گی۔"

"نہیں سربالی! مجھے تمہاری باتوں سے اپنائیت اور خلوص کی خوشبو آتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم میرے دشمن کی با اعتماد کنیز ہو لیکن تم جو بات کہو گی میں اس پر ٹھنڈے دل سے غور کروں گی اور اگر میرے دل کو لگی تو اس پر عمل بھی کروں گی۔"

"اگر یہ بات ہے نوبیہ خاتون اور آپ کو یقین ہے کہ میں آپ کی ہمدرد ہوں تو آپ کو اس کا ثبوت دینا ہو گا تاکہ میں آپ سے صاف بات کر سکوں اور کوئی بہتر راہ پیدا کرنے کی کوشش کروں۔"

"کس قسم کا ثبوت چاہیے تمہیں؟"

نوبیہ الجھتے ہوئے بولی:

"بس میرا دل کہتا ہے کہ تم میری ہمدرد ہو اور مجھے تمہاری ذات سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔"

"نوبیہ خاتون ...!"

سربالی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں:

"آپ اس کا ثبوت یوں دے سکتی ہیں۔۔۔۔ آپ میرے سامنے اعتراف کریں کہ آپ تاتاریوں کے برلاس قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں۔"

"مہربانی۔۔۔۔!"

نوبیہ کا منہ حیرت سے کھل گیا:

"کیا کہہ رہی ہو تم! مجھ سے اعتراف کرا کے مجھے سزا دلوانا چاہتی ہو! میں تمہارے سردار محمد بیگ کو بتا چکی ہوں کہ برلاس قبیلے سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ افسوس! میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی۔"

"میں جانتی تھی آپ یہی کہیں گی!"

مہربانی نے اطمینان سے کہا:

"لیکن یقین کیجیے جب تک آپ برلاس ہونے کا اقرار نہیں کریں گی میں اور میرے ساتھی آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔"

"ایک طرف تو تم میری محبت کا دم بھرتی ہو مہربانی۔ اور دوسری طرف مجھے برلاس ثابت کر کے قتل کرانا چاہتی ہو! کیا یہ غلط ہے کہ محمد بیگ اور اس کے باپ امیر موسیٰ نے اپنے لشکر کے تمام برلاس سپاہیوں کو قتل کرا دیا ہے! انہیں قید میں ڈال رکھا ہے۔"

"یہ بالکل درست ہے نوبیہ خاتون! سردار محمد بیگ اور امیر موسیٰ کے خیال میں اس وقت قرشی اور اس کے نواح میں برلاس قبیلے کا ایک شخص بھی موجود نہیں۔۔۔۔ لیکن یہ غلط ہے۔"

"غلط ہے۔۔۔۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟" نوبیہ نے چونک کر سوال کیا۔

"مجھے اور میرے شوہر کو یقین ہے نوبیہ خاتون کہ آپ برلاس ہیں اور آپ کا یہ نام بھی اصلی نہیں۔" نوبیہ کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ مہربانی نے بالکل صحیح اندازہ لگایا تھا۔ نوبیہ اس کا نام تھا جو اس نے قافلے والوں میں مشہور کرا دیا تھا۔

"تم چاہتی ہو مہربانی! کہ میں برلاس ہونے کا اقبال کروں تب تم میری مدد کرو گی؟"

نوبیہ قدرے توقف سے بولی:

"لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ آخر تم برلاس قبیلے کی ایک عورت کی مدد کیوں کرنا چاہتی ہو!"

"اس لیے کہ۔۔۔۔!"

مہربانی ادھر ادھر دیکھ کر آہستہ سے بولی:

"میں خود برلاس ہوں۔"

نوبیہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ دونوں چند لمحوں تک ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں پھر نوبیہ نے آہستہ سے کہا:

"میری بزرگ بہن! جب تم دشمنوں میں رہ کر خود کو برلاس کہنے میں فخر محسوس کرتی ہو تو میں تم سے کس طرح جھوٹ بول سکتی ہوں۔ میں بھی برلاس ہوں۔"

نوبیہ اپنی جگہ سے اٹھی اور مہربانی کو گلے لگا لیا۔

مہربانی کی ہم جلیسی نے نوبیہ کی قید تنہائی کی کوفت ختم کر دی۔ اب وہ دونوں دن بھر مستقبل کے بارے میں گفتگو کرتی رہتیں۔ نوبیہ نے مہربانی کو اپنا ہمراز بنا لیا تھا۔

مہربانی نے نوبیہ کے شوہر خمید کی تلاش میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا مگر اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ مہربانی کا شوہر قرشی کے قلعے میں ملازم تھا۔ مہربانی نے خمید کو وہاں بھی تلاش کرایا لیکن وہاں بھی خمید نام کا کوئی آدمی موجود نہ تھا۔

نوبیہ کو اپنے شوہر کا کوئی اتہ پتہ نہ مل سکا تو وہ بہت اداس ہو گئی۔ اس نے خود کو گرفتار ہی اس وجہ سے کرایا تھا کہ قرشی میں ٹھہر کر خمید کو تلاش کر سکے گی لیکن اب وہ خمید کو کہاں ڈھونڈے!

چنانچہ اب نوبیہ کو واپسی کی فکر ہوئی۔ مہربانی کا شوہر ہر ہفتے اس سے ملنے قرشی کے قلعے سے آیا کرتا تھا۔ اس دفعہ آیا تو اس نے ایک ہولناک وحشت ناک خبر سنائی۔

"مہربانی۔۔۔۔!"

اس نے آہستہ سے کہا:

"برلاس لڑکی کی گرفتاری کی خبر امیر موسیٰ کو ہو چکی ہے۔ انہیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ لڑکی بہت خوبصورت ہے۔۔۔۔ اور محمد بیگ نے اسے اپنے لشکر میں چھپا رکھا ہے۔"

مہربانی نے گھبرا کر خیمے کی طرف دیکھا۔ نوبیہ پردے سے لگی کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ مہربانی کچھ سوچ کر بولی:

"تمہارا کیا خیال ہے نوبیہ خاتون اس جگہ زیادہ محفوظ ہیں یا قرشی کے قلعے میں محفوظ رہیں گی؟ دونوں جگہ بھیڑیے ہیں۔"

مہربانی کے شوہر نے کہا:

"اگر محمد بیگ کو امیر موسیٰ کا ڈر نہ ہوتا تو معلوم نہیں اب تک اس معصوم پر کیا گزر چکی ہوتی۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ نوبیہ فی الحال اس جگہ زیادہ محفوظ ہے کیونکہ جب تک محمد بیگ پر امیر موسیٰ کا خوف غالب رہے گا وہ نوبیہ کی

طرف ہاتھ نہیں بڑھائے گا۔ . . . لیکن اگر یہ گرفتار کر کے قلعے میں پہنچا دی گئی تو پھر سوائے خدا کے اس کا اور کوئی محافظ نہ ہو گا۔"

"نوبیہ خاتون کی حفاظت کی ذمہ داری اب ہم پر ہے۔ انہیں ان ظالموں کے ہاتھوں سے کسی نہ کسی طرح بچانا ہے۔ کیا نوبیہ خاتون کو دریا پار نہیں پہنچایا جا سکتا؟"

"یہ بالکل ناممکن ہے سربالی!"

اس کے شوہر نے کہا:

"اب تک برلاس قبیلے کے تقریباً پچاس افراد، دریا پار کرنے کی کوشش میں جان گنوا بیٹھے ہیں۔ امیر موسیٰ کے ظالم رسالدار دہف کو تو جانتی ہی ہو۔ امیر موسیٰ نے اسے حکم دے رکھا ہے کہ وہ برلاس قبیلے والوں کے جتنے سر پیش کرے گا اسے اتنے ہزار انعام دیا جائے گا۔ سردار دہف ہر روز ایک دو سر پیش کر کے انعام حاصل کرتا ہے۔ قرشی کے چپے چپے پر پہرہ لگا ہوا ہے۔ اس وقت فرار کے بارے میں سوچنا بھی غلطی ہے!"

"پھر تمہارا کیا خیال ہے، نوبیہ خاتون کی حفاظت تو بہرحال کرنی ہے"۔

"میں نے کہا تو ہے کہ نوبیہ خاتون یہاں زیادہ محفوظ ہیں"۔

"تمہیں چاہیے کہ محمد بیگ تک یہ خبر پہنچا دو کہ امیر موسیٰ، برلاس لڑکی کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے پھر دیکھو. . . . اس سلسلے میں وہ کیا فیصلہ کرتا ہے!"

سربالی اور نوبیہ دونوں ہی پریشان ہو گئی تھیں۔

نوبیہ کو اب تک تو محمد بیگ کی فکر تھی لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ امیر موسیٰ اس سے بھی بڑا بھوکا بھیڑیا ہے تو وہ گھبرا گئی۔

محمد بیگ نے اسے اب تک اس لیے نہیں چھیڑا تھا کہ وہ اپنے باپ امیر موسیٰ کی طرف سے اطمینان کرنا چاہتا تھا۔ اس نے نوبیہ کی گرفتاری کی خبر کو امیر موسیٰ سے پوشیدہ رکھا تھا. . . . لیکن امیر موسیٰ کے جاسوس محمد بیگ کے لشکر میں موجود تھے۔ انہوں نے نوبیہ کی گرفتاری کی خبر کو نمک مرچ لگا کر امیر موسیٰ تک پہنچا دیا۔ ساتھ ہی نوبیہ کے حسن و جمال کی تعریف بھی کی گئی جس نے امیر موسیٰ جیسے عیاش طبع شخص کو بے چین کر دیا لیکن مسئلہ باپ بیٹے کا تھا اس لیے امیر موسیٰ بھی سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہتا تھا۔ وہ کوئی ایسی چال چلنا چاہتا تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ محمد بیگ بہرحال اس کا بیٹا تھا اور قرشی کے مضافات اس کے قبضے میں تھے۔

محمد بیگ اور امیر موسیٰ کی اس کشمکش اور احتیاط نے نوبیہ کو کئی ہفتوں تک ان دونوں موذیوں سے محفوظ رکھا۔ پھر جب امیر موسیٰ کو قلعہ قرشی میں یہ اطلاع ملی کہ سردار تیمور اپنے لشکر کے ساتھ ہرات کی طرف چلا گیا ہے اور

اب جنوب کی طرف سے اسے کسی قسم کا خطرہ نہیں تو اس کی بری فطرت عود کر آئی۔ امیر موسیٰ گرمی کی وجہ سے سخت پریشان تھا لیکن اب تک دریائے آمو کے جنوب میں سردار تیمور کی وجہ سے سخت تکلیفیں برداشت کر رہا تھا۔ تیمور کی واپسی نے اس کی امنگوں کو پھر مہمیز دی اور وہ رنگین محفلیں سجانے کے بارے میں فکر کرنے لگا۔ اور دریائے آمو کے کنارے سایہ دار درخت اور سرسبز و شاداب مرغزار اس کی آنکھوں میں لہرانے لگے۔ گزشتہ کئی ماہ سے وہ قلعے میں قید ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے فوراً فیصلہ کیا کہ قلعے سے نکل کر دریا کے کنارے چلا جائے اور وہاں سبزہ زار پر بزم انبساط برپا رہے۔ شراب ناب کے علاوہ امیر موسیٰ کو رقص و موسیقی کا بھی شوق تھا۔ اس طرح وہ رزم و بزم، دونوں کا بادشاہ تھا۔ اس کی بہادری بے مثل تھی تو عیاشی کا بھی جواب نہ تھا۔ اس نے فوراً لشکر کو بیرون قلعہ منتقل ہونے کا حکم دے دیا۔

امیر موسیٰ کے محافظ دستے کا رسالدار بڑا خودسر اور بددماغ نوجوان تھا۔ اس کے ظلم و ستم کے قصے پورے قرشی میں مشہور تھے۔ برلاس قبیلے کا تو وہ جانی دشمن تھا۔ امیر موسیٰ اسے بہت پسند کرتا تھا اور اپنے تمام اہم کام اسی کے سپرد کرتا تھا۔ قلعے سے دریا کے کنارے منتقلی بھی اسی کے حوالے کی گئی۔

یہ سلسلہ ابھی شروع ہی ہوا تھا کہ برلاس لڑکی کا مسئلہ درمیان میں آ گیا۔ امیر موسیٰ، لڑکی کے جمال کا حال سن کر بے چین ہو گیا۔ اس نے رسالدار دہف کو حکم دیا کہ برلاس لڑکی کو محمد بیگ کے پنجے سے چھڑا کر دریا کے کنارے پہنچایا جائے تاکہ وہ اپنی محفلوں کو اس کے چہرے سے اور زیادہ تابندہ کر سکے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے رسالدار کو تاکید کر دی کہ برلاس لڑکی کو اس طرح حاصل کیا جائے کہ محمد بیگ سے جھگڑا نہ ہو۔

ادھر سربالی نے امیر موسیٰ کے ارادے سے واقف ہوتے ہی فوراً محمد بیگ کو باخبر کر دیا۔ محمد بیگ کو پہلے تو باپ پر بہت غصہ آیا اور اس نے بغاوت کرنے کا ارادہ کیا لیکن پھر کچھ سوچ کر مصلحت کا راستہ اختیار کیا۔ اس نے بڑی خاموشی سے نوبیہ کو سربالی کے خیمے میں منتقل کر دیا اور خود نوبیہ کے خیمے میں آ گیا۔

محمد بیگ نے سربالی کو تاکید کر دی کہ وہ نوبیہ کو دوسروں کی نظروں سے پوشیدہ رکھے۔ سربالی تو خود نوبیہ کی حفاظت کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے خیمے میں نوبیہ کی رہائش کا اس طرح انتظام کیا کہ اگر باہر سے کوئی آدمی اچانک اس کے خیمے میں آ بھی جائے تو اسے نوبیہ نظر نہ آ سکے۔

ان تمام احتیاطی تدبیروں کے باوجود محمد بیگ کو دھڑکا لگا رہتا تھا۔ وہ اپنے باپ سے زیادہ رسالدار دہف سے خوفزدہ تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ نوبیہ کی بازیابی کا کام دہف ہی کے سپرد کیا جائے گا اور وہ نوبیہ کو ڈھونڈنے کے لیے ہر طرح کے حربے استعمال کرے گا۔

آخر جس بات کا ڈر تھا وہ محمد بیگ کے سامنے آ ہی گئی۔

ابھی سورج بھی نہ نکلا تھا اور ہر طرف تیرگی کا دھندلکا پھیلا ہوا تھا کہ محمد بیگ کو گھوڑے کے دوڑنے کی آواز آئی۔ چونکہ اس کے دل میں خوف بیٹھا ہوا تھا اس لیے بستر سے اتر کر خیمے کے دروازے پر پہنچا۔ اس نے ذرا سا پردہ ہٹا کر دیکھا تو خوف کی ایک لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی ۔ ۔ ۔ ۔ رسالدار دہیف کے سوار اس کے خیمے کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے رہے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ اور دہیف انہیں آہستہ آہستہ ہدایات دے رہا تھا۔

محمد بیگ کو تعجب اس بات پر تھا کہ اس کے جاسوس یہاں سے قلعہ قرشی تک پھیلے ہوئے تھے۔ پھر انہوں نے وہ کون سا راستہ اختیار کیا تھا کہ وہ قلعے سے یہاں تک آتے ہوئے کوئی نہ دیکھ سکا۔

خیمے کو پوری طرح گھیرنے کے بعد رسالدار دہیف نے اپنا گھوڑا خیمے کے دروازے کی طرف بڑھایا تو محمد بیگ واپس جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ وہ اپنے آپ کو سوتا ہوا ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ خیمے کا پہرے دار، رسالدار دہیف کو دیکھ کر کانپ رہا تھا۔

"خیمے کے اندر کون ہے؟" دہیف نے گرج کر پہرے دار سے پوچھا۔

پہرے دار پہلے تو گھبرا کر تعظیم کے لیے جھکا۔ پھر مردہ آواز میں بولا:

"اندر چھوٹے امیر محمد بیگ آرام کر رہے ہیں۔"

"چھوٹے امیر ۔ ۔ ۔ ۔!"

رسالدار دہیف کا منہ حیرت سے کھل گیا:

"چھوٹے امیر ۔ ۔ ۔ اور اس خیمے میں؟"

محمد بیگ بستر پر پڑا ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ اسے اندیشہ ہوا کہ پہرے دار کوئی ایسی بات نہ کہہ دے جو اس کے خلاف جاتی ہو۔ اس لیے فوراً اونچی آواز میں لیٹے لیٹے بولا:

"یہ صبح صبح کون ہمیں پریشان کرنے آیا ہے؟"

پہرے دار نے جواب دینے کے بجائے رسالدار دہیف کی طرف دیکھا۔ رسالدار نے اسے اشارہ کیا کہ اندر جا کر خبر کرے۔ پہرے دار گھبرایا ہوا خیمے کا پردہ اٹھا کر اندر چلا گیا۔

رسالدار دہیف کچھ پریشان سا ہو گیا۔ وہ بار بار خیمے اس کے جائے وقوع اور تنہائی پر غور کرتا اور پھر سوچ میں پڑ جاتا۔ شاید وہ غلط خیمے پر آ گیا ہے؟ یا پھر نشاندہی کرنے والے نے اسے غلط بتایا ہے۔ اتنے میں پہرے دار باہر آ گیا۔

"چھوٹے امیر اندر آپ کو یاد کر رہے ہیں۔"

"اندر اور کون ہے پہرے دار؟" دہیف نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"اور کوئی نہیں ہے رسالدار صاحب!"

رسالدار نے پہرے دار کو تیز نظروں سے گھورا:

"اگر تم جھوٹ بول رہے ہو تو چھوٹے امیر بھی تمہیں میرے عتاب سے نہ بچا سکیں گے۔"

"میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں رسالدار صاحب۔" پہرے دار نے دروازے سے ایک طرف ہوتے ہوئے جواب میں کہا۔

رسالدار دہیف نے خیمے کے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ اس کے سوار پوری طرح خیمے کو گھیرے ہوئے تھے۔ اور کسی کے چھپ کر نکل جانے کا کوئی امکان نہ تھا۔

دہیف گھوڑے سے اترا۔ پہرے دار نے اس کے اشارے پر خیمے کا پردہ الٹ دیا۔ اندر سامنے ہی محمد بیگ بستر پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

رسالدار دہیف نے اندر داخل ہو کر محمد بیگ کو سلام کیا۔

محمد بیگ نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے مسکرا کر پوچھا:

"دہیف! خیریت تو ہے۔ کیسے آنا ہوا؟ قلعے میں تو سب خیر ہے؟"

محمد بیگ نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بے تکلفی سے باتیں کرتے ہوئے دہیف کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب ہی بستر پر بٹھا لیا۔

دہیف کی نظریں تیزی سے خیمے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اسے بظاہر کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی جہاں کسی کو فوری طور پر چھپایا جا سکے۔

خیمے کے اندر مخمل کا فرش تھا اور اسی فرش پر ایک طرف محمد بیگ کا بستر لگا ہوا تھا۔ سرہانے ایک گاؤ تکیہ رکھا تھا۔ بستر کے ایک طرف تپائی پر جام دھرا رکھا تھا۔ اپنے باپ کی طرح محمد بیگ بھی بلانوش تھا۔

"دہیف! تم نے کچھ بتایا نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بابا جان کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ بڑے سردار امیر حسین کی طرف سے تو کوئی اطلاع نہیں آئی؟"

دہیف عجیب کشمکش میں تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ خیمے کی تلاشی لینا بھی بیکار تھا۔ سب سے زیادہ محمد بیگ کا اطمینان اور سکون تھا جس نے دہیف جیسے چالاک شخص کو حیران کر دیا تھا۔

"امیر محمد بیگ!"

دہیف نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا:

"آپ کو اس خیمے میں دیکھ کر مجھے تعجب ہوا ہے؟"

"تعجب۔۔۔۔!"

محمد بیگ نے حیرانی کا اظہار کیا:

"دن کے وقت میں سرحد پر گشت کرتا ہوں لیکن رات ہمیشہ اپنے خیمے ہی میں گزارتا ہوں۔ اس میں ڈ
کی کیا بات ہے!"

رسالدار دحیف نے محمد بیگ کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ ایک بار پھر۔۔۔۔ خیمے کا جائزہ لینے
اس جگہ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے جہاں براس لڑکی کو چھپایا جا سکتا تھا۔ جب وہ ناکام ہو گیا تو تند
سخت لہجے میں بولا:

"امیر محمد بیگ! کیا میں اس خیمے کی تلاشی لے سکتا ہوں؟"

"تلاشی۔۔۔۔ اور میرے خیمے کی۔۔۔۔ تم ہوش میں تو ہو؟"

محمد بیگ کو غصہ آ گیا:

"رسالدار دحیف! یہ میری توہین ہے۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ قرشی قلعے کے باہر کا تمام علاقہ
عملداری میں ہے۔ میں اس میں کسی کی دخل اندازی برداشت نہیں کر سکتا۔"

"یہ دخل اندازی نہیں۔ حاکمِ قرشی امیر موسیٰ کا حکم ہے۔"

دحیف نے بڑے رعب سے کہا:

"میں تعمیلِ حکم کے لیے مجبور ہوں۔"

"کیا ابا جان نے تلاشی کا حکم دیا ہے؟ لیکن کیوں؟۔۔۔۔ انہوں نے یہ حکم کیوں دیا ہے؟" محمد
نے جرح کا انداز اختیار کیا۔

"میں اپنے امیر کے کسی حکم کی تشریح کرنے یا اس کی وجہ بیان کرنے سے معذور ہوں۔"

رسالدار دحیف نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا:

"خیمے کو چاروں طرف سے میرے سواروں نے گھیر رکھا ہے۔ مجھے آپ کے وقار کا پاس ہے۔ مجھے تلا
اجازت دی جائے ورنہ۔۔۔۔"

"ٹھہرو دحیف!"

محمد بیگ نے اسے بیچ ہی میں ٹوک دیا:

"میں اپنے سر سرکشی کا الزام نہیں لینا چاہتا۔ تم اپنے آدمیوں کو اندر بلا لو۔ وہ تلاشی لے سکتے
میری طرف سے اجازت ہے!"

"میں شکریہ ادا کرتا ہوں چھوٹے امیر!"

رسالدار دحیف نے سر کو ذرا سا خم دیا:

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر کسی وقت آپ کی وفاداری پر شبہ کیا گیا تو میں، آپ کی طرف سے بطور گواہ پیش ہوں گا۔ چونکہ مجھے آپ کی عزت و وقار کا بھی خیال ہے اس لیے میں اپنے کسی آدمی کو اندر نہیں بلاؤں گا بلکہ اپنے طور پر مطمئن ہونے کی کوشش کروں گا۔"

"مجھے خوشی ہوئی کہ تم امیر کے حکم کی تعمیل کے موقعے پر بھی دوسرے کے وقار کو پیشِ نظر رکھتے ہو۔"

رسالدار دحیف محمد بیگ کے ساتھ ساتھ خیمے میں ٹہلتا اور قدم قدم رک کر قالین اور خیمے کے پردوں کو دیکھتا رہا۔

خیمے کے پردے اکہرے تھے اور خیمے میں کوئی صندوق یا بھاری چیز نہ تھی۔ دحیف کو یقین ہو گیا کہ کبھی براس عورت کی گرفتاری محض ایک افسانہ تھی یا پھر مخبروں نے غلط خیمے کی نشاندہی کی ہے۔ دحیف پوری طرح سے اطمینان کر لینے کے بعد محمد بیگ کے بستر پر آ کر بیٹھ گیا۔

"چھوٹے امیر!"

اس نے مجبور ہو کر باتوں کا سہارا لیا:

"سنا ہے کہ دریائے آمو کی طرف سے آنے والے قافلوں میں سردار تیمور کے کچھ جاسوس تھے جنہیں آپ نے تحقیقات کے لیے گرفتار کیا تھا؟"

"تم نے صحیح سنا ہے دحیف!"

محمد بیگ فوراً بولا:

"جس طرح ہمارے جاسوس جنوب میں جا کر تیمور کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں، اسی طرح دشمن بھی اپنے جاسوسوں کو قرشی بھیجتا رہتا ہے۔ ان پر ہمارے آدمی کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔ اگر ہمیں کسی پر شبہ ہوتا ہے ہم اسے تحقیقات کے لیے روک لیتے ہیں اور اطمینان ہو جانے پر رہا کر دیتے ہیں۔ اس طرح کئی آدمی گرفتار ہوئے لیکن بعد میں چھوڑ دیے گئے۔"

"اس دوران میں کیا کوئی عورت بھی گرفتار ہوئی تھی جس پر براس ہونے کا شبہ کیا گیا تھا؟" دحیف نے محمد بیگ کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ ہمارے آدمیوں نے ایک عورت کی حرکات و سکنات پر شبہ کیا تھا۔" محمد بیگ لاپروائی سے بولا۔
"وہ سالارِ قافلہ کو اپنا عزیز بتاتی تھی اور اسی کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔"

"وہ عورت اس وقت کہاں ہے؟"

رسالدار دہف نے بڑے رعب سے پوچھا:

"اس کے بارے میں امیر موسیٰ کو بھی اطلاع دی گئی ہے۔ انہیں بتایا گیا ہے کہ وہ برلاس قبیلہ سے متعلق ہے اور بہت خطرناک ہے۔ امیر موسیٰ اس سے خود پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہیں۔"

"مجھے افسوس ہے دہف!"

محمد بیگ نے نہایت اطمینان سے کہا:

"اس عورت کو دو دن بعد اس کے قافلے میں جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ وہ اپنے گم شدہ کی تلاش میں تاشقند جانا چاہتی تھی۔ ایک قافلہ اس طرف جا رہا تھا۔ ہم نے اسے اس قافلے کے ساتھ روانہ کر دیا۔"

محمد بیگ کے اس جواب سے رسالدار دہف کا چہرہ نہ جانے کیوں پھیکا پڑ گیا۔ وہ کچھ دیر سر جھکا کر کچھ سوچتا رہا۔ پھر بولا:

"کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ اس وقت قرشی کے گرد و نواح میں موجود نہیں ہے؟"

"یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے دہف! اسے گئے ہوئے دو ہفتے سے بھی زیادہ ہو گئے۔ ہاں اگر محض سے ابا جان کا یہ خیال ہے کہ میں نے اسے کہیں چھپا رکھا ہے تو میں اس کی سختی سے تردید کرتا ہوں۔ رسالدار دہف....! تمہاری وفاداری شک و شبے سے بالاتر ہے۔ میں چاہتا ہوں تم مجھے ان لوگوں سے باخبر رکھو جو اس قسم کی اطلاعات پہنچا کر میرے اور ابا جان کے درمیان اختلاف پیدا کرنا چاہتے ہیں۔"

"آپ مطمئن رہیے چھوٹے امیر!"

دہف نے کہا:

"آپ میرے امیر کے بیٹے ہیں۔ میں آپ کے مفاد کو کبھی نقصان نہیں پہنچنے دوں گا۔ بشرطیکہ آپ اعتماد کریں۔ جب تک میری شخصیت آپ کی نظروں میں مشکوک ہے میں آپ کے لیے کوئی کارنامہ سرانجام دے سکوں گا؟"

"ہمیں تم پر پورا اعتماد ہے دہف!"

محمد بیگ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا:

"آؤ ہم مصافحہ کر کے اس اعتماد کی تجدید کریں۔"

دہف نے بھی بے تکلفی سے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔

رسالدار دہف نے امیر موسیٰ کو یقین دلا دیا کہ برلاس لڑکی کی محمد بیگ کی قید میں ہونے کی خبر غلط ہے۔ دہف نے امیر موسیٰ کو وہی کچھ بتایا جو محمد بیگ نے اس سے کہا تھا۔

امیر موسیٰ کو دہف پر پورا اعتماد تھا اس لیے اسے اس کی بات پر یقین کرنا پڑا.... مگر عجیب بات یہ تھی کہ امیر موسیٰ کو یقین دلانے کے باوجود دہف خود مطمئن نہ تھا۔ اس کے دل کے کسی گوشے سے آواز آتی تھی کہ محمد بیگ نے اسے فریب دیا ہے.... وہ برلاس لڑکی اب تک اس کی قید میں ہے۔

دہف نے اس سلسلے میں ان لوگوں سے معلومات حاصل کیں جن کے ذریعے خبر امیر موسیٰ تک پہنچی تھی۔ وہ امیر موسیٰ کے دو خاص غلام تھے جو محمد بیگ کے لشکر کے ساتھ رہ کر امیر موسیٰ کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دیتے تھے۔

امیر موسیٰ کے یہ جاسوس باری باری، ایک ایک دن قلعے میں آتے اور محمد بیگ کی خبریں پہنچا کر چلے جاتے ... ان کے معمول کا علم تھا۔ چنانچہ ایک دن جب ایک غلام قلعے میں آیا تو دہف نے اسے صدر دروازے کے ... ہی روک لیا۔ اور اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

غلام، رسالدار دہف کے مرتبے اور اس کے اثر و رسوخ سے واقف تھا اس لیے بے جھجک اس کے ساتھ ہو لیا۔

اپنی جائے قیام پر پہنچ کر دہف نے اسے اپنے سامنے بٹھا لیا اور بڑے رعب سے پوچھا:

"تمہیں معلوم ہے میں تمہیں اپنے ساتھ کیوں لایا ہوں؟"

"نہیں رسالدار! مجھے کچھ معلوم نہیں۔" غلام نے گھبرا کر کہا۔

"اگر میں یہ کہوں کہ میں تمہیں قتل کر دوں گا تو کیا تم یقین کر لو گے؟" یہ کہتے ہوئے دہف نے اپنی تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ لیا۔

غلام کا رنگ خوف سے سفید پڑ گیا۔

"آپ قتل کر سکتے ہیں رسالدار۔ مجھے یقین ہے۔"

"لیکن میں تمہیں قتل نہیں کروں گا کیونکہ تم میرے امیر کے وفادار جاسوس ہو۔"

غلام کی جان میں جان آئی۔ اس نے شکر گزار نظروں سے رسالدار کی طرف دیکھا۔

"میں تمہیں تمہارے کام سے نہیں روکوں گا۔"

رسالدار دہف نے کہا:

"تم بدستور محمد بیگ کے لشکر میں رہو گے اور وہاں کی خبریں امیر موسیٰ کو پہنچاتے رہو گے لیکن تمہیں اس کے علاوہ ایک اور کام بھی کرنا ہوگا۔ بتاؤ کیا تم وہ کام کرو گے؟"

"کیوں نہیں رسالدار۔ آپ کے حکم سے تو میں انکار کر ہی نہیں سکتا۔"

"میں تمہارے سپرد بہت معمولی کام کر رہا ہوں۔"

دہف نے کہا:

"تمہیں شاید علم نہیں کہ قرشی پر جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ ان حالات میں قرشی کے گرد و نواح میں کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے۔"

"مگر مجھے کیا کرنا ہوگا رسالدار صاحب؟" غلام نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہے ایک برلاس لڑکی کی وجہ سے امیر موسیٰ اور محمد بیگ میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ لڑکی کی بازیابی میرے سپرد کی گئی لیکن جب میں اس نشان زدہ خیمے پر پہنچا تو وہاں لڑکی کے بجائے محمد بیگ موجود تھا۔ ۔ ۔ ۔ ظاہر ہے کہ اطلاع غلط تھی ورنہ وہاں محمد بیگ کے بجائے لڑکی کو ہونا چاہیے تھا۔ محمد بیگ نے بتایا کہ تفتیش کے بعد لڑکی کو اس کے قافلے کی طرف بھیج دیا گیا تھا لہٰذا میں نہیں چاہتا کہ اس قسم کی جھوٹی خبریں امیر موسیٰ کو پہنچائی جائیں جن سے باپ بیٹے میں اختلاف پیدا ہونے کا امکان ہو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ خبر تم نے یا تمہارے ساتھی نے پہنچائی ہے۔ اب اس چیز سے بحث نہیں لیکن آئندہ ایسی بات نہیں ہونی چاہیے۔"

"رسالدار صاحب!"

غلام نے سنبھلتے ہوئے کہا:

"آپ مجھے قتل کر دیجیے مگر یہ الزام نہ لگائیے کہ میں نے جھوٹی خبر پہنچا کر باپ بیٹے میں لڑائی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ برلاس لڑکی اس خیمے میں پندرہ دن تک رہی تھی جس پر آپ نے چھاپہ مارا۔"

"مگر محمد بیگ کا بیان ہے کہ لڑکی کو میرے چھاپہ مارنے سے دو ہفتے پہلے ہی رہا کر دیا گیا تھا۔ [illegible] ہے محمد بیگ نے مجھ سے غلط بیانی کی!"

"صد فی صد غلط بیانی رسالدار صاحب!"

غلام جوش سے بولا:

"آپ کے چھاپے سے صرف تین دن پہلے تک لڑکی اس خیمے میں موجود تھی۔ ہو سکتا ہے محمد بیگ کو [illegible] چھاپہ مارنے کا علم ہو گیا ہو اور اس نے لڑکی کو کہیں چھپا دیا ہو۔"

یہی شبہ رسالدار دہف کے دل میں موجود تھا:

"اس کا مطلب ہے کہ وہ لڑکی اب بھی محمد بیگ کے لشکر میں موجود ہے۔"

"جی ہاں۔ ۔ ۔ ۔"

غلام نے بڑے وثوق سے کہا:

"ہم اس لڑکی کو تلاش کر رہے ہیں اور جیسے ہی ہمیں اس کا علم ہوا ہم اس کی خبر امیر موسیٰ تک پہنچا دیں گے تاکہ ہمارا سچ ثابت ہو سکے۔"

"نہیں۔ اب تم ایسا نہیں کرو گے۔"

دہف نے سخت لہجے میں کہا:

"اگر تم لڑکی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے تو اس کی اطلاع امیر موسیٰ کی بجائے ہمیں پہنچانا ہوگی۔ تم نہیں جانتے، اگر اب برلاس لڑکی کی محمد بیگ کے کیمپ میں موجودگی کی تصدیق ہو گئی تو باپ بیٹے میں جنگ شروع ہو جائے گی اور اس کا فائدہ ہمارے دشمنوں کو پہنچے گا۔ شاید میری بات تمہاری سمجھ میں آ گئی ہو گی۔"

"جی ہاں رسالدار صاحب۔" غلام نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اور یہ خیال رہے کہ میں اس برلاس لڑکی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تم جس وقت اس کی نشاندہی کرو گے میں اسی وقت اسے گرفتار کر کے کسی ایسی جگہ لے جا کر قتل کروں گا کہ اس کی لاش کا بھی پتہ نہ چلے۔ یہ جھگڑا صرف اسی صورت میں ختم ہو سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے رسالدار صاحب! کیا اب میں۔ ۔ ۔ ؟"

"ہاں، اب تم جا سکتے ہو مگر خبردار! امیر موسیٰ سے اس لڑکی کے بارے میں کوئی گفتگو نہ کرنا ورنہ۔ ۔ ۔ ۔" دہف نے ایک بار پھر تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھا۔

غلام نے جلدی سے اٹھ کر اسے سلام کیا اور پھر سر جھکا کر رخصت ہو گیا۔

○

امیر موسیٰ نے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ قرشی کے قلعے سے نکل کر دریائے آمو کے کنارے مرغزاروں

میں ڈیرے ڈال دیے ..... اور مطابق روایات دہرانا شروع کر دیں۔

موسیٰ نے اپنے بیٹے محمد بیگ کو قلعے میں واپس جانے کا حکم دیا۔ قلعے کی حفاظت کے لیے کچھ دستے بھی دیے گئے۔ باقی تمام لشکر امیر موسیٰ کی دیہاتی لشکرگاہ پر پہنچ گیا ..... چونکہ ایک عرصے سے اس کا لشکر صعوبتیں برداشت کر رہا تھا اس لیے امیر موسیٰ نے جشنِ عام منانے کا حکم دے دیا اور لشکری اپنے گرد و پیش کی دنیا سے بے خبر ہو کر نا و نوش میں معروف ہو گیا۔

امیر موسیٰ کو شاید اب بھی شبہ تھا کہ وہ بربر اس لڑکی محمد بیگ ہی کے قبضے میں ہے لہٰذا اس نے دحیف کو حکم دیا کہ وہ قلعے ہی میں مقیم رہے اور پوشیدہ طریقے سے لڑکی کا پتہ لگاتا رہے۔ جب امیر موسیٰ قلعہ خالی کر گیا اور محمد بیگ نے قلعے میں واپسی کا ارادہ کیا۔ اس وقت رسالدار دحیف نے اپنے تمام آدمیوں کو قلعے کے راستے میں جگہ جگہ مقرر کر دیا کہ وہ محمد بیگ کے ساتھ آنے والوں پر نظر رکھیں۔ اگر کوئی غیر لڑکی نظر آئے تو فوراً مطلع کریں لیکن دحیف کی تمام کوششوں کے باوجود بربر اس لڑکی کا پتہ نہ چل سکا ..... تاہم دحیف نے سرگرمیاں جاری رکھیں۔

کچھ تو امیر موسیٰ کا حکم اور کچھ رسالدار دحیف اپنے طور پر بربر اس لڑکی کی تلاش میں دلچسپی لے رہا تھا۔ اس کے آدمی قلعے کے اندر اور باہر سرگرم عمل تھے ..... اور ہر وقت محمد بیگ اور اس کے آدمیوں پر نظر رکھتے تھے۔ اس محل میں امیر موسیٰ کے اہلِ خانہ بھی رہتے تھے جنہیں وہ یہیں چھوڑ گیا تھا تاکہ انہیں سفر کی مشقت نہ پڑے۔

ایک شام دحیف کے آدمیوں نے قلعے کے ایک آدمی کو پکڑ کر اس کے سامنے پیش کیا۔ اس پر یہ الزام تھا کہ وہ محل کی ایک ملازمہ سے کسی بربر اس لڑکی کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا۔

دحیف کے لیے یہ بڑی اہم خبر تھی۔ اس نے تمام آدمیوں کو باہر بھیج دیا اور خود اس شخص سے گفتگو شروع کر دی۔

"تم محل میں کس عورت سے بات کر رہے تھے؟" دحیف نے گرجدار آواز میں سوال کیا۔

"وہ میری بیوی ہے رسالدار صاحب!"

اس شخص نے اطمینان سے جواب دیا:

"اس کا نام سربالہ ہے اور وہ ایک عرصے سے چھوٹے امیر محمد بیگ کی خدمت پر مامور ہے۔"

رسالدار دحیف کے کان کھڑے ہوئے۔ اس نے کچھ اور سخت لہجے میں پوچھا:

"تمہاری بیوی اس وقت کہاں تھی ..... جب محمد بیگ اپنے لشکر کے ساتھ قلعے سے باہر تھا؟"

"وہ ان کے ساتھ ہی تھی رسالدار صاحب!"

سربالہ کے شوہر نے سادگی سے کہا:

"چھوٹے امیر میری بیوی کی خدمات سے بہت خوش ہیں۔ جب تک وہ باہر رہے، وہ بھی باہر تھی۔ اب وہ ان کے ساتھ ہی محل میں آ گئی ہے۔ میں پہلے ہی سے قلعے میں ہوں۔ میں بیوی سے ملاقات کر رہا تھا کہ آپ کے آدمی مجھے یہاں پکڑ لائے۔"

رسالدار اور زیادہ مشکوک ہو گیا۔ اس نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا:

"تمہیں اپنی جان عزیز ہے؟"

"جی ہاں رسالدار صاحب!" سربالہ کا شوہر سہم کر بولا۔

"تمہیں بتانا ہو گا کہ بربر اس لڑکی کو محمد بیگ نے کہاں چھپا رکھا ہے؟" یہ کہتے ہوئے دحیف نے تلوار کی نوک اس کے سینے پر رکھ دی۔

اس سوال پر سربالہ کے شوہر کی آنکھیں چڑھ گئیں۔ اس نے غصے سے چیخ کر کہا:

"نہیں بتاؤں گا۔ بے شک مجھے مار دو۔ ہرگز نہیں بتاؤں گا!"

دحیف نے حیرت سے اسے دیکھا۔

ادھیڑ عمر کا یہ لاغر سا شخص جو چند لمحے قبل بری طرح سہما ہوا تھا، اچانک اس میں اتنی جرأت آ گئی تھی کہ وہ سینہ تان کر موت سے آنکھیں ملا رہا تھا۔

آخر کیوں .....؟

بربر اس لڑکی اور اس میں کیا رشتہ ہے؟

دحیف نے آہستہ سے تلوار اس کے سینے سے ہٹا کر نیام میں ڈال لی۔

"دشمن قبیلے کی لڑکی کو بچانے کے لیے تم کیوں جان دے رہے ہو؟" دحیف نے نرمی سے پوچھا۔

"رسالدار دحیف!"

سربالہ کا شوہر کڑک کر بولا:

"تم نے اب تک بہت سے بربر اس قبیلے کے لوگوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے ہیں لیکن تم اس معصوم اور بے گناہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ تم مجھے مار سکتے ہو۔ میری بیوی کو قتل کر سکتے ہو لیکن وہ بربر اس لڑکی تمہارے یا امیر موسیٰ کے ہاتھ نہیں آ سکتی ..... وہ بربر اس قبیلے کی لڑکی ہے۔ میں اسے امیر موسیٰ کی ہوس کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گا۔"

"نادان شخص!"

دہیف نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا:

"تم اس لڑکی کو امیر موسیٰ سے بچانا چاہتے ہو لیکن اس کے بیٹے محمد بیگ کے حوالے کر رکھا ہے، ابھی بات کا دعویٰ کر رہے ہو؟"

"رسالدار......"

سربالی کا شوہر بے خوفی سے بولا:

"وہ لڑکی جس طرح تمہاری پہنچ سے دور ہے اسی طرح محمد بیگ کے ہاتھ بھی اس تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہماری موت کے بعد اس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ اس لیے کہ جس جگہ اسے پوشیدہ کیا گیا ہے وہاں میں اور میری بیوی سربالی ہی پہنچ سکتی ہے۔"

"تمہارا تعلق بھی شاید برلاس قبیلے سے ہے۔" دہیف کی آواز میں اب پہلے جیسی گھن گرج نہیں تھی۔

"شاید نہیں رسالدار! مجھے اپنے برلاس ہونے پر فخر ہے۔ یاد رکھو رسالدار! وہ دن بہت قریب ہے پورے ملک تاتار پہ برلاس سردار تیمور کا قبضہ ہوگا۔"

رسالدار دہیف بولا:

"میں تمہاری بے باکی اور صاف گوئی کی وجہ سے تم کو معاف کرتا ہوں۔ میں کل صبح تم سے کچھ اہم گفتگو کروں گا مگر خبردار۔ اس ملاقات کا ذکر کسی سے ذکر نہ کرنا۔"

"تم...... تم مجھے معاف کر رہے ہو رسالدار۔" سربالی کے شوہر نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں..... تم ایک بہادر انسان ہو۔"

دہیف نے پژمردگی سے کہا:

"جس قبیلے میں تم جیسے ایثار کرنے والے لوگ ہوں۔ اس قبیلے کو واقعی حق پہنچتا ہے کہ وہ پورے تاتار پہ حکومت کرے۔ تم جا سکتے ہو۔ صبح ہم پھر ملیں گے۔"

"شب بخیر......" سربالی کے شوہر نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

○

تیمور کے ذہین دماغ نے جو حکمت عملی تیار کی تھی وہ بڑی کامیاب ثابت ہوئی۔ اس نے اپنے آدمیوں

یہی تاثر دیا تھا کہ وہ ہرات جا رہا ہے۔ اس نے قرشی جانے والے قافلوں کے ذریعے بھی اس بات کی کافی تشہیر کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرشی پہنچنے والے قافلوں نے سب کو بتا دیا کہ سردار تیمور والی ہرات کی دعوت پہ ہرات کی جانب روانہ ہو چکا ہے...... حالانکہ تیمور صرف ایک منزل ہرات کی طرف جا کر ٹھہر گیا تھا اور اپنے منصوبے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا تھا۔

جونہی اسے اطلاع ملی کہ امیر موسیٰ قلعہ چھوڑ کر دریائے آمو کے کنارے مخلیں جا رہا ہے تو اس نے اپنے لشکر سے صرف دو سو چالیس سوار ساتھ لیے اور بڑی تیزی سے منزل طے کر کے دریا پہ پہنچ گیا جہاں دوسری طرف موسیٰ پڑاؤ ڈالے پڑا تھا۔

تیمور نے نہایت خاموشی سے رات کے وقت اپنا گھوڑا دریا میں ڈالا اور دوسرے کنارے پہ پہنچ گیا۔ صرف چالیس سوار اس کا ساتھ دے سکے۔ باقی لوگوں کے لیے کشتیوں کا انتظام کیا گیا۔ تمام بڑے بڑے سردار تیمور کے ساتھ تھے۔ ان کی رائے تھی کہ کشتیوں میں سوار لوگ بھی اس پار پہنچ جائیں تو آگے بڑھا جائے لیکن تیمور نے جلدی کی اور سب کو وہیں چھوڑ کر صرف دو خاص غلاموں کے ساتھ قلعے کی طرف بڑھا۔

نصف شب کے قریب تیمور قلعے کی فصیل کے پاس پہنچ گیا...... قلعے کے برجوں میں مدھم روشنی ہو رہی تھی اور فصیل پر بالکل خاموشی طاری تھی۔

فصیل کے گرد خندق تھی۔ تیمور خندق کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا رہا اور اس جگہ پہنچ گیا جہاں قلعے کے اندر پانی کی نہر خندق پر سے گزرتی تھی۔

تیمور ایک غلام کو ساتھ لے کر نہر میں اترا اور دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ اب وہ فصیل کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ایک جگہ فصیل کا بالائی حصہ ٹوٹا ہوا نظر آیا۔ اس جگہ سے فصیل پہ چڑھنا آسان تھا۔ تیمور اس جگہ کو ذہن نشین کر کے اپنے غلام کے ساتھ پھر خندق کے اس پار پہنچ گیا۔

اس وقت تک اس کے بیشتر آدمی وہاں پہنچ چکے تھے۔ اوپر چڑھنے کے لیے رسیاں اور کمندیں پہلے ہی تیار کر لی گئی تھیں۔ تیمور نے ٹکڑیاں بنا کر اپنے آدمیوں کو خندق پار کرنے کا حکم دیا اور خود آگے آگے چلا۔ جب پہلی ٹکڑی خندق پار کر کے اس جگہ پہنچی جہاں فصیل ٹوٹی ہوئی تھی...... تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ تیمور فصیل کے اوپر بیٹھا ہوا ہے۔ اس طرح ایک سو کے قریب آدمی کمندیں لگا کر فصیل پر پہنچ گئے۔

تیمور نے کچھ آدمی قلعے کے دروازے کی طرف بھیجے تاکہ وہ سنتریوں کو قتل کر کے دروازہ کھول دیں۔ باقی آدمیوں کو اس نے فصیل پہ پھیلا دیا۔

سنتری اور پہرے دار سو رہے تھے۔ ان کے خواب و خیال میں بھی کسی حملے کا امکان نہ تھا۔ تیمور کے آدمیوں نے

ایک ایک کو ڈبو ڈبو کر مارنا شروع کر دیا۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی معمولی مزاحمت کے بعد پوری فصیل پر تیمور کا قبضہ ہو گیا
اب صبح ہو چکی تھی۔

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ تیمور نے فتح کا بگل بجوا دیا۔ سنتری پہلے ہی ختم ہو چکے تھے۔ تیمور کے ا
ہر طرف نعرے لگانے اور تلواریں لہراتے پھر رہے تھے۔

قرشی والوں کو تیمور کے لشکر کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکا۔ انہوں نے امان مانگی۔ تیمور نے امان دے دی
وہ ہتھیار پھینک کر اس کے مطیع ہو گئے۔۔۔۔۔ دن چڑھے تک پورے قلعے پر تیمور کا قبضہ ہو گیا۔

صرف امیر موسیٰ کا محل محمد بیگ کے قبضے میں تھا اور محمد بیگ کسی صورت محل تیمور کے حوالے کرنے
آمادہ نہ تھا۔ اس محل کو تیمور نے اپنے لیے بنوایا تھا۔۔۔۔۔ وہ اسے تباہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے لڑائی
کرنے کا حکم دے دیا تاکہ محل کو تباہ کیے بغیر حاصل کرنے کی کوئی تدبیر کی جائے۔

تیمور نے جس وقت بگل بجوایا اور قرشی والوں کو علم ہوا کہ تیمور کا لشکر قلعے میں داخل ہو گیا ہے تو برلاس
کے وہ لوگ جو امیر موسیٰ کے خوف سے اپنی شخصیت چھپائے ہوئے تھے امیر تیمور کے پاس پہنچ گئے اور ا
آدمیوں کے ساتھ مل کر قرشی والوں پر حملہ کر دیا۔ ان میں سربالی کا شوہر پیش پیش تھا۔

تیمور نے اپنے سرداروں کو ایک جگہ طلب کیا تاکہ محل کو بغیر لڑائی جھگڑے کے حاصل کرنے کے لیے
کرے۔ تیمور کے سردار لڑائی بند کر کے اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ سربالی کا شوہر کوئی سردار تو نہ تھا لیکن تیمور
اس کی وفاداری کی وجہ سے اسے بھی مشورے کے لیے بلایا تھا۔

سربالی رات کو محل میں تھی لیکن لڑائی کا شور سن کر وہ باہر آ گئی۔ پھر اسی وقت محل کا پھاٹک بند ہو گیا اور وہ
اندر نہ جا سکی۔

ادھر سے مایوس ہو کر وہ اپنے شوہر کو تلاش کرنے لگی مگر لڑائی کے ہنگامے میں وہ اسے نظر نہیں آیا۔ پھر
سربالی نے ایک جگہ پناہ لے لی اور لڑائی ختم ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

سربالی کا شوہر جب اس جگہ پہنچا جہاں تیمور اپنے سرداروں کے ساتھ بیٹھا تھا تو وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا
امیر موسیٰ کا رسالدار دہف، سردار تیمور کے قریب کھڑا ہے۔ یہ دیکھ کر سربالی کے شوہر کو طیش آ گیا۔ اس نے
سے پکار کر تیمور کو خبردار کیا:

"سردارِ محترم! اس غدار سے بچیے۔ یہ امیر موسیٰ کا خاص آدمی ہے۔"

سردار تیمور نے سر اٹھا کر سربالی کے شوہر کو دیکھا اور اسے قریب آنے کا اشارہ کیا:

"تم کس کے بارے میں کہہ رہے ہو؟" تیمور نے نرمی سے پوچھا۔

"رسالدار دہف کے بارے میں سردارِ محترم!"

سربالی کے شوہر نے دہف کی طرف اشارہ کیا:

"اس نے کل میری جان بخشی کی تھی لیکن یہ بہت سے برلاس قبیلے والوں کا قاتل ہے۔"

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ برلاس قبیلے والوں کا قاتل ہے؟" تیمور نے مسکرا کر دہف کی طرف دیکھتے
ہوئے سربالی کے شوہر سے پوچھا:

"تم نے اسے کبھی کسی برلاس کو قتل کرتے دیکھا ہے؟"

"سردار! میں نے دیکھا تو نہیں لیکن سب جانتے ہیں کہ یہ برلاس قبیلے کا دشمن ہے۔"

"میرے جوشیلے دوست!"

تیمور نے سربالی کے شوہر کو مخاطب کیا:

"جس طرح تم نے برلاس ہو کر اپنے قبیلے کے لوگوں کو بچانے کی کوشش کی ہے اسی طرح یہ شخص بھی برلاس
ہے۔۔۔۔۔ اور یہ بظاہر اپنے قبیلے کے لوگوں کو گرفتار کرتا تھا لیکن پھر اپنے آدمیوں کے ذریعے انہیں سرحد پار
بھجوا دیتا تھا تاکہ وہ امیر موسیٰ کے ظلم و ستم سے محفوظ رہ سکیں۔ اس نے بھی تمہاری طرح خود کو چھپانے کے لیے
رسالدار دہف کا روپ دھار لیا تھا!"

سربالی کے شوہر کے لیے یہ انکشاف بڑا حیرت انگیز تھا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ رسالدار نے کل اس کی
جان بخشی کیوں کی تھی اور آج وہ اس سے کون سی اہم بات کرنا چاہتا تھا۔

اسی وقت تیمور کے نائب سردار جاکو برلاس نے آ کر تیمور کو مطلع کیا کہ محمد بیگ نے اس کی جان بخشی کی
پیش کش ٹھکرا دی ہے اور محل حوالے کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔

تیمور کو سخت غصہ آیا۔ اس نے محمد بیگ کو بڑی فراخدلی سے پیش کش کی تھی کہ اگر وہ اطاعت قبول کر
لے تو محل میں موجود باقی تمام لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کی جائے گی اور وہ جہاں جانا چاہیں گے انہیں
عزت کے ساتھ بھیج دیا جائے گا۔

تیمور نے حکم دیا کہ آتش گیر مادے سے محل میں آگ لگا کر اسے خاکستر کر دیا جائے۔ تیمور کے حکم
سے آتش گیر مادے کی دو ہنڈیاں، محل کے روشن دانوں کے ذریعے اندر پھینکی گئیں۔ اس سے محل کے
ایک حصے میں آگ بھڑک اٹھی۔

تیمور اور اس کے سردار دور کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ آگ لگنے سے محل والوں میں کھلبلی مچ گئی اور
کسی نے سفید کپڑا نیزے پر چڑھا کر محل کی چھت پر بلند کر دیا لیکن محل کا دروازہ بند تھا اس لیے کچھ نہ کیا

جاسکتا تھا۔

اسی دوران کسی طرف سے ایک عورت بھاگتی ہوئی آئی اور تیمور کے پیروں میں گر کر گڑگڑانے لگی:
"سردار! خدا کے لیے محل میں آگ نہ لگوایئے۔ گناہ گاروں کے ساتھ بے گناہ بھی مارے جائیں گے"
تیمور نے اسے تسلی دی اور حواس درست کر کے بات کرنے کا حکم دیا۔ عورت نے قدموں سے سر اٹھایا۔
ایک طرف سے سربالی کے شوہر کی آواز آئی۔ یہ بڑھ کر بیوی کے پاس پہنچ گیا۔

"نوبیہ کہاں ہے سربالی؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"نوبیہ تہ خانے میں ہے۔"

سربالی نے روتے ہوئے بتایا:

"سردار تیمور کو کسی طرح روکو۔ اگر محل جل گیا تو نوبیہ بھی ختم ہو جائے گی۔"

تیمور یہ باتیں سن رہا تھا اس نے پوچھا:

"نوبیہ کون ہے؟ تم لوگ اتنے پریشان کیوں ہو؟"

"محترم سردار!"

سربالی کے شوہر نے کہا:

"یہ میری بیوی ہے۔ ہم دونوں نے اپنی کوششوں سے ایک برلاس لڑکی کو محمد بیگ اور امیر موسیٰ سے بچا کر محل کے تہ خانے میں چھپا رکھا ہے۔ محل جل گیا تو وہ لڑکی بھی مر جائے گی۔"

تیمور نے حکم دیا کہ محل میں مزید کوئی آتش گیر مادہ نہ پھینکا جائے۔

محل کے ایک حصے میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ محمد بیگ جو اب تک بڑی بہادری سے تیمور کے مقابلے پر ڈٹا ہوا تھا، گھبرا گیا۔ محل کی تمام خواتین اسے گھیرے ہوئے تھیں اور اسے اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ تنگ آ کر محمد بیگ نے محل کا دروازہ کھول دینے کا حکم دیا اور تلوار گلے میں ڈال کر اپنے بچے کھچے آدمیوں کے ساتھ محل سے نکل کر تیمور کے پاس پیش ہو گیا۔

تیمور نے ایک بار پھر فراخدلی کا ثبوت دیا۔ محل کی تمام خواتین اور دیگر لوگوں کو امیر موسیٰ کے پاس جانے کی اجازت دے دی۔ صرف محمد بیگ کو کچھ دنوں کے لیے قلعے میں رکھنے کا حکم دیا۔

تیمور نے سربالی اور اس کے شوہر کو حکم دیا کہ محل میں جا کر برلاس لڑکی کو تہ خانے سے نکال کر سامنے پیش کریں۔ ان کی مدد کے لیے اس نے رسالدار دہیف کو ان کے ساتھ کر دیا۔

سربالی اور اس کا شوہر، دہیف کو ساتھ لیے تیزی سے محل میں داخل ہوئے۔ محل میں لگی ہوئی آگ

تیمور کے حکم سے بجھانا شروع کر دیا گیا تھا۔ سربالی نے اندر پہنچ کر تہ خانے کا دروازہ کھولا اور نوبیہ کو آواز دی۔
نوبیہ تہ خانے کا زینہ چڑھ کر بھاگتی ہوئی اوپر آ گئی۔
جب اس کی نظر رسالدار دہیف پر پڑی تو اس کا منہ حیرت سے کھل گیا:

"فہید . . . . تم . . . . ." نوبیہ کی زبان سے بمشکل نکلا۔

"اور تم . . . . ارابینہ ہو . . . . ." جواب میں دہیف نے کہا۔

چند لمحے وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر دوڑ کر ایک دوسرے سے مل گئے۔ سربالی اور اس کے شوہر کے لیے یہ منظر بڑا دلچسپ اور حیرت انگیز تھا۔ حیرت انگیز اس لیے کہ دو اجنبی ہستیاں ان کے سامنے یک جان دو قالب بنی کھڑی تھیں اور دلچسپ اس لیے کہ نوبیہ نے دہیف سے الگ ہو کر حیا سے نظریں جھکاتے ہوئے کہا تھا:

"سربالی! یہ میرے شوہر فہید ہیں جن کی تلاش میں میں یہاں آئی تھی . . . . . میرا اصل نام ارابینہ ہے۔"

○

دیوتا کی چوری

یہ شاہ شوش کی خیمہ گاہ تھی۔ سو سے زیادہ خیمے، پہاڑی ڈھلوان پر دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ شاہ کا خیمہ ذرا بلندی پر نصب تھا۔ رات کا آخری پہر تھا لیکن چودھویں کے چاند کی آخری کرنیں ہر طرف منور کیے ہوئے تھیں۔

داراب چہرے کو کپڑے سے پوشیدہ کیے ہوئے گھنے درختوں کی آڑ لیے آہستہ آہستہ شاہ کے خیمے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ خیمہ گاہ میں رات دیر تک دورِ شراب چلتا رہا تھا اس لیے ہر سپاہی اور سردار خیمے کے اندر یا باہر بے سدھ پڑا خراٹے لے رہا تھا۔

داراب سپاہیوں کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر شاہ کے خیمے کی پشت پر پہنچ گیا۔ اس نے زمین پر بیٹھ کر چہرے سے کپڑا اٹھایا۔ کمر سے خنجر نکالا اور خیمے کا پردہ چاک کر کے اندر جانے کا راستہ بنایا۔ داراب نے اپنے خیال میں بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے کام لیا تھا لیکن شاہ کے خیمے میں ایک ہستی اس سے زیادہ ہوشیار موجود تھی۔ یہ تھی شاہ شوش کی جوان عمر اور خوبصورت بہن ششبیل!

شاہ بڑے شکی دماغ کا تھا۔ اس لیے وہ اپنی بہن کو الگ خیمے میں سلانے کے بجائے اپنے ہی خیمے میں سلاتا تھا۔ شاہ کا خیال تھا کہ اس طرح وہ اپنی بہن کی اچھی طرح حفاظت کر سکے گا لیکن وہ شراب اس کثرت سے پیتا تھا کہ اسے بے ہوشی کی حالت میں خیمے تک پہنچایا جاتا اور اس کی بہن ششبیل کو اپنی حفاظت کے ساتھ اپنے بھائی کی بھی حفاظت کرنا پڑتی تھی۔

وہ تمام رات جاگ کر سویرا کر دیتی تھی!

ششبیل اس وقت بھی جاگ رہی تھی۔ اس نے خیمے کی پشت پر کھٹکا محسوس کیا تو فوراً سر اٹھا کر دیکھا۔ خیمے میں صرف ایک شمع روشن تھی۔ اس کی ملگجی روشنی میں ششبیل کو کچھ نظر نہ آیا۔ اس وقت اسے پھر باہر کچھ سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ اس نے فوراً پاس رکھی ہوئی تلوار اٹھائی اور لڑھکتی ہوئی خیمے کے ایک کونے کے قریب پہنچ گئی۔ اس جگہ کپڑے تبدیل کرنے کے لیے ایک پردہ پڑا تھا۔ ششبیل اس پردے کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ اس نے تلوار نیام سے نکال لی۔ اب وہ خطرے سے نپٹنے کے لیے بالکل تیار تھی۔

ششبیل کا خدشہ درست ثابت ہوا۔

خیمے کی پشت میں ایک چاک پیدا ہوا اور اس میں سے ایک گردن نے اندر آ کر خیمے کا جائزہ لیا۔ گردن گھومتی ہوئی جب اس پردے کی طرف ہوئی جس کے پیچھے ششبیل چھپی ہوئی تھی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ چہرہ نہیں بلکہ چودھویں کا چاند ہے جو پردے کے بادل کو ہٹا کر اندر جھانک رہا ہے۔

ششبیل کے لیے یہ صورت قطعی غیر مانوس تھی لیکن چہرے کا مردانہ حسن و وجاہت کچھ اس قدر پُرتاثیر تھا کہ ششبیل اسے دیکھنے میں محو ہو گئی۔

ششبیل پر محویت کا ایسا عالم طاری ہوا کہ داراب خیمے کے چاک سے اندر داخل ہو کر زمین پر بیٹھے بیٹھے شاہ شوش کے بالکل قریب پہنچ گیا۔

یکایک ششبیل کو خطرے کا احساس ہوا۔ وہ پردے سے نکلی اور دبے پاؤں آنے والے کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی تلوار بلند تھی اور وہ انتظار کر رہی تھی کہ اگر آنے والے نے اس کے بھائی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو وہ ایک ہی وار میں اس کا سر قلم کر دے گی لیکن وہ سخت تعجب میں تھی کہ آنے والے کے پاس کوئی اسلحہ نہ تھا۔ نہ نیزہ نہ تلوار۔ اس نے اپنا خنجر بھی غلاف کر کے اندر کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ وہ شاہ شوش کے سرہانے بیٹھا دائیں بائیں نظریں دوڑا کر کچھ تلاش کر رہا تھا۔ آخر داراب کی نظر شاہ شوش کے دائیں بائیں رکھے دو سونے کے پیالوں پر پڑی۔ یہ پیالے زمین پر اوندھے رکھے ہوئے تھے۔

داراب نے ہاتھ بڑھا کر ایک پیالے کو سیدھا کیا تو اس کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ سونے کے اس پیالے کے نیچے شاہ شوش کا پتھر کا خدا "ربِ شوش" پڑا تھا۔ پتھر کی ٹیڑھی میڑھی مورت کو ترکمانوں کا یہ قبیلہ اپنا رب مانتا تھا۔ اس رب کے ساتھ دوسرے پیالے کے نیچے ایک اور مورتی تھی جو ربیہ کہلاتی تھی۔

ترک، ترکمان، مغل اور تاتاری، یہ سب کے سب ایک ہی نسل کی مختلف قومیں تھیں۔ ان کا اصل وطن منگولیا کے اونچے صحرا اور جھیلیں تھیں جہاں سے مختلف زمانوں میں یہ لوگ جنوب اور جنوب مغرب میں آ کر آباد ہوتے رہے تھے۔ عام طور سے یہ لوگ بت پرست تھے۔ بعض قبائل چاند، سورج، دریا، بجلی اور بادل وغیرہ

کو بھی سجدہ کرتے تھے۔

تیمور کے زمانے میں ان میں سے اکثر قبائلی نورِ اسلام سے منور ہو چکے تھے لیکن سمرقند کے شمال میں سینکڑوں ایسے قبیلے موجود تھے جن کا مذہب بت پرستی تھا۔

داراب نے سونے کے پیالوں کو الگ رکھ دیا اور شوش کے ربّ اور ربّیہ کی مورتیوں کو اٹھا کر احتیاط سے اپنے لمبے کوٹ نما کرتے کے اندر کی جیبوں میں رکھ لیا۔

شتشبیل کو یہ اندازہ ہو گیا کہ آنے والا چوری کی نیت سے نہیں آیا ورنہ وہ پہلے سونے کے ہار پر ہاتھ صاف کرتا۔ اس کے بجائے اس نے پتھر کی مورتیاں اٹھائی تھیں لیکن اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ ان کو چرانے سے اس خوبرو نوجوان کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔

داراب اپنا مقصد پورا کرنے کے بعد بیٹھے ہی بیٹھے پیچھے کی طرف کھسکنے لگا لیکن فوراً ہی اسے پہلو میں کوئی چیز چبھتی ہوئی محسوس ہوئی۔

اس نے گھبرا کر مڑ کر دیکھا۔ شتشبیل فرشتۂ اجل بن کر اس کے سر پہ کھڑی تھی اور اس کی تلوار کی نوک اس کے پہلو تک پہنچی ہوئی تھی۔

داراب کا خون خشک ہو گیا اور منہ حیرت سے کھل گیا۔

"تمہاری سزا موت ہے۔ تم نے چوری کی ہے۔" شتشبیل نے انتہائی کوشش کی کہ اپنی آواز میں سختی پیدا کرے مگر ناکام رہی۔

"نہیں۔ میں چور نہیں ہوں۔" یہ کہتے ہوئے داراب نے خوفزدہ نظروں سے شاہ شوش کی طرف دیکھا جو فرش پر چیت پڑا ہوا تھا۔

"شاہ کی فکر نہ کرو۔"

شتشبیل نے لہجے کو کرخت بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

"یہ کل دوپہر تک اسی طرح پڑے رہیں گے۔ میں تمہیں چوری کی سزا دوں گی۔ تمہیں قتل کر دوں گی۔ کیا تم نہیں جانتے کہ میں شاہ شوش کی بہن شتشبیل ہوں اور رات کو ان کی حفاظت کرتی ہوں۔"

اس گفتگو کے دوران داراب کی نظریں شتشبیل کے سراپا کا جائزہ لیتی رہیں۔ شتشبیل خاموش ہوئی تو داراب نے اس کے سامنے بڑے ادب سے سر خم کر دیا۔ بولا:

"اے حورِ ارضی! میں چور نہیں ہوں۔"

"لیکن تم خیمے کا پردہ چاک کر کے اندر آئے ہو۔ کسی خیمے میں داخل ہونے کا یہ طریقہ تو صرف وہ لوگ

کرتے ہیں جن کی نیت صاف نہ ہو اور جس کی نیت صاف نہ ہو اسے فوراً قتل کر دینا چاہیے۔"

"بے شک!"

داراب اطمینان سے بولا:

"میں واجب القتل ہوں لیکن اگر تم مجھے صفائی کا موقع دو کہ ایک بے گناہ کے خون سے اپنے ہاتھ آلودہ نہیں کرنا چاہتیں تو خیمے سے باہر چلو۔ یہاں شاہ کے ہوش میں آنے کا خطرہ ہے۔ اگر میں نے اسی جگہ خود کو بے قصور ثابت کر دیا اور اس دوران میں شاہ کی آنکھ کھل گئی تو وہ مجھے ضرور قتل کر دیں گے اس صورت میں بھی قتل کی ذمے دار تم ہی ہو گی۔"

شتشبیل تذبذب میں مبتلا ہو گئی۔ پھر خیمے کے دروازے پر گئی۔ باہر جھانک کر دیکھا۔ ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ شاہ کے چاروں محافظ نشے میں چور بے سدھ پڑے تھے۔

"تم نے خیمے کا پردہ کس چیز سے چاک کیا تھا؟" شتشبیل نے واپس آ کر سوال کیا۔

"خنجر سے!" داراب نے کرتے کے اندر ہاتھ ڈالا۔

"وہ میرے حوالے کر دو۔"

داراب نے خنجر شتشبیل کی طرف بڑھا دیا۔

"آؤ میرے ساتھ۔"

شتشبیل نے خنجر لے کر دروازے کی طرف اشارہ کیا اور داراب کو ساتھ لے کر خیمے سے باہر آ گئی۔ اس نے باہر آنے کے لیے خیمے کے دروازے کے بجائے پردے کے اس چاک کا راستہ اختیار کیا جو داراب نے خنجر سے بنایا تھا۔

باہر نکلتے وقت وہ بڑی احتیاط کے ساتھ پہلے خود نکلی۔ پھر داراب کو باہر آنے کا حکم دیا۔ باہر چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ شتشبیل اسے لیے درخت کے نیچے پہنچی۔ درخت کے پتوں اور شاخوں سے چاندنی چھن چھن کر آ رہی تھی اور وہ ایک دوسرے کے چہرے بخوبی دیکھ سکتے تھے۔

شتشبیل نے اپنی تلوار نیام میں کر لی۔ داراب ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے جا رہا تھا۔

"اب بتاؤ تم نے ربّ شوش اور ربّیہ کی مورتیاں کیوں چرائی ہیں؟" شتشبیل نے ایک بڑا تحکمانہ انداز اختیار کیا۔

"اے خوبصورت شتشبیل! میں نے تمہارے ربّ اور ربّیہ کی مورتیاں ضرور اٹھائی ہیں لیکن میری نیت صاف ہے اور میرے اس عمل میں نیکی اور خیر کا ایک پہلو پوشیدہ ہے۔" داراب نے بڑے مہذب انداز میں

اپنی صفائی پیش کی۔

"مگر تم ہمارے رب اور ربیہ کو کہاں لے جانا چاہتے ہو؟"

"خوبصورت لڑکی! میں دونوں قبیلوں کی جنگ رکوانا چاہتا ہوں؟"

داراب نے کہنا شروع کیا:

"میرا خیال ہے کہ اگر تم نے مجھے ان خداؤں کو لے جانے کی اجازت دیدی، تو میں انہیں درمیان ڈال کر، ان کے واسطے سے جنگ رکوا سکوں گا"۔

"میں تمہاری بات نہیں سمجھ سکی"۔

ششبیل الجھتے ہوئے بولی:

"ایک تو اس وقت کوئی جنگ نہیں ہو رہی۔ دوسرے یہ کہ جنگ کا خداؤں سے کیا تعلق ہے؟ یہ ہمارے رب ہیں۔ ان کی برکتوں سے ہم نے اب تک تمام لڑائیوں میں فتح حاصل کی ہے"۔

"میرا مطلب صاف ہے ششبیل!"

داراب بولا:

"شاہ شوش یہ لشکر لے کر قبیلہ چوغان کو تباہ کرنے جا رہا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ ان دونوں میں جنگ ہو"۔

"شاید تمہارا تعلق چوغان قبیلے سے ہے اور تم اپنے قبیلے کو تباہی سے بچانا چاہتے ہو"۔ ششبیل میں طنز پیدا ہو گیا۔

"میں چوغان نہیں ہوں"۔

داراب نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا،

"اگر تم شاہ شوش کی واقعی بہن ہو تو تمہیں علم ہوگا کہ کچھ دن پہلے شاہ شوش نے سرائیل قبیلے کو نکال دے کر ان کے خیمے لوٹ لیے تھے۔ اس لڑائی میں جو سرائیلی بچ گئے تھے انہوں نے چوغان والوں کے پاس پناہ لی ہے۔ اب شاہ شوش چوغان پر محض اس وجہ سے حملہ کرنے جا رہا ہے کہ چوغان والوں نے ہمیں پناہ دی ہے۔ یہ جنگ ہماری وجہ سے ہو رہی ہے"۔

"تو تم سرائیلی ہو!" ششبیل کے لہجے میں اب گہرا طنز پیدا ہو گیا تھا۔

"ہاں۔ مجھے اپنے سرائیلی ہونے پر فخر ہے"۔ داراب نے سر بلند کر کے کہا۔

"مجھے آج معلوم ہوا کہ سرائیلی نہ صرف بزدل ہوتے ہیں بلکہ چور بھی ہوتے ہیں"۔ ششبیل نے نفرت سے کہا:

"مجھے تم کو قتل کر کے ضرور افسوس ہوگا لیکن اب میں تمہیں کسی صورت زندہ نہیں چھوڑ سکتی۔ تم نے رب اور ربیہ کو چوری کر کے بہت بڑا گناہ کیا ہے"۔

ششبیل نے بڑی تیزی سے دوبارہ تلوار نکالی۔

"ذرا ٹھہرو ششبیل!"

داراب نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا:

"بے شک تم مجھے قتل کر دو لیکن پہلے مجھے یہ ثابت کرنے دو کہ سرائیلی نہ تو بزدل ہوتے ہیں اور نہ ہی چور ہوتے ہیں"۔

"تم بڑے دیدہ دلیر معلوم ہوتے ہو"۔

ششبیل نے تلوار کو لہراتے ہوئے کہا:

"میرے منہ پر جھوٹ بول رہے ہو۔ سنو! تم نے ہم سے شکست کھائی اس لیے بزدل ہو۔ تم نے خیمے میں داخل ہو کر ہمارے رب کو اٹھایا اس لیے چور ہو۔ تم اپنی صفائی میں کیا کہہ سکتے ہو؟"

"ششبیل! میں تمہیں ایک عام لڑکی نہیں سمجھتا اس لیے بتاتا ہوں کہ اگر میں بزدل ہوتا تو تمہارے بھائی شاہ شوش کو سوتے میں قتل کر کے اس جھگڑے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتا"۔

داراب نے بڑے جوش سے کہا:

"لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ اگر میں ایسا کرتا تو میرا قبیلہ ہمیشہ کے لیے بدنام ہو جاتا۔ میں چور بھی نہیں ہوں ششبیل! چوری کی نیت ہوتی تو سونے کے پیالے اٹھاتا۔ اب بھی اگر تم مجھے مجرم سمجھتی ہو تو آگے بڑھو اور مجھے قتل کر دو"۔

ششبیل سوچ میں پڑ گئی:

"مگر ہمارے خداؤں کو چرانے سے تمہارا کیا مقصد ہے؟"

"سنو ششبیل!"

داراب پر سکون لہجے میں بولا:

"صبح کو جب شاہ شوش کو ہوش آئے گا اور اسے معلوم ہوگا کہ اس کے خدا چوری ہو گئے ہیں تو اسے یقیناً شبہ ہوگا کہ یہ کام چوغان والوں نے کیا ہے۔ وہ فوراً چوغان والوں سے دریافت کرے گا۔ میں اس وقت چوغان والوں کی طرف سے شرط پیش کروں گا کہ اگر شاہ شوش جنگ سے باز آ جائے تو رب اور ربیہ اسے واپس کیے جا

سکتے ہیں۔ کیا خیال ہے تمہارا شستبیل! کیا شاہ شوش اپنے خداؤں کو واپس لینے کے لیے جنگ ملتوی نہیں کرے گا؟"

"ہاں۔ شاہ بھائی اپنے خداؤں کی واپسی کے لیے جنگ سے باز آجائیں گے لیکن اے سرائیلی! یہ تو بتاؤ کہ اگر میں تمہیں گرفتار کرا دوں تو کیا ہوگا؟"

"نادان لڑکی!"

دلراب کو جیسے طیش آگیا:

"میں تمہارے نرم و نازک ہاتھوں سے قتل تو ہو سکتا ہوں لیکن تمہارے آدمی مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔ میں فیصلہ کر کے چلا تھا کہ اگر میں خداؤں کو حاصل کرنے میں ناکام ہوا اور تمہارے آدمیوں نے مجھے گھیر لیا تو میں دو چار کو مار کر خود بھی اپنا خاتمہ کر لوں گا۔ شاہ شوش جیسے ظالم کی غلامی سے موت کہیں زیادہ بہتر ہے۔"

"دیکھو سرائیلی! تم میرے بھائی کی توہین کر رہے ہو۔"

شستبیل برا مناتے ہوئے بولی:

"میرا بھائی جیسا بھی ہے۔ ہے تو میرا بھائی۔ میں اس کی برائی نہیں سن سکتی۔"

"شستبیل!"

داراب نے صاف آواز میں کہا:

"تم خوبصورت ہو۔ میں نے تمہاری تعریف کی۔ شاہ شوش ظالم ہے۔ اسے ہر ایک ظالم ہی کہے گا۔ تم خود ہی انصاف سے کہو کہ اس نے ہمارے سرائیلی قبیلے کو تباہ کر کے کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔ تمام سرائیلی خانماں برباد ہوئے اور دوسرے قبائل سے پناہ کی بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ یہ کتنا بڑا ظلم ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے سرائیلی۔"

شستبیل نرمی سے بولی:

"لیکن تمہارے قبیلے کے سردار کی بھی تو غلطی ہے۔ اسے چاہیے تھا کہ میرے بھائی نے جس رباب بجانے والے کو بلایا تھا اسے ہمارے آدمیوں کے حوالے کر دیتا۔ ایک آدمی کو بچانے کے لیے تمہارے قبیلے کے سردار نے پورا قبیلہ تباہ کروا دیا۔"

"شستبیل! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

داراب نے فوراً جواب دیا:

"میں نے سنا ہے کہ جس کی صورت اچھی ہوتی ہے اس کا دل بھی خوبصورت ہوتا ہے۔ کیا قبیلہ سردار کا فرض نہیں کہ وہ اپنے آدمیوں کی حفاظت کرے۔ اگر کوئی اور قبیلے والا تمہارے بھائی سے کہے کہ شستبیل کو اس کے حوالے کر دے تو کیا وہ مان جائے گا؟"

"نہیں۔ بالکل نہیں مانے گا۔" شستبیل نے اس کی بات کی تائید کی۔

"تو پھر تم ہی بتاؤ کہ میرے قبیلے کے سردار نے اگر داراب کو تمہارے بھائی کے آدمیوں کے حوالے نہیں کیا تو کونسی غلطی کی؟"

شستبیل سوچ میں پڑ گئی۔

داراب پھر بولا:

"داراب قبیلہ سرائل کا سب سے اچھا رباب بجانے والا ہے۔ . . . ترکستان کے تمام قبائل میں اس جیسا رباب بجانے والا اور کوئی نہیں۔"

"کیا اس کا نام داراب ہے؟"

شستبیل نے دلچسپی سے پوچھا:

"تم نے اسے دیکھا ہوگا؟ اس کے رباب بجانے کی تعریف میں نے بھی سنی ہے۔ صورت شکل کیسی ہے اس کی؟ لوگ کہتے ہیں کہ اچھے گانے والے صورت کے اچھے نہیں ہوا کرتے۔"

"خوبصورت شہزادی!"

داراب بولا:

"تم نے شاید قبیلہ سرائل کے لوگوں کو نہیں دیکھا۔ اس قبیلے کے لوگ بڑے وجیہ اور خوبصورت ہوتے ہیں۔"

"کیا وہ تم سے زیادہ خوبصورت ہے؟"

"ہاں شستبیل!"

داراب مسکرایا:

"اگر تم مجھے خوبصورت سمجھتی ہو تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ قبیلہ سرائل کا رباب بجانے والا داراب واقعی خوبصورت انسان ہے اور اب میں یہ بات بھی دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر تم نے مجھے ان خداؤں کو لے جانے دیا تو دونوں قبیلوں میں جنگ ہرگز نہ ہوگی۔"

"اور اگر شاہ بھائی نے پہلے ہی کی طرح خداؤں کے ساتھ داراب کو بھی مانگا تو کیا ہوگا؟" شستبیل نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"تو میرا خیال ہے کہ داراب خود ہی اس قبیلے میں چلا آئے گا" داراب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

شتشبیل یہ سن کر شرما گئی۔ بولی:

"مجھے داراب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ دونوں قبیلوں میں ملاپ ہو جائے اور جنگ کے بادل ہمیشہ کے لیے چھٹ جائیں"

داراب محسوس کر رہا تھا کہ سویرا قریب ہے اور گفتگو میں کافی وقت صرف ہو چکا ہے لیکن شتشبیل کی میٹھی میٹھی باتیں اسے الجھائے ہوئے تھیں۔ اس وقت دور کسی خیمے سے کوئی آدمی نکلا۔ دونوں نے پریشان ہو کر ادھر دیکھا۔

"اچھا سراتی۔ اب تم جاؤ لیکن جانے سے پہلے ایک وعدہ کرو۔"

"یہ جان حاضر ہے"۔

داراب نے سر جھکا کر کہا:

"میں ہر طرح کا وعدہ کرنے کو تیار ہوں"۔

"اچھا تو وعدہ کرو کہ تم مجھ سے پھر ملو گے خواہ دونوں قبیلوں میں جنگ ہو یا صلح ہو جائے" شتشبیل نے آہستہ سے کہا۔

"وعدہ نہیں کرتا بلکہ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں شتشبیل"

داراب پورے وثوق سے بولا:

"میں تمہارے پاس ضرور آؤں گا"۔

سویرا قریب تھا اور وہ سپاہی جنھوں نے کم شراب پی تھی بیدار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ لا کئی اور خیموں سے لوگ نکلنے لگے تھے۔

"اچھا سراتی۔ جاؤ تمہیں رب شورش کے حوالے کیا لیکن دیکھو اپنا وعدہ نہ بھولنا" شتشبیل بولی اور داراب ہاتھ سے رخصتی اشارہ کرتے ہوئے صبح کے دھندلکے میں غائب ہو گیا۔

⊙

طوائف الملوکی کے اس دور میں دو طاقتیں ایک دوسرے کو زیر کرنے میں مصروف تھیں۔ ایک

شہر سبز کے سردار تیمور کی تھی جو اپنی ہمت اور دور اندیشی کے زور پہ علاقے فتح کر رہا تھا اور دوسری طرف اپنے سالے امیر حسین کو برابر پیچھے دھکیل رہا تھا۔

تیمور نے اپنی جانا کی سے قرشی کے قلعے پر قبضہ تو کر لیا تھا لیکن ایک مختصر لشکر کے ساتھ قلعے پر قبضہ برقرار رکھنے میں اسے بڑی دقت پیش آ رہی تھی۔ اس کے ہمدرد قبائلی سرداروں کا لشکر قلعہ سے باہر تھا اور امیر موسیٰ جو اپنی غلطی سے قلعے کا قبضہ کھو چکا تھا اب اس فکر میں تھا کہ تیمور کو باہر سے کوئی مدد نہ مل سکے۔ اس نے قرشی کے قلعے کو گھیر لیا تھا اور اس کی بازیابی کے لیے مسلسل حملے کر رہا تھا۔

تیمور نے قلعے کا دفاع اس قدر مضبوط بنا دیا تھا کہ امیر موسیٰ کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور آخر اسے قلعے کا محاصرہ چھوڑ کر اپنے سردار اعلیٰ امیر حسین کے پاس جانا پڑا۔

امیر حسین قلعہ قرشی کے ہاتھ سے نکل جانے پر بڑا دلبرداشتہ تھا اور اب اس کوشش میں تھا قرب و جوار کے خانہ بدوش ترکمان سرداروں کا تعاون حاصل کر کے تیمور پر ایک بھرپور حملہ کرے۔

سرائیل، چوغان اور شورش ایسے ہی خانہ بدوش قبائل تھے جنھوں نے خانہ بدوش زندگی کو خیرباد کہہ کے اب بڑے بڑے علاقوں پر قبضہ کر کے خود کو امیر، سردار یا بادشاہ کہلوانا شروع کر دیا تھا۔ یہ قبائل آپس میں لڑتے رہتے اور کمزور کو زیر کر کے اس کے علاقے پر قبضہ کر لیتے۔ یہ تمام قبائل اصنام پرست تھے اور ان سب کا الگ الگ خدا تھا۔ انھوں نے اپنے اپنے خدا کا نام قبیلے کے نام پر رکھ چھوڑا تھا۔ ان خود تراشیدہ خداؤں کی یہ لوگ پرستش کرتے اور ان کے سامنے قربانیاں پیش کرتے۔ سب سے اہم قربانی انسانی خون کی ہوا کرتی تھی۔

یہ وحشی قبائل امیر حسین اور تیمور کی جنگوں سے ناواقف نہ تھے لیکن اپنی خودسری کی وجہ سے ان پر توجہ نہ دیتے۔ وہ روایتی جنگ و جدل میں مصروف تھے۔

سرائل قبیلے نے جب شاہ شورش کے ہاتھوں شکست کھائی تو اس کے بچے کھچے لوگوں نے، جن کی تعداد دس بارہ سے زیادہ نہ تھی، قبیلہ چوغان میں پناہ حاصل کر لی۔ قبیلہ چوغان بھی کچھ زیادہ طاقتور نہ تھا لیکن جب اس نے سرائیلیوں کو پناہ دی اور شاہ شورش، اس جرم میں ان پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا تو یہ ان کے قبیلے کی انا کا مسئلہ بن گیا اور وہ لڑنے مرنے پر تیار ہو گئے۔

داراب ایک ذی شعور جوان تھا۔ اسے جنگ سے زیادہ رباب بجانے سے دلچسپی تھی لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ شاہ شورش اس کے محسنوں پہ حملہ کرنے آ رہا ہے تو اس کی حمیت نے جوش مارا اور وہ اپنے محسنوں کو بچانے کے لیے میدان میں آ گیا۔

شاہ شورش نے چوغان پر فوج کشی کا یہ بہانہ تراشا کہ چوغان والوں کے پاس داراب نام کا ایک رباب بجانے والا

ہے، اسے شاہ شوش کے پاس بھیج دیا جائے کیونکہ داراب کا تعلق سرائل قبیلے سے ہے جو شاہ شوش سے ٹکرا چکا ہے اور اس کے بچے ہوئے لوگ فاتح شاہ شوش کے غلام ہیں۔

اس زمانے میں یہ رواج تھا کہ مفتوح کی ہر چیز کا مالک فاتح ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ شکست کھانے والے یا بادشاہ کی بیوی بھی جنگی قانون کے تحت فاتح کی بیوی ہو جاتی تھی۔

شاہ شوش کو اب داراب سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو داراب کا بہانہ بنا کر چوغان قبیلے کو ختم کر کے ان کے علاقے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ چوغان والے داراب کو ہرگز واپس نہ کریں گے کیونکہ اسے وہ پناہ دے چکے ہیں اور پناہ میں آئے ہوؤں کی حفاظت کرنے میں وہ اپنی جان تک قربان کر دیں گے۔

داراب نے جب دیکھا کہ محض اس کی وجہ سے دو قبیلوں میں جنگ ہوگی تو اس نے شاہ چوغان سے درخواست کی کہ اسے شاہ شوش کے حوالے کر دیا جائے۔

داراب یہ قربانی دے کر جنگ کو روکنا چاہتا تھا لیکن چوغان کے بادشاہ نے اس کی یہ درخواست رد کر دی کیونکہ اس کے خیال کے مطابق داراب کو حوالے کرنے سے چوغان قبیلے کی کمزوری ظاہر ہوتی تھی جس کے لیے چوغان کسی طرح آمادہ نہ ہوا۔ داراب نے اپنے محسن بادشاہ کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد رب شوش اور ربہ کو چرانے کا منصوبہ بنایا اور وہ اس میں کامیاب بھی رہا۔ اس کے لیے تو یہ چوری ایک پنتھ دو کاج بن گئی۔ شوش کے خداؤں کی چوری کے دوران اس کی ملاقات ششبیل سے ہوئی جس کے حسن نے داراب کو اس قدر گرویدہ کر لیا کہ وہ خود ہی شاہ شوش کے پاس جانے کو تیار ہو گیا۔

○

دوسرے دن شاہ شوش حسب دستور دوپہر کے وقت بیدار ہوا۔ اس کی بہن ششبیل پہلے ہی جاگ چکی تھی اور بستر پر پڑی ان خطرات پر غور کر رہی تھی جو خداؤں کی چوری کا راز کھلنے پر پیش آنے والے تھے۔ بڑی آسانی سے داراب کو قتل کر سکتی تھی یا گرفتار کرا سکتی تھی لیکن وہ تو پہلی ہی نظر میں اسے دل دے بیٹھی تھی اب اس سے دوبارہ ملاقات کی آرزو دل میں کروٹیں لے رہی تھی۔

رات کی تیز اور تلخ شراب کا نشہ دور ہو چکا تھا۔ اس نے کروٹ بدل کے ششبیل کو دیکھا جس کی آنکھیں خیالات کے ہجوم اور شب بیداری کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ بھائی کو بیدار ہوتے دیکھ کر اس نے آنکھیں موند لیں۔

"ششبیل!"

شاہ شوش نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا:

"میں جانتا ہوں کہ تو صبح ہی سے جاگ رہی ہے اور میرے آرام میں خلل نہ پڑنے کے خیال سے آنکھیں بند کیے پڑی ہے۔ میں تجھ پر بڑا ظلم کرتا ہوں ششبیل۔ تجھے پتہ نہیں کہ مجھے تجھ سے کس قدر محبت ہے۔ تو مجھے دنیا میں سب چیزوں سے زیادہ عزیز ہے۔ میں نے اسی لیے فیصلہ کیا ہے کہ اس سال۔۔۔"

شاہ شوش کو اک دم کچھ خیال آیا۔ اس نے اپنا جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ پھر فوراً بات بناتے ہوئے بولا:

"اس سال قربانی کے موقع پر تجھے دلہن بناؤں گا۔ تیری شادی کر دوں گا۔"

شاہ شوش نے ششبیل کو خوش کرنے کے لیے یہ سفید جھوٹ بولا تھا۔ پروہتوں اور مذہبی پیشواؤں کے کہنے پر وہ اس بات پر آمادہ ہو گیا تھا کہ اس سال قربانی کے موقع پر وہ اپنی عزیز بہن کے خون کی بھینٹ دے گا تاکہ اس کے خود ساختہ خدا اس سے خوش ہو کر اس کی دولت اور سلطنت میں اضافہ کر دیں۔ اس کی خبر ششبیل کو اپنی ایک وفادار کنیز کے ذریعے ہو گئی تھی لیکن اس نے اس کا اعتبار نہیں کیا تھا۔ اس وقت بھی جب شاہ شوش نے بات پلٹ کر اس کی شادی کا ذکر کیا تو وہ فریب میں آ گئی اور دل ہی دل میں خبر دینے والی کنیز کو برا بھلا کہنے لگی۔

شاہ شوش سرہانے کی طرف رخ کر کے بیٹھ گیا۔ سونے کے دونوں بڑے پیالے جن کے نیچے وہ رب اور ربہ شوش کو رکھا کرتا تھا۔ معمول کے مطابق اوندھے رکھے تھے۔ شاہ شوش صبح بیدار ہونے کے بعد پہلے ان دونوں مورتیوں کو سجدہ کرتا تھا۔ اس کے بعد دنیاوی کاموں میں مصروف ہوتا تھا۔

شاہ شوش نے پہلے اس پیالے کی طرف ہاتھ بڑھایا جس کے نیچے رب شوش کی مورتی رکھی تھی۔ ششبیل بھی بستر پر بیٹھی کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ شاہ شوش نے پیالے کا کنارہ پکڑ کر اسے اٹھایا مگر وہ اس قدر حیرت زدہ اور خوفزدہ ہوا کہ پیالہ اس کے ہاتھوں میں لرز کر زمین پہ گر گیا۔

شاہ شوش نے پھٹی پھٹی نظروں سے ششبیل کی طرف دیکھا لیکن وہ دل کو سنبھالے، آنکھیں بند کیے دو زانو بیٹھی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ جڑے ہوئے آگے کی طرف اس طرح اٹھے ہوئے تھے جیسے وہ عبادت میں ہی مصروف ہو حالانکہ وہ آنکھوں کے پپوٹوں کی جھری سے شاہ شوش کی بوکھلاہٹ کو دیکھ رہی تھی۔

شاہ شوش نے ششبیل کو عبادت میں مصروف دیکھ کر ہاتھ بڑھا کر دوسرے پیالے کو اٹھایا مگر اس کے

نیچے بھی کچھ نہ تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے رب اور ربیہ شوش مٹی بن کر مٹی میں مل گئے ہیں یا زمین نگل گیا ہے۔

"ششبیل!"

شاہ شوش اس قدر خوفناک آواز میں دھاڑا کہ ششبیل سب کچھ جانتے ہوئے بھی آواز کا دہرا اچھل پڑی۔ اس کی غزالی آنکھیں پھیل گئیں۔

"شاہ بھائی! کیا ہوا؟" اس نے پیالوں کی طرف توجہ دیے بغیر بھائی سے پوچھا اور اس کی طرف میں جھانکنے لگی۔

"دیکھتی نہیں ہمارے ربِ شوش اور ربیہ کہیں گم ہو گئے ہیں؟"

شاہ شوش بوکھلا کر خیمے کی ایک ایک چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ معاً اس کی نظر خیمے کے چاک پر پڑی:

"چوری، چوری۔ خداؤں کی چوری"۔

شاہ شوش چاک میں سر ڈال کر باہر جھانکتے ہوئے چیخا:

"ضرور ضرور یہ چوغان والوں کی حرکت ہے۔ انہوں نے ربِ شوش اور ربیہ شوش کو چرایا ہے۔ میں ایک کے ٹکڑے کر دوں گا اگر۔۔۔۔"

شاہ شوش نے مشکوک نظروں سے ششبیل کو دیکھا:

"کیا تو بھی شراب پی کے رات بھر سوتی رہی"۔

"نہیں شاہ بھائی"۔

ششبیل لرز گئی:

"میں رات میں کئی بار جاگی تھی۔ پتہ نہیں کب چور آیا؟ لیکن شاہ بھائی! یہ کیسا چور تھا کہ سونے کے چھوڑ گیا اور پتھر۔۔۔۔"

"بکواس نہ کر"۔

شاہ شوش نے اسے زور سے ڈانٹا:

"تو کیا جانے۔ یہ ہمارے خلاف سازش ہے۔ ہم چوغان والوں سے اس کا بدلہ لیں گے"۔

"شاہ بھائی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہمارے رب اور ربیہ خود ہی کہیں چلے گئے ہوں"۔ ششبیل نے بڑی معصومیت سے کہا اور جواب کے لیے بھائی کو دیکھنے لگی۔

شاہ شوش گھبرا گیا:

"ہاں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے لیکن کیوں؟ وہ کیوں چلے گئے؟ کیا ہم نے کوئی بات ان کی مرضی و منشا کے خلاف کی ہے؟"

"مجھے کیا پتہ شاہ بھائی!"

ششبیل نے سادگی سے جواب دیا:

"یہ تو جب وہ واپس آئیں گے تو معلوم ہو گا۔ آپ نے بھی تو ان کی حفاظت کا کوئی معقول انتظام نہیں کیا۔ آپ شراب پی کے ایسے پڑتے ہیں کہ کسی بات کی خبر ہی نہیں رہتی"۔

شاہ شوش غصے میں بھنایا ہوا باہر نکلا۔ باہر پہرے دار موجود تھا۔ اس کے کانوں میں چوری کی خبر پڑ چکی تھی اور وہ خوف کے مارے کانپ رہا تھا۔

شاہ شوش نے اس کی گردن پکڑی اور کھینچتا ہوا اندر لے آیا:

"تو سو رہا تھا؟ خیمے میں چوری کیسے ہو گئی؟"

پہریدار کی گردن پہلے ہی دبی ہوئی تھی وہ جواب کیسے دیتا۔ پھر اس کے پاس جواب بھی تو نہ تھا۔ اسے یہ اپنی ہی غلطی معلوم ہوئی کیونکہ وہ خود بھی رات بھر نشے میں دھت رہا تھا۔

ششبیل کو اس پر رحم آ گیا۔ بولی:

"شاہ بھائی! اس غریب کی کیا خطا؟ رب اور ربیہ تو پردہ چاک کر کے گئے ہیں۔ یہ دروازے پر پہرہ دے رہا تھا اسے کیسے خبر ہوتی؟"

شاہ شوش نے پہریدار کی گردن چھوڑ دی:

"مگر ششبیل سوال یہ ہے کہ وہ پردہ چاک کر کے کیوں گئے؟"

شاہ شوش نے ایک نیا سوال اٹھایا:

"انہیں جانا تھا تو دروازے سے بھی جا سکتے تھے؟"

"شاہ بھائی! یہ تو ان کی مرضی ہے"۔

ششبیل نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہا:

"دروازے کی طرف سے جاتے تو پہریدار انہیں ضرور دیکھتا۔ ممکن ہے ربِ شوش پہریدار پر اپنی روانگی نہ ظاہر کرنا چاہتے ہوں۔ ان کی مرضی میں کون دخل دے سکتا ہے!"

بت پرست قبائل میں خداؤں کی یہ پہلی چوری تھی۔ اس پر طرح طرح کی باتیں اور حاشیہ آرائیاں ہو رہی تھیں کچھ لوگ اسے ایک چوری کی واردات قرار دے رہے تھے لیکن زیادہ کا خیال تھا کہ ربِ شوش کو کوئی چوری نہیں

کر سکتا تھا۔ اگر چہ انہیں ہاتھ لگاتا تو اس کے ہاتھ جل جاتے۔ پروہتوں اور جنتوں نے لوگوں کو یہی باور کرانے کی کوشش کی اور اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ رب اور ربیہ کا اس طرح غائب ہو جانا قبیلے کے لیے ایک بڑی بات ہے۔ اگر رب جلدی واپس نہ آئے تو قبیلے پر کوئی بڑی مصیبت آ سکتی ہے۔

اسی شام کو ایک اور ایسا واقعہ پیش آیا جس نے شاہ شوش کو حواس باختہ کر دیا اور اسے یقین ہو گیا کہ رب شوش واقعی اس سے ناراض ہو کر کہیں اور چلے گئے ہیں۔

شاہ شوش ابھی اسی الجھن میں گرفتار تھا کہ ایک سوار نے اسے آ کر خبر دی کہ ڈیڑھ سو مسلح سوار تیزی سے اس طرف آ رہے ہیں۔

شاہ شوش کو پہلے گمان ہوا کہ چوغان والے حملہ کرنے آ رہے ہیں۔ اس نے فوراً اپنے آدمیوں کو تیار رہنے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر بعد شاہ شوش کا ایک اور سوار ہانپتا کانپتا آیا اور اس نے اطلاع دی کہ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر تاتاریوں کا ایک بڑا لشکر خیمہ زن ہے۔ اس لشکر کے کچھ سوار سامانِ رسد کی تلاش میں ادھر آ رہے ہیں۔ لشکر کا نام سن کر شاہ شوش کے اور بھی حواس جاتے رہے۔ وہ چوغان پر حملہ کرنا تو ایک طرف رہا، اپنے رب اور ربیہ کی گمشدگی کو بھی بھول گیا۔ اسے اپنے قبیلے اور بادشاہت کی فکر پڑ گئی۔ دم کے دم میں تمام خیموں میں یہ خبر پھیل گئی کہ تاتاری سوار حملہ کرنے آ رہے ہیں۔ شاہ شوش کے وہ سوار جو چوغان والوں کے مقابلے کے لیے تیار تھے تاتاریوں کا نام سن کر ان کے ہوش جاتے رہے۔

شاہ شوش نے اپنے بڑے بڑے سرداروں کو خیمے میں بلایا اور ان سے صلاح مشورے میں مصروف ہو گیا۔ تاتاریوں کی خانہ جنگی کی خبریں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ شاہ شوش بھی اس سے بے خبر نہ تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ سردار تیمور اور امیر حسین کے جھگڑے سے دور دور رہے گا لیکن اب تاتاری لشکر کی نزدیکی منزل پر موجودگی اور اس کے سواروں کی اس طرف آمد اس کے لیے بڑی پریشان کن تھی۔ اسے اب احساس ہو رہا تھا کہ اس نے چوغان والوں پر حملہ کرنے کا غلط فیصلہ کیا ہے کیونکہ وہ اپنے علاقے سے دور اس ویرانے میں پڑا تھا اور اسے اپنے علاقے سے کسی فوری کمک کی توقع بھی نہ تھی۔

ان حالات میں اس نے اپنے سرداروں کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ تاتاری دستہ اگر کسی چیز کا مطالبہ کرے تو جھگڑا کرنے کے بجائے کچھ لے دے کے انہیں رخصت کر دیا جائے تاکہ وہ تاتاریوں کی آویزش سے دور رہیں اور چوغان پر حملہ کرنے کے بجائے چپ چاپ اپنے علاقے میں واپس چلے جائیں۔

شاہ شوش اور اس کے سردار ابھی کسی فیصلے پر نہ پہنچے تھے کہ ڈیڑھ سو تاتاری سوار اس کی خیمہ گاہ میں دھمکے۔ تاتاریوں نے شاہ شوش کے دو جاسوسوں کو ایک گھوڑے پر باندھ رکھا تھا اور ان کی رہنمائی میں وہ یہاں

پہنچے تھے۔

شاہ شوش کے سوار مسلح ہو چکے تھے اور تاتاریوں کی اس قلیل تعداد پر آسانی سے قابو پا سکتے تھے لیکن شاہ کو ڈر تھا کہ اگر اس نے مقابلے کی کوشش کی تو کہیں پورا تاتاری لشکر یہاں نہ آ پہنچے۔ اس لیے اس نے مصالحت کا فیصلہ کیا اور تاتاری سوار بغیر کسی روک ٹوک کے اس کے خیمے تک پہنچ گئے۔

شاہ شوش انتہائی بددماغ اور متکبر تھا لیکن تاتاریوں کا کچھ ایسا رعب تھا کہ اس نے اپنے خیمے سے نکل کر تاتاری سردار کا استقبال کیا۔

"شاہ شوش اپنے تاتاری دوستوں کو خوش آمدید کہتا ہے۔" شاہ نے آگے بڑھ کر تاتاری سردار سے نہایت خندہ پیشانی سے کہا۔

تاتاری سردار، شاہ شوش کا نام سن کر گھبرا گیا۔ وہ کوئی بڑا سردار نہ تھا۔ فوراً گھوڑے سے اترا اور شاہ کے سامنے قدرے خم ہو کر کہا:

"تاتاریوں کا ایک ادنیٰ سردار، شاہ شوش کی خدمت میں سلام پیش کرتا ہے اور شاہ افغانستان، سردارِ اعظم امیر حسین کی طرف سے دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے۔"

سردار نے اپنا ہاتھ آگے کی طرف کر دیا۔ شاہ شوش نے مسکرا کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر اپنے خیمے کی طرف چلا۔

خیمے کے دروازے پر پہنچ کر شاہ نے پلٹ کر اپنے ایک سردار کو حکم دیا:

"مہمانوں کے لیے کھانا تیار کیا جائے اور تمام تاتاری سواروں کے قیام کا بندوبست کیا جائے۔ آج شب تمام تاتاری سوار ہمارے مہمان رہیں گے۔"

"نہیں شاہ!"

تاتاری سردار نے دخل دیا:

"ہم آپ کے شکر گزار ہیں لیکن ہم شب کو قیام نہیں کر سکتے۔ ہم اپنے شاہ امیر حسین کی طرف سے آپ کے پاس دوستی اور تعاون کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ ہمیں اپنا کام پورا کر کے لشکر میں واپس جانا ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے سردار!"

شاہ شوش نے تکلف بھرا لہجہ اختیار کیا:

"آپ کے شاہ کیا سوچیں گے کہ شاہ شوش نے ان کے سواروں کی ایک شب بھی مہمان داری نہ کی۔ نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا!"

"یہ تو صحیح ہے شاہِ محترم!"

تاتاری سردار بولا:

"لیکن ہماری واپسی اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہمارے لشکر میں اس وقت گھوڑوں کی کمی ہے اور کچھ کھانے پینے کے سامان کی بھی ضرورت ہے۔ اگر آپ شاہ امیر حسین سے دوستی اور تعاون کے لیے تیار ہیں تو ہمیں ضروری سامان مہیا کر دیجیے تاکہ ہم واپس جا کر اپنے شاہ کو آپ کی دوستی اور تعاون کا عملی ثبوت پیش کر سکیں۔" یہ کہتے ہوئے تاتاری سردار نے کنکھیوں سے شاہ شوش کو دیکھا۔

شاہ شوش کو تاتاری سردار کی یہ بات بڑی ناگوار گزری۔ اس کا چہرہ متغیر ہو گیا لیکن اس نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا:

"میں تاتاری بادشاہ سے دوستی پر فخر کرتا ہوں۔ میں کوشش کروں گا کہ ان کے ساتھ ممکن حد تک تعاون بھی کروں۔"

"تو پھر آپ یوں کیجیے شاہِ محترم!"

تاتاری سردار لاپروائی سے بولا:

"ہمارے لیے دو سو گھوڑوں اور چار سو بھیڑوں کا انتظام کر دیجیے۔ فی الحال آپ سے اسی قدر تعاون درکار ہے۔ ہاں جنگ کے دنوں میں آپ کو فوجی تعاون بھی کرنا ہو گا۔ غالباً دو سو سواروں کا ایک دستہ آپ آسانی سے مہیا کر سکیں گے۔ شاہ امیر حسین آپ کے اس تعاون سے مزید خوش ہوں گے۔"

تاتاری سردار نے محسوس کر لیا تھا کہ شاہ شوش رعب میں آ گیا ہے اور اس سے جو کچھ طلب کیا جائے گا وہ بلا پس و پیش دے دے گا اس لیے اس کا انداز تحکمانہ ہو گیا۔ اس نے یہ مطالبہ اس طرح پیش کیا جیسے اس نے شاہ شوش کو مسحور کر لیا ہے اور اب اپنی شرائط پر صلح چاہتا ہے۔

تاتاری سردار نے اس گفتگو کے دوران اپنی نظریں شاہ شوش پر جمائے رکھیں تاکہ وہ اس کے تاثرات اور ردِ عمل سے واقف ہوتا رہے۔

"اچھا اندر تو چلیے۔"

شاہ شوش نے مضمحل آواز میں کہا:

"ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ہم بیٹھ کے باتیں کریں گے۔ اس دوران کھانا تیار ہو جائے گا اور جہاں تک ہم سے تعاون ہو سکے گا ہم ضرور کریں گے۔"

شاہ شوش اسے خیمے میں لے گیا۔ اس وقت وہ بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنے خاص حا

دیوں کو بھی بلا لیا تاکہ جو فیصلہ ہو اس میں سرداروں کا مشورہ بھی شامل رہے۔

شاہ کے سردار جمع ہو گئے تو اس نے سلسلۂ کلام شروع کیا:

"دیکھو تاتاری سردار! ہم شاہ امیر حسین سے تعاون کرنا چاہتے ہیں لیکن جو مطالبہ ہم سے کیا گیا ہے وہ ہمارے امکان سے باہر ہے۔ ہم لوگ خود اس وقت حالتِ جنگ میں ہیں۔ پچغان قبیلہ ہمارا دشمن ہے۔ ہم ان سے لڑنے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں خود ہمیں مشکلات درپیش ہیں۔ آپ شاہ امیر حسین سے ہماری مشکلات بیان کر دیں۔ اگر آپ خواہش کریں تو ہم اپنا سردار آپ کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ وہ شاہ کے دربار میں ہماری نمائندگی اور ترجمانی کرے گا!"

تاتاری سردار شاہ شوش کے اس غیر متوقع جواب سے کچھ پریشان ہوا۔ شاہ شوش کا رویہ خیمے کے باہر مالکانہ تھا لیکن اندر آ کے اس نے جیسے چولا بدل لیا تھا۔

ایک لمحہ سوچنے کے بعد تاتاری سردار بولا:

"اس کا مطلب ہے کہ شاہ شوش، ہمارے امیر سے تعاون کے لیے آمادہ نہیں۔"

"ایسا ہرگز نہیں ہے۔"

شاہ شوش نے فوراً تردید کی:

"ہم کب کہتے ہیں کہ ہم تعاون نہیں کریں گے لیکن اس وقت ہماری بھی مجبوریاں ہیں اور ہمیں خود شاہ امیر حسین کے تعاون کی ضرورت ہے۔"

تاتاری سردار کے لیے یہ جواب پہلے سے بھی زیادہ غیر متوقع تھا۔ وہ جھلا کے بولا:

"شاہ شوش! آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ تعاون کرنے سے انکار نہیں کرتے لیکن ایک چھوٹے سے مطالبے سے انکار کر رہے ہیں۔"

"ہم نے مطالبے سے بھی انکار نہیں کیا۔"

شاہ نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا:

"آپ نے جو مطالبہ کیا ہے ہم اس سے زیادہ جانور پیش کرنے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ آپ بھی ہم سے تعاون کریں۔"

"ہم تعاون کریں؟"

تاتاری سردار نے حیرانی سے پوچھا:

"شاہ شوش تاتاریوں سے کیا تعاون چاہتے ہیں؟"

"ہم شاہ امیر حسین کے لشکر کو کوئی زحمت نہیں دینا چاہتے۔"

شاہ شوش نے تدبر کا بڑا کامیاب مظاہرہ کیا:

"آپ کے ساتھ ڈیڑھ دو سو سوار ہیں۔ اس مختصر جماعت سے آپ ہمارا ساتھ دیں اور ہمارے سا[تھ]
چوغان سے جنگ میں شریک ہوں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہمیں چوغان سے جو مالِ غنیمت حاصل ہوگا وہ سب
کے حوالے کر دیں گے۔ اگر کچھ کمی بیشی ہوئی تو اپنے پاس سے پورا کریں گے۔"

تاتاری سردار بھونچکا رہ گیا۔

وہ شاہ شوش کو محض ایک اجڈ اور جاہل سردار سمجھ رہا تھا لیکن اس نے ایسی صورت سامنے رکھ[ی]
سردار کے لیے اس کا جواب دینا مشکل ہو گیا۔ اسے بہرصورت اپنا وقار بھی برقرار رکھنا تھا۔ بولا:

"شاہ نے جو بات کہی ہے وہ قابلِ غور ہے لیکن اس کا جواب میں تنہا نہیں دے سکتا۔ مجھے اپنے سا[تھیوں]
سے مشورہ کرنا پڑے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مجھے اس سلسلے میں امیر کے پاس خود جا کر گفتگو کرنی پڑ[ے]"

"تاتاری سردار کا کہنا بالکل درست ہے۔"

شاہ نے اس کی تائید کر دی:

"میں نے بھی اس اہم گفتگو کے لیے اپنے سرداروں کو اکٹھا کیا ہے۔ آپ بھی اپنے ساتھیوں سے [مشورہ]
کر سکتے ہیں۔ مسئلہ فوجی تعاون کا ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو شاہ امیر حسین کا عندیہ بھی معلوم کر لی[ں]
اس صورت میں میرا قبیلہ ہمیشہ کے لیے آپ کا حلیف ہو جائے گا اور میں اپنے تمام سرداروں کے ساتھ آپ[کے]
دوش بدوش آپ کے دشمن کا مقابلہ کروں گا۔"

بات یہاں پہنچ کر رک گئی۔

شاہ شوش چاہتا تھا کہ تاتاری سردار اس کے ساتھ ہی کھانا کھائے لیکن تاتاری سردار اپنی جگہ پر بے[تاب]
جلد سے جلد اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے شاہ شوش سے "مشورے" کا بہانہ کیا اور [اسے]
چھوڑ کر سیدھا اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا۔

تاتاری سردار نے جب شاہ شوش کے مشروط تعاون کی تفصیل بتائی تو وہ بھی پریشان ہو گئے۔ [ان]
کا خیال تھا کہ وہ شاہ شوش کو مرعوب کر کے گھوڑے اور بھیڑیں حاصل کرے گا لیکن شاہ نے تعاون کی [شرط]
رکھی تھی اس میں تاتاریوں کے زیادہ نقصان کا امکان تھا۔ اسے قبیلہ چوغان کی طاقت کا بھی اندازہ نہ [تھا]
تو لڑائی ہوتی ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اگر شاہ نے تاتاریوں کی مدد سے چوغان کو [شکست]
دے بھی دی تو کیا پتہ اس جنگ میں کس قدر تاتاریوں کی جانیں ضائع ہو جائیں جبکہ اس وقت سردار[ی]

ان کے سر پر منڈلا رہا تھا۔

ایسی صورت میں محض ایک امیدِ موہوم پر پرائی آگ میں کود پڑنا کوئی عقلمندی نہ تھی۔ تاتاری سردار نے
شاہ شوش کی خیمہ گاہ میں آتے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ شاہ کے پاس جتنے سوار ہیں ان پر آسانی سے قابو پانا
مشکل ہے۔

آخر یہ طے ہوا کہ کسی باعزت طریقے سے ان وحشیوں سے جان چھڑائی جائے اور خواہ مخواہ ایک اور
دشمن نہ پیدا کیا جائے۔

تاتاری سردار کے شاہ شوش کے خیمے سے اٹھ جانے کے بعد شاہ کے سرداروں نے شاہ کی بہت تعریف
کی۔ وہ اپنے شاہ کو بہادر تو سمجھتے ہی تھے لیکن اس نے تاتاریوں کے ساتھ جو جنگی چال چلی تھی اس نے سرداروں
کے دل میں شاہ کی عزت دوبالا کر دی۔

شاہ شوش بہت مسرور تھا۔ اس کی بہن شیشبین جو دوسرے خیمے سے کان لگائے تمام گفتگو سن چکی تھی بڑی
بے چینی سے بھائی کا انتظار کر رہی تھی تاکہ اسے اس کامیاب جنگی چال پر مبارک باد دے لیکن شاہ شوش اپنے
ساتھیوں پر رعب ڈال رہا تھا اور بڑی دور کی ہانک رہا تھا۔

"دشمن کے ہاتھ سے سانپ کو مارنا اسے کہتے ہیں۔"

شاہ شوش نے بڑے غرور سے کہا:

"اگر تاتاری سواروں کی مدد سے ہم نے چوغان کو شکست دے دی تو ہمارے پاس سے کچھ نہ جائے گا سوائے
اس کے کہ ہمیں مالِ غنیمت حاصل نہ ہو۔ میں نے یہ بھی سوچا ہے کہ میں تاتاریوں کو آگے رکھوں گا۔ وہ مالِ غنیمت
کے لالچ میں جان توڑ کر لڑیں گے۔ انہی کی جانوں کا زیادہ نقصان ہوگا۔"

"شاہ پر دیوتاؤں کا سایہ ہے۔"

یہ بات قبیلے کے بڑے مذہبی پیشوا نے کہی جسے شاہ نے خصوصیت کے ساتھ اس مجلس میں شرکت کی
[دعو]ت دی تھی:

"یہ بات صرف دیوتا ہی شاہ کے دل میں ڈال سکتے تھے۔"

"پروہت نے بالکل درست فرمایا۔"

شاہ کے ایک نائب نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی:

"شاہ پر صرف دیوتاؤں کا سایہ ہی نہیں بلکہ معلوم ہوتا ہے جیسے دیوتا آسمان سے ہماری مدد کے لیے اتر
کر آ گئے ہوں۔ تاتاری سردار تو شاہ کے سامنے کچھ بول ہی نہیں سکا۔ اس کی تو زبان بند ہو گئی۔"

"ہمارے دیوتا!"

شاہ شوش نے ایک ٹھنڈی سانس بھری:

"کاش اس وقت رب اور ربیہ شوش میرے خیمے میں موجود ہوتے۔ پھر تم لوگ دیکھتے کہ یہ ان ہمارے سامنے کیسے ہاتھ جوڑتے۔ افسوس! وہ ہم سے ناراض ہو کر چلے گئے۔"

"شاہ اطمینان رکھیں۔"

پروہت نے فوراً ٹکڑا لگایا:

"جب دیوتا مہربان ہو کر آسمان سے اتر آئے ہیں تو رب اور ربیہ کی ناراضگی بھی دور ہو جائے گی۔ ہم پوجا کرتے ہیں۔ وہ زیادہ دن ہم سے ناراض نہیں رہ سکتے۔"

شاہ شوش جب محفل برخاست کر کے اپنے خیمے میں گیا تو شبیل دوڑ کر بھائی کے گلے میں لٹک گئی اور فرطِ مسرت سے بولی:

"شاہ بھائی! مبارک ہو۔ ہمارے خداؤں کی ناراضگی دور ہو گئی۔ وہ واپس آ جائیں گے۔"

"کاش ایسا ہی ہو۔" شاہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"کاش نہیں۔ وہ ضرور واپس آئیں گے شاہ بھائی....."

شبیل نے پورے وثوق سے کہا کیونکہ سرائکی نوجوان اسے یقین دلا گیا تھا کہ وہ رب اور ربیہ کو واپس لائے گا۔

"میرا دل بھی یہی کہتا ہے شبیل!"

شاہ شوش خوش ہونے کے باوجود خداؤں کے ناراض ہو کر چلے جانے سے پریشان تھا:

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ رب اور ربیہ کے واپس آتے ہی میں ان کے سامنے ایک زبردست قربانی کروں گا۔ ایسی قربانی جو آج تک کسی نے پیش نہ کی ہو۔"

شبیل نے بھائی کی بات کو اس کی پریشانی پر محمول کیا۔ فوراً بولی:

"ضرور شاہ بھائی! خداؤں کی واپسی ہمارے لیے بڑی برکت کا باعث ہو گی۔ آپ دل کھول کر قربانی میں تو کہتی ہوں آپ قربانی کی تیاریاں ابھی سے شروع کر دیجیے۔ کیا خبر رب اور ربیہ شوش کل ہی واپس آ جائیں"

"یہ تو کیسے کہہ سکتی ہے شبیل؟"

شاہ نے اسے تعجب سے دیکھا:

"خدا جب ناراض ہوتے ہیں تو اپنے پجاریوں کو جلدی معاف نہیں کرتے۔"

"میرے اس یقین کی ایک وجہ ہے شاہ بھائی۔"

شبیل نے مسکرا کر کہا:

"آپ سنیں گے تو آپ کو بھی ان کی واپسی کا یقین ہو جائے گا۔"

"کیا۔ کیا وجہ ہے تیرے یقین کی؟"

شاہ بے چین ہو گیا:

"جلدی بتا مجھے!"

"شاہ بھائی! جب آپ برابر کے خیمے میں باتیں کر رہے تھے تو میں بہت پریشان تھی۔"

شبیل نے سنجیدہ سا منہ بنا کر کہنا شروع کیا:

"اسی پریشانی میں میری آنکھ لگ گئی۔ میں نے دیکھا کہ رب شوش اور ربیہ شوش میرے خیمے میں آئے ہیں اور کہہ رہے ہیں..... 'شبیل خوش ہو جا۔ ہم نے تیرے بھائی کی خطائیں معاف کر دیں۔ اسے خوش خبری سنا دے کہ ہم بہت جلد واپس آ رہے ہیں لیکن اسے بھی ایک قربانی دینا ہو گی' تو اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائے گی کیونکہ ہم نے تیرے لیے ایک نیا گھر منتخب کیا ہے۔ اس گھر میں تو زیادہ خوش رہے گی۔'"

شاہ شوش اس کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ شبیل چپ ہوئی تو بولا:

"اور کیا کہا رب شوش نے؟"

"اور تو کچھ نہیں کہا" شبیل بولی جیسے کچھ یاد کر رہی ہو:

"کچھ دیر دونوں مسکراتے رہے پھر جانے کہاں غائب ہو گئے۔"

"ٹھیک ہے میں سمجھ گیا۔ جو وہ چاہتے ہیں وہی ہو گا لیکن....."

شاہ شوش نے رک کر شبیل کو دیکھا:

"لیکن کیا شاہ بھائی؟" شبیل نے گھبرا کر پوچھا۔

"لیکن یہ کہ تجھے میرا ساتھ دینا ہو گا۔"

شاہ نے متانت سے کہا:

"خداؤں کی مرضی اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب تو بے چون و چرا میرا کہنا مان لے۔"

"شاہ بھائی!"

شبیل نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں:

"بھلا میں آپ کی بات سے انکار کر سکتی ہوں۔ آپ کے کہنے سے تو میں جان بھی دے سکتی ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تو مجھ سے جدا ہونے پر راضی ہو جائے گی؟"

شاہ شوش اس سلسلے میں ستشبیل کی رضامندی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پروہتوں نے اس کے دماغ میں
بات ڈال دی تھی کہ اسے اپنی پیاری بہن کی قربانی دے کر خداؤں کو خوش کرنا چاہیے۔ ستشبیل کے خواب میں
قربانی کا ذکر تھا۔۔۔۔ مزید یہ کہ اسے ستشبیل کو ہمیشہ کے لیے اپنے سے جدا کرنا ہو گا۔ ان تمام باتوں سے
اس نتیجے پر پہنچا کہ رب شوش نے بھی ستشبیل کی قربانی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ستشبیل نے فوراً ہی جواب نہیں دیا۔ کچھ توقف کے بعد بولی:

"شاہ بھائی! تم سے جدائی کے تصور ہی سے میں لرز جاتی ہوں لیکن رب شوش مجھے کسی نئے گھر بھیجنا
چاہتے ہیں اور آپ بھی اس کے لیے آمادہ ہیں تو میں دل پہ پتھر رکھ لوں گی۔ رب شوش اور آپ کے حکم کے آگے
مجھے سر جھکانا ہی پڑے گا۔"

"شاباش ستشبیل شاباش!"

شاہ شوش مسرت سے بھرپور لہجے میں بولا:

"تو نے میرا دل خوش کر دیا۔ اب میں قربانی دے کے خداؤں کی خوشنودی حاصل کروں گا۔" شاہ شوش
واپس چلا گیا۔

بہن بھائی کے درمیان قربانی کے مسئلہ پر بڑی واضح اور تفصیلی گفتگو ہوئی تھی لیکن کتنی عجیب بات
دونوں ہی غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ شاہ شوش نے ستشبیل کی باتوں سے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ خداؤں کی خوشنودی
اپنے بھائی کی ترقی کے لیے اپنی جان کی قربانی دینے پر آمادہ ہو گئی ہے اور اسے قربانی کے وقت ستشبیل
سختی نہیں کرنی پڑے گی۔

ادھر ستشبیل اس لیے خوش تھی کہ اس نے جو فرضی خواب بھائی کے سامنے بیان کیا تھا اس میں
جدائی کا ذکر تھا۔ ستشبیل چاہتی تھی کہ رب شوش کے حوالے سے وہ شاہ شوش کو اس بات پر آمادہ کر
اپنے سے جدا کر کے نئے گھر میں جانے کی اجازت دے دے۔ نئے گھر سے اس کی مراد سرائلی جوان کا گھر
سوچا تھا کہ سرائلی جوان کے آنے پر وہ کسی ذریعے سے سرائلی سے اپنی شادی کا مسئلہ چھیڑ
مجبور کرے گی کہ وہ رب شوش کے کہنے کے مطابق قربانی دے اور اسے اپنے سے جدا کر کے سرائلی جوان
کر دے۔

بہرحال!

اس غلط فہمی نے دونوں کے لیے مشکلات پیدا کر دیں۔

تاتاری سردار کھانا کھانے کے بعد دیر تک صلاح و مشورہ کرتے رہے۔ آخر یہ طے کر کے سو گئے کہ صبح کو
کسی نہ کسی طرح ان وحشیوں سے جان چھڑا کر واپس چلے جائیں گے۔ چنانچہ اپنے منصوبے کے مطابق
تاری سردار نے شاہ شوش سے ملاقات کی۔

شاہ دوپہر تک سویا کرتا تھا لیکن رات کو اس کی بہن ستشبیل نے اسے یہ کہہ کر ڈرا دیا کہ اگر اس نے زیادہ
راب پی تو ممکن ہے رب اور رب یہ پھر ناراض ہو جائیں اور یہاں آنے کے بجائے کسی اور طرف نکل جائیں۔ شاہ
ب نہ تو اپنے خداؤں کو ناراض کرنا چاہتا تھا اور نہ ستشبیل کو۔ اس لیے اس نے کم شراب پی اور صبح کو جلدی بیدار ہو گیا
ب اسے تاتاری سردار کے آنے کی اطلاع دی گئی تو وہ ملاقات کے لیے تیار تھا۔

اس نے اپنے سرداروں کو بھی بلا لیا تاکہ مسئلے کا فیصلہ ان کے سامنے ہو۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی
ہیں پھر تاتاری سردار نے کہا:

"شاہ شوش! یہ بتلائیے کہ اگر آپ کا کوئی سردار بغیر آپ کی اجازت کے کسی جنگ میں شریک ہو تو آپ اسے
سزا دیں گے یا معاف کر دیں گے؟"

"تاتاری سردار! میرے سردار ایسی جرأت کر ہی نہیں سکتے۔"

شاہ نے بلا توقف جواب دیا:

"اور اگر کسی نے ایسی حماقت کر ڈالی تو خواہ وہ فتح حاصل کر کے ہی کیوں نہ آئے میں اسے حکم عدولی کے جرم
میں گرفتار کر کے اسے قتل کرا دوں گا۔"

"بے شک ایک بادشاہ اور حاکم کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔"

تاتاری سردار نے اس کی تائید کی:

"اگر ماتحت سردار اپنی مرضی سے کام کرنے لگیں گے تو اس سے شاہی وقار کو نقصان پہنچتا ہے اور قانون
شکنی کی راہیں کھل جاتی ہیں۔"

"لیکن تاتاری سردار! تم نے یہ سوال مجھ سے کیوں کیا؟"

شاہ شوش نے الجھتے ہوئے پوچھا:

"کیا تمہارے خیال میں میرے کسی سردار نے اس قسم کی قانون شکنی کی ہے؟"

"جی نہیں شاہ شوش!"

تاتاری سردار نے ملائمت سے کہا:

"دراصل یہی قانون اور یہی حکم ہمارے شاہِ امیر حسین والیِ افغانستان کا ہے۔ ہم دل سے آپ کی مدد کرنا چاہتے ہیں لیکن اپنے بادشاہ کی اجازت کے بغیر ہم کسی سے خود جنگ نہیں کر سکتے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تاتاری خیمہ گاہ میں واپس جا کر اپنے شاہ امیر حسین سے آپ کے حالات بیان کریں گے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ ضرور تعاون کریں گے۔ اگر انہوں نے اجازت دے دی تو ہم کم از کم تین سو سواروں کے ساتھ واپس آئیں گے تاکہ آپ کو اپنے دشمن کو شکست دینے میں پریشانی نہ ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم آپ کو مجبور نہیں کرتے۔"

شاہ شوش بہت خوش ہوا اور اس نے ایک فاتحانہ نظر اپنے سرداروں پر ڈالی:

"آپ واپس جائیں اور اجازت حاصل کر کے جلد لوٹ آئیں۔ جب تک آپ نہیں آئیں گے ہم آگے نہیں بڑھیں گے۔"

تاتاری سردار نے کہا:

"دراصل میں شاہ شوش سے درخواست کرنا چاہتا ہوں لیکن پھر خیال آتا ہے کہ کہیں یہ اصول کے خلاف نہ ہو۔"

"نہیں تاتاری سردار۔ آپ اپنی خواہش بیان کریں۔ ہمیں ناگوار نہیں ہوگا۔"

شاہ شوش خود ان کے یہاں زیادہ دیر ٹھہرنے سے پریشان تھا اور چاہتا تھا کہ انہیں کچھ دے کر رخصت کر دیا جائے۔

"شاہ شوش! آپ جانتے ہیں کہ ہم لوگ سامانِ رسد کے لیے نکلے ہیں۔"

تاتاری سردار نے رک کر شاہ کے چہرے کو غور سے دیکھا:

"اگر ہم خالی ہاتھ خیمہ گاہ میں واپس گئے تو شاید امیر حسین ہم پر ناراض ہوں اس لیے ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمارے مطالبے سے قطع نظر ازراہِ دوستی ہمیں کچھ گھوڑے اور بھیڑیں عنایت کر دیں تاکہ ہم اپنے امیر کے سامنے شرمندہ نہ ہوں۔"

"ہم اپنے مہمانوں کی خاطر مدارات دل کھول کر کرتے ہیں۔"

شاہ نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا:

"آپ چلنے کی تیاری کریں۔ ہم پچاس گھوڑے اور ایک سو بھیڑیں آپ کے ساتھ کر دیں گے۔"

"بہت بہت شکریہ شاہ شوش کا۔" تاتاری سردار خوش ہو کر بولا اور پھر فوراً ہی اٹھ کے اپنے ساتھیوں میں واپس آگیا۔

"کیوں! ہم نے کیسا سودا کیا سردارو؟" شاہ شوش نے بڑی تمکنت سے سرداروں سے پوچھا۔

"یہ سب آسمانی دیوتاؤں کی مہربانی ہے۔"

ایک پروہت نے کہا:

"ورنہ یہ تاتاری جان کا جنجال ہیں۔ جس سے چمٹ جائیں اس کا خون تک چوس لیتے ہیں۔"

تاتاریوں نے فوراً اپنے گھوڑوں پر کاٹھیاں چڑھائیں اور سوار ہو کر شاہ شوش کو سلام کرنے کے لیے آئے۔ شاہ شوش نے حسبِ وعدہ گھوڑوں اور بھیڑوں کا انتظام کرا دیا تھا۔ یہ جانور تاتاریوں کے حوالے کر دیے گئے۔ اور وہ خوشی خوشی واپس ہو گئے۔

شاہ شوش اور اس کے سردار اپنی جگہ خوش تھے کہ پچاس گھوڑوں اور سو بھیڑوں پر سودا ہو گیا ورنہ تاتاری نہ جانے کیا غضب ڈھاتے۔

شاہ شوش نے اسی جگہ خیمے لگائے رکھے۔ اسے امید تھی کہ اس کا رب اور ربیہ واپس آئیں گے لیکن جب وہ واپس نہ آئے تو وہ بڑا دل شکستہ ہوا۔ سب سے زیادہ افسوس اور صدمہ ششبیل کو تھا۔ سرائی جولن اپنے وعدے کے مطابق اب تک واپس نہیں آیا تھا۔ ششبیل جب سوچتی تو اس کا دل بیٹھنے لگتا۔ اس نے بھائی کے سامنے جو دعوا کیا تھا وہ جھوٹا پڑ رہا تھا۔ دن گزرتے جا رہے تھے اور دیوتاؤں کی واپسی کے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔

شاہ شوش نے اب تک جتنی لڑائیاں جیتی تھیں ارب اور ربیہ کے بت اس کے ساتھ رہے تھے۔ اس کے خیال میں ان تمام لڑائیوں میں اسے بتوں کی برکت کی وجہ سے کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ آخر خداؤں کی واپسی سے ناامید ہو کر شاہ شوش نے چرغان پر حملے کا ارادہ ترک کر دیا اور لشکر کو حکم دیا کہ خیمے ڈیرے اکھاڑ کر اپنے علاقے شوش جانے کی تیاری کریں۔

قاعدے کے مطابق نصف سے زیادہ خیمے اکھاڑ کر منزل کی طرف روانہ کر دیے گئے تاکہ جب لشکر وہاں پہنچے تو اسے خیمے تیار ملیں۔ نصف خیموں کے ساتھ شاہ شوش نے اپنے لشکر کے ساتھ وہ رات اسی جگہ گزارنے کا فیصلہ کیا۔ دوپہر سے شام اور پھر رات ہو گئی۔ خیموں کے باہر الاؤ اور اندر مشعلیں روشن ہو گئیں۔

شاہ شوش اس رات بہت مضمحل، اداس اور دل برداشتہ تھا۔ اس نے شام ہی سے شراب پینا شروع کر دی حالانکہ اس نے ششبیل سے وعدہ کیا تھا کہ اب زیادہ شراب نہیں پیے گا۔

ابھی رات کا پہلا ہی پہر تھا کہ خیمے کے باہر گھوڑے کے دوڑنے کی آواز آئی۔ شاہ شوش نشے میں تھا لیکن
اسے تاتاریوں کے واپس آنے کا دھڑکا لگا ہوا تھا اس لیے چوکنا ہو گیا اور بڑھ کر تلوار اٹھا لی۔ ششبیل نے بھی
سنبھال لی۔ قبائلی لڑکیاں اور خواتین اہم موقعوں پر مردانہ وار جنگ میں حصہ لیتی تھیں۔

شاہ شوش باہر نکلنے والا تھا کہ اس کے کان میں پہرے دار کی آواز آئی جو اندر آنے کی اجازت طلب
رہا تھا۔ شاہ شوش کے اشارے پر ششبیل ایک پردے کے پیچھے چھپ گئی۔ شاہ نے پہرے دار کو اجازت
دی تو اس کے ساتھ ہی شاہ کا نائب بھی اندر آ گیا۔

"شاہ شوش کو مبارک ہو"۔

پہرے دار کے بجائے شاہ کے نائب نے گفتگو کا آغاز کیا:

"ایک جوان کسی دور علاقے سے آیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ وہ رب اور ربیہ شوش کے بارے میں
مبارک خبر لے کر آیا ہے"۔

"فوراً بلاؤ اسے۔ تم نے اسے باہر کیوں چھوڑا ہے؟"

شاہ شوش نے شراب کے برتن ایک طرف کر دیے اور آنے والے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔
پردے کے پیچھے کھڑی ہوئی ششبیل کے دل میں پنکھے سے لگ گئے تھے۔ وہ امید و بیم کے دوراہے پر
کھڑی تھی۔ ایک دل کہتا کہ سراکی جوان نے وعدہ وفا کیا اور آنے والا شوش کے خداؤں کو واپس لایا ہے
پھر وہ اس خیال کی خود ہی تردید کر دیتی کیونکہ نائب نے صرف یہ اطلاع دی تھی کہ آنے والے کے پاس
خداؤں کی کوئی اہم خبر ہے۔ غرض مخبر یا قاصد کے آنے تک کے یہ چند لمحے ایک بوجھ بن کے ششبیل کے ذہن پر
اور مسلتے رہے۔

آخر خیمے کا پردہ اٹھا۔

آگے پہرے دار تھا، اس کے پیچھے شاہ کا نائب اور ان دونوں کے عقب میں وہ تھا جسے دیکھ کر ششبیل کا
دل سینے میں اس زور سے اچھلا کہ اسے خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ عقب میں آنے والا شوش کے خداؤں کا
سراکی جوان تھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے خیمے میں داخل ہوا تھا اور نظریں نیچی کیے شاہ شوش کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا
تھا۔

سراکی جوان اس وقت اپنے قبائلی کپڑوں میں تھا اور ایک بیش قیمت ہیرا اس کی پگڑی میں ٹکا ہوا تھا۔
ایک ہاتھ میں ریشم کا ایک تھیلا تھا اور پشت پر ایک لمبا سا تھیلا تھا جس میں سامان بھرا تھا۔

"تم کون ہو اور کیا خبر لائے ہو؟" شاہ شوش نے سراکی جوان کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"اے شاہ عالی مقام! میں قبیلہ چوغان کے سردارِ اعلیٰ کی طرف سے امن، دوستی اور باہمی تعاون کا پیغام لایا
ہوں۔ میں قبیلہ چوغان کا......"

"تم ہمارے خداؤں کے بارے میں کیا خبر لائے ہو؟"

شاہ شوش نے اسے درمیان ہی میں ٹوک دیا:

"سب سے پہلے ہمیں یہ بتایا جائے کہ تم یا تمہارا قبیلہ رب اور ربیہ شوش کے بارے میں کیا خبر
رکھتے ہیں؟"

"شاہِ محترم!"

سراکی نے نظریں ملائے بغیر کہا:

"آسمانی رب اور ربیہ شوش کے بارے میں ہمارے سردارِ اعلیٰ نے یہ پیغام بھیجا ہے کہ آپ کے رب اور
ربیہ ناراض ہو کر چوغان قبیلے میں تشریف لے گئے ہیں"۔

"چوغان قبیلے میں؟"

شاہ شوش نے حیران ہو کر پوچھا:

"تم لوگوں نے ہمارے خداؤں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟"

"اے شاہ شوش!"

سراکی نے اطمینان سے جواب دیا:

"دیوتا یا خدا آپ کے ہوں یا ہمارے۔ وہ ہم سب کے لیے قابلِ احترام اور لائقِ پرستش ہیں۔ ہمارے
قبیلے نے ان کو قربانیاں پیش کیں۔ ان کے غیظ و غضب کو ٹھنڈا کیا اور آپ کی طرف سے معذرت کر کے ان سے
معافی مانگی!"

"پھر...... پھر کیا ہوا؟" شاہ شوش نے بے چینی سے پوچھا۔

"رب اور ربیہ شوش نے آپ کو معاف کر دیا ہے شاہ شوش!" سراکی نے جواب دیا اور نظریں اٹھا کر شاہ شوش
کو دیکھا۔

"ہم چوغان کے سردارِ اعلیٰ کے شکر گزار ہیں!"

شاہ نے بڑی نرمی سے کہا:

"ہم چوغان سردار کے امن اور دوستی کے پیغام کو قبول کرتے ہیں اور ایسی ہی خواہشات کا ان کے لیے اظہار
کرتے ہیں لیکن اب ہمارے خدا کہاں ہیں اور کیا انہوں نے واپسی کے لیے کسی قسم کی قربانی کا مطالبہ کیا ہے؟ ہم

ان کی خوشنودی کے لیے اپنی عزیز ترین چیز بھی قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

"اے شاہِ شوش!"

سرائلی نے اب ذرا ادب سے کہا؛

"رب اور ربیہ شوش کو معلوم ہو گیا ہے کہ آپ اور آپ کے قبیلے والے اپنی غلطیوں پر نادم ہیں [...] جنگ کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کو تیار ہو گئے ہیں۔ اس لیے وہ بغیر کسی شرط اور قربانی کے واپس آ گئے [...]"

"کہاں ہیں ہمارے خدا؟" شاہ نے خیمے میں نظریں دوڑاتے ہوئے دریافت کیا۔

"اے شاہِ شوش!"

سرائلی نے شاہ شوش کے جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا:

"آپ کی ایک دیرینہ خواہش یہ تھی کہ چوغان قبیلے میں پناہ لینے والا رباب بجانے کا ماہر داراب [...] دربار میں آ جائے اور اسی لیے آپ نے قبیلہ چوغان پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ آپ کی اس خواہش کے [...] آپ کے خداؤں نے چوغان سردار کو حکم دیا ہے کہ وہ داراب کو آپ کے دربار میں بھیج دے تاکہ دونوں [...] امن اور دوستی کے رشتے مضبوط اور استوار ہو جائیں۔"

"پھر کیا تمہارے سردار نے ہمارے خداؤں کے حکم کی تعمیل کی؟" شاہ نے پوچھا۔

"خداؤں کی نافرمانی کون کر سکتا ہے اے شاہ؟"

سرائلی نے فوراً جواب دیا:

"چوغان کے سردار نے رب اور ربیہ شوش کے حکم کی تعمیل میں نہ صرف آپ کے خداؤں کو عزت [...] کے ساتھ آپ کی طرف واپس کر دیا بلکہ رباب کے ماہر داراب کو بھی ان کے ساتھ کر دیا۔"

"لیکن۔۔۔ لیکن وہ تو اب تک یہاں نہیں پہنچے؟"

شاہ شوش کو گھبراہٹ پیدا ہوئی؛

"وہ چوغان سے کب روانہ ہوئے تھے؟"

"اے شاہ شوش۔ آپ فکر نہ کریں۔"

یہ کہتے ہوئے سرائلی نے تھیلے میں ہاتھ ڈالا اور اس میں سے ریشم میں بندھا ہوا ایک بنڈل نکالا [...] اور دوسرے لوگوں کی نظریں ریشمی بنڈل پر جم کر رہ گئیں۔

سرائلی نے بڑی احتیاط سے بنڈل کھولا۔ ریشم میں رب اور ربیہ کی مورتیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ سرا[...] ان مورتیوں کو آنکھوں سے لگا کر بوسہ دیا پھر وہ شاہ کی طرف بڑھا دیں۔

"لیجیے شاہ شوش۔ سنبھالیے اپنے خداؤں کو۔"

سرائلی نے مورتیاں شاہ شوش کے ہاتھ میں دے دیں۔ شاہ نے بھی مورتیوں کو بوسہ دیا۔ پھر انہیں فرش پہ رکھ کر ان کے سامنے سجدے میں گر گیا۔ شاہ شوش کے نائب اور پہرے داروں نے اسے سجدے میں دیکھا تو وہ بھی فوراً سجدے میں چلے گئے۔

سرائلی جوان کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی اور وہ بڑی دلچسپی سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ اس وقت سرائلی کی نظر شاہ کی پشت کی جانب لٹکے ہوئے پردے پر پڑی جس میں آہستہ آہستہ لہریں سی پیدا ہو رہی تھیں۔ اس نے پردے کو غور سے دیکھا۔ خیمے میں ہوا نہ تھی اور شمع کی لو بھی سیدھی تھی۔ سرائلی کی نظریں پردے پہ لگی تھیں۔ پردہ ذرا سا ایک طرف سرک گیا۔ سرائلی کا دل خوشی سے کھل اٹھا۔ اسے ششتیں کا چاند سا مکھڑا مسکراتا ہوا نظر آ گیا تھا مگر پھر اسے فوراً ہی نظریں نیچی کرنی پڑیں۔ شاہ شوش سجدے سے سر اٹھا رہا تھا۔

"اے جوان! تو نے ہمارے خداؤں کا جو احترام کیا ہے اس کے لیے ہم تیرے شکر گزار ہیں۔"

شاہ شوش نے دو زانو بیٹھتے ہوئے کہا؛

"چوغان سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں رہا۔ ہم اپنے علاقے کی طرف واپس جا رہے تھے لیکن اب ہمیں کوئی جلدی نہیں۔ ہمارے رب اور ربیہ واپس آ گئے ہیں۔ ہمیں کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ اگر تاتاریوں نے اس طرف کا رخ کیا تو ربِ شوش کی قسم! ہم انہیں عبرت ناک قسم کی شکست دیں گے۔ ہمارے خدا دور کا سفر کر کے آئے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ کچھ دن آرام کر لیں۔ پھر واپسی کا فیصلہ کریں گے۔"

"شاہِ عالی مقام!"

شاہ کے نائب نے لقمہ دیا:

"ہمارے محسن سرائلی جوان نے خداؤں کی واپسی کے علاوہ کچھ اور بھی کہا تھا۔"

"اور کیا کہا تھا؟" شاہ شوش سوچتے ہوئے بولا۔

"میں بتاتا ہوں شاہ محترم!"

داراب مسکرایا۔

"میں نے عرض کیا تھا کہ چوغان سردار نے آپ کی پہلی شرط بھی قبول کر لی ہے اور قبیلے میں پناہ لینے والے سرائلی قبیلے کے داراب کو بھی خدائے شوش کے ساتھ ہی آپ کے پاس بھیجا ہے۔ یہ وہی داراب ہے جس کے رباب بجانے کی آج کل تمام قبائل میں دھوم مچی ہوئی ہے اور آپ نے اس کا مطالبہ کیا تھا۔"

"داراب!" شاہ شوش خوشی سے چلایا۔

"ہاں۔ ہم نے یہ نام سنا تھا۔ اس کے رباب بجانے کا ذکر تو آج کل ہر خاص و عام کی زبان پر ہے۔ داراب! اب تک کیوں نہیں پہنچا؟ ایسے ماہر فنکار سے ہمارے قبیلے کو چار چاند لگ جائیں گے۔ ہم سر آنکھوں پر بٹھائیں گے جوان! تم فوراً جاؤ اور اسے لے کر آؤ۔ اگر وہ ہمارے پاس آنے سے خوف زدہ ہو تو اسے یقین دلاؤ کہ ہم اسے چوغان قبیلے سے زیادہ عزت دیں گے۔ اس کی ہر خواہش پوری کریں گے۔"

سرائیکی جوان نے پشت پر لٹکا ہوا لمبا سا تھیلا اتارا اور شاہ کے سامنے رکھ دیا:

"شاہِ عالی مقام! داراب کی یہ خواہش تھی کہ اسے آپ کے بڑے دربار میں جگہ ملے۔"

اس نے تھیلا کھولا اور اس میں سے ایک رباب نکالا۔ سارنگی کی مانند بنے ہوئے اس ساز کا "نزکستان" میں بڑا رواج تھا۔

"یہ۔۔۔۔ یہ تو رباب ہے، کیا یہ اسی ماہر فن کا رباب ہے؟" شاہ نے بے چینی سے پوچھا۔ شاہ شوش نے صحیح اندازہ لگایا۔

یہ کہتے ہوئے سرائیکی جوان نے پشت کے پردے پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور سر جھکا کر عاجزی سے بولا:

"یہ رباب داراب کا ہے اور داراب اس وقت شاہ شوش کے سامنے کھڑا ہے۔"

"تم۔۔۔۔ تم داراب ہو۔۔۔۔۔ وہی مشہور فنکار؟" شاہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

شاہ شوش کا نائب اور خیمہ کا پہریدار بھی حیرت بھری نظروں سے داراب کو دیکھنے لگا۔ انہوں نے اس کا نام اور اس کے فن کی بہت تعریف سنی تھی لیکن وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ اتنا عظیم فنکار خود ہی اس کے پاس آجائے گا۔

داراب نے شاہ کو جواب دینے سے پہلے ایک اچٹتی نظر پردے پر ڈالی۔ اسے محسوس ہوا کہ دو اور ہنستی ہوئی آنکھیں اس کی طرف بڑی بے تابی سے دیکھ رہی ہیں۔ داراب بولا:

"داراب آپ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ اب یہ شاہ کی مرضی ہے کہ چاہے اسے ہمیشہ کے لیے خدمت میں قبول کریں یا ایک بیکار آدمی سمجھ کر ٹھکرا دیں۔"

"تم بیکار آدمی نہیں ہو داراب؟"

شاہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا:

"تمہیں ہم وہ عزت و توقیر دیں گے جس کا تم تصور بھی نہ کرسکو گے۔"

پھر شاہ نے اپنے نائب کو مخاطب کیا:

"ایک عظیم الشان جشن کا انتظام کرو۔ ہمارے رب واپس آگئے ہیں اور داراب اپنے فن سے ہمیں خوش کرے گا اور ہم اسے انعام و اکرام سے مالا مال کریں گے۔"

شاہ نے نائب کو کچھ اور ضروری ہدایات دے کر داراب کو اس کے ساتھ رخصت کر دیا۔ وہ آج بہت خوش تھا۔ لوگوں کے جاتے ہی اس نے پہلے تو رب اور رب شوش کو سونے کے پیالوں میں ڈھانپ دیا۔ پھر شراب کا پیالہ منگا کر مے نوشی شروع کر دی۔

ششبیں پردے کے پیچھے سے نکل کر اس کے پاس آگئی تھی۔ وہ بھی اس قدر خوش تھی کہ اس نے بھائی کو شراب پینے سے نہیں روکا اور شاہ شوش نے بہن کی طرف سے ڈھیل پاکر پیالے بھر بھر کر پینا شروع کر دی، اور اس وقت تک پیتا رہا جب تک پیالہ اس کے ہاتھ سے گر نہیں گیا۔

اب شاہ شوش نشے میں مدہوش بستر پر اوندھا پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ ششبیں اس کے قریب ہی بیٹھی تھی لیکن شاہ کی طرف توجہ دینے کے بجائے وہ اپنے خیالوں میں گم تھی۔

٥

ششبیں کو جب یقین ہوگیا کہ شاہ شوش نے اس قدر شراب پی لی ہے کہ کل دوپہر سے پہلے اسے ہوش آنا ممکن نہیں تو وہ خیمے کے دروازے کے پاس گئی اور پہرے دار کو حکم دیا کہ اس کی خاص کنیز کو فوراً بلا کر لائے۔

اس نے پہریدار سے بہانہ کیا کہ اس کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے اور وہ کنیز سے اپنے لیے دوا منگوانا چاہتی ہے۔

خیمے کا پہریدار ششبیں کی کنیز کو آتے جاتے دیکھتا رہتا تھا اور کسی قدر اس کی طرف مائل بھی تھا اس لیے وہ خوشی خوشی کنیز کو بلانے چلا گیا۔

ششبیں کی کنیز کو اس وقت بلاوے پر تعجب سا ہوا جب یہ دونوں خیمے پر پہنچے تو ششبیں خیمے کے دروازے کے باہر کھڑی ان کا انتظار کر رہی تھی۔ کنیز شہزادی کو دیکھ کر خوش ہوگئی اور اس کے وسوسے ختم ہوگئے کیونکہ راستے بھر پہرے دار اس سے الٹی سیدھی باتیں کر کے اس کے کان کھاتا رہا تھا اور وہ دل ہی دل میں ڈر رہی تھی۔

ششبیں، کنیز کو ساتھ لے کر خیمے کے ایک کونے میں جا کھڑی ہوئی اور دیر تک دونوں کھسر پھسر کرتی رہیں۔ پھر کنیز خیمے سے باہر نکلی۔

"کیا تم واپس جا رہی ہو؟" پہریدار نے محبت سے پوچھا۔

"شہزادی کی طبیعت اچھی نہیں۔ میں دوا لے کر ابھی واپس آتی ہوں۔" کنیز نے کچھ اتنی نرمی سے کہا کہ پہریدار کا دل باغ باغ ہو گیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ابھی ایک بار اور تمہارا دیدار ہو گا۔"

کنیز قدم بڑھا چکی تھی لیکن پھر کچھ سوچ کر رک گئی۔ بولی:

"ایک بار نہیں۔ کئی بار۔"

وہ مسکرا دی تو پہریدار ریشہ خطمی ہو کر رہ گیا۔

"یعنی آج رات تم خیمے ہی میں رہو گی؟"

"اور کیا تم چاہتے ہو کہ میں شہزادی کو اس حال میں اکیلا چھوڑ کر چلی جاؤں؟" کنیز نے مصنوعی غصے کا اظہار کیا۔

"نہیں نہیں!"

پہریدار نے دانت نکال دیے:

"میں چاہتا ہوں کہ تم روز اس خیمے میں رہا کرو تا کہ.....۔"

کنیز ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ پہریدار نہ معلوم کس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد کنیز واپس آئی تو مٹکتی بل کھاتی اندر چلی گئی۔

ذرا دیر بعد کنیز پھر واپس آئی۔ اس کے ہاتھ میں پیالہ اور دوسرے میں لکڑی کا ایک بڑا گول سا برتن تھا۔ اس طرح کے لکڑی کے برتن شراب رکھنے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔

"اسے سنبھالو۔"

کنیز نے شراب اور پیالہ پہریدار کے حوالے کر دیا:

"چپ چاپ اسے پیتے رہو۔"

"بڑی مہربانی تمہاری!" پہریدار نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھ کیا رہے ہو!" کنیز ٹھنک کر بولی:

"خبردار۔ کوئی آواز نہ ہو۔ شہزادی بیمار ہیں۔"

"اطمینان رکھو۔ میں کوئی گڑبڑ نہیں کروں گا۔" پہرے دار سہم گیا۔ اسے ڈر ہوا کہ کنیز کہیں اس سے ناراض نہ ہو جائے۔

"ایک بات کا اور خیال رکھنا۔"

کنیز خیمے میں جاتے جاتے پلٹ کے بولی:

"مجھے ابھی کئی بار باہر جانا پڑے گا۔ شہزادی بیمار ہیں نا۔ تم آتے جاتے مجھے مت ٹوکنا۔ چپ چاپ بیٹھے رہنا۔"

کنیز اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اندر چلی گئی۔

پہرے دار شراب پا کر خوش ہو گیا تھا۔ کنیز کے جاتے ہی اس نے پیالہ بھرا اور غٹ غٹ پی گیا۔ یہ شراب شاہ شوش کے لیے آئی تھی جو اس کے پینے سے بچ رہی تھی۔ شاہ اعلیٰ درجے کی شراب پیتا تھا جو بہت زیادہ تیز ہوتی تھی۔ پہرے دار ایک ہی پیالے سے مست ہو گیا۔ دوسرا پیالہ بھرا تھا کہ کنیز پھر خیمے سے نکلی اور تیز قدم اٹھاتی ایک طرف چلی گئی۔ پہرے دار شراب پینے میں مصروف ہو گیا۔ کنیز تیز مگر احتیاط سے قدم اٹھاتی، خیمے کی قطاروں کے پاس سے گزر رہی تھی۔

شاہ شوش نے پہلے روانگی کا اعلان کیا تھا اس لیے لوگ صبح کو روانہ ہونے کے لیے تیاریاں کرنے لگے تھے مگر پھر شاہ نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور دوسرے دن جشن کا اعلان کرا دیا۔ جشن کے نام سے لوگ خوش ہو گئے کیونکہ ایسے موقعوں پر انہیں شراب پینے کے علاوہ دوسری بھی تمام بے ہودگیوں کی اجازت ہوتی تھی۔ وہ مطمئن ہو کر اپنے خیموں میں آرام کر رہے تھے۔ جو جاگ رہے تھے وہ الاؤ کے گرد بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ششبیں کی کنیز کو سب ہی پہچانتے تھے اس لیے کسی نے اسے ٹوکنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

کنیز خیمے کی قطاریں گنتی ہوئی بڑھ رہی تھی۔ ایک خیمے کے پاس وہ ٹھہری۔ باہر اندھیرا تھا۔ اندر ایک شمع جل رہی تھی۔ کنیز نے دروازے کے پاس پہنچ کر پیر ادھر ادھر گھمایا جیسے کچھ ٹٹول رہی ہو۔ اس کا پیر ایک چھوٹے پتھر سے ٹکرایا۔ کنیز نے بیٹھ کر پتھر پر ہاتھ رکھا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا تو اس نے آہستہ سے پردہ ہٹا کر اندر جھانکا۔

ایک شخص بستر پر چت لیٹا تھا۔ کنیز نے غور کیا۔ شمع کی مدھم روشنی میں اس نے داراب کو پہچان لیا۔ وہ داراب ہی تھا۔ اس کا داراب۔

"داراب!" اس نے اندر داخل ہو کر آہستہ سے آواز دی۔

داراب چونک کر بیٹھ گیا۔

"تم ...... ششبیل تم!" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"ہاں۔ میں ہی ہوں۔" ششبیل مسکراتی ہوئی بولی۔

"لیکن اس وقت۔ کسی نے دیکھا تو نہیں تمہیں؟" داراب نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

"دیکھا کیوں نہیں؟"

ششبیل کے لبوں پہ دلفریب تبسم تھا:

"بہتوں نے مجھے اس طرف آتے دیکھا ہے"۔

"پھر۔ پھر ٹوکا تو نہیں کسی نے؟" داراب کے خوف میں اب تعجب بھی شامل ہو گیا۔

"کوئی ٹوکتا کیسے؟"

ششبیل کی مسکراہٹ میں اضافہ ہو گیا:

"یہ کپڑے میری کنیز کے ہیں اور وہ میرا لباس پہنے شاہ شوش کے خیمے میں موجود ہے"۔

داراب نے حیران نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا:

"شاہ شوش جاگ پڑے تو کیا ہو گا۔ کنیز یقیناً قتل کر دی جائے گی۔ پھر تم اور میں......"

کہتے کہتے رک گیا۔

"ہم دونوں بھی قتل کر دیے جائیں گے"۔

ششبیل نے مسکرا کر اس کی بات پوری کر دی:

"دیکھو داراب! میں بے وقوف نہیں ہوں جو اتنا بڑا خطرہ مول لے کر تمہارے پاس آئی ہوں۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے"۔

"وجہ کچھ بھی ہو ششبیل!"

داراب نے بھی مستقل مزاجی سے کہا:

"لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ میری سچی محبت کی کشش ہے جو تمہیں یہاں کھینچ لائی ہے"۔

"کیا تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہے؟"

ششبیل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں:

"اور کیا مجھے حاصل بھی کرنا چاہتے ہو؟"

"ششبیل۔ اگر محبت نہ ہوتی تو میں یہاں آنے کا خطرہ کیوں مول لیتا؟" داراب بڑے جذباتی

"میں جانتا ہوں کہ میں تمہیں حاصل نہیں کر سکتا لیکن تمہارے قبیلے میں رہ کر کم از کم میں رو

تو کر سکوں گا۔ تمہیں دیکھنے سے پہلے میں نے منصوبہ بنایا تھا کہ رب اور ربیہ شوش کے بدلے میں دونوں قبیلوں میں صلح صفائی کرا دوں گا لیکن تمہیں دیکھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اب میری زندگی تمہارے بغیر ادھوری ہے اسی لیے میں تمہارے خداؤں کو لے کر خود آ گیا تاکہ تمہارے قریب رہ کر اپنے دل کو تسکین دیتا رہوں"۔

"داراب۔ یقین کرو کہ میرا بھی یہی حال ہے"۔

ششبیل کہتے کہتے شرمائی پھر سنبھل کر بولی:

"میں بھی جانتی ہوں کہ شاہ شوش سے تم مجھے حاصل نہیں کر سکتے لیکن اگر تم ہمت کرو اور میرے کہنے کے مطابق کام کرو تو میں ہمیشہ کے لیے تمہاری ہو سکتی ہوں"۔

"کیا ایسا ممکن ہے ششبیل؟"

داراب بے چین ہو کر بولا:

"تمہیں حاصل کرنے کے لیے تو میں جان کی بازی لگا دوں گا ششبیل! بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ جہاں تک ہمت کا تعلق ہے تو میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں جس طرح میری انگلیاں رباب کے تاروں پر گردش کرتی ہیں۔ اس طرح میرے ہاتھ قبضہ شمشیر کو حرکت دے سکتے ہیں۔ میں ایک اچھا تیر انداز بھی ہوں ششبیل!"

"تمہیں نہ تلوار کی ضرورت پڑے گی اور نہ ترکش سنبھالنا پڑے گا"۔

ششبیل اطمینان سے بولی:

"غور سے سنو۔ کل جشن ہو گا۔ تم رباب بجاؤ گے۔ شراب کے دور چلیں گے۔ شاہ شوش کا یہ طریقہ ہے کہ جشن کے موقع پر وہ جس سے خوش ہوتا ہے اسے منہ مانگا انعام دیتا ہے۔ تم سے تو وہ پہلے ہی خوش ہے۔ تمہارے رباب سے اور زیادہ خوش ہو گا۔ وہ تم سے پوچھے گا کہ تم انعام میں کیا چاہتے ہو؟ تم کوئی جواب نہ دینا اور رباب کے راگ راگنیوں سے اسے مست کرتے رہنا۔ وہ تم سے بار بار سوال کرے گا۔ جب تم محسوس کرو کہ شاہ بالکل مدہوش ہو گیا ہے اس وقت تم اسے انعام میں مجھے مانگ لینا۔ میرا خیال ہے وہ انکار نہ کرے گا۔ اگر وہ منظوری دے دے تو اس کے سرداروں کو گواہ بنا لینا۔ پھر میں سدا کے لیے تمہاری ہو جاؤں گی"۔

"لیکن ششبیل......"

"انکار نہ کرو داراب!"

ششبیل نے اس کی بات کاٹ دی:

"شاید تمہیں یہ خیال ہو کہ شاہ شوش کے سردار یہ گوارا نہ کریں کہ ان کے قبیلے کی لڑکی دوسرے قبیلے میں بیاہی جائے۔ تم اس طرف سے مطمئن رہو۔ یہ اعتراض مذہبی پیشوا اٹھاتے ہیں لیکن جس وقت شراب کا دور چلے گا

تو تمام پروہت اٹھ کے چلے جائیں گے۔ کوئی اعتراض کرنے والا نہ ہوگا۔"

"لیکن ششبیل!"

"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں داراب۔۔۔۔"

ششبیل نے اس کی بات پھر کاٹی:

"میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی۔ میں جا رہی ہوں۔ رب اور ربیہ شوش تم پر مہربان ہوں۔ کل اپنا دل مضبوط رکھنا"۔

ششبیل تیزی سے باہر نکل گئی۔

داراب حیران نظروں سے خیمے کے ہلتے ہوئے پردے کو دیکھتا رہ گیا!

O

جشن کی تیاریاں علی الصبح ہی شروع ہو گئیں۔

میدان میں ایک بڑا سا پنڈال بنایا گیا۔ جانوروں اور پرندوں کا گوشت بریاں کیا گیا۔ اس جشن میں تمام شا
شرکت کی اجازت تھی۔ سب کے لیے کھانا تیار کیا گیا۔ فرش کے کنارے کنارے مٹی کے مٹکے اور پیالے سجا
گئے۔ دوپہر کو دعوتِ عام تھی۔

کھانے کے بعد رب اور ربیہ شوش کی مورتیاں پنڈال میں لائی گئیں۔ مورتیاں قالین کے فرش پر رکھ
تمام حاضرین نے انہیں سجدہ کیا۔ پھر مذہبی پیشوا مورتیوں کو لے کر ایک خاص خیمے میں چلے گئے جسے عارضی طور پر
بنایا گیا تھا۔

پروہتوں کے جانے کے بعد شراب کا دور شروع ہوا۔ شاہ شوش نے مستی کے عالم میں داراب کو طلب کیا
اسے رباب چھیڑنے کا حکم دیا۔

داراب کو معلوم تھا کہ جشن کی اصل محفل تو رات کو جمے گی۔ اس نے بڑی خوبی سے شاہ کو یہ باور کرایا کہ
دھنیں تو رات کو اپنا رنگ دکھاتی ہیں اس لیے "محفلِ شب" کا انتظار کیا جائے۔ ششبیل اسے یہ بات سمجھا چکی
لیکن داراب نے خود ہی رباب کا مسئلہ بات پر ملتوی کر دیا۔

شاہ شوش اور اس کے لشکریوں نے دوپہر کا کھانا تو رات تک ہضم کر لیا لیکن ابھی ان کا نشہ پوری طرح

کہ محفلِ شب آراستہ ہو گئی۔ پہلے دعوت، پھر رب اور ربیہ شوش کی پوجا اور سب سے آخر میں موسیقی کا ہنگامہ برپا
ہوا۔ داراب حسبِ وعدہ اپنا رباب سنبھالے پنڈال میں پہنچ گیا۔

جس وقت وہ پنڈال میں داخل ہو رہا تھا تو شہزادی ششبیل کی کنیز نے اس کے پاس پہنچ کر آہستہ سے
سرگوشی کی:

داراب کی نظر فوراً ایک طرف اٹھ گئی۔ اس طرف ایک خیمہ استادہ تھا۔ یہ خیمہ دوپہر کے وقت وہاں نہیں تھا۔
داراب کی نظر خیمے سے ٹکرائی۔ ششبیل پردے سے لگی کھڑی تھی۔ اس نے خود یہ خیمہ وہاں لگوایا تھا تاکہ وہ محفلِ نشاط کا منظر
بھی دیکھتی رہے اور داراب کو بھی اس کی موجودگی سے تقویت رہے۔

داراب، رباب کا بادشاہ تھا۔ اسے اس ساز پر پورا عبور حاصل تھا۔ پھر آج تو وہ ایک خاص جذبے کے تحت
رباب بجانے آیا تھا۔ اس نے رباب چھیڑا تو پوری محفل اس کی دھنوں میں ڈوب گئی۔

کچھ ایسا سماں بندھا کہ لوگوں کو تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ رقاصاؤں کے طائفے بار بار آتے۔ ناچتے اور تھک کے
چلے جاتے لیکن رباب کی دھنیں بند ہونے کا نام نہ لیتیں۔

داراب خیمے پر نظریں جمائے رباب بجا رہا تھا۔ شہزادی ششبیل بھی رباب کی دھن پر مست ہو کر از خود تھرکنے
لگی تھی۔

رات ڈھلنے لگی لیکن نہ داراب کا ہاتھ رکتا تھا اور نہ سننے والوں میں اکتاہٹ یا بیزاری کے آثار پیدا ہوتے
تھے۔ شاہ شوش سر دھن رہا تھا اور تعریف کے ڈونگرے برسا رہا تھا۔ نشے سے اس کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے
آواز بھاری ہو گئی تھی لیکن وہ رباب بند کرنے کا حکم نہیں دے رہا تھا اور داراب اس طرح رباب بجا رہا تھا کہ جیسے
اس کے بعد وہ کبھی رباب نہ بجائے گا۔

"داراب!"

آخر شاہ شوش کی نشے میں ڈوبی ہوئی بھاری آواز ابھری۔ رباب کے تار اک دم رک گئے۔ داراب نے
شاہ کی طرف دیکھا۔

"تم نے ہمیں خوش کیا ہے۔ مانگو ہم سے کیا مانگتے ہو؟" شاہ شوش لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔

"شاہ عالی مقام!"

داراب نے نظریں اونچی کر کے شاہ کو دیکھا پھر اہلِ محفل کو مخاطب کیا:

"حاضرینِ مجلس! شاہ شوش میرے فن سے خوش ہو کر مجھے انعام دینا چاہتے ہیں۔ اگر آپ لوگ اجازت
دیں تو میں اپنا انعام طلب کروں؟"

"ہاں داراب!"

شاہ کا نائب جھومتے ہوئے بولا:

"مانگو۔ تم شاہ سے کیا مانگتے ہو۔ جو مانگو گے ملے گا۔ رب شوش کی قسم! اگر تم اس وقت میرا سر بھی مانگو گے تو شاہ انکار نہ کریں گے"۔

"اے شاہِ عالی مقام!"

داراب نے رباب ایک طرف رکھتے ہوئے ہاتھ باندھ کر کہا:

"آپ بادشاہ ہیں اور میں آپ کے دربار میں سوالی ہوں لیکن سوال کرنے سے پہلے میں یقین کرنا چاہتا ہوں کہ میں شاہ سے جس چیز کا سوال کروں گا وہ مجھے عنایت کی جائے گی"۔

"تو احمق ہے داراب"۔

شاہ نے شراب کا پیالہ دُور پھینکتے ہوئے کہا:

"ہمارے وعدے پر اعتبار نہیں کرتا۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ تیرا سوال خالی نہیں جائے گا"۔

"میں تمام معزز سرداروں کو گواہ بناتا ہوں"۔ داراب نے اہلِ مجلس کی طرف منہ کر کے کہا۔

"ہم تیرے گواہ ہیں داراب" کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔

داراب نے خیمے کی طرف دیکھا۔ پھر دل مضبوط کیا اور سر جھکا کے بولا:

"شاہ عالی مقام! چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے لیکن آپ نے وعدہ پورا کرنے کا یقین دلایا ہے اور اہلِ مجلس اس کے گواہ ہیں اس لیے میں اپنے انعام میں شہزادی ستشبیل کے ساتھ اپنی شادی کی اجازت طلب کرتا ہوں۔ امید ہے کہ شاہ میرا سوال پورا کریں گے"۔

"شہزادی..... ستشبیل..... شادی"۔ شاہ شوش کے حلق سے یہ ترنم الفاظ ہچکیوں کے درمیان رک رک کر نکلے۔

داراب سہم گیا۔ اور اسے خطرہ ہوا کہ بس اب آ گئے اس کے قتل کا حکم ہو گا۔ شاہ شوش سنبھل کے

اس نے شراب کا پیالہ منہ سے لگایا اور ایک ہی سانس میں پی کر بولا:

"داراب۔ جا ہم نے شہزادی کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں دیا"۔

سہما ہوا داراب خوش ہو گیا۔

اس کا جی چاہا کہ دوڑ کے شہزادی کے پاس پہنچ جائے۔ اس نے خیمے کی طرف دیکھا ستشبیل حیا کے جذبے چہرے پر سجائے پردے سے لگی کھڑی تھی۔

"کیا میں یقین کر لوں کہ شاہ نے مجھے شہزادی ستشبیل کے ساتھ شادی کی ان گواہوں کے سامنے اجازت دے دی ہے!" داراب نے خوشی کے جذبات دباتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ وہ چاہتا تھا کہ بات بالکل صاف اور واضح ہو تا کہ شاہ شوش نشہ اترنے کے بعد انکار نہ کر سکے۔

"ہاں۔ اجازت دی۔ اجازت دی"۔ شاہ شوش شراب کے نشے میں بار بار یہ جملہ دہرانے لگا۔

اب کوئی شک و شبہ نہ رہ گیا تھا۔ داراب بڑی بے خوفی سے شہزادی کے خیمے پہ پہنچا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

ان قبائل میں رواج تھا کہ اگر لڑکی کا وارث شادی کی اجازت دے دے تو شادی ہو جاتی تھی۔ کسی مزید تصدیق یا رسم کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

"ٹھہرو داراب!"

شہزادی ستشبیل نے کہا:

"پہلے مجھے دلہن تو بننے دو۔ چلو تم بھی دُلہا بنو"۔

شہزادی کی کنیزِ خاص اس کے ساتھ ہی اس خیمے میں موجود تھی۔ اس نے بڑھ کر داراب کا ہاتھ پکڑ لیا:

"چلیے شہزادے! میں آپ کو دلہا بنواتی ہوں"۔

کنیز داراب کو دوسرے خیمے میں لے گئی اور چند کنیزوں کو حکم دیا کہ داراب کو فوراً دولہا بنا کر تیار کر دیا جائے اور خود دوسری کنیزوں کو لے کر واپس آئی اور شہزادی کو دلہن بنانے لگی۔ دم کے دم میں دونوں دلہن دلہا کے روپ میں آ گئے۔

کنیز داراب کے پاس گئی اور اسے لے کر شہزادی کے خیمے میں آ گئی۔ شہزادی کے اسی خیمے کو حجلۂ عروسی میں تبدیل کر دیا گیا۔

جب کنیز دلہن، دلہا کو تنہا چھوڑ کر واپس ہوئی تو پنڈال میں اب بھی شراب کا دور چل رہا تھا اور آسمان پر صبح کا تارا نمودار ہو گیا تھا۔

○

داراب اور ستشبیل کی شبِ عروسی کا بھی اختتام ہوا لیکن مسرت کے بجائے ان کے چہروں پہ خوف کے سائے

لرز رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ شاہ شوش نے رات نشے کی حالت میں انہیں شادی کی اجازت دی تھی۔ اب ا
ہوش میں آئے گا تو معلوم نہیں ان کا کیا حشر کرے۔

شبیل کی کنیزِ خاص جب ان کے پاس آئی تو ان کی حالت دیکھ کے وہ بھی پریشان ہو گئی۔ ا
انہیں تسلی دی کہ شاہ نے کسی بھی حالت میں اجازت دی ہو وہ اب اس سے انکار نہیں کریں گے لیکن دل
کی کسی طرح تسلی نہ ہوئی۔

صبح سے دوپہر ہو گئی لیکن ان دونوں نے خیمے سے قدم نہ نکالا۔ کنیز کو بھی انہوں نے اپنے پا
روک لیا۔

دوپہر کو جب شاہ کا نشہ ٹوٹا اور اس کے سردار اکٹھے ہوئے تو رات کی محفل کی باتیں شروع ہوئیں۔
سب ہی مدہوش تھے۔ پھر بھی کچھ لوگوں کو شبیل کی شادی کا ایک ہلکا سا خیال تھا لیکن انہوں نے اپنی طرف
بارے میں کچھ کہنے کی کوشش نہیں کی۔

شاہ نے داراب کو محفل میں موجود نہ پایا تو اس کی طلبی کا حکم دیا۔ اب بھی کسی نے زبان نہ کھولی اور دا
انتظار کرنے لگے۔

داراب لرزتا کانپتا شاہ کے سامنے آیا۔ جھک کے سلام کیا اور ایک طرف چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ شا
اس کے لباس پر پڑی تو وہ چونکا۔ داراب کے ریشمی کپڑوں سے خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔

"داراب!"

شاہ نے اسے مخاطب کیا تو داراب کانپ اٹھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر شاہ کو دیکھا:

"داراب تیری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ کیا تو رات بھر جاگتا رہا ہے؟"

"جی شاہِ عالی مقام!"

داراب نے سنبھل کے کہا:

"میں تمام رات بیدار رہا ہوں!"

"کیوں۔ تو کیوں بیدار رہا؟ تیرے کپڑوں سے خوشبو بھی آ رہی ہے؟"

"شاہِ عالی مقام۔ کیا آپ کو میری شادی کی خبر نہیں"۔ داراب نے جی کڑا کر کے کہا۔

"تیری شادی۔ تو نے ہم سے اجازت کیوں نہیں لی؟ ہمیں کیوں شریک نہیں کیا شادی میں؟" شا
حیران نظروں سے داراب کو دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

"شاہِ محترم! میری شادی کل رات ہوئی"۔ داراب واضح لہجے میں بولا۔ "آپ نے خود ہی مجھ

سے شادی کی اجازت دی تھی"۔

"کیا بک رہا ہے نابکار"۔

شاہ شوش چیخ کے بولا:

"تجھے یہ الفاظ منہ سے نکالنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ کہاں تو ایک معمولی سازندہ اور کہاں شہزادی شبیل!
شاہ شوش کی بہن۔ تو ہم پر الزام لگا رہا ہے۔ ہم تیری زبان کٹوا دیں گے"۔

"سنیے شاہ محترم!"

موت سامنے ہو تو انسان بے خوف ہو جاتا ہے۔ اس وقت داراب کا بھی یہی عالم تھا:

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے شہزادی سے شادی آپ کی اجازت کے تحت کی ہے۔ آپ کے تمام سردار
اس کے گواہ ہیں"۔

داراب نے امید بھری نظروں سے اہلِ دربار کو دیکھا۔

"سن رہے ہو تم لوگ۔ یہ کمینہ تم پر بھی الزام لگا رہا ہے"۔ شاہ شوش نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"اے شاہِ شوش! میں گواہی دیتا ہوں کہ داراب سچ کہہ رہا ہے"۔

شاہ کے نائب نے سر جھکا کر کہا:

"آپ نے خوش ہو کر اس سے انعام مانگنے کو کہا۔ اس نے شہزادی کو مانگا۔ آپ نے شادی کی اجازت دے دی۔
ہم سب اس کے گواہ ہیں۔ ہم جھوٹ بولیں تو ہم پر ربِ شوش کا عذاب نازل ہو"۔

پھر تو ایک ایک کر کے سب سرداروں نے شوش کے نائب کی تائید کی۔ شاہ شوش کی آنکھیں حیرت سے
کھلی رہ گئیں۔ پھر وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔

"یہ واقعہ کب پیش آیا میرے سردارو؟" شاہ نے سر اٹھا کر مضمحل آواز میں پوچھا۔

"کل شب اے شاہِ شوش"۔

نائب نے جواب دیا:

"داراب نے ہم سب کو گواہ بنا کر شہزادی سے شادی کی ہے۔ ہم گواہی سے انکار نہیں کر سکتے"۔

شاہ شوش کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ اپنے تمام سرداروں کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے داراب کو کوئی
سزا نہ دی اور سرداروں کو فوراً رخصت کر دیا۔

پھر اس نے پروہتوں کو اپنے خیمے میں بلایا اور انہیں بتایا کہ کس طرح کل رات اس نے نشے کی حالت میں
داراب کو شبیل کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دی تھی۔ مذہبی پیشوا یہ سن کر بہت بگڑے۔ اس دور میں

اگر لڑکی غیر قبیلے میں بیاہی جاتی تو یہ قبیلے کی توہین کے مترادف سمجھا جاتا تھا لیکن شادی منسوخ کرنا بھی مشکل تھا کیونکہ اس شادی کے تمام سردار گواہ تھے اور شادی کی منسوخی ان کی توہین تھی۔ وہ بغاوت کر سکتے تھے۔ اس لیے اس وقت کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔

پروہتوں نے شاہ کو یقین دلایا کہ وہ بہت جلد اس کا حل تلاش کر لیں گے جس سے سردار ناراض بھی نہ ہوں اور شادی منسوخ بھی ہو جائے۔

پروہتوں کو اپنی روایات برقرار رکھنا تھیں۔ وہ بھلا غیر قبیلے میں شہزادی کی شادی کیسے برداشت کرتے۔ انہوں نے اس کا یہ حل نکالا کہ آج رات داراب کو خیمے میں گھس کر قتل کر دیا جائے۔ داراب کے قتل ہونے سے یہ قصہ ختم ہو جائے گا۔ سردار بھی مخالفت نہ کریں گے اور چپ ہو کر بیٹھ جائیں گے۔

شام تک مذہبی پیشواؤں نے داراب کے قتل کے منصوبے کو آخری شکل دے دی اور رات ہوتے ہی بڑا پیشوا شاہ کے پاس پہنچ گیا۔

شاہ اپنی بہن کی اس طرح شادی ہو جانے سے سخت پریشان تھا۔ اس نے دن میں شراب بھی نہیں پی تھی۔ منہ لپیٹے اپنے خیمے میں اکیلا پڑا تھا۔

ششبیل اپنے نئے خیمے میں تھی اور داراب اس کے پاس سہما ہوا بیٹھا تھا۔ بڑے پیشوا نے جب شاہ کے سامنے داراب کے قتل کا منصوبہ رکھا تو جیسے اس کے دل کی مراد بر آئی۔ وہ داراب سے سخت ناراض تھا کیونکہ اس کے خیال میں داراب نے اسے فریب دے کر یہ شادی کی تھی۔

اب مشکل یہ پیش آئی کہ داراب کے قتل پر کسے متعین کیا جائے۔ اگر کسی سردار کا تعاون حاصل کیا جاتا تو راز کھل جانے کا امکان تھا اور بغاوت کا بھی امکان تھا۔ اس لیے یہ ذمے داری شاہ نے پروہتوں پر ڈالی کہ وہ اپنے آدمیوں کو شہزادی کے خیمے میں بھیج کر داراب کو قتل کرا دیں۔ بعد کے معاملات شاہ خود سنبھال لے گا۔ شاہ نے پیشوا کے رخصت ہوتے وقت اسے تاکید کر دی کہ صرف داراب کو قتل کیا جائے۔ شہزادی کو کوئی نقصان نہ پہنچے کیونکہ وہ شہزادی کی قربانی دے کر اپنا عہد پورا کرنا چاہتا ہے۔

(۰)

یہ داراب اور ششبیل کی شادی کی دوسری رات تھی لیکن دونوں اداس بیٹھے تھے۔ خیمے میں

جاری تھی اور ایک نہ معلوم خوف سے وہ بار بار چونک پڑتے تھے۔

ان کا خوف غلط نہ تھا۔ داراب کے قتل کے لیے چار پروہت خنجر اور تلواروں سے مسلح ہو رہے تھے۔ اسی عالم میں شہزادی ششبیل کی کنیزِ خاص ہانپتی کانپتی خیمہ میں داخل ہوئی۔ اسے اس ہیئت میں دیکھ کر ان دونوں کا رنگ اڑ گیا:

"داراب کا قتل ..... شہزادی کی قربانی .... فیصلہ ہو گیا۔"

کنیز نے سانس سنبھالتے ہوئے کہا:

"جلدی کرو۔ قاتل آ رہے ہیں۔ جنوب کی طرف بڑے پیڑ کے نیچے دو گھوڑے پہنچا دیے گئے ہیں۔ جلدی .... فوراً ..... جان بچاؤ داراب!"

داراب اور ششبیل نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر داراب جلدی سے ششبیل کا ہاتھ پکڑ کر خیمے سے نکلا۔ کنیز بھی ان کے پیچھے باہر آ گئی۔

سامنے سے چھ آدمی تیزی سے خیمے کی طرف آ رہے تھے۔ داراب اور ششبیل نے جنوب کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ داراب نے اپنا خنجر نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ ششبیل کا ہاتھ اس نے چھوڑ دیا تھا تاکہ وہ آزادی سے دوڑ سکے۔ داراب ششبیل سے دو قدم آگے تھا۔ تعاقب کرنے والے قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ خیموں کی رسیاں اور زمین میں گڑی ہوئی کھونٹیاں راستے میں حائل تھیں۔

معاً ششبیل کی قمیض کا دامن کسی چیز سے الجھا اس کے ساتھ ہی اس نے ٹھوکر کھائی اور زمین پر گر گئی۔ داراب چار قدم آگے نکل گیا تھا۔ ششبیل کو گرتے دیکھ کر وہ پلٹا۔ ششبیل چیخی:

"داراب، تم نکل جاؤ۔"

داراب ایک لمحے کے لیے رکا۔ اس کا دل نہ چاہا کہ ششبیل کو اکیلا چھوڑ کر نکل جائے۔

"داراب! تمہیں میری قسم! اپنی جان بچاؤ۔"

ششبیل کے لہجے میں ہزاروں التجائیں تھیں۔

داراب نے مجبور ہو کر اس کی طرف پیٹھ کی اور بڑے پیڑ کی طرف بھاگنے لگا جو اب زیادہ دور نہ تھا۔ جس وقت چھ پروہت شہزادی ششبیل کو زمین سے اٹھا رہے تھے اس وقت شہزادی کے کانوں میں ایک گھوڑے کے بھاگنے کی آواز آئی۔ اس نے اطمینان کی سانس لی اور خود کو بلا عذر پروہتوں کے حوالے کر دیا۔

داراب کے فرار ہونے سے مسئلہ خود بخود حل ہو گیا۔ شاہ نے تمام لشکر میں یہ خبر پھیلا دی کہ داراب نے شہزادی کے ساتھ بے وفائی کی۔ یہی نہیں بلکہ شہزادی نے دلبرداشتہ ہو کر دنیا کو تیاگ دینے کا ارادہ کیا ہے اور

وہ ربّ شوش کی خوشنودی کے لیے آگ میں جل کر قربانی دے گی۔

شاہ کے سرداروں کو داراب کی بے وفائی پہ بڑا افسوس ہوا۔ انہوں نے داراب کو بہت لعنت ملامت کی۔ شاہ نے وہاں سے خیمے اٹھانے کا حکم دے دیا۔ کیونکہ اسے اطلاع ملی تھی کہ تاتاریوں کے دو بڑے لشکر قریب ہی جنگ میں مصروف ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی ادھر نکل آئے اور خواہ مخواہ کی مصیبت پڑ جائے۔

⊙

شاہ نے اگلی منزل پہ قیام کیا تو اس نے قربانی کے انتظام کا حکم دیا۔ وہ اپنے علاقے میں واپسی سے پہلے خداؤں کا یہ قرض بھی اتارنا چاہتا تھا۔

خیموں کے سامنے میدان میں دائرے کی شکل میں لکڑیاں چن کر بارہ فٹ اونچی گول دیوار اٹھا دی گئی۔ اندر جانے کے لیے ایک چھوٹا سا راستہ رکھا گیا۔ رات ہوتے ہی لکڑیوں میں آگ لگا دی گئی۔

شاہ شوش نے دربار لگایا۔ رب اور ربیہ شوش کی مورتیاں سامنے رکھی گئیں۔ پروہتوں نے جنتر منتر پڑھنا شروع کیے۔ لوگوں میں شراب تقسیم کی گئی اور خداؤں کے سامنے وحشیانہ رقص شروع ہوا۔ ڈھول تاشوں کی آوازوں سے صحرا گونج اٹھا۔

اس دوران قبیلے کی چار کنواریوں کے ساتھ شہزادی کو لایا گیا۔ سب کو دلہنوں کا لباس پہنایا گیا تھا اور وہ زیورات پہنے ہوئے تھیں۔

پروہتوں نے ان کی مانگ میں کسی رنگین لعاب کی لکیر بنائیں اور انہیں قربان کرنے کا حکم دے دیا۔ لڑکیاں لپکتے ہوئے شعلوں کو دیکھ کر چیخیں مارنے لگیں۔

شہزادی شنشبیل کا دل جیسے دنیا سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ بھائی کے ظالمانہ رویّے نے اسے دلبرداشتہ کر دیا۔ وہ خود کو مرنے کے لیے تیار کر چکی تھی اس لیے بالکل پُرسکون تھی۔

آگ کے اندر جانے کے لیے جو چھوٹا سا راستہ بنایا گیا تھا، شہزادی سب سے پہلے اس میں داخل ہو گئی۔ دوسری لڑکیوں کو پروہتوں نے دھکے دے کر اندر دھکیل دیا۔ پھر اس راستے کو بھی آگ دکھا دی گئی۔

اب شہزادی اور چاروں لڑکیاں جلتے ہوئے شعلوں کے درمیان سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔ ان کی نظریں آگ کی دیوار پہ تھیں۔ جو کسی وقت بھی گر سکتی تھی۔

شہزادی نے آنکھیں بند کر لیں کیونکہ جلتی ہوئی لکڑیاں گرنا شروع ہو گئی تھیں اور معصوم لڑکیاں بچنے کے لیے ادھر ادھر بھاگ رہی تھیں مگر کہاں جاتیں۔ چاروں طرف آگ کی دیوار تھی۔

جنگلی رقص اپنے عروج پر تھا۔ شراب لنڈھائی جا رہی تھی۔ قربان گاہ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے کہ ہزاروں کی تعداد میں گھڑسوار شاہ شوش کی خیمہ گاہ میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے خیموں کو آگ لگا دی اور شوش قبیلے والوں کو بے دریغ قتل کرنا شروع کر دیا۔

شوش قبیلے والے ابھی سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ ان کے نصف سے زیادہ آدمی قتل ہو گئے۔ شاہ شوش بھی مارا گیا... کچھ مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے۔ باقی گرفتار کر کے قیدی بنا لیے گئے۔

یہ حادثہ "آناً فاناً" ہو گیا۔

یہ امیر حسین کا شکست خوردہ تاتاری لشکر تھا جو سردار تیمور کے ہاتھوں مار کھا کے بلخ کی طرف پسپا ہو رہا تھا امیر حسین نے پسپائی کے وقت حکم دے دیا تھا کہ راستے کی تمام بستیوں کو تباہ کر دیا جائے اور آدمیوں کو قیدی بنا لیا جائے تاکہ تیمور کو رسد مل سکے اور نہ کام کے آدمی میسّر ہوں۔

امیر حسین کا لشکر شاہ شوش کی خیمہ گاہ کو برباد کر کے بلخ کی طرف چل پڑا۔ قربان گاہ سے اب تک شعلے بلند ہو رہے تھے۔ لڑکیوں کی آوازیں بند ہو گئی تھیں اور ان کے جسم خاکستر بن چکے تھے۔

دوسرے دن سردار تیمور کا لشکر امیر حسین کا تعاقب کرتا ہوا اس جگہ پہنچا۔ تیمور کو جلے ہوئے خیمے اور میدان میں بکھری ہوئی لاشیں دیکھ کر دکھ ہوا۔ میدان میں ایک جگہ راکھ کا ڈھیر تھا اور چار جلی ہوئی لاشیں پڑی تھیں۔ لاشوں کے چہرے مسخ ہو چکے تھے لیکن انہیں دیکھ کر یہ اندازہ ضرور ہوا کہ یہ عورتوں کی لاشیں ہیں۔

تیمور نے وہیں خیمے لگانے کا حکم دیا اور چند سوار ادھر ادھر دوڑائے تاکہ وہ قریب کی کسی آبادی سے کسی ایسے شخص کو پکڑ لائیں جو یہ بتا سکے کہ یہ کون بدنصیب لوگ ہیں اور ان پہ کیا افتاد پڑی؟

تیمور کے لشکر کے ساتھ قیدیوں کی ایک بڑی تعداد تھی جن میں زیادہ امیر حسین کے لشکری تھے جو جنگ میں شکست کھانے کے بعد گرفتار کر لیے گئے تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جنہیں تیمور کے لشکر نے جاسوس سمجھ کے پکڑ لیا تھا۔ انہی قیدیوں میں شہزادی شنشبیل کا شوہر رباب بجانے کا ماہر داراب بھی تھا۔

داراب شاہ شوش کی خیمہ گاہ سے گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگ نکلا تھا۔ وہ رات بھر گھوڑا دوڑاتا جنوب کی سمت بھاگتا رہا۔ صبح کو اس نے ایک لشکر کو آتے ہوئے دیکھا تو پیڑوں کی آڑ میں چھپ گیا۔ یہ لشکر امیر حسین کا تھا جو تیمور سے شکست کھا کر بے تحاشا بھاگتا چلا آ رہا تھا۔

لشکر کے نکل جانے کے بعد داراب نے پھر اپنا سفر شروع کیا لیکن شام کے وقت تیمور کے ہراول دستے

سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ تیمور کے سپاہیوں نے اسے جاسوس سمجھ کر گرفتار کر لیا۔ داراب بہت چیخا چلایا اور اپنی صفائی پیش کی لیکن سپاہیوں نے اس کی ایک نہ سنی۔

جب تیمور نے پڑاؤ کا حکم دیا تو قیدیوں کو اس جگہ کے قریب رکھا گیا جہاں سے جلے ہوئے خیمے نظر آرہے تھے۔ پورے لشکر میں یہ بات پھیل گئی کہ تیمور نے اس وجہ سے یہاں پڑاؤ کیا ہے کہ یہاں کسی قبیلے کی بڑی کو امیر حسین نے تہس نہس کر دیا ہے اور سردار یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ یہ کون سا قبیلہ تھا اور اس کے کتنے آدمی مارے گئے؟

داراب کو جلے ہوئے خیمے صاف نظر آرہے تھے اور وہ انہیں غور سے دیکھ رہا تھا۔ بعض خیمے آدھے ادھورے جلے تھے اور کچھ خیمے جلنے سے بچ گئے تھے۔

ایک خیمے پہ داراب کی نظر پڑی تو وہ زور سے چیخا:

"میرا خیمہ، یہ میرا خیمہ ہے"۔

قیدیوں کا ایک محافظ داراب کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اس نے داراب کی آواز سنی تو چونک کر بولا:

"بڑا آیا خیمے والا۔ تیرے باپ کا خیمہ ہے یہاں؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں محافظ"۔

داراب نے جواب دیا:

"تم مجھے سردار کے پاس لے چلو۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ یہ خیمہ گاہ کس کی ہے۔ میں اس قبیلے کو جانتا ہوں"۔

محافظ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر داراب کا ہاتھ پکڑ کر تیمور کے پاس لے گیا۔ تیمور جلی ہوئی لڑکیوں کی لاشوں کے پاس کھڑا افسوس کر رہا تھا۔

داراب نے تیمور کے پاس پہنچتے ہی کہا:

"سردار محترم! یہ خیمہ گاہ قبیلہ شوش کی ہے۔ میں اس خیمہ گاہ میں رہ چکا ہوں"۔

"قبیلہ شوش!"

تیمور سوچتے ہوئے بولا:

"اس قبیلے کا نام تو ہم نے پہلے کبھی نہیں سنا"۔

"یہ جوان ٹھیک کہہ رہا ہے سردار محترم"۔

ایک بوڑھا آدمی تیمور کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ اس بوڑھے کو تیمور کے آدمی کہیں سے پکڑ لائے تھے۔ اس نے قریب پہنچ کر ادب سے سلام کیا۔ پھر بولا:

"اے شہر سبز کے امیر تیمور۔ یہ خیمہ گاہ واقعی شاہ شوش کی ہے۔ یہ لاشیں جو آپ دیکھ رہے ہیں، ان کنواری لڑکیوں کی ہیں جنہیں شاہ شوش نے اپنے خداؤں کی خوشنودی کے لیے زندہ آگ میں جھونک دیا مگر وہ ظالم خود بھی نہ بچ سکا اور امیر حسین کے شکست خوردہ لشکر نے ادھر سے گزرتے ہوئے پورے قبیلے کو تہ و بالا کر ڈالا"۔

"ظالم . . . . کتنا ظالم تھا وہ شخص!" تیمور نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔

"امیر محترم! شاہ شوش تو اتنا ظالم تھا کہ اس نے اپنی سگی بہن کو بھی آگ میں جھونک دیا تھا"۔

بوڑھے کی زبان سے یہ الفاظ سن کر داراب تڑپ اٹھا۔

"بابا! کیا شہزادی شستبیل بھی آگ میں جل مری؟"

یہ کہتے ہوئے داراب کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ بوڑھا داراب کے رونے سے بڑا متاثر ہوا۔ اس نے سردار تیمور سے پوچھا:

"اے امیر! یہ جوان کون ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟"

تیمور داراب کا نام نہ جانتا تھا۔ اسے تو صرف یہ بتایا گیا تھا کہ یہ قیدی جاسوسی کے شبے میں گرفتار ہوا ہے۔ تیمور نے داراب کی طرف دیکھا جس کا مطلب تھا کہ وہ خود اس کا جواب دے۔

داراب افسردگی سے بولا:

"اے امیر! آگ میں جلنے والی شہزادی شستبیل میری بیوی تھی اور شاہ شوش کی بہن۔ میرا نام داراب ہے اور میرا تعلق سرائم قبیلے سے ہے"۔

"داراب!"

بوڑھا زیر لب بڑبڑایا پھر تیز آواز میں بولا:

"سردار محترم! اگر یہ جوان داراب ہے تو بلاشبہ یہ شہزادی شستبیل کا شوہر ہے۔ یہ غم نہ کرے کیونکہ شہزادی زندہ ہے اور اس وقت میری پناہ میں ہے"۔

یہ نوید سن کر داراب کی سوکھی کھیتی پر جیسے بارش کے چھینٹے پڑ گئے۔ خوشی سے اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ پھر بوڑھے نے واقعے کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا:

"سردار تیمور! جب سے امیر حسین نے قلعہ قرشی کے باہر آپ کے ہاتھوں شکست کھا کر پسپائی اختیار کی ہے۔ اس وقت سے اس مقام تک راہ پسپائی کے دوران جتنے مسلم اور غیر مسلم قبائل اس کی راہ میں آئے ان تمام قبائل کو اس نے تباہ کر کے ان کا سامان چھین لیا اور ان کے جوانوں کو قیدی بنا [illegible] کیونکہ ان قبائل نے تاتاریوں کی خانہ جنگی میں یا تو غیر جانبداری کا اعلان کیا تھا یا امیر حسین کی مدد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں بھی اسی طرح کے ایک مسلم

قبیلہ کا فرد ہوں۔ میں نے اپنی بیوی کے ساتھ ان پہاڑیوں میں پناہ لے رکھی تھی۔ قبیلہ سنوش کو تباہ کرنے کے
جب امیر حسین چلا گیا تو میں پناہ گاہ سے نکل کر اس خیمہ گاہ میں آیا۔ یہاں میری ملاقات شہزادی شستبیل سے ہوئی
معجزاتی طور پر آگ سے بچ گئی تھی۔ اس کے جسم کے کچھ حصے آگ سے جل گئے ہیں"۔

سردار تیمور نے داراب کو آزاد کر دیا اور اس کی بیوی کو پناہ گاہ سے منگوا کر اس کے حوالے کر دیا۔ شہزادی
شستبیل اپنے مسلم محسن کے اخلاق سے متاثر ہو کر پہلے ہی مسلمان ہو چکی تھی۔ داراب بھی کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوا
اور رباب کو بالائے طاق رکھ کر تیمور کے سپاہیوں میں شامل ہو گیا۔

○

سرائے خانم

تیمور اپنا خواب بیان کر رہا تھا۔ وہ بڑے صبر و تحمل کا مالک تھا۔ بڑی سے بڑی پریشانی بھی اپنے چہرے
سے ظاہر نہ ہونے دیتا تھا مگر آج خلافِ معمول اس کی آواز بھرا رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا دل
اندر ہی اندر رو رہا ہو۔

مرحوم بیوی الجائی خاتون کے تصور سے اس کی آنکھیں اکثر بھر آتی تھیں۔ پھر جب کبھی یہ تصور خواب کے
پردے پر ابھرتا تو اس کے دل سے ٹیسیں اٹھنے لگتیں۔

ادھر کئی دن سے الجائی خاتون مسلسل اس کے خوابوں میں یادیں بھیر رہی تھیں۔ رات تو اس نے تیمور
سے باتیں بھی کی تھیں۔ اس نے محسوس کیا تھا جیسے سیستانیوں کو شکست دینے کے بعد وہ ایک پہاڑی مقام پر
ٹھہر گیا ہے۔ اس کا خیمہ ایک بلند مقام پر نصب ہے۔ الجائی خاتون قالین کے فرش پر اس کے سامنے بیٹھی ہے۔
صبا کے سبک جھونکے پہاڑی پھولوں کی خوشبو ہر طرف بکھیر رہے ہیں۔ سامنے کی پہاڑیوں سے ماہتاب سر ابھار
رہا ہے۔ ڈھلے ہوئے آسمان پر بادلوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑے آگے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ تیمور اور الجائی فضا
کی رنگینیوں اور سحر انگیزیوں میں کھوئے ہوئے ہیں۔

"میرے سرتاج!"

یکایک جیسے الجائی خاتون نے خواب سے چونک کر کہا۔ اس کا انداز وہی پرانا اور والہانہ تھا لیکن آواز کرب میں
ڈوبی ہوئی تھی۔

تیمور نے آسمان میں کھیت کرتے ماہتاب سے نظریں ہٹا کر الجائی خاتون کو دیکھا۔ اسے الجائی کی روشن
آنکھوں میں اشکوں کے موتی چھلکتے دکھائی دیے۔

"تم رو رہی ہو الجائی! فرصت کے ان لمحات میں آنسوؤں کا ظاہر ہونا نہایت بڑی بدشگونی ہے!"

"نہیں میرے سرتاج!"

الجائی نے منہ گھما کر آنسو پونچھ ڈالے:

"میری روح پر ایک بوجھ ہے۔ ایک دکھ ہے۔ مجھے نجات دلا دو اس سے میرے سرتاج!"

"جلد بتاؤ الجائی!"

تیمور بے چین ہو گیا:

"تم میرے گرم و سرد کی شریک ہو۔ جہانگیر کی ماں ہو۔ تمہارے لیے میں ہفت خواں کی منزلیں طے کر سکتا ہوں۔ پہاڑوں سے ٹکرا سکتا ہوں۔ تم تو بے آب و گیاہ صحراؤں اور تپتے ہوئے ریگستانوں میں مسکراتی رہی ہو۔ قیمتی موتیوں کو کیوں ضائع کر رہی ہو؟"

"تم نے مجھے سب کچھ دیا۔ اپنا پیار۔ اپنی رفاقت۔"

الجائی خاتون جذباتی ہو گئی:

"یہ آرزو بھی پوری کر دو۔ میرا بھائی امیر حسین خود سر ہے۔ ضدی ہے مگر میرا بھائی ہے۔ اس کی خطائیں درگذر کرو۔ اسے معاف کر دو میرے سرتاج۔ میری روح کو آزاد کر دو۔ اس کرب سے مجھے نجات دلا دو۔"

الجائی نے آسمان کی طرف دیکھا اور لرزتی ہوئی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولی:

"یہ لکاتا ہے ابر، بادل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، درخشاں ماہتاب کو اپنی آغوش میں لینا چاہتے ہیں۔ اس کی تابانی کو سیاہ چادر میں سمیٹنا چاہتے ہیں۔ تم روشن ماہتاب ہو میرے سرتاج! امیر حسین تم پر قابو نہیں پا سکتا۔ تم اس پر قابو پاؤ گے۔ اسے اسیر کر دو گے۔ وعدہ کرو کہ تم اسے قتل نہیں کرو گے؟"

الجائی خاتون کی آنکھوں کے بند ٹوٹ گئے۔

"الجائی!"

تیمور نے الجائی کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھا:

"میں نے اسے قتل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اس نے بلخ و درخشاں مانگا۔ میں نے اعتراض نہیں کیا۔ قرشی جیسے مضبوط قلعہ کے لیے ضد کی۔ میں نے انکار نہیں کیا۔ وہ غزنی کا حاکم تھا۔ چاہے تو غزنی اسے میں اسے دے سکتا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے سرتاج!"

الجائی اب بھی چمکتے چاند کو دیکھ رہی تھی:

"میں دیکھتی رہی ہوں اور اب بھی دیکھ رہی ہوں۔ امیر حسین برابر غلطیاں کر رہا ہے۔ پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ وہ تمہارے ہاتھ سے قتل نہ ہو اور نہ تمہارے حکم سے قتل کیا جائے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔ قول دیتا ہوں۔" تیمور نے وعدہ کر لیا۔

تیمور نے رات جو خواب دیکھا تھا، اپنے سرداروں اور ساتھیوں کے سامنے بیان کر دیا۔

ہر شخص دم بخود بیٹھا بڑی توجہ اور دلچسپی سے سن رہا تھا۔ اس وقت اس کے خیمے میں خواب سننے کے لیے سب ہی سردار بیٹھے تھے۔ پرانے وفاداروں میں جاکو برلاس، امیر ارلات، طرحدار ایلچی بہادر اور شیر بہرام ... امیر جن کی وفاداریاں اور تعاون تیمور کو پچھلے چھ سال میں حاصل ہوتی تھیں ان میں جتہ سپہ سالار ... عمر بیٹا بیان اور دوسرا ملک ختا کا امیر جغتائی بہادر تھا۔ جغتائی بہادر ہر وقت چمڑے کا کوٹ پہنے رہتا تھا، ... کی پشت پر گھوڑے کی ایال لٹکتی رہتی تھی۔ یہ دونوں مغل شہزادے تھے جنہوں نے مغلوں کی شکست کے ... بعد سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

ایک اور مغل سردار منگلی بوغا بھی تیمور کا حلیف بن گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ اگر اسے چھ ہزار کا ... دے دیا جائے تو وہ تیمور کو زندہ گرفتار کر سکتا ہے لیکن جب مغل خاقان الیاس خواجہ خان شکست کھا کر شمال ... بھاگ گیا تو ایک دن یہی خانہ بدوش مغل سردار تیمور کے خیمے پر پہنچا۔ تیمور اسی طرح دربار لگائے بیٹھا ... منگلی بوغا گھوڑے سے اترا۔ اور بغیر اپنا تعارف کرائے تیمور کے سرداروں میں بیٹھ گیا۔ اب وہ یہ کہتا تھا کہ ... کا نمک کھا چکا ہوں کسی اور طرف کا رخ نہ کروں گا۔

سرداروں نے تیمور کی بھرائی ہوئی آواز سے یہ اندازہ لگا لیا کہ تیمور پر اس خواب کا بڑا گہرا اثر ہوا ہے۔ تمام امیر حسین کے سخت مخالف تھے اور اس کے خاتمے کے در پے تھے۔ امیر حسین شکست پر شکست کھاتا، پسپا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے بہت سے امیر اور سردار اس کا ساتھ چھوڑ کر تیمور کے پاس آ گئے تھے لیکن عقل کا دشمن امیر ... ابھی تک اسی طرح اکڑا ہوا تھا اور سمرقند کی حکومت کو اپنا موروثی حق سمجھتا تھا۔

تیمور نے خواب بیان کر کے سر جھکا لیا۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر عمر رسیدہ امیر جاکو برلاس نے سکوت کو توڑا:

"اے تاتاری قوم کے عظیم رہنما! خاتون آغا الجائی خاتون وہ عظیم خاتون تھیں جن کی تمام زندگی آپ کے ساتھ جنگ میں گزری۔ وہ ہمارے لیے قابلِ احترام تھیں۔ انہوں نے آپ سے کوئی وعدہ لیا ہے تو آپ اسے ضرور ... رہیں۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔"

جاکو برلاس نے تیمور کی خوشنودی کے لیے یہ کہہ تو دیا لیکن وہ جانتا تھا کہ تیمور کے تمام سردار اور امیر ...

امیر حسین کے خون کے پیاسے ہیں اور ان میں سے جس کے ہاتھ بھی امیر حسین پڑ گیا، وہ اس کے ہا
گا۔ خود تیمور کو بھی اس بات کا علم تھا۔ اُس وقت بھی اسے سرداروں کے تیور سے اندازہ ہو گیا تھا کہ
برلاس کی بات پسند نہیں آئی۔

"اے تاتاری قوم کے بہادر سپوتو!"

تیمور نے سرداروں کا غصہ کم کرنے کے لیے کہا:

"بے شک تم نے میری جدوجہد آزادی میں بھرپور تعاون کیا ہے اور اب بھی تم وفاداری کا
میں نے الجائی خاتون سے عالمِ رویا میں جو وعدہ کیا ہے اس وعدے اور عہد کی میں تمہارے سامنے تجد
اور اعلان کرتا ہوں کہ اگر امیر حسین گرفتار ہو کے میرے سامنے پیش کیا گیا تو میں نہ تو اسے اپنے ہاتھ
گا اور نہ اس کے قتل کا حکم دوں گا۔ تم لوگ گواہ رہو اور دعا کرو کہ الجائی خاتون کی روح کو میرے اس
سکون اور اطمینان حاصل ہو۔"

"ہم سب دعا کرتے ہیں سردار۔" جاکو برلاس نے بات ختم کرنے کے لیے سب کی طرف سے کہا۔

"اس تجدیدِ عہد کے بعد میں چاہتا ہوں کہ امیر حسین کو صلح کا پیغام بھیجوں۔"

تیمور کی زبان سے یہ نکلنا تھا کہ سرداروں کے چہرے غصے سے سرخ ہو گئے۔

"سردار یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

منگلی بوغا بگڑ کر بولا:

"آپ اسے صلح کا پیغام کیوں بھیجیں۔ شکست امیر حسین کھا رہا ہے۔ اسے چاہیے کہ گلے میں ہا
کے سامنے پیش ہو اور آپ سے جان بخشی کی درخواست کرے۔"

"اور کیا سردار!"

امیر جِلّا حطائی بہادر اپنی بیٹھ پر گھوڑے کی ایال ٹٹولتے ہوئے بولا:

"اگر وہ آنے میں لیس و پیش کرے تو ہمیں حکم دیجیے ہم اسے گھوڑے کی دم سے باندھ کے ہا

"سردار! آپ نے اسے بہت معافیاں دی ہیں!"

شیخ علی بہادر نے اپنا غصہ دکھایا:

"جب تک امیر حسین زندہ ہے ملکِ تاتار میں امن و امان نہیں ہو سکتا۔ میں تو اس کی گردن ا
دوں گا سردار!"

"ابھی اس کا وقت نہیں آیا علی بہادر۔" تیمور نے اسے ٹھنڈا کیا: "ہمیں الجائی خاتون کی

ہر وہ کوشش کرنا ہو گی جس سے امیر حسین مطیع ہو کر راہِ راست پر آجائے۔ میں اسے غزنی کی حکومت پیش کرتا
ہوں۔"

"سردار!"

بیک جک کے بیٹے بیان کا خون کھول اٹھا:

"غزنی اور قندھار آپ نے بزورِ شمشیر فتح کیا ہے۔ امیر حسین کا اب اس پر کوئی حق نہیں۔ اس کی بادشاہت
تو پہلے ہی مغلوں نے الٹ دیا تھا۔"

"تحمل سے کام لو بیان۔"

تیمور نے کہا:

"میں نہیں چاہتا کہ تاتاری، تاتاری سے لڑتا رہے۔ اس لیے مزید خانہ جنگی سے بچنے اور ملک میں امن و امان کی
خاطر ہمیں غزنی کی حکومت امیر حسین کو واپس کرنا پڑے تو یہ سودا مہنگا نہ پڑے گا۔"

پھر ذرا رک کر تیمور نے اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا:

"میں شیر بہرام کو امیر حسین کے پاس بھیج رہا ہوں۔ شیر بہرام پہلے بھی امیر حسین سے مل چکے ہیں۔"

تیمور نے فیصلہ کر دیا تھا اس لیے کسی کو دخل دینے کی جرأت نہ ہوئی۔ تیمور اپنے سرداروں سے مشورہ ضرور کرتا مگر
وہ کوئی فیصلہ کر دیتا تو پھر کسی کو بولنے کی اجازت نہ تھی۔

تیمور کے ساتھ پرانا قاصد ایلچی بہادر بھی تھا جو کئی بار سفارتی فرائض انجام دے چکا تھا لیکن شیر بہرام کو اس نے
منتخب کیا کہ اس میں ایلچی بہادر کی بہ نسبت زیادہ بردباری پائی جاتی تھی۔

تیمور نے شیر بہرام کو اپنا قاصد بنا کے امیر حسین کی طرف روانہ کیا۔ امیر حسین نے دریائے آمو کی طرف پسپائی
کی تھی اس لیے شیر بہرام نے ادھر ہی کا رخ کیا۔ شیر بہرام کے ساتھ چار سوار تھے۔ ان سب نے نیزوں پر سفید
پٹیاں باندھ لی تھیں تاکہ امیر حسین کے چھپے ہوئے آدمی ان پر حملہ نہ کر دیں۔

تیمور نے لشکر کو ایک ہفتہ آرام کرنے کا حکم دیا تھا۔ ہفتے کے اختتام پر اس نے بھی کوچ کیا اور آہستہ
آہستہ دریائے آمو کی طرف چل دیا۔

تیمور اور امیر حسین کی خانہ جنگی نے تاتاریوں کو بہت نقصان پہنچایا لیکن ملکِ تاتار میں اس ابتری کے باوجود
منگولستان کے خانِ اعظم کی ہمت نہ ہوئی کہ تاتاری علاقوں کی طرف نظر اٹھائے۔ انہیں تیمور کے پیکر میں ایک ایسا تاتاری
نظر آیا تھا جس سے مقابلہ اب ان کے لیے ممکن نہ رہ گیا تھا۔ انہیں تو اپنے علاقوں کی فکر پڑ گئی تھی۔ وہ چاہتے تھے
کہ تیمور اور امیر حسین کی خانہ جنگی طویل ہوتی رہے تاکہ تیمور اُن کی طرف رخ نہ کر سکے۔

تیمور کو صرف امیر حسین ہی سے نہیں نمٹنا تھا بلکہ اسے ازبکوں کی بھی فکر تھی جو الیاس خواجہ
ساتھ ہی اپنے اپنے علاقوں میں خود مختار بن بیٹھے تھے۔ یہ سب ماوراء النہر کے بڑے بڑے قلعوں
تیمور کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ ان لوگوں سے قلعے کس طرح خالی کرائے جائیں۔ اگر ان پر فوج کشی کی گئی تو
سکتا تھا اور زیادہ جانی نقصان کا بھی امکان تھا۔ چنانچہ تیمور نے ان قلعوں پر قبضے کے لیے ایک
چال چلی۔

اس نے تمام قلعہ داروں کو الیاس خواجہ خان کی طرف سے ایک حکمنامہ لکھا جس میں انہیں تاکید
بلادِ شمال میں مغلوں کے مستقر حصار المالیق میں حاضر ہو کر الیاس خواجہ خان سے تازہ ہدایات حاصل کر
یہ خطوط تیمور نے الگ الگ سب قلعداروں کو بھجوا دیے۔ پھر چند لشکر ان قلعوں کی طرف روانہ
دیا کہ ہر قلعے کے سامنے پہنچ کر خوب گرد اڑائے اور قلعے والوں کو ہراساں کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
کے حملے کا خدشہ پیدا ہو گیا۔ بلادِ شمال سے طلبی کا پروانہ ان کو پہنچ چکا تھا اس لیے انہوں نے بہتر یہی سمجھا کہ
تیمور سے الجھنے کے وہ الیاس خواجہ خان کے پاس چلے جائیں۔

ان ازبکوں نے فوراً قلعے خالی کر دیے اور شمال کی طرف چلے گئے۔ تیمور نے اپنی حکمتِ عملی
ماوراء النہر کے تمام قلعوں پر قبضہ کر لیا۔

تیمور جب دریائے آمو کے کنارے اس مقام پر پہنچا جہاں امیر حسین کے لشکر کی موجودگی
دی گئی تھی تو اسے معلوم ہوا کہ امیر حسین اپنے لشکر کے ساتھ کئی ہفتے پہلے بلخ کی طرف چلا گیا ہے۔
شیر بہرام اب تک واپس نہیں آیا تھا۔

یہ سوچ کر تیمور نے دریائے آمو کے کنارے خیمے لگا دیے اور شیر بہرام کی واپسی کا انتظار
یہ خیال ٹھیک تھا۔ شیر بہرام بھی اس مقام تک پہنچا تھا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ امیر حسین بلخ کے
قریب پہاڑیوں میں خیمہ زن ہے تو وہ بغیر رکے اس طرف روانہ ہو گیا۔

شیر بہرام پہاڑی علاقے میں ایک تنگ گھاٹی سے گزر رہا تھا کہ اسے امیر حسین کے آدمی
نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ ان گھاٹیوں اور پہاڑیوں کو امیر حسین کا لشکر گھیرے ہوئے ہے اور

خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔
شیر بہرام کو امیر حسین کا کوئی آدمی نہ پہچانتا تھا لیکن جب شیر بہرام نے یہ بتایا کہ وہ تیمور کی طرف سے صلح
کا پیغام لایا ہے اور اسی سلسلے میں امیر حسین سے گفتگو کرنے جا رہا ہے تو امیر حسین کے آدمیوں نے اس کی
رہنمائی کی اور انہیں امیر حسین کی طرف لے چلے۔
شیر بہرام پورا ایک دن پہاڑ کی مختلف گھاٹیوں میں سفر کرتا رہا۔ پھر پہاڑی سلسلہ ختم ہوا اور دوسرے
دن شام کو وہ میدانی سفر کر کے امیر حسین کے لشکر میں پہنچ گیا۔
امیر حسین کو شیر بہرام کی آمد کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی۔ گھاٹی کے محافظ دستوں کے سردار نے ایک تیز رفتار
قاصد کے ذریعے امیر حسین کو یہ خبر بھجوا دی تھی۔
امیر حسین کو اس خبر سے بڑی خوشی ہوئی تھی اور اس نے اپنے سرداروں میں ڈینگیں مارنا شروع کر دی تھیں کہ تیمور اس سے
ڈر کر صلح کرنا چاہتا ہے۔

امیر حسین کی حسین و جمیل بیوی دلشاد آغا کو شوہر سے بڑی محبت تھی۔ اس نے جوانی کے چند سال بڑی شان
سے گزارے تھے۔ امیر حسین غزنی کا حکمران تھا اور دلشاد آغا ملکۂ غزنی۔ پھر جب مغلوں نے شمال سے یلغار کی تو غزنی کی
چھوٹی سی ریاست خس و خاشاک کی طرح بکھر کے رہ گئی۔ اس میں کچھ امیر حسین کی جلد بازی کو بھی دخل تھا۔ امیر حسین
جتنا بہادر تھا اتنا ہی جلد باز اور ضدی بھی تھا۔ اس نے مغلوں کی طاقت کا غلط اندازہ لگایا اور ان پر حملہ کر دیا۔ جب سے
وہ دربدر پھر رہا تھا۔ اس صحرا نوردی اور غریب الوطنی میں دلشاد کا حسن کچھ کملا گیا تھا۔ امیر حسین اگر تیمور کے ساتھ قدم
ملا کر چلتا تو بہت کچھ حاصل کر سکتا تھا کیونکہ اس کی سگی بہن الجائی خاتون تیمور کی بیوی تھی لیکن اس پر سمرقند کی
بادشاہت کا بھوت سوار ہو گیا اور اس نے تیمور کے ساتھ جنگ شروع کر دی۔
دلشاد آغا اس خانہ جنگی کی شروع ہی سے مخالف تھی لیکن امیر حسین نے اسے کم عقل کہہ کے خاموش کر دیا تھا۔
حالانکہ دلشاد بڑی سمجھدار عورت تھی۔ اس نے تیمور کی اہلیت اور طاقت کا بالکل صحیح اندازہ کیا تھا۔ اسے یہ محسوس ہو رہا
تھا کہ تیمور ایک دن ضرور ملکِ تاتار کا امیر بنے گا اور جب سے مغل شکست کھا کر شمال کی طرف پسپا ہو گئے تھے اس کا
یہ احساس یقین میں تبدیل ہو گیا تھا۔ امیر حسین شکست پر شکست کھا رہا تھا لیکن ہٹ دھرمی نہیں چھوڑتا تھا۔ وہ

اب بھی خود کو سمرقند کا بادشاہ سمجھتا تھا۔

شیر بہرام کی خبر پاتے ہی وہ بھاگا بھاگا دلشاد آغا کے پاس گیا اور بڑے تبحتر سے بولا:

"دلشاد۔ دیکھا تم نے۔ تیمور نے آخر گھٹنے ٹیک دیے۔ اب وہ صلح پر آمادہ ہے"۔

"تیمور اور تم سے صلح؟"

دلشاد جل کر بولی،

"کہیں خواب تو نہیں دیکھا تم نے؟"

"دلشاد۔ مجھے تم سے یہی شکایت ہے"۔

امیر حسین بگڑ گیا:

"تم نے میری عظمت کا کبھی اعتراف نہیں کیا۔ کیا میں بہادر نہیں۔ میں امیر قزعن کا بیٹا نہیں۔ سمرقند پر کیا میرا حق نہیں؟"

"امیر حسین! تم بہادر ہو اور مجھے ایک بہادر کی بیوی ہونے پر فخر ہے"۔

دلشاد نے سچے دل سے اعتراف کیا:

"یہ بھی صحیح ہے کہ تم امیر قزعن کے بیٹے ہو لیکن سمرقند کے تخت کا وہ حقدار ہے جس کے پاس طاقت ہے، جس کی تلوار میں زور ہے اور جس کے ساتھ تاتاری سرداروں کی اکثریت ہے۔ طاقت کا توازن تیمور کے حق میں ہے۔ وہ ہم پر فتح پا رہا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم خود دوستی کا ہاتھ اس کی طرف بڑھائیں۔ تیمور دل کا برا نہیں۔ وہ بہادروں کا قدردان ہے"۔

"تم مجھے ذلیل کرنا چاہتی ہو دلشاد"۔

امیر حسین کے تن بدن میں آگ لگ گئی:

"طاقت میرے پاس بھی ہے۔ اب بھی چھ ہزار سوار میرے ساتھ ہیں۔ بلخ میں اس سے زیادہ سوار میرے منتظر بیٹھے ہیں۔ تیمور کی طاقت اب ختم ہو چکی ہے۔ وہ اس طویل جنگ کا متحمل نہیں ہو سکتا اسی لیے اب وہ مجھ سے صلح کرنا چاہتا ہے"۔

"تو پھر مجھ سے کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ صلح کر لو"۔

دلشاد نے زہرخند کیا:

"میں تو شروع ہی سے خانہ جنگی کے خلاف ہوں۔ ہم نے ایک دوسرے کا خون بہا کے کیا پایا؟ بلخ لٹ گیا۔ آخر نقصان کس کا ہوا؟ کیا یہ افسوس کا مقام نہیں؟"

"مجھے کوئی افسوس نہیں!"

امیر حسین نے منہ بنایا:

"تخت و تاج کے لیے تو جنگ ہوا ہی کرتی ہے۔ اگر تلواریں نیام میں ڈال لی جائیں تو زنگ آلود ہو جاتی ہیں سپاہی خون بہتا ہوا نہ دیکھیں تو بزدل ہو جاتے ہیں۔ تیمور نے میری شرط مان لی تو میں ضرور صلح کر لوں گا ورنہ یہ جنگ یونہی جاری رہے گی"۔

"تم نے صلح کی کیا شرط پیش کی ہے؟" دلشاد آغا مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں اب بھی دل کشی تھی۔

"میں سمرقند کا بادشاہ اور تاتاریوں کا امیر ہوں گا اور تیمور میرا سپہ سالار"۔

امیر حسین گردن اکڑا کر بولا:

"میری یہی شرط ہوگی۔ صلح صرف اسی شرط پر ہو سکتی ہے"۔

"سردار تیمور نے تمہاری شرط کا کیا جواب دیا ہے؟" دلشاد نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ابھی سوال جواب کا وقت نہیں آیا"۔

امیر حسین نے وضاحت کی:

"ہمارے محافظوں نے صرف اتنی خبر دی ہے کہ شیر بہرام صلح کا پیغام لے کر میرے پاس پہنچ رہا ہے۔ شیر بہرام ابھی راستے میں ہے اور تم نے شرطیں بھی طے کر لیں"۔

دلشاد ناگواری سے بولی:

"امیر حسین! تیمور اس قدر بے وقوف نہیں کہ تمہیں سمرقند کا حاکم تسلیم کر لے۔ پھر ایسی صورت میں جبکہ وہ فاتحانہ بلخ کی طرف بڑھ رہا ہے اور ہمارا لشکر مسلسل پسپا ہونے پر مجبور ہے"۔

"تمہارے وسوسوں اور اندیشوں ہی نے مجھے تباہ کیا ہے"۔

امیر حسین کو غصہ آ گیا:

"تم اپنے شوہر کی طرفداری کرنے کی بجائے ہمیشہ تیمور کی حمایت کرتی ہو"۔

"امیر حسین!"

دلشاد کو بھی غصہ آ گیا:

"تم میری وفاداری پر شک کرتے ہو۔ کیا میں نے قدم قدم پر تمہارا ساتھ نہیں دیا۔ میدانِ جنگ میں تمہارے گھوڑے سے گھوڑا ملا کر نہیں لڑی۔ میں نے حقیقت بیان کی ہے۔ یہ کوئی وسوسہ یا اندیشہ نہیں۔ مجھے تو یہ بھی یقین نہیں کہ شیر بہرام واقعی صلح کا پیغام لے کر آ رہا ہے"۔

لیکن جب اسی شام شیر بہرام اپنے چار سواروں کے ساتھ نیزوں پر سفید کپڑا چڑھائے اظہار کمی
پاس پہنچ گیا تو دلشاد کو اپنے اندازے پر افسوس ہوا۔ وہ سخت متعجب تھی کہ تیمور نے یہ کمزوری کیوں
ایک فاتح نے شکست خوردہ دشمن کے پاس صلح کا پیغام کیوں بھیجا؟ تیمور کو کیا مجبوری تھی کہ جس نے
امیر حسین سے صلح پہ آمادہ کر دیا؟

امیر حسین نے شیر بہرام کو بڑی گرمجوشی سے خوش آمدید کہا اسے گلے سے لگایا اور بڑی عزت دی مگر امیر حسین
اسے ایک خیمے میں ٹھہرایا۔

پھر وہ ہنستا ہوا دلشاد آغا کو خبر دینے یا اسے جلانے آیا:

"شیر بہرام آ گیا ہے دلشاد!" امیر حسین کے لہجے میں طنز کے نشتر بھرے تھے۔

"مجھے معلوم ہے"۔ دلشاد آغا نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

"اس کے نیزے پر سفید کپڑا چڑھا ہوا ہے"۔ امیر حسین نے طنز کا ایک اور تیر چلایا۔

"خدا کا شکر ادا کرو امیر حسین"۔

دلشاد آغا بڑے خلوص سے بولی:

"صلح کا ایک سنہرا موقع ہاتھ آیا ہے اسے ضائع مت کر دینا"۔

"اب تم دیکھتی جاؤ۔ میں کیا کرتا ہوں"۔

امیر حسین آپ ہی آپ اکڑ گیا:

"میں تیمور سے اپنی شرط منوا کے رہوں گا۔ شیر بہرام مجھ سے بہت حد تک جھک کے ملا ہے۔ یہ
کمزوری کا اظہار ہے"۔

"اس قدر پر امید نہ ہو امیر حسین"۔

دلشاد نے ناصحانہ انداز میں کہا:

"بہت سنبھل کے گفتگو کرنا شیر بہرام سے۔ شیر بہرام تاتاری سردار ہی نہیں، وہ تیمور کا گہرا دوست
وہ بڑا جہاندیدہ ہے اور ہماری کمزوریاں بھی اس سے پوشیدہ نہیں"۔

"تمہارا یہ اندازہ بھی غلط ثابت ہو گا"۔

امیر حسین نے تمسخر سے کہا:

"ہماری کمزوریاں اپنی جگہ لیکن تیمور کا صلح کے لیے اس قدر بے چین ہونا، اس کی کمزوری ظاہر کرتا
امیر حسین نے چار دن تک شیر بہرام سے کوئی گفتگو نہ کی البتہ اس کی خاطر مدارات میں کوئی

شیر بہرام خیمے میں پڑے پڑے تنگ آ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ امیر حسین بات چیت سے کیوں
گریز کر رہا تھا؟

دلشاد آغا بھی امیر حسین کے رویے سے خوش نہ تھی۔ . . . اسے امید کی ایک جھلک دکھائی دی تھی،
پتہ نہیں گفتگو سے کیوں کترا رہا ہے؟

اس سے نہ رہا گیا تو ایک دن پوچھ بیٹھی:

"شیر بہرام کو خیمے میں کیوں قید کر رکھا ہے؟ اس سے گفتگو کیوں نہیں کرتے؟"

"تم نہیں سمجھو گی اس حکمت عملی کو"۔

امیر حسین نے بڑے مدبرانہ انداز میں کہا:

"شیر بہرام کو جتنا انتظار کرایا جائے گا اتنا ہی اس پہ ہمارا رعب پڑے گا"۔

"تمہاری اس بے التفاتی نے پتہ نہیں اس پہ کیا اثر کیا ہو گا؟ تم آج اس سے ضرور ملاقات کرو"۔

"دیکھو دلشاد۔ میں نے تمہیں کئی بار منع کیا ہے کہ تم میرے معاملات میں دخل نہ دیا کرو"۔

امیر حسین چڑ کے بولا:

"تم ان باریکیوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔ میں اپنی طرف سے کیوں ظاہر کروں کہ میں صلح کے لیے بے چین ہوں۔
اس کا مطلب ہے کہ شیر بہرام یہیں پڑا رہے"۔

دلشاد نے الجھتے ہوئے کہا:

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارے سلوک سے بددل ہو کر واپس چلا جائے"۔

"واپس چلا جائے اور میرے پاس رہے؟"

امیر حسین کی تیوریوں پر بل پڑ گئے:

"ہاتھ آئے ہوئے دشمن کو چھوڑا نہیں جاتا"۔

"کیا کہا . . . . کیا کہا تم نے؟"

دلشاد چونک پڑی:

"کیا تم اسے قید کر دو گے؟ مجھے تم سے اتنی بڑی غلطی کی امید نہیں"۔

"صرف قید ہی نہیں دلشاد آغا"۔

امیر حسین نے اسے گھورتے ہوئے کہا: "اگر شیر بہرام نے میری اطاعت قبول نہ کی تو اسے قتل بھی

کیا جاسکتا ہے"۔

"امیر حسین!"

دلشاد آغا کمر پر ہاتھ رکھ کے اس کے سامنے کھڑی ہوگئی:

"ہم نے اب تک بہادروں کی طرح مصائب برداشت کیے ہیں۔ میں بزدلی کا داغ چہرے پر نہیں لا
تم ایسا نہیں کرسکتے"۔

امیر حسین نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا:

"یہ جنگ ہے دلشاد آغا۔ اس کے معاملات تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتے۔ مجھے تمہارے مشورے
ضرورت نہیں"۔

امیر حسین چلا گیا۔

دلشاد آغا پیچ و تاب کھاتی رہ گئی۔

آج پہلی مرتبہ امیر حسین کے خلاف نفرت کا ہلکا سا جذبہ اس کے دل میں پیدا ہوا۔ امیر حسین کے جانے
نے اپنی کنیزِ خاص کے ذریعے شیر بہرام کے پاس کہلا بھیجا کہ وہ امیر حسین سے محتاط رہے اور گفتگو
فوراً کسی بہانے یہاں سے نکل جائے۔

شیر بہرام کے دل میں پہلے ہی بدگمانی پیدا ہوگئی تھی۔ دلشاد آغا کے پیغام نے اس بدگمانی میں اضا
کردیا مگر مشکل یہ تھی کہ وہ تیمور کا پیغام دیے بغیر واپس بھی نہ جاسکتا تھا۔

شیر بہرام کو اپنی زیادہ فکر نہ تھی لیکن وہ امیر حسین سے جلد از جلد گفتگو کرکے سردار تیمور کو اس کے
سے آگاہ کرنا چاہتا تھا کہ وہ امیر حسین کے جواب کی روشنی میں آئندہ قدم اٹھائے۔ اس نے مزید انتظار کے بجا
کے پہریدار کے ذریعے امیر حسین کو اطلاع دی کہ اگر شیر بہرام سے ملاقات نہیں کرنا چاہتا تو اسے واپسی
کی اجازت دی جائے۔

امیر حسین، شیر بہرام کا پیغام ملتے ہی ملاقات پر آمادہ ہوگیا۔ اس نے شیر بہرام کو اپنے خیمے میں

"امیر محترم! یہ کون سی مہمان نوازی ہے۔ میں ایک ہفتے سے آیا پڑا ہوں اور آپ نے مجھ سے بات

شیر بہرام خیمے میں داخل ہوتے ہی بغیر دعا سلام کے شروع ہوگیا:

"میں کوئی ایسا گرا پڑا نہیں ہوں۔ میں نہ اپنی ضرورت سے آیا ہوں اور نہ مجھے آپ سے کچھ لے
سردار تیمور کا پیغام لایا ہوں۔ وہ تاتاریوں کے بہت بڑے سردار ہیں۔ آپ کو ان کا پیغام فوراً
چاہیے تھا"۔

امیر حسین نے کئی بار بولنے کی کوشش کی لیکن شیر بہرام نے دل کی بھڑاس نکالنے سے پہلے اسے بولنے کا موقع
نہیں دیا۔

شیر بہرام خاموش ہوا تو امیر حسین مسکرا کے بولا:

"شیر بہرام۔ تیمور بڑا ہو یا نہ ہو لیکن تم بڑے سردار ضرور ہو"۔

امیر حسین نے اپنے منصوبے کے تحت جال بچھانا شروع کیا:

"میں نے تم سے اس لیے ملاقات نہیں کی کہ میں چاہتا تھا کہ تم اچھی طرح آرام کرلو۔ آخر اتنی دور کا سفر
کرکے آئے ہو"۔

"میرے آرام کو چھوڑیے امیر"۔

شیر بہرام بات کاٹ کر بولا:

"میں سردار تیمور کا پیغام لایا ہوں۔ اسے سنیے اور مجھے رخصت کیجیے۔ میں کاہل بننا نہیں چاہتا"۔

"پیغام بھی سن لیا جائے گا اور گفتگو بھی ہوگی مگر اتنی جلدی بھی کیا ہے؟"

امیر حسین نے ٹالنے کے انداز میں کہا:

"پہلے یہ بتاؤ شیر بہرام! تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"آپ کا شکریہ امیر!"

بہرام اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا:

"تاتاری کو گھوڑے کی پیٹھ سے زیادہ کہیں آرام نہیں ملتا۔ کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔ . . . آپ بھی
تو تاتاری ہیں"۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو شیر بہرام"۔

امیر حسین سوچتے ہوئے بولا:

"لیکن تم ایک معزز مہمان ہو۔ تاتاریوں میں تمہیں ایک اہم حیثیت حاصل ہے۔ دراصل مجھے تیمور کی یہ
حرکت پسند نہیں آئی"۔

"حرکت۔ کیسی حرکت؟"

شیر بہرام نے اسے چونک کر دیکھا:

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"دیکھو شیر بہرام! میرے دل میں تمہاری بڑی عزت ہے"۔ امیر حسین نے بظاہر بڑی سادگی سے کہا:

"تم تاتاریوں کے ایک بڑے سردار ہو۔ تیمور کو کیا ضرورت تھی کہ وہ تمہیں اپنا قاصد بنا کر بھیجتا۔ چھوٹے بڑے میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ تم میرے سردار ہوتے تو میں یہ معمولی کام تمہارے سپرد نہ کرتا۔"

"اے امیر! آپ تو اجنبیوں جیسی باتیں کرتے ہیں۔"

شیر بہرام نے اسے تعجب سے دیکھتے ہوئے کہا:

"کیا آپ تاتاری نہیں۔ ہم تاتاریوں کا طریقہ ہے کہ جب ہم کسی کو اپنا سردار بنا لیتے ہیں تو اپنے اختیارات اس کے سپرد کر دیتے ہیں۔ تیمور ہمارے سردار ہیں۔ انہیں اختیار ہے خواہ وہ ہمیں میدان میں لڑائیں یا سفیر و قاصد بنا کر بھیجیں۔ پتہ نہیں آپ قاصد کو کمتر کیوں سمجھتے ہیں؟ قاصد تو اپنے سردار کا ہوتا ہے۔ وہ اپنے سردار کی زبان سے بولتا ہے۔ اگر وہ غلطی سے بھی کوئی فیصلہ کر لے تو سردار اسے کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔"

"میرا یہ مقصد نہیں شیر بہرام۔"

امیر حسین نے دیکھا کہ اس پر تو الٹا اثر ہوا ہے تو فوراً بات بدل دی:

"میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ یہ کام تم سے کسی کم تر درجے کے سردار کو بھی تو دیا جا سکتا تھا۔ خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ تم خیریت سے رہے۔ تمہارے قبیلے والے تو ٹھیک ٹھاک ہیں۔"

"واہ امیر! آپ نے تو کمال کر دیا۔"

شیر بہرام کو اور زیادہ حیرت ہوئی:

"آپ تو یوں پوچھ رہے ہیں جیسے آپ میدانِ جنگ کے بجائے اپنے گھر میں بیٹھے ہیں اور میں یہاں مہمان آیا ہوں۔ میں سردار تیمور کی طرف سے صلح کا پیغام لایا ہوں، اس کے بارے میں آپ مجھ سے کیوں نہیں پوچھتے؟"

"وہ اہم بات نہیں۔"

امیر حسین نے لاپروائی دکھائی:

"کیا صلح ضروری ہے؟ آخر تیمور صلح کے لیے اس قدر بے چین کیوں ہے؟"

"یہ تو میں نہیں کہتا کہ وہ بے چین ہیں؟"

شیر بہرام ناگوار لہجے میں بولا:

"لیکن اس خانہ جنگی اور تاتاریوں کا بلاوجہ خون بہنے سے کم از کم میں بے چین ضرور ہوں اور اگر آپ بھی پر خلوص دل سے غور کریں گے تو آپ بھی بے چین ہو جائیں گے۔"

امیر حسین نے دیکھا کہ یہ تو الٹا ہی گلے پڑ رہا ہے تو کھٹتے ہوئے پُرغرور انداز میں پوچھا:

"اچھا بیان کرو۔ تیمور کیا چاہتا ہے؟ کن شرائط پر صلح کرتا ہے؟ مگر بات کرنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لو کہ سمرقند کی حکومت میری ہے۔ اس پر میرا حق ہے۔ میں امیر قزعن کا بیٹا ہوں۔"

"بیٹے نہیں۔ آپ امیر قزعن کے پوتے ہیں۔"

شیر بہرام نے فوراً اصلاح کی:

"یہ ضرور ہے کہ امیر قزعن نے الجائی خاتون آغا کو ہمیشہ اپنی ہی اولاد سمجھا۔ اب اگر آپ پوتا ہونے کی حیثیت سے سمرقند پہ اپنا حق رکھتے ہیں تو پھر یہ خیال رکھیے کہ سردار تیمور امیر قزعن کے داماد ہیں اور امیر قزعن کی پوتی الجائی خاتون، ان کی بیوی تھیں۔ اگر آپ مجھ سے پوچھیں گے تو میں یہ کہوں گا کہ تخت و تاج کے لیے رشتہ داری کا سہارا لینا بے کار ہے۔ اس کے لیے تو ہمیں اپنی روایات پر عمل کرنا چاہیے۔"

"شیر بہرام! ہماری روایت بھی خون کے رشتوں کو تسلیم کرتی ہے۔"

امیر حسین نے بحث شروع کر دی:

"باپ کے بعد بیٹا اور بیٹے کے بعد پوتا۔ یہی سب سے قریبی رشتہ ہے!"

"امیر! آپ نے تاتاریوں کی مثل نہیں سنی۔"

شیر بہرام نے بے خوف ہو کر کہا:

"آپ زیادہ عرصہ غزنی میں رہے ہیں، ممکن ہے کہ یہ مثل وہاں مشہور نہ ہو لیکن ملک تاتار کا ہر فرد تسلیم کرتا ہے کہ وہی ہاتھ عنانِ حکومت سنبھال سکتے ہیں جو تلوار پکڑنا جانتے ہوں۔ . . . تخت کا فیصلہ تو تلوار ہی سے ہوتا ہے۔"

"کیا میں بزدل ہوں؟"

امیر حسین ایک دم بھڑک اٹھا:

"کیا میں تلوار پکڑنا نہیں جانتا؟ میں غزنی کا خود مختار بادشاہ رہ چکا ہوں۔ میں تیمور سے زیادہ حکومت چلانا جانتا ہوں۔"

"امیر! آپ کی بہادری شبہ سے بالاتر ہے۔"

شیر بہرام نے نرمی سے کہا:

"میں نے خود سردار تیمور کی زبان سے سنا ہے کہ آپ جیسے بہادر تاتاریوں میں کم موجود ہیں۔ میں نے تو آپ کی بات کا جواب دیا تھا۔ آپ کسی اور شبہ میں مبتلا ہو گئے ہیں۔"

امیر حسین کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا۔ اس نے پوچھا:

"اچھا تم صلح کی شرط بتاؤ؟"

"شرط نہیں امیر، سردار تیمور نے بڑے خلوص سے آپ کو ایک پیش کش کی ہے۔"

شیر بہرام نے یہ کہہ کر اس کا غصہ اور بھی ٹھنڈا کر دیا؛ امیر حسین کے چہرے کی شکنیں دور ہو[...]
اس نے کہا:

"سردار تیمور نے آپ کو آپ کی پرانی بادشاہت یعنی غزنی کی حکومت پیش کی ہے اور اطلاع کی ہے کہ اگر آپ غزنی واپس چلے جائیں تو وہ آپ کو وہاں کا خود مختار بادشاہ تسلیم کر لیں گے۔ اس طرح خانہ جنگی ختم ہو جائے گی اور ہر دو حاکم اپنے اپنے علاقوں میں آزادی سے حکومت کریں گے۔"

امیر حسین نے یہ سنا تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اب اسے احساس ہوا کہ تیمور اس سے صلح نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ اس پیش کش کے پردے میں وہ اسے ملک تاتار سے بالکل بے دخل ہونے کا حکم دے رہا تھا۔

امیر حسین بڑا متلون مزاج اور جلد باز تھا لیکن اس موقع پر خلاف امید اس نے خود کو سنبھالا اور اپنے چہرے سے کسی قسم کا تاثر نہ ظاہر ہونے دیا۔

"تیمور کی شرط قابل غور ہے۔"

امیر حسین نے بڑے تحمل سے کہا:

"لیکن میری بھی کچھ شرطیں ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ کر معاملات طے کریں۔ اگر تیمور پسند کرے تو میں اس سے ملاقات کے لیے تیار ہوں۔ یہ ملاقات کسی جگہ ہو سکتی ہے۔"

"امیر، آپ جو فرماتے ہیں وہ اپنی جگہ درست ہے۔"

شیر بہرام متانت سے بولا:

"لیکن سردار تیمور نے مجھے اس سلسلے میں ہر قسم کی گفتگو سے منع کر دیا ہے۔ انہوں نے دو ٹوک بات کی ہے اور اس کا جواب بھی دو ٹوک "ہاں یا نہیں" میں مانگا ہے۔ . . . . آپ مجھے جواب دیجیے تاکہ یہ جواب سردار تیمور کو پہنچا کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں مگر یہ جواب صرف ہاں یا نہیں میں ہو۔"

"جواب بھی مل جائے گا مگر تمہیں انتظار کرنا ہوگا۔"

امیر حسین نے بڑی مکاری سے کہا:

"میں تیمور کی پیش کش اپنے سرداروں کے سامنے رکھوں گا اور جو فیصلہ وہ کریں گے اس سے تمہیں آگاہ کر دیا جائے گا۔ اس فیصلے تک تم یہیں ٹھہرو گے۔ ہمارے مہمان رہو گے۔"

شیر بہرام کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن امیر حسین تیزی سے اٹھا اور بولا:

"تم جا کر آرام کرو۔ میں اپنے سرداروں کو مشورے کے لیے بلا رہا ہوں۔"

شیر بہرام کے بولنے کے لیے کوئی گنجائش نہ رہ گئی تھی۔ وہ بھی اٹھ کر خیمے میں آ گیا۔

امیر حسین کے خیمے کے ساتھ ہی دلشاد آغا کا خیمہ تھا۔ اس نے شیر بہرام سے امیر حسین کی پوری گفتگو سن لی تھی۔ امیر حسین نے شیر بہرام کو تو کسی حد تک مطمئن کر دیا تھا لیکن دلشاد آغا سمجھ گئی تھی کہ امیر حسین کے اس غیر متوقع تحمل کے پیچھے ضرور کوئی طوفان چھپا ہوا ہے۔ شیر بہرام کے جانے کے بعد امیر حسین نے اپنے کسی سردار کو نہیں بلوایا بلکہ تھوڑی دیر کے بعد وہ کسی اور خیمے میں چلا گیا۔ ممکن ہے یہ اس نے احتیاط کے طور پر کیا ہو اور وہ نہ چاہتا ہو کہ دلشاد اس کے ارادے یا منصوبے سے واقف ہو سکے۔

امیر حسین رات تک واپس نہ آیا تو دلشاد کے دل میں وسوسے پیدا ہونے لگے۔ اسے سب سے زیادہ شیر بہرام کی فکر تھی۔ وہ اس لیے زیادہ فکر مند تھی کہ اگر امیر حسین نے شیر بہرام کو قتل کرنے کی غلطی کی تو پھر تیمور امیر حسین کو کسی صورت نہیں بخشے گا اور شیر بہرام کے خون کا بدلہ لے کر رہے گا۔

دلشاد نے اپنی خاص کنیز کو شیر بہرام کے خیمے پر بھیجا تاکہ معلوم ہو سکے کہ امیر حسین نے اب تک اس کے خلاف کوئی قدم اٹھایا ہے یا نہیں؟

کنیز تھوڑی دیر بعد پریشان صورت بنائے واپس آئی اور بتایا کہ شیر بہرام کے خیمے پر پہرہ لگا دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ آنے والے سواروں کو بھی اسی خیمے میں پہنچا دیا گیا ہے۔

دلشاد کو اسی بات کا دھڑکا تھا۔ اسے امیر حسین پر سخت غصہ آیا لیکن وہ مجبور تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے اس سلسلے میں امیر حسین سے گفتگو کی تو بلا وجہ کی ناچاقی ہو گی اور نتیجہ کچھ نہ نکلے گا۔ امیر حسین نے جو فیصلہ کر لیا ہے وہ اس سے کسی طرح باز نہ آئے گا۔ چنانچہ جب رات گئے امیر حسین اپنے خیمے میں واپس آیا تو دلشاد نے اس سے کوئی بات نہ کی اور یہی ظاہر کیا کہ جیسے وہ اس معاملے سے بالکل بے تعلق ہے۔

○

شیر بہرام کو قید ہوئے تین روز ہو چکے تھے۔ اس کے ساتھی بھی اس کے ساتھ تھے۔ شیر بہرام کو

یقین ہو گیا کہ شیر بہرام کی گرفتاری سے امیر حسین ناجائز فائدہ اٹھا کر کوئی زبردست چال چلنا چاہتا ہے، ممکن ہے اس سے تیمور کو نقصان پہنچ جائے۔ اس لیے وہ اس فکر میں تھا کہ کسی طرح تیمور کو امیر حسین کے ارادوں سے آگاہ کر دے۔

خیمے کے گرد سخت پہرہ لگا ہوا تھا اور وہاں سے رہائی یا فرار کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ اس قید سے بھاگنے کی کوشش کرے گا خواہ اس میں اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

اس نے جب اپنے ساتھیوں سے گفتگو کی تو انہوں نے مخالفت کی اور کہا۔ اگر یہاں سے فرار ہی ہونا ہے پھر شیر بہرام کے بجائے اس کے ساتھیوں میں سے کوئی فرار ہو تاکہ پکڑے جانے کی صورت میں شیر بہرام بچ جائے۔

شیر بہرام اپنے ساتھیوں کی وفاداری سے بہت خوش ہوا لیکن اس کا دل نہ مانتا تھا کہ اپنے کسی ساتھی کی قربانی دے۔

اس طرح دو دن گزر گئے اور کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔

شیر بہرام خود جانے پر بضد تھا لیکن اس کے ساتھی اسے بھیجنے پر کسی طور راضی نہ ہوتے۔ آخر شیر بہرام کو مجبور ہونا پڑا۔ وہ ہر حالت میں تیمور کو امیر حسین کے ارادے سے باخبر کرنا چاہتا تھا۔

پھر ایک شب شیر بہرام نے پیٹ میں سخت درد کا بہانہ کیا اور زور زور سے چیخنے لگا۔ پہرے دار گھبرا کر اس کے خیمے میں آ گئے۔ شیر بہرام کا مقصد بھی یہی تھا۔ اس نے پہرے داروں کو باتوں میں لگا لیا۔ درد کا واویلا کرنے لگا۔ اسی وقت اس کا ایک ساتھی نظر بچا کر خیمے سے باہر نکلا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد شیر بہرام کا پیٹ درد ختم ہو گیا۔ اس نے پہرے داروں کا شکریہ ادا کیا۔ پہرے دار اپنی جگہ واپس چلے گئے۔ انہیں خبر بھی نہ ہوئی کہ خیمے کا ایک آدمی غائب ہو گیا ہے اور اب وہ امیر حسین کی لشکرگاہ کے آخری سرے پر پہنچ چکا ہے۔

○

امیر حسین کا مصالحتی وفد تیمور کے خیمے میں داخل ہوا۔ یہ وفد چار آدمیوں پر مشتمل تھا۔ ایک آدمی آگے اور تین اس کے پیچھے تھے۔

آگے آنے والے کے سر پر کلامِ پاک رکھا ہوا تھا۔ مصحفِ آسمانی کو دیکھ کر تیمور کے جسم میں سنسنی پیدا ہو گئی۔ اس کا آہنی بدن جیسے پگھل کر موم بن گیا۔ احترامِ قرآن کے لیے تیمور اور اس کے سردار کھڑے ہو گئے۔ تیمور نے آگے بڑھ کر کلامِ پاک لیا۔ آنکھوں سے لگا کر چوما۔ پھر ایک اونچی جگہ رکھ دیا۔

تیمور کے پاس شیر بہرام کا بھیجا ہوا گزشتہ رات پہنچ گیا تھا۔ اس نے تیمور کو بتایا تھا کہ امیر حسین نے شیر بہرام کو قید کر لیا ہے اور اب وہ کوئی چال چلنا چاہتا ہے۔ اس لیے تیمور بھرا بیٹھا تھا۔ اس وقت وہ اپنے سرداروں سے شیر بہرام کے سلسلے میں گفتگو کر رہا تھا۔

شیر بہرام کی گرفتاری سے اس کے سردار بھڑک اٹھے تھے اور تیمور پر زور دے رہے تھے کہ فوراً امیر حسین کے مقابلے پر روانہ ہوا جائے اور اگر شیر بہرام کو قتل کر دیا گیا ہے تو اس کا سخت انتقام لیا جائے۔

تیمور کا خود بھی یہی ارادہ تھا کہ اسی دوران اسے امیر حسین کے مصالحتی وفد کے آنے کی اطلاع ملی۔ اسے امیر حسین پر غصہ بھی آیا اور اس کی دیدہ دلیری پر تعجب بھی ہوا لیکن وہ فوراً سمجھ گیا کہ امیر حسین نے ایک طرف تو شیر بہرام کو گرفتار کیا ہے اور دوسری طرف، وہ اس وفد کے ذریعے کوئی جال بچھانا چاہتا ہے۔

شیخ علی بہادر اور امیر جغتائی بہادر نے پُرزور الفاظ میں مطالبہ کیا کہ وفد کے ارکان کو فوراً قتل کر دیا جائے لیکن جب امیر حسین کا وفد قرآن پاک ان کے سامنے لے کر آیا تو سب کی زبانیں بند ہو گئیں۔

سردار تیمور نے وفد کے ارکان کو عزت سے بٹھایا اور اپنے تمام سرداروں کو باہر بھیج دیا۔ اسے خطرہ تھا کہ اس کے سردار گفتگو کے دوران کہیں غصے میں آ کر کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھیں جس کے لیے اسے بعد میں پچھتانا پڑے۔

"میں نے امیر حسین کے پاس شیر بہرام کو صلح کا پیغام دے کر بھیجا تھا۔" تیمور نے بالکل انجان بن کر پوچھا اور وفد کے ارکان پر اپنے الفاظ کا تاثر تلاش کرنے لگا۔

وفد کے ارکان نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ان میں سے ایک بولا:

"اے سردار تیمور۔ شیر بہرام آپ کا پیغام لے کر ہمارے امیر کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ آپ کے اسی پیغام کا جواب لے کر ہم حاضر ہوئے ہیں۔"

"مگر شیر بہرام کہاں ہے؟ وہ واپس کیوں نہیں آیا؟" تیمور نے بڑے ضبط سے کام لیا لیکن پھر بھی اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"شیر بہرام ہمارے بڑے قابلِ احترام سردار ہیں۔"

وفد کے دوسرے رکن نے سنبھل کر کہنا شروع کیا:

"ہمارے امیر بھی ان کی بہت عزت کرتے ہیں۔ دورانِ سفر شیر بہرام کی طبیعت کچھ ناساز ہو گئی تھی اس لیے امیر نے انہیں علاج کے لیے روک لیا ہے۔ آپ ان کی طرف سے بالکل مطمئن رہیں۔ وہ ہمارے امیر کے مہمان ہیں۔"

تیمور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کے رہ گیا۔ وہ غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا:

"امیر حسین نے ہماری پیش کش کا کیا جواب دیا ہے۔ اسے منظور ہے یا انکار کیا ہے؟"

"اے سردار تیمور۔ ہمارے امیر نے آپ کی پیش کش شکریے کے ساتھ منظور کر لی ہے۔" ایک رکن نے جواب دیا۔

تیمور نے چونک کر اسے دیکھا۔ اسے اس جواب کی قطعی امید نہ تھی۔ اس نے مزید تصدیق کے لیے پوچھا:

"امیر حسین کب غزنی واپس جا رہے ہیں؟"

"ہمارے امیر اپنی واپسی کی تفصیلات طے کرنے کے لیے آپ سے ملاقات کے خواہش مند ہیں۔"

وفد کے رکن نے کہا:

"انہوں نے کہا ہے کہ وہ آپ کی طرف دوستی اور وفاداری کا ہاتھ بڑھاتے ہیں اور کلام اللہ کو درمیان رکھ کر اعلان کرتے ہیں کہ اگر میں قول و قرار کو توڑ دوں تو اس مصحف کی مجھ پر مار پڑے اور جو سزا چاہے دی جائے۔ لہٰذا اگر ہو سکے اور آپ مناسب سمجھیں، تو ان سے تفصیلات طے کرنے کے لیے چک چکک میں تنہا ملاقات کریں تا کہ ہم نئے سرے سے نئے حالات میں قول و قرار کر سکیں۔"

یہ امیر حسین کا کھلا ہوا فریب تھا۔

تیمور سمجھ گیا کہ امیر حسین اسے اس حیلے سے گرفتار کرنا چاہتا ہے مگر چونکہ امیر حسین نے کلام اللہ کو درمیان میں ڈالا تھا اس لیے تیمور نے سب کچھ جانتے ہوئے مصحفِ قرآنی کا احترام کرنا اپنا فرض سمجھا اور انتہائی پُر وقار لہجے میں کہا:

"امیر حسین نے کلام اللہ کے واسطے سے گفتگو کی ہے اس لیے میں انکار نہیں کر سکتا۔ اس نے چک چکک کے مقام پر تنہا ملاقات کی خواہش ظاہر کی ہے۔ میں اس کی خواہش ضرور پوری کر دوں گا۔ تم واپس جاؤ اور اطلاع دو کہ وہ چک چکک پر میرا انتظار کرے۔ میں وہاں تنہا پہنچ رہا ہوں۔"

امیر حسین کے وفد کے ارکان کے منہ حیرت سے کھل گئے۔ وہ دل ہی دل میں تیمور کے حوصلے کے قائل ہو گئے۔ انہیں یہ قطعی امید نہ تھی کہ تیمور اتنی جلدی امیر حسین سے ملاقات پر آمادہ ہو جائے گا۔ وفد کے ارکان تیمور سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان میں سے ایک نے کھلے الفاظ میں اس کا اعتراف کیا:

"اے سردار تیمور! ہماری نظر سے آپ جیسا حوصلہ مند انسان اب تک نہیں گزرا۔ آپ واقعی عظیم ہیں۔"

تیمور جواب دینے کے بعد گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ اس نے سر اٹھا کے دیکھا اور بولا:

"عظیم صرف خدائے بزرگ و برتر ہے۔ میں ایک ناچیز بندہ ہوں۔ میرا باپ سردار طرغائی برلاس جب مجھے نصیحت کرتا تو عام طور پر اپنی بات ان الفاظ پر ختم کرتا کہ اے تیمور! میری خواہش ہے کہ تم خدائے تعالیٰ کے احکام حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی شریعت پر رہ کر درویشوں اور بزرگوں کی دعائیں لیتے رہو اور ہمیشہ اسلام کے چار ارکان کے پابند رہو۔ . . . . . میں اپنے باپ کی نصیحت پر ہمیشہ عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بلادِ شمال کے خانِ اعظم نے مجھے سمرقند میں اپنا نائب بنایا تھا لیکن تاتاریوں کی حالتِ زار دیکھ کر میں نے مغلوں کے خلاف تلوار اٹھائی اور انہیں ملکِ تاتار سے مار بھگایا۔ اب میں تاتاریوں کی ایک مضبوط حکومت قائم کرنا چاہتا ہوں لیکن جس طرح ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں اسی طرح ایک ملک میں دو بادشاہ نہیں ہو سکتے۔ میں نے امیر حسین کو اس لیے غزنی کی حکومت پیش کی ہے۔ اگر وہ ملنے گا تو خوش رہے گا اور اگر اس نے فریب دینے کی کوشش کی تو وہ اس سے بھی زیادہ خوار ہو گا۔ میں اسے تاتار سے ہی نہیں دنیا سے بھی بے دخل کر دوں گا۔"

"بے شک بے شک۔ سردار صحیح فرماتے ہیں!" ایک نے تیمور کی تائید کی۔

"تم لوگ تھکے ہوئے ہو جتنے دن چاہو آرام کر سکتے ہو۔"

تیمور نے کہا:

"ہم تمہیں اپنا مہمان بنا کر روکنا نہیں چاہتے۔ تم جب چاہو ہمیں بغیر اطلاع دیے واپس جا سکتے ہو۔ تمہارا مصحفِ با برکت ہمارے پاس برکت کے لیے محفوظ رہے گا۔"

"آپ کا شکریہ سردار۔"

ایک رکن نے کہا:

"ہم صرف ایک دن آرام کرنے کے بعد واپس جائیں گے لیکن جانے سے پہلے آپ کو سلام کرنے ضرور حاضر ہوں گے۔"

تیمور نے وفد کے ارکان کو ایک کمرے میں بھیج دیا اور ان کی خاطر و مدارات کی خاص ہدایت کی۔ تیمور نے یہ بھی حکم دیا کہ وفد جس وقت بھی واپس جانا چاہے اسے قطعی نہ روکا جائے۔

تیمور کے سردار امیر حسین کے بھیجے ہوئے پیغام کو سننے کے لیے بہت بے چین تھے۔ انہیں خیال تھا کہ تیمور وفد سے گفتگو کرنے کے بعد انہیں بلا کر تمام باتوں سے آگاہ کرے گا لیکن تیمور نے انہیں شام تک

انتظار کے کرب میں مبتلا رکھا۔ پھر شام کو ہر سردار کو یہ مژدہ سنایا گیا کہ سردار تیمور نے تمام سرداروں کو
کے کھانے پر مدعو کیا ہے۔

اس نوید سے سرداروں کی تمام کلفت دور ہو گئی اور رات کے کھانے پر تیمور کے خیمے میں وقت سے پہلے ہی پہنچ گئے۔ تیمور بہت ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر سردار بھی خوش ہو گئے۔ انہیں خیال ہوا شاید امیر حسین راہِ راست پر آ گیا ہے اور اس نے غزنی جانے کی اطلاع تیمور کو بھیجی ہے۔

کھانے کے دوران تیمور نے ایلچی اور ارکانِ وفد کے درمیان ہونے والی گفتگو کا بالکل ذکر نہ کیا۔ سردار بار بار اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے مگر تیمور نے انہیں ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف رکھا۔ جب
نے اطمینان سے کھانا کھا لیا تو تیمور نے بڑی سنجیدگی سے کہا:

"میرے سردارو! تم تاتاریوں کی آن اور عظمت ہو۔ تمہارے سردار نے جتنی فتوحات حاصل کی ہیں ان
تم تیمور کے برابر کے شریک ہو۔ تم یقیناً امیر حسین کا پیغام سننے کے لیے بے چین ہو گے۔ میں تمہیں
وقت بلوا لیتا لیکن تم اس وقت جوش میں تھے اور امیر حسین کا پیغام ہم سے ہوش کا تقاضا کرتا ہے۔ سب
پہلے تو میں تمہیں یہ افسوسناک خبر سناتا ہوں کہ شیر بہرام واقعی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ وفد کے ایک رکن نے
بتایا ہے کہ شیر بہرام کو امیر حسین نے اپنا خاص مہمان بنا کر روک لیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت امیر
کے ہاتھوں شیر بہرام پر کیا گزر رہی ہو گی لیکن یہ ضرور ہے کہ اگر شیر بہرام قتل کر دیا گیا تو اس کا افسوس
زندگی بھر رہے گا۔ اس کے ساتھ ہی میں اعلان کرتا ہوں کہ اب میں اپنے کسی سردار کو سفیر یا قاصد بنا کر
پاس نہیں بھیجوں گا۔"

"کیا مجھے بھی نہیں سردار؟" ایلچی بہادر فوراً بول پڑا۔

ایلچی بہادر ہزاروں کے مجمع میں سب سے الگ نظر آتا تھا۔ جسم پر قاقم کی پوستین، ریچھ کی کھال
زری کا پٹکا اور رکابدار جوتے۔ دیکھنے والوں کی نظریں اس پر جم کے رہ جاتی تھیں۔ تیمور اسے کئی سفارتوں پر
چکا تھا اسی لیے وہ ایلچی بہادر کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

"تمہیں بھی نہیں ایلچی بہادر۔"

تیمور نے نفی میں سر ہلایا:

"شیر بہرام کی گرفتاری نے میرے دل میں ایک داغ ڈالا ہے۔ میں دوسرا داغ نہیں پڑنے دوں گا۔"

"میں شیر بہرام کا انتقام ضرور لوں گا۔" ایک سردار بولا۔

"شیر بہرام کو گرفتار کر کے اس نے اپنی موت کو دعوت دی ہے۔" کسی دوسرے سردار

"امیر حسین کا سر میں اتاروں گا۔" یہ امیر جغتائی بہادر کی آواز تھی۔ اس کی آنکھیں خون کبوتر ہو رہی تھیں۔

"تم سر کیسے اتارو گے امیر جغتائی بہادر۔ اس کے تن پر تو سر ہی نہیں ہو گا۔" یہ عجیب بات شیخ علی بہادر نے کہی۔

"ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے شیخ علی؟" امیر جغتائی نے شیخ کو گھورا۔

"یہی ہو گا امیر۔"

شیخ علی بہادر نے اطمینان سے کہا:

"جب تم گھوڑا بڑھا کر امیر حسین کے سر پہ پہنچو گے تو دیکھو گے کہ میں اس کا سر پہلے ہی اتار چکا ہوں گا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ میں اسے ابھی جا کے قتل کیے دیتا ہوں۔" امیر جغتائی غصے سے تلملا کر کھڑا ہو گیا۔

"میرا گھوڑا تمہارے گھوڑے سے تیز دوڑتا ہے۔"

شیخ علی بہادر بھی کھڑا ہو گیا:

"میں تم سے پہلے اس کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ اس کا سر میرے پاس ہو گا۔"

"چلو دیکھتے ہیں۔" امیر جغتائی نے قدم اٹھایا۔

"ضرور چلو۔" شیخ علی بہادر کا قدم بھی اٹھ گیا۔

اسی وقت تیمور کی گرجدار آواز سنائی دی:

"کہاں جا رہے ہو تم؟"

شیخ علی بہادر اور امیر جغتائی نے پلٹ کر ایک ساتھ تیمور کو دیکھا۔ پھر جیسے خواب سے چونک پڑے۔ دونوں نے ایک دوسرے کے چہرے پر نظر ڈالی اور شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔

یہ دونوں آپس میں گہرے دوست تھے لیکن جب بہادری دکھانے کا موقع آتا تو ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ اس وقت بھی وہ جوشِ شجاعت میں بالکل بھول گئے کہ وہ کہاں ہیں اور کس موضوع پر گفتگو ہو رہی ہے؟

"امیر جغتائی بہادر اور شیخ علی بہادر۔"

تیمور نے ان کی حوصلہ افزائی کے لیے کہا:

"تیمور کو تم جیسے بہادروں پر فخر ہے۔ اطمینان سے بیٹھ جاؤ اور میری بات سنو۔"

دونوں سردار اپنی اپنی جگہ خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

"امیر حسین نے مجھے ملاقات کی دعوت دی ہے۔"

تیمور نے کہا:

"وہ مجھ سے تنہائی میں ملنا چاہتا ہے۔ ملاقات کے لیے چپ چک کا پُر فضا مقام مقرر کیا گیا ہے۔"

"لیکن سردار، چپ چک تو ایک تنگ گھاٹی ہے۔"

امیر حنطائی نے بتایا:

"میں اکثر اُدھر سے گزرا ہوں۔ ایک درّے سے گزر کر گھاٹی میں داخل ہوتے ہیں۔ راستہ اتنا تنگ ہے کہ چار سوار مشکل سے برابر برابر چل سکتے ہیں۔"

"گھاٹی کے دوسری طرف کیا ہے؟ کوئی میدان ہے یا؟" تیمور نے دلچسپی سے پوچھا۔

"سردار، وہ گھاٹی تو ایک بھول بھلیاں ہے۔ ادھر درّہ اُدھر درّہ۔ بیچ میں تنگ پتھریلا راستہ۔"

امیر حنطائی نے منہ بنا کر کہا:

"چوروں لٹیروں کے لیے ایک بہترین پناہ گاہ ہے لیکن امیر حسین اس گھاٹی میں آپ سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟"

"امیر حسین کے خیال میں وہ بہترین جگہ ہے۔"

تیمور نے سر ہلاتے ہوئے کہا:

"اس گھاٹی میں ہم دونوں اکیلے ملیں گے۔ اس نے کہلوایا ہے کہ چپ چک کی وادی میں میں تنہا جاؤں گا وہ بھی اکیلا آئے گا۔ ملاقات کے وقت ہمارے ساتھ کوئی نہیں ہوگا۔"

"دھوکہ، دھوکہ، فریب!" ہر طرف سے آوازیں اٹھنے لگیں۔

"ملاقات کی آڑ لے کر وہ آپ کو گرفتار کرنا چاہتا ہے سردار۔" ایلچی بہادر نے بڑے رازدارانہ انداز میں تیمور سے کہا۔

"سردار آپ کہہ دیجیے کہ یہ ملاقات نہیں ہو سکتی۔" شیخ علی بہادر نے اپنے خیال میں بڑا اہم مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں شیخ علی! ہم نے وفد سے کہا ہے کہ ۔۔۔۔"

تیمور کہتے کہتے رکا اور دلچسپی سے اپنے سرداروں کے چہرے دیکھے۔ سب ہمہ تن گوش تھے۔ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ بولا:

"ہم نے وفد کو جواب دیا ہے کہ ہم امیر حسین سے ضرور ملاقات کریں گے۔ چپ چک میں ہم اکیلے جائیں گے۔"

تیمور کے سردار گھبرا گئے۔ ان کے چہرے پھیکے پڑ گئے۔ ایلچی بہادر نے تلوار کھینچ لی:

"میں اپنے ہاتھوں سے گلا کاٹ لوں گا اگر سردار نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔"

"ایلچی بہادر ٹھیک کہہ رہا ہے سردار۔"

امیر حنطائی بے چینی سے بولا:

"اس تنگ وادی میں اکیلے جانا کسی طرح مناسب نہیں۔ اگر جانا ہی ہے تو ہمیں ساتھ لے کے چلیے۔"

"مگر کیوں، تم پریشان کیوں ہو؟"

تیمور بالکل پُر سکون تھا:

"امیر حسین مجھے کھا تو نہیں جائے گا۔"

"وہ آپ کو کھلا دھوکا دے رہا ہے۔"

شیخ علی نے کہا:

"وہ مکار ہے۔ جھوٹا ہے۔ اس کی بات کا آپ اعتبار نہ کیجیے۔"

"وہ مجھے دھوکا دے سکتا ہے شیخ علی۔"

تیمور نے گردن گھما کر قرآن کی طرف دیکھا:

"مگر وہ اس کلام کو تو فریب نہیں دے سکتا۔ اس نے مجھے کلام اللہ کا واسطہ دے کر بلایا ہے۔ میں اس واسطے سے انکار نہیں کر سکتا۔ مجھے جانا ہوگا۔"

تیمور کے جواب نے سرداروں کی زبانیں بند کر دیں مگر ان کے چہرے لٹک گئے۔

دوسرے دن امیر حسین کے آدمی واپسی کی اجازت لینے تیمور کے پاس آئے۔

تیمور نے ان سے ملاقات کی تاریخ مقرر کی اور خوشی خوشی رخصت کیا۔ تیمور نے انہیں یقین دلایا کہ تاریخ مقررہ پر وہ امیر حسین کا چپ چک کی گھاٹی میں انتظار کرے گا۔

وفد کے رخصت ہوتے ہی تیمور نے فوراً دو سو سواروں کا ایک رسالہ ترتیب دیا۔ اس میں اس نے اپنے تمام بڑے بڑے سرداروں کو شامل کیا اور وفد کے پیچھے پیچھے کچھ فاصلہ دے کر چلنے لگا۔

تیمور چاہتا تھا کہ وفد کے امیر حسین تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ گھاٹی تک پہنچ جائے اور وہاں کے حالات اور راستوں سے واقفیت حاصل کر لے۔

یہ بھی امکان تھا کہ امیر حسین وہاں موجود ہو اور اس نے تمام راستے بند کر رکھے ہوں۔ اس لیے وہ چپ چک

کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ اور چار سواروں کو دریافت حال کے لیے گھاٹی میں بھیجا۔

ان سواروں نے صرف گھاٹی کے اندر ہی نہیں بلکہ ارد گرد کی تمام پہاڑیوں پر چڑھ کر یہ اطمینان کر دشمن کا کوئی آدمی اب تک وہاں نہیں پہنچا تھا۔

تیمور کو اس سے بڑا اطمینان ہوا۔ وہ اپنے سوار لے کر گھاٹی میں داخل ہوا۔

تیمور نے گھاٹی کو اچھی طرح دیکھا بھالا اور پھر اس نے پچاس سواروں کو اس درے کے مقرر کر دیا جدھر سے امیر حسین کے داخل ہونے کا امکان تھا۔ ان سواروں کو حکم دیا گیا کہ جب امیر ح آدمیوں کے ساتھ گھاٹی میں داخل ہو جائے تو درے کا راستہ روک کر واپسی ناممکن بنا دی جائے۔

باقی سواروں کو تیمور نے گھاٹی میں مناسب جگہ پر چھپا دیا لیکن انہیں حکم دیا کہ اگر امیر حسین اکیلا آ جائے تو اس سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ تیمور یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ بھی امیر حسین کی طرح اسے دھو گرفتار کرے۔ اس کا ارادہ تھا کہ اگر امیر حسین واقعی مخلص ہے اور وہ اس سے اکیلا ملاقات کرنے تو وہ بھی پورے خلوص سے گفتگو کرے گا۔

مقررہ دن کو شام کے وقت تیمور کے پہاڑی پر متعین آدمیوں نے اطلاع دی کہ ایک لشکر گھاٹی رہا ہے۔

تیمور گھوڑے پر سوار ہو کر گھاٹی کے ایک سرے پر نمودار ہوا۔ دوسری طرف سے امیر حسین اندر آنا شروع ہوا۔ تیمور اپنا گھوڑا ذرا اونچی جگہ لے آیا تھا تاکہ سامنے سے آنے والے اسے دیکھ سکیں امیر حسین کا لشکر گھاٹی میں داخل ہو گیا تو تیمور گھوڑا بڑھا کر چند قدم آگے آیا۔

"ٹھہرو!" تیمور کی آواز پہاڑیوں میں گونجی۔

امیر حسین کے سوار ایک لمحے کے لیے رکے۔

"امیر حسین کو آگے بھیجو!" تیمور نے انہیں چیخ کر حکم دیا۔

امیر حسین کے سواروں نے جواب دینے کے بجائے اپنے گھوڑے تیز کر دیے۔ تیمور سمجھ گیا کہ امیر حسین موجود نہیں ہے یا پھر وہ بغیر سامنے آئے تیمور کو گرفتار کرنا چاہتا ہے۔ اس نے فوراً ہا

سے جوابی کارروائی کا حکم دیا۔

اشارے کے ساتھ ہی گھاٹی کے دائیں بائیں سے سوار نکلنا شروع ہو گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے پہاڑیاں سوار اگل رہی ہیں۔ ان سواروں نے امیر حسین کے لشکر پر دو طرف سے حملہ کر دیا۔

امیر حسین کا لشکر تعداد میں دو ہزار تھا لیکن اس دو طرفہ حملے سے گھبرا گیا۔ اسے تیمور کی طرف سے نہ مڑ کر تیمور کے سواروں کا مقابلہ کرنا پڑا۔

تیمور کے سوار دس دس پانچ پانچ کر کے گھاٹی سے باہر نکل کر آ رہے تھے۔ اس لیے ان کی صحیح تعداد کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ امیر حسین کا لشکر یہ سمجھا تھا کہ گھاٹی میں تیمور کا پورا لشکر موجود ہے۔ انہوں نے راہ فرار اختیار کی اور جس راستے سے آئے تھے ادھر بھاگنے لگے۔ اس راستے کو تیمور کے سواروں نے پہلے ہی بند کر دیا تھا۔ امیر حسین کا جو سوار جان بچا کر درے سے نکلتا وہ بڑی آسانی سے تیمور کے آدمیوں کے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اتر جاتا۔ آدھے سے زیادہ سوار مارے گئے۔ باقی یا تو گرفتار ہوئے یا جان بچا کر بھاگ گئے۔

امیر حسین نے بڑی عقلمندی کی تھی کہ وہ خود گھاٹی میں نہیں آیا تھا ورنہ اس کا بھی یہی انجام ہوتا۔ وہ چک چک سے کچھ دور ٹھہر گیا تھا اور اپنا لشکر تیمور کی گرفتاری کے لیے گھاٹی میں بھیج دیا تھا۔ اس نے اپنے سواروں کو بھاری انعام و اکرام کا لالچ دیا تھا اور تیمور کو زندہ یا مردہ لانے والے کو اپنا نائب مقرر کرنے کا اعلان کیا تھا۔

وہ تصور ہی تصور میں تیمور کو اپنے سامنے پابہ زنجیر کھڑا دیکھ کر مسکرا رہا تھا کہ اس کے شکست خوردہ سوار اس کے پاس سے گزرنا شروع ہو گئے۔ وہ اس قدر گھبرائے ہوئے تھے اور بے تحاشہ یوں بھاگ رہے تھے کہ امیر حسین کو دیکھ کر وہ گھوڑا روکتے روکتے دور نکل جاتے۔

امیر حسین نے یہ حال دیکھا تو خود بھی گھوڑے پر سوار ہوا اور ان سے زیادہ تیز رفتاری سے اپنے مستقر کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔

امیر حسین اپنی خیمہ گاہ میں پہنچ کر وہاں ایک لمحہ بھی نہ ٹھہرا اور خیمے اکھڑوا کر بلخ کی طرف بھاگا۔ بلخ اس کا آخری سہارا اور پناہ گاہ تھی۔ اسے تیمور سے تعاقب کا خطرہ تھا اس لیے وہ دو دو منزلیں طے کرتا ہوا بلخ پہنچ گیا۔

تیمور نے امیر حسین کا تعاقب نہ کیا۔ وہ چک چک کی وادی سے قلعہ قرشی آ گیا اور یہاں پہنچ کر اس نے امیر حسین سے آخری معرکے کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔ اس نے مرحوم بیوی کی خاطر امیر حسین کو صلح کا پیغام بھیجا تھا لیکن امیر حسین نے اسے اس کا الٹا ہی صلہ دیا اور اسے فریب سے قتل کرنے کی کوشش کی۔ تیمور کے لیے اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ امیر حسین کی طاقت کو ہمیشہ کے لیے کچل کر رکھ دے۔

پھر اس وقت تو اس کے غصے کی انتہا نہ رہی جب اس نے سنا کہ امیر حسین نے بلخ پہنچتے ہی شیر بہرام کو قتل کرا دیا۔ تیمور کو اپنے بچپن کے دوست کے بہیمانہ قتل سے اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ کئی دن کھانا نہ کھا سکا۔

تیمور آندھی اور طوفان کی طرح قلعہ قرشی سے نکلا۔ اس کے پاس کچھ زیادہ بڑی فوج نہ تھی لیکن بلخ کے قریب پہنچتے پہنچتے اس کے گرد ایک بڑا لشکر جمع ہو گیا۔

امیر حسین بھی پوری طرح تیار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جنگ فیصلہ کن ہے۔ اس نے اس دوران میں دوڑ دھوپ کر کے بڑا لشکر اکٹھا کر لیا تھا لیکن اس کی جلد بازی اور بد دماغی سے اس کے سردار پریشان تھے۔ اس نے صوبہ ختلان کے حاکم کو مشورے کے لیے بلایا۔ جب وہ اس کے پاس آ گیا تو امیر حسین نے اسے قتل کرا دیا۔ حاکمِ ختلان بڑا با اثر سردار تھا۔ ختلان کے قتل سے اس کا بھائی کیخسرو جو امیر حسین کا زبردست حلیف تھا، اس سے باغی ہو گیا اور تیمور کے پاس چلا آیا۔

امیر حسین بڑی شان سے تیمور کے مقابلے پر نکلا۔ تیمور چاہتا تھا کہ بلخ کا شہر تباہ نہ ہو کیونکہ اس شہر کو کبھی عروس البلاد کہتے تھے۔ خراسان سے ہندوستان جانے والے قافلے اسی شہر سے گزرتے تھے۔ یہاں کے بکھرے بکھرے پتھروں کے کھنڈرات میں دنیا کے قدیم ترین آتش کدہ کے آثار تھے۔ اس شہر کی گلیوں میں مہاتما بدھ کے مجسمے کے ریزے بھی بکھرے ہوئے تھے۔ ۔ ۔ ۔ سکندر اعظم جب یہاں سے گزرا تو اس نے اس کو باکتریہ کے نام سے پکارا تھا لیکن چنگیزی لشکر نے اس کے تمام حسن کو برباد کر دیا تھا۔ اب یہ مٹی اور پتھر کا ڈھیر بن چکا تھا جس کے گرد مسجدیں اور مقبرے تعمیر ہو گئے تھے۔ تیمور نہیں چاہتا تھا کہ اس کی تباہی میں اور اضافہ ہو۔ چنانچہ اس نے شہر سے ذرا ہٹ کر صف آرائی کی۔

امیر حسین بلاشبہ بہادر اور جری تھا لیکن اس کا لشکر پہلے ہی حملے میں جی چھوڑ گیا۔ اس کے سرداروں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور تیمور کے لشکر میں شامل ہو کر اطاعت قبول کر لی۔ کسی لڑائی کی نوبت نہ آئی۔ امیر حسین کا لشکر پیٹھ دکھا گیا اور وہ بھاگ کر کھنڈرات میں چھپ گیا۔

شہر بڑی آسانی سے فتح ہو گیا۔

تیمور نے قتلِ عام کی ممانعت کر دی۔ بوڑھے، بچوں اور عورتوں کو عام معافی دے دی گئی۔ جن سپاہیوں نے ہتھیار ڈال دیے انہیں معاف کر دیا گیا۔

شام ہو گئی تھی لیکن امیر جفائی بہادر اور شیخ علی بہادر پورے شہر اور قرب و جوار میں گھوڑے دوڑاتے پھر رہے تھے۔ انہیں امیر حسین کی تلاش تھی۔ وہ شیر بہرام کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ امیر حسین کی گرفتاری سے پہلے ہی اسے ختم کر دیں کیونکہ سردار تیمور اسے نہ قتل کر سکتا تھا اور نہ ہی قتل کا حکم دے سکتا تھا لیکن امیر حسین ہزار کوشش کے باوجود ان کے ہاتھ نہ آیا۔

تیمور نے شہر کے باہر ہی اپنے خیمے لگوائے۔ اسے فتح حاصل ہوئی تھی لیکن امیر حسین کے گرفتار نہ ہونے سے وہ کچھ پریشان تھا۔ اس نے امیر حسین کی طاقت کا بالکل خاتمہ کر دیا تھا۔ وہ اسے قتل کرنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن اس کا گرفتار ہونا ضروری تھا۔ اس کے بچ کر نکل جانے سے کسی وقت بھی کوئی فتنہ کھڑا ہو سکتا تھا۔

رات ہوئی تو اس کی یہ مشکل بھی آسان ہو گئی۔ امیر حسین کی گرفتاری کی امید پیدا ہو گئی۔

امیر حسین کے ایک لشکری کو تیمور کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ تیمور سے تنہائی میں ملنا چاہتا تھا۔ اس لیے اسے پہلے غیر مسلح کر دیا گیا۔

تیمور نے اسے سر سے پیر تک دیکھا اور پوچھا:

"تم کون ہو اور کس سلسلے میں بات کرنا چاہتے ہو؟"

"اے تاتاریوں کے عظیم قائد!"

لشکری نے پوری تہذیب کا مظاہرہ کیا:

"دو فریقوں میں جنگ ہوتی ہے تو ایک غالب اور دوسرا مغلوب ہوتا ہے۔ اللہ نے آپ کو غالب بنایا آپ کو چاہیے کہ مغلوب پر رحم فرمائیں۔"

"اے شخص! تیمور کو تیری نصیحت سننے کی فرصت نہیں۔ مقصد بیان کر"۔ تیمور نے اسے ڈانٹا۔

"میں۔ ۔ ۔ ۔ میں مغلوب کا پیامبر ہوں۔"

وہ شخص گھبرا گیا:

"میرے آقا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں ان کی درخواست آپ کے سامنے تنہائی میں پیش کروں۔ تاکہ غیروں کے سامنے ان کی شرم رہ جائے"۔

"تم میرے دشمن کی درخواست لائے ہو اور میرے دوستوں کے سامنے پیش کرتے ہوئے

شرماتے ہو؟"

تیمور کو غصہ آ گیا:

"جاؤ اور امیر حسین کو کہہ دو کہ جب اسے شیر بہرام کو قتل کرتے ہوئے شرم نہ آئی تو معافی مانگتے ہوئے کیوں شرماتا ہے؟"

"سردارِ اعظم!"

امیر حسین کا قاصد گڑگڑایا:

"میرے آقا نے حج پر جانے کی درخواست کی ہے۔ وہ وعدہ کرتے ہیں کہ وطن کبھی واپس نہیں آئیں گے۔"

"حج پر کوئی شخص اس وقت جا سکتا ہے جب تاجدارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بلاوا آئے۔"

تیمور نے بڑی سنجیدگی سے کہا:

"یہ فیصلہ میرے اختیار میں نہیں۔ اس سے کہو کہ وہ خود پیش ہو کر عذر داری کرے۔ اگر مکہ بلاوا آیا ہے تو وہ ضرور حج پر جائے گا۔"

"شکریہ سردارِ اعظم۔"

قاصد نے جھک کر سلام کیا:

"میں ابھی اپنے آقا کو آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔"

قاصد واپس ہونے لگا تو تیمور نے اسے روک لیا۔

"سردارِ محترم!"

تیمور نے بزرگ سردار جاکو برلاس کو مخاطب کیا:

"تم ہمارے محافظ دستے کو ساتھ لے کر جاؤ امیر حسین ہمارا قرابت دار ہے۔ اسے نہایت عزت و احترام سے لے کر آؤ۔ اسے اپنے قید ہونے کا احساس نہ ہونا چاہیے۔"

جاکو برلاس محافظ دستے کے ساتھ بلخ کے کھنڈرات میں گیا۔ اس نے خود امیر حسین سے مل کے اسے تیمور کا حکم سنایا۔ امیر حسین نے کوئی عذر نہ کیا اور دلشاد آغا کو لے کر جاکو برلاس کے ساتھ ہو لیا۔

جاکو نے واپس آ کر تیمور کو اطلاع دی۔ تیمور نے حکم دیا کہ امیر حسین کو الگ خیمے میں رکھا جائے۔ جب تک اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہو جاتا اس کی بیوی دلشاد آغا کو اس کے پاس نہ جانے دیا جائے۔

تیمور کے حکم کے مطابق امیر حسین اور دلشاد آغا کو الگ الگ خیموں میں رکھا گیا اور دونوں خیموں پر پہرہ لگا دیا گیا۔

اب امیر حسین کا معاملہ تمام سرداروں کے سامنے فیصلے کے لیے پیش ہوا۔ امیر حسین کی حیثیت اگر صرف ایک مغلوب اور مفتوح دشمن کی ہوتی تو تیمور خود ہی اس کا فیصلہ کر دیتا لیکن امیر حسین نے شیر بہرام کو قتل کر کے اپنے جرم میں اضافہ کر لیا تھا۔ اس کے سرداروں نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا اس لیے تیمور ان سرداروں کو اپنے اعتماد میں لے کر کوئی فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔

اسے جو فیصلہ کرنا تھا وہ تو اس کے دل میں تھا لیکن اس نے بارہا یہی کہا تھا کہ وہ امیر حسین کو قتل نہیں کرنا چاہتا...... اس نے اپنے سرداروں کو اس سلسلے میں دل کھول کر گفتگو کرنے کا موقع دیا اور خود اس گفتگو میں بہت کم حصہ لیا۔

امیر حسین کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تھا کہ دلشاد آغا کی ایک کنیز نے تیمور کو اپنی مالکہ کا پیغام پہنچایا۔ دلشاد آغا نے تیمور سے درخواست کی تھی کہ امیر حسین کی تقدیر کا فیصلہ کرنے سے پہلے اسے اپنے شوہر کی صفائی پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔

تیمور دلشاد آغا کی درخواست رد نہ کر سکا۔ وہ جانتا تھا کہ دلشاد آغا اپنے شوہر کو معاف کرنے کی سفارش کرے گی۔ تیمور کا خود بھی یہی ارادہ تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے سرداروں کے جذبات کو ٹھنڈا کر کے امیر حسین کے بچاؤ کی کوئی صورت نکالے۔

تیمور محفل سے اٹھا اور چلتے چلتے کہتا گیا:

"امیر حسین میرا رشتے دار ہے۔ میرے اس کے درمیان دوستی کا بھی عہد و پیمان ہے۔ اس نے جو کچھ کیا بہت برا کیا لیکن میرے ہاتھوں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔"

تیمور کے الفاظ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ امیر حسین کو معاف کرنا چاہتا ہے۔ سرداروں کے سامنے کہنے کا یہی مقصد ہو سکتا تھا کہ وہ بھی امیر حسین کو اگر دل سے نہیں تو کم از کم اپنے سردار کی خاطر معاف کر دیں۔

تیمور فکر میں ڈوبا ہوا دلشاد آغا کے خیمے میں داخل ہوا۔ دلشاد فوراً کھڑی ہو گئی۔ تیمور نے جھجکتے ہوئے اس پر نظر ڈالی۔ دلشاد کا گلاب جیسا شگفتہ چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ تیمور سے اس کی آخری ملاقات خیوہ کی جنگ کے موقع پر ہوئی تھی۔ اسے چھ سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ یہ عرصہ اتنا طویل تو نہ تھا کہ دلشاد آغا جوانی کی سرحدوں سے نکل جاتی۔ لیکن تفکر اور مسلسل پریشانیوں نے اس کی صحت کو برباد کر دیا تھا اور فکر کی لکیریں رخساروں پر ابھر آئی تھیں۔

"بیٹھ جاؤ دلشاد آغا" تیمور نے کہا۔

"نہیں سردار"۔

دلشاد نے دلی کرب دباتے ہوئے کہا:

"آپ فاتح ہیں اور قسمت نے ہمیں مغلوب کیا ہے۔ میرا فرض ہے کہ میں ایک مجرم کی ط
سامنے کھڑی رہوں"۔

"دلشاد آغا"۔

تیمور نے سنجیدگی سے کہا:

"دو حریفوں میں جنگ ہوتی ہے تو ایک ہی فریق فاتح ہو سکتا ہے۔ امیر حسین نے جو کچھ ک
میں افسوس ہی کر سکتا ہوں۔ مجھے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ اس نے بعض حرکتیں ایسی ک
اس کی شجاعت اور جوانمردی کو داغدار کر دیا"۔

"مجھے معلوم ہے سردار تیمور"۔

دلشاد آغا نے قطع کلام کیا:

"آپ اس کی غلطیوں کی تفصیل بیان نہ کیجیے۔ اس لیے کہ میں اس کی بیوی ہوں۔ اس کی کمزو
سے زیادہ آپ واقف نہیں۔ امیر حسین نے سمرقند کے تخت کو حاصل کرنے کے لیے بعض ایسی با
کا آپ کو علم نہیں لیکن ان تمام غلطیوں اور کمزوریوں کے باوجود میں یہی امید کروں گی کہ آپ۔۔۔۔:

"دلشاد آغا"۔

اب کی تیمور نے اس کی بات کاٹی:

"میں جانتا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو لیکن تم میری جگہ کھڑی ہو کر دیکھو۔ ذرا یہ بتاؤ کہ اگر میں مغ
بعد اسی طرح امیر حسین کے سامنے کھڑا ہوتا تو تم کیا کرتیں؟"

"میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں کہ خدا نہ کرے ایسا وقت آتا تو۔۔۔۔ تو۔۔۔۔"

دلشاد کی آواز بھرا گئی:

"میں آپ کی بھی اسی طرح سفارش کرتی جس طرح اس وقت امیر حسین کی زندگی کی خواہاں ہوں۔
خواہ آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن میں سچے دل سے کہتی ہوں کہ مجھے امیر حسین اس لیے عزیز ہے ک
ہے۔ زندگی کے کتنے ہی بہترین سال میں نے اس کے ساتھ گزارے ہیں لیکن سچ جانیے کہ آپ
سے کسی طرح کم عزیز نہیں۔ میں آپ کی اس لیے قدر کرتی ہوں کہ آپ ایک سچے اور کھرے تاتاری ہیں

بہادری اور جنگی حکمت عملی کی گرد کو بھی امیر حسین نہیں پہنچ سکتا۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ حق پر ہیں۔ سمرقند پر
آپ کا امیر حسین سے زیادہ حق اس لیے ہے کہ آپ امیر قزغن کے ہم قبیلہ نہ ہونے کے باوجود امیر حسین سے
زیادہ سمرقند پر حکومت کے اہل ہیں۔ آپ میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک جہانگیر اور جہاندار میں
ہونی چاہییں"۔

"دلشاد آغا تم نے اس وقت مجھے ایک اور افسوس سے دوچار کر دیا ہے"۔

تیمور نے اس پر ایک بھرپور نظر ڈالی:

"میں نے تمہارے بارے میں اندازہ لگایا تھا کہ تم ایک جاں باز اور عقلمند تاتاری خاتون ہو لیکن تمہاری
باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ تم بہت حقیقت پسند اور صاف گو بھی ہو۔ یہ وہ خوبیاں ہیں جو ایک عورت میں جمع ہو جائیں تو وہ
صحیح معنوں میں کسی تاجدار کی ملکہ بن سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ امیر حسین نے تمہاری قدر نہیں کی۔ تمہیں وہ
مقام نہیں دیا جس کی تم مستحق تھیں"۔

"نہیں امیر تیمور"۔

دلشاد فخریہ انداز میں بولی:

"امیر حسین میرا قدر دان ہے۔ اسے مجھ سے بے پناہ محبت ہے۔ صرف اس کی فطری کمزوریاں کبھی کبھی اس
محبت اور قدر دانی میں حائل ہوتی رہی ہیں۔ اس کی جلد بازی اور تلون مزاجی اسے دنیا سے لاپروا بنا دیتی ہے۔ اگر
اس نے شیر بہرام کے معاملے میں میرے مشورے پر عمل کیا ہوتا تو شاید اسے آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا"۔

"شیر بہرام"۔

تیمور نے چونک کر دلشاد آغا کو دیکھا:

"دلشاد آغا! کیا تمہیں شیر بہرام کے قتل کی پہلے سے خبر تھی؟"

"اگر میں یہ کہوں کہ مجھے شیر بہرام کے انجام کی خبر تھی تو آپ کے دل میں ضرور یہ سوال پیدا ہوگا کہ میں
نے اسے بچانے کی کوشش کیوں نہیں کی"۔

دلشاد آغا نے گلوگیر آواز میں کہا:

"سردار تیمور۔ آپ کو علم نہیں کہ میں نے شیر بہرام کو بچانے کی کتنی کوشش کی۔ جس وقت مجھے معلوم ہوا کہ
امیر حسین نے شیر بہرام کو قید کر دیا ہے تو میں نے اس کی سخت مخالفت کی اور امیر حسین سے صاف صاف کہہ دیا کہ
یہ اس کی بزدلی کا اتنا بڑا داغ ہے جسے وہ عمر بھر اپنے دامن سے نہیں دھو سکے گا۔ امیر حسین جب اپنی ضد سے نہ
باز آیا تو میں نے اپنی ایک کنیز کے ذریعے شیر بہرام کو امیر حسین کے ارادے سے باخبر کر دیا۔ آپ اسے شاید

شوہر سے غداری یا بے وفائی کا نام دیں لیکن میں خود کو قصوروار نہیں سمجھتی۔ میری طبیعت یہ بات گوارا نہ کر سامنے ایک بے گناہ قتل کر دیا جائے اور میں خاموش بیٹھی رہوں لیکن موت تو شیر بہرام کا مقدر بن چکی تھی نے خود فرار ہونے کے بجائے اپنے ایک ساتھی کو فرار کرا دیا جس کا علم دوسرے دن امیر حسین کو ہو گیا اور پاداش میں اس نے شیر بہرام کو قتل کرا دیا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ قتل رنگ لایا اور آج امیر حسین زندگی کی بھیک مانگنے پر مجبور ہے۔ اس بھیک میں اس کے ساتھ میں بھی شریک ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے دلشاد آغا نے چادر کا دامن تیمور کے سامنے کر دیا:

"اس دامن کو امیر حسین کی زندگی سے بھر دیجیے امیر تیمور۔ مجھے ناامید نہ کیجیے۔ میرا امیر مجھے کر دیجیے"۔

کئی موتی دلشاد آغا کی آنکھوں سے ٹپک پڑے۔

تیمور اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ بولا:

"دلشاد آغا۔ قسمت والا ہے وہ شوہر جسے تم جیسی بیوی ملی۔ جو شوہر کی ہر کمزوری کو اپنی زندگی ہے اور اس کی زندگی کے لیے دشمن کے سامنے دامن پھیلا رہی ہے۔ آنسو پونچھ ڈالو دلشاد آغا میرے شیر بہرام کے قتل سے بہت ناراض ہیں۔ میں نے انہیں ہموار کرنے کی کوشش کی ہے اور ان پر یہ بھی ظاہر کر کہ امیر حسین سے میری دوستی اور قرابت داری ہے۔ امیر حسین کو نہ تو میں قتل کر سکتا ہوں اور نہ اس کے قتل کا حکم دے سکتا ہوں"۔

"سردار تیمور۔ میں آپ کے اس احسان کو عمر بھر نہ بھول سکوں گی"۔

دلشاد کے مغموم چہرے پر خوشی کی چمک پیدا ہو گئی:

"میں وعدہ کرتی ہوں کہ امیر حسین کو آئندہ کبھی آپ کے خلاف تلوار بلند نہیں کرنے دوں گی"۔

تیمور اسے تسلی دے کر اٹھا:

"دلشاد آغا۔ تم کو اس خیمے میں کوئی تکلیف تو نہیں؟"

"نہیں سردار"۔

دلشاد جلدی سے بولی:

"اگر کوئی تکلیف تھی تو وہ آپ کی باتوں سے ختم ہو گئی"۔

"میں تمہیں امیر حسین کے خیمے میں پہنچانے کا حکم دے رہا ہوں"۔ تیمور نے خوش ہی کہا:

"تم امیر حسین کو مناسب الفاظ میں تسلی دے دینا"۔

تیمور چلا گیا۔ دلشاد آغا کو امیر حسین کے خیمے میں پہنچا دیا گیا۔

یہ بات شام کے وقت ہوئی تھی۔ تیمور اپنے سرداروں کے پاس پہنچا اور اعلان کیا کہ امیر حسین کی قسمت کا فیصلہ کل صبح کیا جائے گا۔

تیمور کا خیال تھا کہ رات کا یہ وقفہ اس کے سرداروں کو آپس میں صلاح مشورے کا موقع فراہم کرے گا۔ اور وہ امیر حسین کی جان بخشی کے معاملے پر متفق ہو جائیں گے لیکن رات کے ختم ہونے سے پہلے ہی اس کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔

تیمور کے خیمے سے نکلنے کے بعد اس کے سرداروں نے اس معاملے پر غور کیا۔ انہیں اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ دلشاد آغا نے اپنی باتوں سے تیمور کو رام کر لیا ہے اور وہ امیر حسین کو ضرور آزاد کر دے گا۔ تیمور کے سردار امیر حسین کو زندہ چھوڑنے پر کسی صورت میں آمادہ نہ تھے۔ ان کے خیال میں امیر حسین کی رہائی سے ایک غلط رسم کا آغاز ہو جائیگا اور لشکر کے سرداروں کی جان کی کوئی ضمانت نہ دی جا سکے گی۔

رات کو تیمور کے سرداروں نے اپنے طور پر ایک منصوبہ تیار کیا اور اس پر عملدرآمد کے لیے سردار موئڈارلات کو منتخب کیا۔ یہ وہی سردار تھا جس نے امیر موسیٰ کے ساتھ مل کر صرف پانچ سو سواروں کی قلیل تعداد سے "منگی پل" کا حملوں سے کامیاب دفاع کیا تھا۔

موئڈارلات منصوبے کے مطابق ایک اور سردار کو ساتھ لے کر امیر حسین کے خیمے پر پہنچا۔ دلشاد آغا اسی وقت امیر حسین کے پاس پہنچ چکی تھی اور اس نے امیر حسین کا خوف بڑی حد تک دور کر دیا تھا لیکن موئڈارلات کی آمد سے وہ کانپ اٹھا اور سمجھ گیا کہ اس کی موت آ گئی ہے۔

موئڈارلات خلاف امید امیر حسین سے بڑی محبت سے ملا اور تسلی دیتے ہوئے بولا:

"آپ کو خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ سردار تیمور کے تقریباً تمام سردار آپ کے قتل کے خواہاں ہیں لیکن چند سردار آپ کو بچانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کو اپنی جان عزیز ہے تو ان کے کہنے پر عمل کیجیے"۔

"وہ کیا چاہتے ہیں؟ مجھے کیا کرنا ہوگا؟" امیر حسین نے امید و بیم کے ملے جلے لہجے میں پوچھا۔

"آپ کے ہمدرد سرداروں نے آپ کے لیے ایک تیز رفتار گھوڑے کا انتظام کر دیا ہے"۔

موئڈارلات سنجیدگی سے بولا:

"یہ گھوڑا آپ کو صبح ہونے تک یہاں سے بہت دور پہنچا دے گا اور آپ دشمنوں سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائیں گے"۔

"میں ۔ میں ۔۔۔ "

امیر حسین کچھ کہنا چاہتا تھا کہ دلشاد آغا دوڑ کر اس سے لپٹ گئی:

"نہیں نہیں امیر حسین"۔

دلشاد روتے ہوئے بولی:

"میں تمہیں نہیں جانے دوں گی ۔ تمہارا فرار سردار تیمور کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائے گا۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ تمہارے قتل کا حکم نہیں دیں گے"۔

"سردار تیمور کا وعدہ اپنی جگہ درست ہے"۔

موئڈارلات بولا:

"لیکن سردار تیمور نے انہی سرداروں کے زور پر فتوحات حاصل کی ہیں ۔ وہ ان وفادار اور بہادر کی مخالفت نہ مول لے سکے گا۔ دلشاد آغا ایک سمجھدار خاتون ہیں۔ آپ یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ تیمور نے آپ کے لیے یہ بات کہی ہے۔ کوئی سردار اپنے ساتھیوں کی خواہش سے انکار نہیں کر سکتا پھر اس صورت میں جب جانتے ہو۔ امیر حسین قاتل ہیں۔ سردار تیمور ان پر اپنے سرداروں کو قربان نہیں کر سکتا"۔

"سردار ارلات!"

دلشاد اشکوں کے درمیان بولی:

"سردار تیمور اپنے وعدے سے نہیں پھر سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ امیر حسین کی جان فرور بخش

"میں نے اپنا فرض ادا کر دیا"۔

موئڈارلات نے واپسی کا ارادہ کیا:

"آپ کو اس پیش کش سے فائدہ اٹھانا چاہیے تھا میں واپس جا رہا ہوں اور یہ واضح کیے دیتا صبح کا سورج دیکھنا نصیب نہ ہوگا"۔

امیر حسین نے دلشاد آغا کو دھکا دے کر خود کو اس کی گرفت سے آزاد کیا۔ دلشاد خیمے کے میں جا گری۔

امیر حسین نے موئڈارلات کو روکتے ہوئے کہا:

"سردار موئڈ! مجھے آپ کی تجویز منظور ہے لیکن آپ وعدہ کریں کہ میرے بعد دلشاد آغا نہیں ہوگی"۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی"۔

دلشاد فوراً کھڑی ہو گئی:

"امیر حسین! جب تم سردار تیمور کے اعتماد کو ٹھکرا کر موت کے منہ میں جانا چاہتے ہو تو میں بھی تمہارے ساتھ ہی جان دوں گی"۔

"مجھے افسوس ہے دلشاد آغا!"

موئڈارلات دکھ سے بولا:

"اوّل تو یہ کہ امیر حسین کے لیے صرف ایک گھوڑے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اگر آپ نے ان کے ساتھ جانے کی ضد کی تو گرفتاری کے امکانات بڑھ جائیں گے نیز آپ ان کی ہلاکت کا سبب بھی بن سکتی ہیں"۔

دلشاد آغا لاجواب ہو کر موئڈارلات کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

"میں تیار ہوں سردار ارلات"۔

امیر حسین جلدی سے بولا:

"آپ دلشاد کی حفاظت کا وعدہ کیجیے"۔

"آپ مطمئن رہیں امیر حسین!"

موئڈارلات نے سپاٹ لہجے میں کہا:

"وہ تاتاری خواتین جو اپنے شوہروں کے ساتھ میدانِ جنگ میں شانہ بشانہ لڑتی ہیں وہ قابلِ احترام ہوتی ہیں۔ دلشاد آغا کے عزت و وقار میں کوئی فرق نہیں آنے دیا جائے گا"۔

امیر حسین موئڈارلات کے ساتھ خیمے سے باہر آیا۔ اسے جانے کے لیے گھوڑا تیار تھا۔ اس نے محبت سے دلشاد آغا کا ماتھ دبایا اور جست لگا کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے گھوڑا مہمیز پا کر ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

امیر حسین ایک نامعلوم منزل کو رواں تھا اور دلشاد آغا اپنے دھڑکتے دل کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھ رہے تھے۔

"آپ جا کے آرام کیجیے دلشاد آغا"۔ یہ کہتا ہوا موئڈارلات واپس ہو گیا۔

⊙

کہا جاتا ہے کہ رات بڑی پردہ پوش ہوتی ہے ۔ دنیا کے تمام گھناؤنے کام اس کی تاریک چادر کے دامن

ہی میں انجام دیے جاتے ہیں۔

وہ رات بھی بظاہر پُرسکون تھی۔

تیمور تمام رات کروٹیں بدلتا رہا۔ ایک طرف اس کے تمام با اثر سردار تھے جو شیر بہرام کے قاتل کو کسی بھی معاف کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ دوسری طرف اس کی اکیلی ذات، جس میں الجائی خاتون کی یاد اور اب دلشاد آغا کی باتیں شامل ہو گئی تھیں۔

اسے امیر حسین کے مقدمے کا صبح کو فیصلہ کرنا تھا۔ تاخیر کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اپنے طور پر تو وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ امیر حسین کو غزنی کی حکومت سونپنے پر اب بھی آمادہ تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ امیر حسین کے سامنے دو صورتیں رکھے گا:

۱۔ وہ چاہے تو غزنی واپس چلا جائے۔ یہ تیمور کی پیش کش تھی۔

۲۔ ورنہ پھر حج پر روانہ ہو جائے، جس کی امیر حسین نے خود خواہش کی تھی۔

دلشاد آغا بھی رات بھر جاگتی رہی تھی۔ وہ اس بات سے خوش تھی کہ امیر حسین اس وقت تک بہت دور جا چکا ہو گا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک نامعلوم خوف اس کے دل میں کسی طرف سے در آنا اور وہ سوچنے لگتی کیا مونڈا... واقعی امیر حسین کا ہمدرد ہے؟

امیر مونڈارلات اور تیمور کے دوسرے سردار بھی اس رات چین سے نہ سو سکے۔ انہیں فکر و فردا ستا رہی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ انہوں نے جو قدم اٹھایا ہے اگرچہ وہ متفقہ تھا پھر بھی کہیں ان کا یہ قدم تیمور کے غضب کا سبب نہ بن جائے۔

چنانچہ جب بلخ کی مسجدوں میں فجر کی اذان گونجی تو وہ سہم گئے۔ چند لمحوں بعد اس خیمہ گاہ میں ایک انکشاف ہونے والا تھا جس سے ایک عظیم فتنہ بھی جنم لے سکتا تھا۔

نماز ختم ہوتے ہی لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔

"امیر حسین مارا گیا۔ قید سے بھاگ نکلا تھا۔"

"محافظوں نے اسے ایک میل دور جا کے پکڑا۔ اس نے مقابلہ کیا اور مارا گیا۔"

"سردار تیمور نے دلشاد آغا کی سفارش پر اسے معاف کر دیا تھا لیکن اس کے سر پر موت کھیل رہی تھی۔"

"ہاں۔ جبھی تو بھاگا اور محافظوں نے پکڑ کر قتل کر دیا۔"

جتنے منہ اتنی باتیں!

نمازیوں کے ساتھ یہ خبر شہر میں پہنچی۔ تیمور کے لشکری بھی مسجد میں تھے۔ وہ اپنے ساتھ یہ خبر خیمے میں لے آئے۔

تیمور نے اپنے خیمے میں نماز پڑھی تھی۔

"امیر حسین مارا گیا!"

سب سے پہلے ایلچی بہادر نے اس خبر کی تصدیق کی۔

"مگر کب؟ کیسے، کہاں؟" تیمور نے گھبرا کر پوچھا۔

"سردار!"

امیر حفائی داخل ہوتے ہوئے بولا:

"امیر حسین فرار کے دوران مارا گیا۔ اس کی موت یونہی لکھی تھی"۔

"اس کا وقت آ گیا تھا سردار!"

مونڈارلات بھی آ گیا:

"موت برحق ہے۔ پھر وہ تھا بھی اسی قابل"۔

"امیر حسین محافظوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا"۔

بوڑھے جاکو برلاس نے اندر آ کر کہا:

"مگر افسوس کس بات کا؟ اس نے بھی تو ہمارے ساتھی شیر بہرام کو قتل کر دیا تھا۔"

"ہاں ہاں۔ ہمیں کوئی افسوس نہیں۔ مر گیا۔ اچھا ہی ہوا۔"

تیمور کے کانوں میں اس طرح کی مسلسل آوازیں پڑتی رہیں۔ آوازیں، مختلف، الگ الگ لوگوں کے منہ سے نکلی ہوئی! لیکن مقصد و مفہوم سب کا ایک تھا۔ تیمور کو اندازہ ہو گیا کہ امیر حسین کے مارے جانے کا کسی کو افسوس نہیں بلکہ وہ سب خوش ہیں۔ پتہ نہیں تیمور کو امیر حسین کا افسوس ہوا کہ نہیں لیکن وہ اس بات سے زور مطمئن تھا کہ امیر حسین لشکر گاہ کے باہر فرار کے دوران مارا گیا۔ اس لیے تیمور کی طرف کوئی انگلی نہ اٹھا سکتا تھا۔ اس نے اس سلسلے میں کچھ زیادہ تحقیقات کی بھی ضرورت نہ محسوس کی۔ اس کے تمام سردار یک زبان ہو کر کہہ رہے تھے کہ امیر حسین فرار کے دوران مارا گیا۔ پھر وہ ان کی بات پر اعتبار کیوں نہ کرتا۔

تیمور نے اپنے محافظ سواروں کو حکم دیا کہ امیر حسین کی لاش لے آئیں اور اسے دلشاد آغا کے سپرد کر دیں۔ اس نے امیر حسین کے کفن دفن کا بھی حکم دیا۔

دلشاد آغا امیر حسین کی لاش دیکھ کر رونے کے بجائے دہشت زدہ ہو گئی۔ اس کی آنکھیں خشک ہو گئیں۔ اس کی کنیزیں رو رہی تھیں لیکن وہ دم بخود کھڑی ان کا منہ تک رہی تھی۔

امیر حسین کی موت کے متعلق مختلف روایتیں مشہور ہیں۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ تیمور کے جاں بخشی کے وعدے کے باوجود امیر حسین نے راہِ فرار اختیار کی اور بھیس بدل کر مسجد میں جا چھپا۔ اگلی صبح کو مؤذن نے اسے پہچان لیا اور گرفتار کرا دیا۔

ایک روایت کے مطابق امیر حسین ایک مسجد کے مینار میں جا کر چھپ گیا۔ اس کی تلاش جاری تھی کہ ایک آدمی مسجد کے مینار پر چڑھا تاکہ اپنے گم شدہ گھوڑے کو دور دور تک دیکھ سکے۔ اسے گھوڑا تو دکھائی نہ دیا امیر حسین نظر آ گیا۔ اس نے امیر حسین کو گرفتار کرا دیا اور تیمور کو اطلاع ہونے سے پہلے ہی اس کے سرداروں نے امیر حسین کو ختم کر دیا۔

بہر حال اس پر سب کو اعتماد تھا کہ امیر حسین خیمے سے نکل بھاگا تھا۔ کسی مؤرخ نے بھی امیر حسین کے قتل میں تیمور کو ملوث نہیں کیا۔ جو کچھ ہوا اس کا علم تیمور کو نہ تھا۔

امیر حسین کو پورے شاہانہ طریقے سے دفن کیا گیا جس میں تیمور اور اس کے تمام سرداروں نے شرکت کی۔ تیمور نے بعد میں امیر حسین کا مقبرہ بھی تعمیر کرا دیا تھا۔

امیر حسین کے کفن دفن کے دوران تیمور اور دلشاد آغا کا کئی بار سامنا ہوا لیکن دونوں ایک دوسرے سے نظر بچا گئے۔ تیمور کو اپنی جگہ یہ شرمندگی تھی کہ اس نے دلشاد آغا سے امیر حسین کی جاں بخشی کا وعدہ کیا تھا لیکن امیر حسین قتل ہو گیا۔ دوسری طرف دلشاد آغا بھی شرمندگی کی وجہ سے تیمور کا سامنا کرنے سے کتراتی تھی۔ وہ یہ سوچ کر شرمندہ تھی کہ اگر تیمور نے اس سے پوچھا کہ امیر حسین کی معافی کے باوجود دلشاد آغا نے اسے کیوں فرار ہونے دیا تو وہ کیا جواب دے گی؟

اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ تیمور اس سے اس معاملے میں سخت باز پرس کرے گا لیکن کچھ دن گزرنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ تیمور کا رویہ اس کے ساتھ نہ صرف معالحانہ ہے بلکہ دوستانہ بھی ہے۔ تیمور نے حکم دے دیا کہ دلشاد آغا کو وہ تمام مراعات حاصل رہیں گی جو اسے بحیثیت ملکہ غزنی حاصل تھیں۔ اس کا خیمہ تبدیل کر دیا گیا اور اس کے ملازمین کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا۔

O

امیر حسین کی موت کے ساتھ تاتاریوں کی خانہ جنگی کا خاتمہ ہو گیا۔ امیر حسین کے قبضے میں غزنی، کابل اور

ماوراءالنہر کا کچھ علاقہ تھا۔ وہ سب تیمور کے قبضے میں آ گیا۔ اب پورے تاتار میں اس کا کوئی مدِمقابل نہ تھا۔ سمرقند کی حکومت کا جھگڑا ابھی نمٹ گیا تھا۔

تاتاری مسلمان ہو جانے کے باوجود اب بھی چنگیز خانی قانون کے بعض حصوں کو تسلیم کرتے تھے۔ مغلوں میں خاقان کے مرنے کے بعد دوسرا خاقان مقرر کیا جاتا تھا۔ امیر قزغن کے بعد سمرقند کا تخت خالی ہو گیا تھا۔ امیر حسین نے اس کا دعویٰ کیا تھا لیکن وہ تیمور کے ہاتھوں شکست کھا کر قتل ہو چکا تھا۔ دوسری طرف بلادِ شمال کے مغلوں کا اقتدار بھی ختم ہو گیا تھا۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ تاتاریوں کا حاکمِ اعلیٰ منتخب کیا جائے۔

نئے امیر یا حاکم کے انتخاب کے لیے ضروری تھا کہ پرانے مغل دستور کے مطابق قورولتائی (مجلسِ مشاورت) منعقد ہو اور تمام بڑے بڑے سردار، اتفاقِ رائے سے اپنا حاکم چن لیں۔ چنانچہ ہندوستان کے دروں سے لے کر شمال کے مرغزاروں تک، تمام قبائل کے سرداروں کو قورولتائی میں شرکت کے لیے پیغامات بھیجے گئے۔

یہ ایک بڑا اہم مسئلہ تھا اس لیے خبر ملتے ہی قبائلی سردار جوق در جوق بلخ میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ قورولتائی کا اجتماع بھی دیدنی تھا۔ اس میں عمامہ پوش ایرانی شہزادے، آئمہ کرام، بخارا کے علما، درس گاہوں کے شیوخ، خادمانِ دین شرکت کے لیے بلائے گئے۔ تیمور نے اپنے مرشد ہادیٔ زمان مولانا زین الدین اور ان کے مصاحبین کو خصوصی دعوت نامہ بھیجا۔ ماوراءالنہر کے ہادی و مرشد خواجہ بہاءالدین کو بھی مدعو کیا گیا۔ غرض یہ کہ پورے ملکِ تاتار میں کوئی فوجی افسر، عالم، صوفی اور سردارِ قبیلہ نہ تھا جس کے پاس تیمور کا قاصد نہ پہنچا ہو اور اسے فوراً قورولتائی میں پہنچنے کا پیغام نہ دیا گیا ہو۔ یہ تمام انتظامی امور تیمور کی طرف سے کیے جا رہے تھے لیکن تیمور کا یہ عالم تھا کہ وہ اس سے بالکل لاپروا نظر آتا اور اپنے آپ کو ملکی انتظام میں مصروف ظاہر کرتا۔

ملکِ تاتار کے تمام سرداروں کو علم تھا کہ قورولتائی میں کسی نئے امیر کا انتخاب نہ ہو گا بلکہ تیمور کے حق میں ان سے رائے مانگی جائے گی کیونکہ سوائے تیمور کے اور کوئی اس منصب کا اہل نظر نہ آتا تھا۔

قورولتائی میں، دور دراز علاقوں سے بھی سرداروں کو شرکت کے لیے آنا تھا اس لیے اس کی تاریخ دو ماہ بعد مقرر کی گئی تھی تاکہ تمام مدعوئین آسانی سے بلخ پہنچ جائیں لیکن ابھی ان کی آمد کا سلسلہ شروع بھی نہ ہوا تھا کہ تیمور کو ایک حادثے سے دوچار ہونا پڑا۔

تیمور کا ایک جاں نثار شیر بہرام تو امیر حسین کے ہاتھوں قتل ہوا تھا جس کا غم ابھی دور نہ ہوا تھا کہ تیمور کو اپنے ایک اور عزیز دوست اور ساتھی کا غم برداشت کرنا پڑا۔

تیمور قورولتائی کے انتظامات میں منہمک تھا کہ اسے ختلان کے حاکم کیخسرو کی بغاوت کی اطلاع ملی۔ کیخسرو پہلے امیر حسین کا حلیف تھا لیکن جب اس کے بھائی کو امیر حسین نے بلاوجہ قتل کرا دیا تو وہ امیر حسین سے خفا ہو کر تیمور کے

پاس آ گیا لیکن امیر حسین کے قتل ہوتے ہی اس نے تیمور کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ وہ پہلے شمال کے مغلوں کا ہمدرد اور ان کا باجگذار تھا۔ اس نے فوراً مغلوں سے امداد طلب کی۔ مغل تک تاتار تھے لیکن کیخسرو کی مدد کو انہوں نے کچھ فوج بھیج دی۔ کیخسرو کا حوصلہ اس وجہ سے بھی بڑھ گیا تھا۔

تیمور کو علم تھا کہ ابھی اسے بہت سے سرکش سرداروں کو زیر کرنا ہے۔ اس نے فوراً کیخسرو کا فیصلہ کیا اور ایک فوج ترتیب دی۔ قرولتائی کا دن قریب آ رہا تھا اس لیے تیمور کے سرداروں نے مشورہ دیا کہ اس وقت تیمور کی بلخ میں موجودگی ضروری ہے۔ اس لیے اپنے بجائے وہ کسی سردار کو مقابلے پر بھیجے۔ تیمور نے اس مشورے کو پسند کیا اور تین سرداروں کو اس مہم کے لیے منتخب کیا۔ یہ امیر جغتائی، عرب سردار شیخ علی بہادر اور مشہور طرحدار ایلچی بہادر تھے۔

ان میں صرف ایلچی بہادر سمجھدار تھے اور حکمت عملی سے کام لیتے تھے۔ باقی دونوں سردار نہایت تند اور جلالی فطرت کے مالک تھے۔ بات بات پر تلوار کھینچنے اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ تیمور نے ضروری ہدایات دے کر بھیجا تھا لیکن بلخ سے روانہ ہوتے ہی ان کی تندخوئی عود کر آئی۔ وہ اس قدر تیزی سے کیخسرو کی طرف بڑھے کہ باقی فوج ان سے پیچھے رہ گئی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ وہ اس قدر آگے نکل گئے کہ کسی جگہ ٹھہر کر کئی کئی گھنٹے فوج کا انتظار کرنا پڑا۔

ایک دن یہ تینوں فوج سے بہت آگے ایک دریا کے کنارے گھوڑے اڑائے چلے جا رہے تھے کہ ان کی نظر دریا کے دوسری طرف پڑی تو وہاں ایک فوج نظر آئی۔ انہوں نے گھوڑوں کی راسیں کھینچیں اور پیڑ کی آڑ میں چھپ گئے۔ انہیں شبہ تھا کہ یہ مغلوں یا کیخسرو کی فوج ہے۔

ذرا دیر بعد انہیں دریا پار کیخسرو گھوڑے پر سوار نظر آیا۔ اس کے ساتھ کئی مغل سردار بھی تھے۔ کر لینے کے بعد کہ یہ وہی فوج ہے جس کی تلاش میں وہ آئے ہیں، ان تینوں نے آپس میں صلاح مشورے شروع کر دیے۔

"ہمیں پہلے اپنی فوج کا انتظار کرنا چاہیے۔"

ایلچی بہادر نے نہایت صائب مشورہ دیا:

"فوج کی آمد سے پہلے حملے کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔"

"ہوں....."

امیر جغتائی غرایا:

"تمہارا مطلب ہے کہ جب تک فوج نہ آئے ہم چوروں کی طرح یہاں چھپے بیٹھے رہیں اور دشمن

امیر جغتائی بہادر۔"

ایلچی بہادر نے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی:

"ہم صرف تین ہیں۔ بیچ میں دریا۔ اس طرف دشمن کی پوری فوج۔ سوائے انتظار کے ہم اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟"

"دیکھتے رہو کہ کیا ہو سکتا ہے؟"

ایلچی بہادر نے اسے حیرت سے دیکھا۔ امیر جغتائی بہادر دراصل مغل سردار تھا اور اب تیمور کا وفادار ہو گیا تھا۔ اس کی طبیعت میں مغلوں جیسی سختی اور تندی موجود تھی۔ ایلچی بہادر نے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر امیر جغتائی بہادر سے زیادہ بحث کی تو وہ تلوار کھینچ لے گا اور دو میں سے ایک مارا جائے گا۔

امیر جغتائی بہادر کو ایلچی بہادر کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے شیخ علی بہادر کو دیکھا۔ لطف یہ کہ وہ دونوں اپنی تندی اور بد دماغی کی وجہ سے پورے تاتاری لشکر میں مشہور تھے لیکن دونوں میں خوب گہری دوستی بھی تھی۔

شیخ علی بہادر نے گھور کر امیر جغتائی کو دیکھا اور طنزیہ انداز میں بولا:

"خوب، بہت خوب۔ کیا مغل اسی طرح لڑتے ہیں؟"

بھلا امیر جغتائی بہادر یہ طنز کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ وہ تڑپ کے اٹھا۔ اچک کے گھوڑے پر بیٹھا اور بولا:

"شیخ علی! میں دکھاتا ہوں کہ مغل کیسے لڑتے ہیں؟"

اس کے ساتھ ہی اس نے گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔

شیخ علی بہادر اور ایلچی بہادر حیرت زدہ رہ گئے۔ انہیں امیر جغتائی بہادر سے ایسی حماقت کی امید نہ تھی۔ پھر ان کی حیرت کی اس وقت تو انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ امیر جغتائی نے دریا پار کیا اور دوسری طرف پہنچتے ہی کیخسرو کے سواروں پر حملہ کر دیا۔

یہ شیخ علی بہادر کی بہادری پر بہت بڑا تازیانہ تھا۔ وہ بجلی جیسی سرعت سے اٹھا۔ گھوڑے پر سوار ہوا اور دریا کا تیز دھارا کاٹنے لگا۔

ایلچی بہادر کیسے پیچھے رہ سکتا تھا۔ اس نے بھی اپنا گھوڑا دریا میں اتار دیا۔ شیخ علی بہادر جس وقت دریا پار پہنچا تو اس وقت تک امیر جغتائی، دشمن کے دو سواروں کو ختم کر چکا تھا لیکن اب وہ دشمنوں کے نرغے میں آ گیا تھا۔

شیخ علی بہادر نے ایک نعرہ لگایا اور دشمنوں پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے سامنے جو آیا وہ یا تو مارا گیا یا پیچھے ہٹ گیا۔ شیخ علی نے جلد ہی امیر حطائی کا گھیرا توڑ دیا اور مارتا کاٹتا اس کے قریب پہنچ گیا پھر امیر حطائی سے کہا:

"امیر اس طرح لڑنا حماقت ہے۔ پاگل نہ بنو، واپس چلو۔"

"مغل حملہ کر کے واپس نہیں جایا کرتا۔ تمہیں واپس جانا ہے تو چلے جاؤ۔" امیر حطائی نے بھی اسی طرح جواب دیا اور اس کے حملے میں شدت پیدا ہو گئی۔

"لاحول ولا قوۃ۔" شیخ علی کے منہ سے نکلا۔

اب دونوں دوست شانہ بشانہ دشمنوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ اس گفتگو کے دوران بھی ان کی تلواروں کے ساتھ ساتھ تلواریں بھی چلتی رہی تھیں۔ اُس دن ان دونوں کا خاتمہ ہو جاتا۔ . . . . لیکن عین وقت پر ان کا لشکر دریا عبور کر کے ان کی مدد کو پہنچ گیا۔

پھر زبردست لڑائی ہوئی۔ تیمور کے لشکر کو فتح حاصل ہوئی اور کیخسرو گرفتار ہوا۔ اس کی فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ وہ دونوں اس فتح پر خوش ہو رہے تھے کہ چند سواروں نے بتایا کہ ایلچی بہادر مع گھوڑے کے دریا پار کرتے ہوئے غرق ہو گیا ہے۔ اس خبر سے ان کے چہرے اتر گئے۔

جب تیموری لشکر کیخسرو کو گرفتار کر کے تیمور کے پاس پہنچا تو اسے جہاں اس فتح کی خوشی ہوئی وہاں ایلچی کی غرقابی سے اسے سخت صدمہ ہوا۔ تیمور نے اپنے دوست کا کئی دن سوگ منایا۔ دو ماہ کے عرصے میں تیمور کے دو دوست اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے تھے۔

○

قرولتائی کا اجلاس شروع ہوا۔ تیمور نے قصداً اس میں شرکت نہ کی۔ مجلس میں بڑی گرما گرم بحث ہوئی۔ سرداروں کی اکثریت تیمور کے حق میں تھی لیکن وہ قبائلی سردار جو زیادہ طاقتور تھے اور جن کے قبائل تعداد میں زیادہ تھے تیمور کو اپنا حاکم ماننے پر تیار نہ تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ کسی کی ماتحتی برداشت کرنے پر کسی صورت بھی آمادہ نہ تھے۔

"ہمارا ملک مغلوں کی غلامی سے آزاد ہو چکا ہے۔" ایک بدخشانی سردار نے کہا۔ . . . "خانہ جنگی ہو

چکی ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ملک کو آپس میں تقسیم کر لیں اور اپنے علاقوں میں آزاد امیر کی طرح حکومت کریں اگر خدانخواستہ ہم پر کسی طرف سے حملہ ہوا تو ہم سب متحد ہو کر اس کا مقابلہ کریں۔ بھائیوں کی طرح خلوص اور محبت سے رہنے کا یہی طریقہ ہے۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ ہمیں بھائیوں کی طرح رہنا چاہیے۔"

بوڑھا جاکو برلاس سنجیدگی سے بولا:

"لیکن بھائیوں میں اتحاد اور میل ملاپ اسی وقت برقرار رہتا ہے جب ان کے سر پر ایک بڑا بھائی ہو جو انہیں اونچ نیچ سمجھاتا رہے۔ ملک کو تقسیم کرنے کا مطلب اپنی طاقت کو تقسیم کر دینا ہے۔ تمہارے الگ الگ ہوتے ہی شمال کے مغل پھر پلٹ آئیں گے اور فرداً فرداً ہر حاکم کو شکست دے دیں گے۔ ہر ایک کو اپنی پڑی ہوگی۔ کوئی کسی کا ساتھ نہ دے گا اس لیے ایک امیر بادشاہ کا انتخاب ضروری ہے۔"

جاکو برلاس نے معقول دلیل دی تھی لیکن طاقتور سرداروں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ ایک سردار نے سخت لہجے میں کہا:

"امیر یا بادشاہ کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارے پرانے دستور میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہمیں امیر قزغن کے طریقے پر چلنا چاہیے اور چنگیز خان کی اولاد میں سے کسی کو بادشاہ مقرر کرنا چاہیے۔ ایسی صورت میں سردار تیمور کو اس کا نائب مقرر کیا جا سکتا ہے۔"

علماء اور درویش یہ سنتے ہی بگڑ کر کھڑے ہو گئے۔ خواجہ ابوالبرکات نے مخالفت کرتے ہوئے کہا:

"الحمد للہ ہم مسلمان ہیں اور مغل اب تک کافر ہیں۔ پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم مسلمان اور طاقتور ہوتے ہوئے اپنے آپ ایک غیر مسلم کو اپنے سر پر مسلط کریں۔ سردار تیمور کی طاقت چنگیز خان سے کسی طرح کم نہیں۔ پھر ہم مغلوں کی محکومی کیوں قبول کریں۔ تم وہ وقت کیوں بھولتے ہو جب بلادِ شمال کے زنانِ مظلم کے خوف سے صحراؤں اور پہاڑ دروں میں منہ چھپاتے پھرتے تھے۔ ان کے مقابلے پر تیمور کی تلوار بلند ہوئی۔ مغلوں کے خلاف اٹھنے والی یہ پہلی تلوار تھی۔ تم میں بھی ہمت پیدا ہوئی اور سب نے مل کر مغلوں کو مار بھگایا لیکن خیال رہے کہ سردار تیمور نے تم سے نہ اس وقت مدد مانگی تھی اور نہ آج وہ تمہاری مدد کا خواہاں ہے۔ اس کے بازوؤں میں طاقت موجود ہے اور عنانِ حکومت وہی ہاتھ سنبھال سکتے ہیں جو تلوار چلانا جانتے ہوں۔ ہم تمام درویش، علما اور شیوخ کا واضح اعلان ہے کہ ہم نے سردار تیمور کو ملک تاتار کا امیر اور بادشاہ تسلیم کر لیا ہے۔ ہم نے یہ فیصلہ اس وجہ سے نہیں کیا کہ سردار تیمور کوئی بڑا دیندار آدمی ہے بلکہ تیمور نے اپنی اہلیت، جاں بازی اور فوجی تدبر سے مغلوں کو شکست دے کر ہمیں سر بلند کر کے چلنے کا موقع

فراہم کیا

"سردار تیمور ہمارا امیر ہے"۔ امیر حنظائی بہادر نے چیخ کر کہا۔

"وہ ہمارا بادشاہ ہے"۔ شیخ علی بہادر نے اس کی آواز میں آواز ملائی۔

مخالفت کا طوفان دب گیا۔ اب کس میں ہمت تھی کہ سردار تیمور کو "امیر" تسلیم کرنے سے انکار کرتا جبکہ تیمور کو تاتاری سرداروں کے علاوہ بعض مغل سرداروں کا بھی تعاون حاصل تھا جو مغلوں کی شکست کے بعد تیمور کے سایہ عافیت میں پناہ لے چکے تھے۔

تیمور کو امیر منتخب کر لیا گیا اور خود پوشش قبائلی سرداروں نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ دوسرے دن تمام قبائلی سردار اور حاکم، تیمور کے خیمے میں اظہارِ اطاعت کے لیے حاضر ہوئے۔ تیمور حسبِ معمول زرہ بکتر پہنے آبنوس کے ایک چھوٹے سے تخت پر بیٹھا تھا۔

تمام سردار اس کے سامنے قالین کے فرش پر دو زانو ہو کر بیٹھ گئے۔ پھر ایک سردار نے سفید نمدے کا مسند لی اور تیمور کے تخت کے پاس آ کر اس سے تخت پر مسند بچھانے کی اجازت چاہی۔ تیمور تخت سے اتر گیا۔ سفید مسند تخت پر لگا دی گئی۔ پھر سب نے یک زبان ہو کر تیمور سے مسند پر بیٹھنے کی درخواست کی۔ تیمور مسند پر بیٹھ گیا۔

مغلوں کے دستور کے مطابق سفید مسند پر صرف شاہِ وقت یا حاکمِ اعلیٰ بیٹھتا تھا۔ اب تیمور کا لقب "امیر تیمور گورگان" ہو گیا۔

آخری رسم 'حلفِ وفاداری کی تھی۔

امیر تیمور کے پیر و مرشد مولانا زین الدین نے قرآن منگوا کر درمیان میں رکھا۔ پھر ایک ایک سردار کو بلایا۔ سردار آتے۔ قرآن پر ہاتھ رکھتے اور امیر تیمور سے وفاداری کا اقرار کرتے۔

تاتاریوں میں اس رسم کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ اس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ آج سے تاتاری تیمور کے مطیع اور فرمانبردار ہو گئے۔ اس کے صلے میں تیمور رعیت کی املاک کا محافظ ہو گا اور ان کے تمام جھگڑوں کا تصفیہ کرنے کا ذمہ دار ہو گا۔

آخر میں مولانا نے کھڑے ہو کر دعا پڑھی اور امیر تیمور کو مخاطب کر کے کہا:

"اللہ تعالیٰ کی یہی مرضی تھی کہ آپ سپہ سالار، فاتح اور تاتاریوں کے امیر بنیں اور آپ کی عظیم طاقت اسلام کی تقویت کا باعث بنے"۔

امیر تیمور اس وقت چار آئینہ سجائے، بازو بند اور شانہ گیر لگائے اور سر پر زریں کام کا جگمگاتا خود پہنے بڑا پُر وقار اور بارعب دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اس خوشی کے موقع پر دل کھول کر تحائف تقسیم کیے۔ قیمتی خلعتیں،

مرصع زینیں اور گھوڑے جو کچھ اس کے پاس تھا، اس نے سرداروں میں تقسیم کر دیا۔ ہر سردار کے خیمے پر میووں اور کھانے کی کشتیاں بھجوائیں۔ قرولتائی میں آنے والے عالموں اور درویشوں کو یہ فضول خرچی پسند نہ آئی۔ ایک درویش سے ضبط نہ ہو سکا اور اس نے سردار تیمور سے کہا:

"انعام و اکرام امیر پر واجب ہے لیکن سب کچھ لٹا دینا آئین اور اصولِ سلطانی کے خلاف ہے"۔

امیر تیمور نے درویش کو مسکرا کر دیکھا اور بڑی سادگی سے جواب دیا:

"اے درویشِ محترم! میں سب کچھ بخش دینے کے بعد بھی غریب نہیں ہوں کیونکہ اگر میں "امیر" ہوں تو ان سب کی دولت میری دولت ہے اور میں حاکمِ وقت اور امیرِ تاتار نہیں تو میرے پاس جو دولت ہے وہ کس کام کی؟"

درویش اس جواب سے خوش بھی ہوئے اور مطمئن بھی۔ پھر کبھی کسی نے تیمور کی داد و دہش اور دریا دلی پر اعتراض نہ کیا۔

تیمور کے تمام لواحقین اور عزیز و اقارب قرولتائی کی خبر سن کر بلخ پہنچ گئے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ قرولتائی میں سردار تیمور کو ہی "امیرِ تاتار" چنا جائے گا۔ ان میں شہرِ سبز کے بہت لوگ تھے۔ سمرقند سے اس کی بہن اور بہن کے تمام عزیز بھی اسے مبارک باد دینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔

دربار کے بعد جب تیمور خواتین کے خیمے میں پہنچا تو اس کے قبیلے کی عورتوں اور سرداروں کی بیگمات نے اسے گھیر لیا۔ کسی نے بلائیں لیں۔ کسی نے صدقہ اتارا۔ ہر طرف مبارک باد کا غلغلہ اٹھا۔ تیمور نے بزرگ خواتین کی دعاؤں کے جواب میں انہیں ادب سے سلام کیا۔ بچیوں اور نوعمر لڑکیوں کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور انہیں تحائف دیے۔

یکایک تیمور کی نظر خیمے کے ایک طرف پڑی جہاں دلشاد آغا سب سے الگ کھڑی بڑی مسرت اور دلچسپی سے امیر تیمور کو دیکھ رہی تھی۔

"امیر کی نوازشوں کے لیے شکر گزار ہوں"۔

دلشاد نے بغیر نظریں ملائے جواب دیا:

"آپ نے مجھ بدنصیب کو سہارا دے کر سخاوت اور احسان کی ایک مثال قائم کی ہے ورنہ مفتوح کے حرم کا فاتح کے ہاتھوں جو حال ہوتا ہے اس سے کون واقف نہیں"۔

خواتین تیمور کو گھیرے ہوئے تھیں لیکن تیمور کو دلشاد آغا سے گفتگو کرتے دیکھ کر پاس ادب سے ذرا پیچھے ہٹ گئی تھیں۔

تیمور نے پھر بھی کنکھیوں سے اپنے ارد گرد دیکھا۔ پھر سرگوشی کی: "دلشاد آغا! تم ملکہ تھیں اور ملکہ ہی

دلشاد آغا نے گھبرا کر نظریں اٹھائیں لیکن تیمور کے قدم آگے بڑھ چکے تھے اور عورتوں نے پھر اسے اپنے حلقے میں لے لیا تھا۔

تیمور بہت دیر تک خواتین کے درمیان رہا لیکن نہ تو اس نے دوبارہ دلشاد آغا سے گفتگو کرنے کی کوشش کی اور نہ دلشاد آغا اس کے قریب گئی۔

دلشاد آغا تذبذب میں مبتلا ہو گئی تھی۔ وہ بار بار تیمور کے آخری جملے کا کوئی واضح مطلب نکالنے کی کوشش کرتی لیکن الجھ کر رہ جاتی۔ اس کی سمجھ میں یہ تو آ گیا تھا کہ تیمور اس کے شاہانہ وقار کو برقرار رکھنا چاہتا ہے لیکن اس کی کوئی صورت بھی ہو سکتی ہے؟ اس بارے میں وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ تیمور چلا گیا لیکن دلشاد آغا کی پُرسکون دنیا میں تلاطم پیدا کر گیا۔

اسی شام تیمور نے مولانا زین الدین سے تنہائی میں ملاقات کی۔ مولانا کے گھر کی خواتین بھی اس وقت اس خیمے میں موجود تھیں جس وقت تیمور اور دلشاد آغا کے درمیان سرگوشیوں میں باتیں ہوئی تھیں۔ ان خواتین نے یہ بات مولانا کے کان میں ڈال دی تھی۔ مولانا خود بھی امیر تیمور کی تنہائی کی طرف سے پریشان تھے۔ الجائی خاتون کو انتقال کیے چھ سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا اور تیمور نے اب تک دوسری شادی کا ارادہ نہیں کیا تھا۔

"مولانائے محترم! میں ایک ذاتی معاملے میں آپ کا مشورہ چاہتا ہوں۔"

تیمور نے بڑے ادب سے کہا:

"لیکن یہ خیال دامن گیر ہے کہ کہیں آپ میری خواہش کو طاقت کے غلط استعمال کا نام نہ دیں۔"

مولانا زین الدین سمجھ گئے کہ تیمور دلشاد آغا کے سلسلے میں گفتگو کرنا چاہتا ہے لیکن شاید اس خیال سے جھجک رہا ہے کہ اس کی عمر اب پینتیس سال سے تجاوز کر چکی ہے اس لیے مولانا نے اس کی الجھن دور کرنے کا کام اپنے اوپر لے لیا۔ وہ بولے:

"اے امیر! اب آپ اپنے ذاتی اور ملکی معاملات میں خود مختار ہیں۔ آپ کو کسی سے صلاح و مشورے کا کام نہیں۔ بہرحال، یہ امیر کی سعادت مندی ہے کہ وہ اب بھی مجھے کسی مشورے کے قابل سمجھتے ہیں لیکن قبل اس کے کہ آپ اپنا مسئلہ بیان کریں، پہلے میری ایک پریشانی پر توجہ فرمائیے۔ یہ پریشانی صرف میری ہی نہیں بلکہ اس الجھن میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو شروع سے اب تک آپ کی ذات اور جدوجہد آزادی میں آپ کے شریک ہیں۔"

"آپ کو کیا پریشانی ہے مولانا؟"

تیمور نے پوچھا:

"میں اپنے تمام دیرینہ رفیقوں اور دوستوں کو انعام و اکرام سے نوازنا چاہتا ہوں۔ اگر انہیں کوئی پریشانی

ہے تو آپ نے مجھے پہلے آگاہ کر دیا ہوتا۔"

"آپ زیادہ فکر مند نہ ہوں امیر!"

مولانا نے سنجیدگی سے کہا:

"ہم لوگ دراصل آپ کی تنہائی اور اس بے سکون زندگی سے پریشان ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ الجائی خاتون کا بدل پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی درست ہے کہ آپ کو ان سے بے پناہ محبت تھی اور اب بھی ہے لیکن انسان مشیت ایزدی کے آگے بے بس ہے۔ جس کو جتنی عمر عطا ہوتی ہے وہ اس سے ایک سانس آگے نہیں جا سکتا۔ شہزادہ جہانگیر پر نظر ڈالیے۔ وہ جوانی میں قدم رکھ رہا ہے۔ وہ ممتا سے محروم کنیزوں کے ہاتھوں پرورش پا رہا ہے۔ اس عمر میں شہزادے کو ماں کی نصیحتوں کی ضرورت ہے۔ اگر آپ دوسری شادی کر لیں تو آپ کی تنہائی دور ہو جائے گی اور شہزادے کو صحیح راستہ دکھانے والا بھی میسر آ جائے گا۔"

تیمور دل میں بہت خوش ہوا۔ وہ تو اسی معاملے میں گفتگو کے لیے آیا تھا۔ وہ اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے خوش دلی سے بولا:

"مولانا! اگر آپ اور میرے احباب کا یہ مشورہ ہے تو میں اس پر خوشی کے ساتھ عمل کرنے پر تیار ہوں۔ میں بھی کچھ دنوں سے اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کر رہا تھا۔"

"اے امیر! آپ نے ہم سب کا بوجھ ہلکا کر دیا۔"

مولانا فوراً بولے اور بات آگے بڑھائی:

"اگر آپ نے اب تک کسی ہستی کا انتخاب نہیں کیا ہے تو میں ایک خاتون کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ میرے خیال میں وہ مرحومہ الجائی خاتون آغا کی کمی کچھ نہ کچھ ضرور پوری کر سکتی ہیں۔"

تیمور گھبرا گیا۔

وہ تو پہلے سے کسی کو منتخب کر چکا تھا۔ اسے ڈر پیدا ہوا کہ مولانا کسی ایسی خاتون کا نام نہ تجویز کر دیں جس کے لیے انکار کرنا پڑے اور مولانا کی خواہ مخواہ دل آزاری ہو کیونکہ بات مولانا کے منہ سے نکل چکی تھی اس لیے اس نے احتیاطاً کہا:

"مولانائے محترم! میرے ذہن میں کچھ نام ہیں۔ آپ اپنی تجویز بتائیے۔ میں فیصلہ کرتے وقت اس نام کو بھی پیش نظر رکھوں گا۔"

مولانا نے ایک لمحہ توقف کے بعد کہا:

"آپ اپنے فیصلے میں مختار ہیں اور ہم آپ کے فیصلے کو ہر صورت قبول کریں گے۔ پھر بھی یہ میری خواہش ہے

کہ اگر آپ اس اہم منصب کے لیے سابق ملکہ دلشاد آغا کو پسند کریں تو نہایت مناسب رہے گا۔ ملکہ ایک بہادر اور سمجھدار خاتون ہیں۔ وہ ایک غمزدہ بیوہ بھی ہیں۔ اس منصب پر فائز ہونے سے وہ اپنے غم بھلا دیں گی۔ ان کی دلجوئی ہوگی اور ان سے دوسروں کی بہ نسبت زیادہ وفاداری اور جان نثاری کی امید کی جا سکتی ہے لیکن یہ میرا محض مشورہ ہے۔"

تیمور کا دل مسرتوں سے لبریز ہو گیا۔ وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکا اور فوراً بولا:

"مجھے آپ کی تجویز سے اتفاق ہے . . . . دلشاد آغا کا نام میرے ذہن میں بھی تھا۔ آپ نے تجویز کر کے مجھے بہت سی الجھنوں سے بچا لیا۔"

"اے امیر! خدا آپ کی عمر میں برکت دے۔"

مولانا نے خوش ہو کر کہا:

"دلشاد آغا یقیناً ایک بہترین ملکہ ثابت ہوں گی۔ میرا مسئلہ تو آپ نے حل کر دیا۔ اب آپ اپنی کہیے، آپ کو کس سلسلے میں مشورہ درکار ہے؟"

"میرا مسئلہ بھی آپ کے مسئلے میں شامل ہو گیا۔"

تیمور مسکرا کر کھڑا ہو گیا:

"اب کسی مزید مشورے کی ضرورت نہیں۔"

تیمور واپس چلا گیا۔ مولانا نے جو اندازہ لگایا تھا، وہ درست نکلا۔

○

ابھی رات نہ بھیگی تھی کہ دلشاد آغا کی ایک کنیز بھاگتی ہوئی باہر سے آئی اور ہانپتے ہوئے بولی:

"امیر۔ امیر تیمور تشریف لا رہے ہیں۔ آپ سے ملنے۔ ابھی۔ ابھی۔ وہ آ رہے ہیں۔"

دلشاد آغا گھبرا گئی۔ بوکھلا گئی۔

امیر اور اس کے خیمے میں؟ . . . . آخر کیوں آ رہے ہیں وہ؟

ابھی وہ اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ دوسری کنیز خیمے میں آئی اور اطلاع دی کہ امیر خیمے کے پاس آ گئے۔ دلشاد آغا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اسی وقت تیسری کنیز نے خیمے کا پردہ اٹھایا اور تیمور مسکراتا ہوا داخل ہوا۔

"کنیز ادب پیش کرتی ہے امیرِ محترم!"

دلشاد آغا نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا:

"زہے نصیب کہ امیر مجھ بدنصیب کے خیمے میں تشریف لائے لیکن کنیز یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ والیٔ تاتار نے یہاں آنے کی زحمت کیوں کی؟ مجھے طلب کیا ہوتا، میں خود حاضر ہو جاتی۔"

"دلشاد آغا! ہمیں تم سے ایک اہم مسئلے پر گفتگو کرنا ہے۔"

تیمور نے خیمے میں موجود کنیزوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا:

"مسئلے کا تقاضا تھا کہ ہم خود چل کر تمہارے پاس آئیں۔"

"تشریف رکھیے امیر"۔ دلشاد آغا نے کہا اور کنیزوں کو اشارہ کیا۔ تمام کنیزیں خیمے سے باہر چلی گئیں۔

"دلشاد آغا!"

تیمور نے بیٹھتے ہوئے کہا:

"ہم تمہاری اہمیت اور اہلیت کے ہمیشہ معترف رہے ہیں لیکن حالات پر کسی کا اختیار نہیں۔ ہم پرانی باتیں کر کے تمہارے دل کو تکلیف دینا نہیں چاہتے۔ اس کے ساتھ ہی ہماری خواہش ہے کہ تم گزشتہ زندگی کے دکھوں کو بھول کر ایک نئی زندگی کا آغاز کرو۔ ہم تمہارا جواب سننے آئے ہیں۔ اطمینان رکھو کہ تمہاری مرضی کے خلاف ہم کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے"۔

دلشاد آغا فوراً سمجھ گئی کہ تیمور کا مقصد کیا ہے؟

یہ بات اس کے لیے بڑی باعثِ مسرت تھی۔ تیمور اس کے شوہر امیر حسین کا بدل ہی نہ تھا بلکہ اس سے ہر لحاظ سے بہتر اور ارفع تھا مگر دلشاد کے دل میں ابھی کچھ شبہ تھا۔ اس نے بات صاف کرنے کے لیے کہا:

"میں امیر کی نوازشوں کی دل سے شکر گزار ہوں۔ ایک مفتوح اور مقتول کی بیوہ کے ساتھ آپ نے جو سلوک کیا اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ آپ نے تو مجھے نئی زندگی پہلے ہی عطا کر دی ہے۔ مجھے دنیا کی ہر نعمت سے سرفراز کیا ہے۔"

دلشاد آغا نے دراصل تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا تھا۔ تیمور نے اس کی وضاحت ضروری سمجھی اور پھر صاف صاف کہہ دیا۔ بولا:

"دلشاد آغا! ہم نے جو سلوک تمہارے ساتھ کیا تم اس کی حقدار تھیں لیکن یہ سب کچھ تمہارے مرتبے سے کم ہے۔ ہم تمہیں اپنے حرم میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔"

بات بالکل صاف ہو گئی تھی۔ تیمور نے دلشاد کو جواب کا موقع بھی دیا تھا۔

دلشاد ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولی:

"امیرِ محترم! اگر آپ تاتاریوں کے پرانے دستور کے مطابق مفتوح اور مقتول دشمن کی بیوی کی حیثیت سے اپنے حرم میں داخل کرنا چاہتے ہیں تو میرے جواب کی ضرورت نہیں۔ آپ آقا ہیں۔ کنیز کا فرض اپنے آقا کے حکم کی بجا آوری ہے۔ میرے لیے سوائے تعمیلِ حکم کے اور کوئی چارہ نہیں۔ نہ آپ سے شکوہ ہوگا اور نہ اپنی قسمت سے"۔

مغل اور تاتاری قبلِ اسلام مفتوح بادشاہ یا سردار کی بیوی کو زبردستی اپنے حرم میں داخل کر لیتے تھے اور یہ ایک مصدقہ دستور بن گیا تھا۔

دلشاد بہت ذہین تھی۔ وہ کنیز کی حیثیت سے تیمور کے حرم میں داخل نہیں ہونا چاہتی تھی۔ یوں بھی جہاد کے دوران یہ طریقہ اختیار کیا جاتا تھا لیکن امیر تیمور اور امیر حسین، دونوں مسلمان تھے اور اسے جہاد کا نام نہیں دیا جاسکتا تھا۔ دلشاد نے اپنی فراست سے اس نکتے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"دلشاد آغا"۔

تیمور اس سے زیادہ ذہین تھا:

"تم نے ہماری بات سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ تاتاریوں کے پرانے رسم و رواج کے اب ہم پابند نہیں۔ ہم نے اس سلسلے میں مولانا زین الدین سے گفتگو کی ہے۔ اگر تم اپنی رضامندی ظاہر کردو تو شرعی نکاح منعقد ہوگا۔ تمہارے انکار کی صورت میں ہم کوئی جبر نہیں کریں گے"۔

دلشاد آغا کا چہرہ مسرت اور شرم سے تمتما اٹھا۔

اسے جواب تو بہر حال دینا تھا۔ نظریں جھکا کر بولی:

"اس سے بڑا اعزاز میرے لیے اور کونسا ہو سکتا ہے امیرِ محترم؟"

"ہم تمہارے شکر گزار ہیں دلشاد آغا"۔

تیمور نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا:

"ہم اپنی تنہائی سے تنگ آ گئے تھے۔ تمہاری رفاقت سے ہمیں مسرت حاصل ہوگی"۔

دوسرے دن ایک بڑی ضیافت کا اہتمام ہوا جس میں چھوٹے بڑے تمام تاتاری سردار شامل تھے۔ مولانا زین الدین نے دلشاد آغا اور تیمور کا نکاح پڑھایا۔

نکاح کے بعد تیمور نے بخشش کا ایسا بازار گرم کیا کہ اہلِ بلخ حیران رہ گئے۔

دلشاد آغا رخصت ہو کر تیمور کے خیمے میں آئی تو تیمور نے اسے سرائے خانم کا خطاب دیا۔ سرائے خانم نے اپنے رویے سے تیمور کو بھی اس قدر خوش کیا کہ وہ خاتون آغا الجائی خاتون کے غم کو بڑی حد تک بھول گیا۔

خوارزم کی کلی

خوبرو شہزادہ جہانگیر شکار کا پیچھا کرتے ہوئے دریائے آمو تک پہنچ گیا۔

دریائے آمو ملکِ تاتار اور سلطنتِ خوارزم کے درمیان قدرتی سرحد تھی۔ خوارزم کا حاکم حسین تاتاری تھا اور اس کا تعلق تاتاریوں کے سب سے مضبوط قبیلہ جلائر سے تھا لیکن اب تک خود کو خانِ اعظم کا حلیف اور باجگذار سمجھتا تھا جبکہ تاتار کے امیر تیمور نے خانِ اعظم کو شکستِ فاش دے کر ملک سے نکال دیا تھا۔ اور اب ماوراءالنہر کا خود مختار حاکم تھا۔

تیمور اور حسین صوفی میں اختلاف کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی اور شہزادہ جہانگیر اسی امیر تیمور کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔

جہانگیر کا شکار نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا مگر جب دریا پار نگاہ کی تو نظر بس وہیں جم کے رہ گئی۔ اس طرف نکہت و نور کا ایک گلستاں کھلا ہوا تھا۔ دس بارہ لڑکیاں جھلملاتے کپڑوں میں گھوڑوں پر سوار تھیں۔ ان کا رخ جہانگیر کی طرف تھا اور وہ بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

ان کے چہروں کے نقش و نگار تو واضح نظر نہ آ رہے تھے لیکن وہ حسن ہی کیا جو دریا کے منجدھار کو عبور کر کے اپنی جلوہ نمائی نہ کر سکے۔

سب سے آگے والی لڑکی کے شہابی رخساروں سے پھوٹنے والی کرنیں تو جہانگیر کے دل میں اترتی محسوس ہو رہی تھیں۔ شہزادہ جہانگیر اس حسنِ بے محابہ سے کچھ ایسا سرشار ہوا کہ دریا کے بالکل کنارے آ گیا۔ یہاں تک کہ اس کے گھوڑے کے اگلے پیر پانی میں پہنچ گئے۔

لڑکیوں میں کچھ سرگوشیاں ہوئیں۔ سب سے آگے والی شوخ و شنگ حسینہ نے ساتھ کی لڑکیوں کو کوئی بات سمجھائی۔ ان میں ایک لڑکی بڑھ کے آگے آ گئی اور دریا میں گھوڑا ڈال کے تقریباً چیختی ہوئی بولی:

"وہاں کھڑے کیا دیکھ رہے ہو؟ ہمت ہے تو ادھر آ جاؤ۔"

شہزادہ جہانگیر کی شجاعت پر جیسے چوٹ پڑی۔ اس کا دل چاہا کہ گھوڑا تیرا کر اس پار چلا جائے اور ان حسیناؤں کو بتائے کہ تیمور کا بیٹا دریا کی ان حقیر موجوں سے تو کیا، ضرورت پڑے تو چٹانوں سے بھی ٹکرا سکتا ہے لیکن اس کے ساتھی جو اب اس کے قریب پہنچ چکے تھے، ان میں سے ایک گھوڑا بڑھا کر جہانگیر کے پاس آیا اور آہستہ سے کہا:

"شہزادے بہادر۔ ادھر ہرگز نہ جائیے گا۔ دشمن کا علاقہ ہے۔ خدا معلوم کیا افتاد پڑے؟"

شہزادہ تذبذب میں پڑ گیا۔

دوسری طرف سے ایک اور آواز بلند ہوئی:

"جوان ہو، اچھے ہو مگر بزدل ہو۔"

اس کے ساتھ ہی تمام لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

جہانگیر کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ چہرہ تمتما اٹھا۔ پلٹ کر اپنے ساتھی سے کہا:

"سنا تم نے؟ ہم پر طنز ہو رہا ہے۔ بزدل ہونے کا طعنہ دیا جا رہا ہے۔ یہ ناقابلِ برداشت ہے۔ ہم ادھر جا رہے ہیں۔"

"مگر شہزادے.... "

"تم یہیں انتظار کرو۔" شہزادے نے ساتھی کی بات کاٹ دی۔

گھوڑا اپنے سوار کو لے کر موجوں سے برسرِ پیکار ہو گیا۔ سوار بھی کون؟ امیر تیمور کا بیٹا شہزادہ جہانگیر — سلطنتِ تاتار کا ولی عہد۔

تیمور نے شہزادے جہانگیر کو پندرہ سال کی عمر ہی میں حرب و ضرب کے جملہ فنون میں ماہر کر دیا تھا۔ شہزادہ جری اور نڈر تھا۔ میدانِ جنگ میں شیر کی طرح جھپٹ کر حملہ کرتا اور دشمن کی صفیں الٹ کر رکھ دیتا لیکن مجلسی زندگی میں بڑا شرمیلا اور نیک مشہور تھا۔ ولی عہدِ سلطنت ہونے کی وجہ سے خاندان اور دوسرے قبیلوں کی دوشیزائیں اس کے قریب آنے کی کوشش کرتیں، تو کچھ اپنے وقار اور کچھ شرم کی وجہ سے ان سے کتراتا لیکن دریائے آمو کے اس پار حسن و جوان کے اس منظر نے اسے مسحور کر دیا اور اب تو اس کے وقار پر ضرب پڑی تھی۔ اس کا امتحان لیا جا رہا تھا۔ پھر وہ دریا پار کیوں نہ کرتا۔

گھوڑے نے اسے دم کے دم میں دوسرے کنارے پر پہنچا دیا . . . . لڑکیوں نے اسے گھیر لیا

گرد نور کا ہالہ سا بن گیا۔

"کون ہو تم ؟"

"کہاں سے آئے ہو ؟"

"ادھر کیوں دیکھ رہے تھے ؟"

"کیسے بے شرم ہو، ایک آواز پر بھاگے چلے آئے۔"

کچھ چٹکیاں، کچھ چہلیں، کچھ طنز۔ ہر لڑکی نے اپنے اپنے طور پر آوازے کسے۔ مزاج کے تیز

جہانگیر میدان کا مرد تھا۔ لڑکیوں سے وہ یونہی گھبراتا تھا لیکن اس نے سوچا کہ اس وقت شرم و لحاظ

اور خواری کے سوا کچھ اور حاصل نہ ہوگا۔

اس نے لڑکیوں کو گھور کر دیکھا۔ مذاق اڑانے والی لڑکیاں اس کی تیز نظروں کا سامنا نہ کر سکیں۔

پُرجلال چہرے نے لڑکیوں کو مرعوب کر دیا۔ وہ گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگیں۔

"ہم خود نہیں آئے۔ بلکہ بلائے گئے ہیں"۔ جہانگیر شاہانہ انداز میں بولا۔

لڑکیاں جہانگیر کے پُرجلال چہرے سے پہلے ہی مرعوب تھیں، لہجے کے وقار نے انہیں ششدر

گلے خشک اور زبانیں گنگ ہو گئیں۔ کسی کو جواب نہ سوجھا۔ سب کی نظریں جھک گئیں اور ایک خجالت سی ان

پر ابھر آئی۔

"ہمارا مقصد آپ کی توہین ہرگز نہیں"۔

جہانگیر نے فوراً اپنا لہجہ شگفتہ کر لیا:

"کچھ بولیے۔ بلبلوں کا چہچہانا کسے اچھا نہیں لگتا"۔

لڑکیوں پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ بولتا کون؟ جہانگیر نے تو ان کی زبانیں کتر کر رکھ دی تھیں۔

"تم کون ہو اجنبی ؟" یہ اس شعلہ جوالا کی آواز تھی جو سب سے الگ کھڑی جہانگیر کو بغور دیکھ

"یہی سوال آپ سے کیا جا سکتا ہے ؟"

جہانگیر نے بڑے مہذب طریقے سے بات بنائی:

"جس طرح ہم آپ کے لیے اجنبی ہیں اسی طرح آپ بھی اب تک ہمارے لیے اجنبی کی حیثیت رکھ

بات ہے کہ ہمیں اس اجنبی ماحول میں ایک اپنائیت سی محسوس ہو رہی ہے"۔

"جی ہاں۔ ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ !" اس شعلہ جوالا کے جواب دینے سے پہلے ہی لڑکیوں

یک بول اٹھی:

"آپ غیر کیسے ہوئے ! مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ چلیے ہمارے ساتھ۔ ہم آپ کو کھانا کھلائیں گے۔ آپ کو

انعام و اکرام دیں گے اور . . . . ."

"چپ رہو شریر"۔

جہانگیر کی مخاطب دوشیزہ نے بولنے والی لڑکی کو زور سے ڈانٹا:

"آدمی کو دیکھ کر بات کرتے ہیں"۔

"ٹھیک ہے شہزادی صاحبہ۔ آدمی کو تو آپ پہچانتی ہیں"۔

شہزادی کی شوخ سہیلی چہل کر بولی:

"مگر یہ خیال رہے کہ یہ صرف آدمی نہیں بلکہ دریا پار کا آدمی ہے اور اُدھر جو تاتاری قبیلہ حکمران ہے اسے آپ

طرح جانتی ہیں۔ ذرا سنبھل کے بات کیجیے"۔

جہانگیر "شہزادی" کے لفظ پر چونک اٹھا اور ادھیڑ بن میں لگ گیا تھا۔ اس نے شہزادی کی سہیلی کی گفتگو پر

ناز توجہ نہ دی۔ جب وہ خاموش ہوئی تو نہایت ادب سے پوچھا:

"آپ شہزادی ہیں۔ یعنی . . . . . " جہانگیر کہتے کہتے رکا۔

"یعنی وانی کچھ نہیں"۔

اسی سہیلی نے پھر لقمہ دیا:

"یہ واقعی شہزادی ہیں۔ اب کورنش پیش کرو۔ تعظیم بجا لاؤ شہزادی صاحبہ کی"۔

"ہم شہزادی کے حضور میں تعظیم پیش کرتے ہیں"۔

جہانگیر نے شوخ نظروں سے شہزادی کو دیکھتے ہوئے اپنے سر کو ذرا سا خم کیا:

"آپ شہزادی نہ بھی ہوتیں تو بھی ہم آپ کو کورنش پیش کرنے میں فخر محسوس کرتے"۔

"ہمارے بارے میں تمہیں معلوم ہو گیا"۔

شہزادی نے دلنواز نظروں سے جہانگیر کو دیکھا:

"تم کون ہو؟ کچھ اپنے بارے میں بھی بتاؤ"۔

"اے والی خوارزم حسین صوفی کی قابل احترام بیٹی !"

"ٹھہرو اجنبی! تم کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا"۔

شہزادی نے اپنا دست حنائی اٹھا کر جہانگیر کو روکا:

"والیِ خوارزم حسین صوفی ہمارے تایا جان ہیں۔ ہمارے والد کا نام آق صوفی ہے۔"

"ایک ہی بات ہے شہزادی صاحبہ۔"

سہیلی نے دخل دیا:

"آپ اجنبی کو کیوں الجھا رہی ہیں۔"

پھر اس نے جہانگیر سے کہا:

"سنو دریا پار کے اجنبی! میں تمہیں بتاتی ہوں۔ یہ شہزادی سویتہ بیگ ہیں لیکن پورے خوارزم میں عرفیت "شہزادی خان زادہ" کے نام سے مشہور ہیں۔ ہیں تو یہ آق صوفی کی بیٹی لیکن ان کے تایا شاہِ خوارزم اور دوسرے تایا یوسف صوفی کے کوئی اولاد نہیں۔ اس لیے یہ تینوں بھائیوں کی بیٹی اور سلطنتِ خوارزم کی ولی عہد ہیں۔"

"ایک اجنبی سے یہ تفصیل بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" شہزادی خانزادہ بظاہر چڑ کر بولی۔

سہیلی بھلا کب خاموش رہنے والی تھی۔ فوراً چہک کر کہا:

"شہزادی صاحبہ! جس اجنبی کو دریا پار سے بلا کر ایسی گھاوٹ سے گفتگو کی جائے وہ اجنبی نہیں رہتا۔"

شہزادی اس برجستہ جواب پر سٹپٹا گئی۔ حیا کی سرخی اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔ اس نے کم سہیلی کو ڈانٹا:

"بس اب خاموش ہو جاؤ۔ دوسرے کی گفتگو میں دخل نہیں دیا کرتے۔"

"ہمیں اپنا تعارف کرانے میں کوئی عذر نہیں۔"

جہانگیر مسکرایا:

"لیکن ہمیں ڈر ہے کہ......"

"نہ نہ۔ ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں اجنبی۔"

پہلی سہیلی تو ڈانٹ کھا کر خاموش ہو گئی لیکن فوراً ہی اس کی جگہ دوسری سہیلی نے لے لی۔ اٹھلا کر بولی:

"ماشاءاللہ۔ چھ فٹ کے لمبے چوڑے، خوبصورت، میرا مطلب ہے اچھے خاصے قوی ہیکل جوان۔ ڈر کا لفظ زبان سے سن کر ہمیں شرم آنے لگی ہے۔"

"ہمیں اپنی جان کی کوئی فکر نہیں خاتون!"

شہزادے نے متانت سے کہا: "کاندھے پر کمان اور کمر میں تلوار لٹکانے والے اپنی حفاظت کرنا خوب جانتے

ہیں۔ خوف صرف اس بات کا ہے کہ اپنا تعارف کرانے کے بعد کہیں ہم آپ کی اس دلچسپ گفت گو سے محروم نہ ہو جائیں۔ آپ کی نظریں نہ بدل جائیں۔"

"باتیں تمہاری بھی دلچسپ ہیں اجنبی۔"

شہزادی خانزادہ تبسم بکھیرتے ہوئے بولی:

"تم خواہ کوئی بھی ہو اب ہمارے مہمان ہو اور ہمارا جلائر قبیلہ مہمان نوازی میں اپنی مثال آپ ہے۔ اگر دشمن بھی ہمارے قبیلے میں مہمان بن کر آ جائے تو ہم اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں اور وہ ہماری نوازشوں کا اعتراف کرتے ہوئے جاتا ہے۔"

شہزادہ جہانگیر ابھی تک خود کو تعارف کرانے پر آمادہ نہ کر سکا تھا۔ اسے بار بار اپنے اس ساتھی کے الفاظ یاد آ رہے تھے جس نے کہا تھا کہ دریا پار دشمنوں کا علاقہ ہے۔ خدا معلوم کیا افتاد پڑے۔ شہزادی کی من موہنی باتوں نے اسے کچھ اطمینان دلایا تھا لیکن یہ حکومت کے جھگڑے تھے۔ شاہِ خوارزم نے اب تک امیر تیمور کی برتری تسلیم نہ کی تھی اور ایک اطلاع کے مطابق وہ جنگ کی تیاریاں کر رہا تھا۔ امیر تیمور نے اس بات کی ٹوہ لگانے کے لیے شہزادہ جہانگیر کو ایک لشکر کے ساتھ اس طرف بھیجا تھا۔

شہزادی کو اس کے جواب کا بے چینی سے انتظار تھا۔ اجنبی کے باوقار لہجے اور رعب دار اندازِ گفتگو سے اس نے یہ تو اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ کوئی غیر معمولی جوان ہے جو شجاع اور بہادر ہونے کے باوجود بڑی احتیاط سے گفتگو کر رہا ہے۔

شہزادی کو اس کی شخصیت کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو گیا تھا لیکن اس کی سہیلیاں اس خاموشی سے اکتا گئی تھیں۔ ان سے ضبط نہ ہو سکا اور ایک بول پڑی:

"اجنبی! اس خاموشی سے تمہاری شخصیت میں کوئی اضافہ نہ ہو گا۔ تم جو ہو وہی رہو گے۔ شہزادی نے تمہیں گفتگو کا شرف بخشا ہے اس لیے اگر تم غریب آدمی بھی ہو تو اس عزت افزائی سے تمہارے مرتبے میں اضافہ ہو گیا ہے۔ تمہیں اس بات کا خیال ہونا چاہیے کہ تم اس وقت سلطنتِ خوارزم کی ولی عہد کے حضور میں ہو اور ان کا جواب نہ دینا ان کی توہین ہے۔"

"قابلِ احترام شہزادی خانزادہ!"

شہزادے نے سنبھل کر کہا:

"ہم چاہتے تھے کہ اس دوستانہ گفتگو کو طول دے کر اپنی زندگی کے یادگار اور مسرت آگیں لمحات میں شامل کر لیں لیکن آپ اور آپ کی سہیلیاں ان لمحوں کو افسوس اور افسردگی میں بدلنے پر بضد ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ شہزادی

ہونے کے بجائے اس خوش گوار ملاقات کو ایک رنگین اور حسین خواب سمجھ کر بھول جائیں اور اپنی سہیلیوں کو تاکید کریں کہ وہ اس کا ذکر کسی سے نہ کریں۔"

ذرا رک کر اس نے پھر کہا:

"ہماری اس ملاقات کا حال اگر خوارزم شاہ کو معلوم ہو گیا تو آپ کو شاید ان کے سامنے شرمندگی اٹھانی پڑے کیونکہ آپ جس اجنبی سے مخاطب ہیں وہ امیر تیمور گورگان والیٔ ملکِ تاتار کا بیٹا جہانگیر ہے جسے خوارزم کے لوگ دشمنی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔"

"شہزادہ جہانگیر۔ تختِ سمرقند کا وارث؟"

شہزادی خانزادہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اسے گھبراہٹ سے پسینہ آ گیا۔

شہزادی کی سہیلیوں کا برا حال تھا۔ وہ شرمندہ ہی نہیں خوفزدہ بھی تھیں۔ انہوں نے شہزادہ جہانگیر کو ایک عام آدمی سمجھ کر نہایت بے تکلفی سے گفتگو کی تھی۔ اس پر طنز و مزاح کے تیر پھینک کر اس کی توہین کی تھی۔ وہ اپنے علاقے میں تھیں لیکن امیر تیمور نے جب سے اپنے سالے امیر حسین کو شکست دے کر سمرقند کی حکومت حاصل کی تھی، دور و نزدیک کے تمام امیر اور والی لرز اٹھے تھے یہاں تک کہ آزاد وحشی قبائل نے بھی امیر تیمور کی اطاعت اور بالادستی تسلیم کر لی تھی۔ سہیلیوں نے اس جلیل القدر امیر کے ولی عہد کا مضحکہ اڑایا تھا۔ ان کا خوف اپنی جگہ بجا تھا۔

"اے خوارزم کی پری پیکر شہزادی!"

جہانگیر نے مسکراتے ہوئے اسے چھیڑا:

"ہم نہ کہتے تھے کہ تعارف ہوتے ہی آپ کی نظریں بدل جائیں گی اور ابتدا کے یہ لمحات مختصر ہو جائیں گے۔ خیر اب ہمیں اجازت دیجیے لیکن یہ یاد رکھیے کہ اس ملاقات کو ہم زندگی بھر نہ بھلا سکیں گے اور آپ سے دوبارہ ملنے کی آرزو ہمیں بے چین رکھے گی"۔

شہزادہ جہانگیر نے اپنے گھوڑے کا رخ دریا کی طرف کر لیا لیکن اس کی نظریں اب تک شہزادی خانزادہ کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

"ٹھہریے شہزادے!"

شہزادی جیسے خواب سے چونک پڑی:

"آپ اس طرح واپس چلے گئے اور خوارزم والوں کو معلوم ہوا کہ سمرقند کا شہزادہ ہماری سرزمین پر آیا تھا اور ہم نے اس کی مہمان نوازی میں کوتاہی کی تو وہ ہمیں کیا کہیں گے۔ ہم ان کی نظروں میں کس قدر حقیر ہو جائیں گے۔ حکومتوں کے جھگڑے الگ چیز ہیں لیکن ہم اپنے قبیلے کی قدیم روایات سے تو منہ نہیں موڑ سکتے۔ آپ ہمارے مہمان ہیں اور مہمان نوازی کے فرائض ادا کیے بغیر ہم آپ کو نہیں جانے دیں گے۔ ہم شہزادہ جہانگیر سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اپنی مہمان نوازی کا شرف عطا کریں۔ ہم ان کے شکر گزار ہوں گے۔"

شہزادی خانزادہ نے کچھ ایسی ادا سے درخواست کی کہ شہزادہ جہانگیر کا جوان دل سینے میں دھڑک اٹھا۔ حسن سوال بن کر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ عشق شوریدہ سر بے خوف ہو کر جاں نثاری پر آمادہ ہو گیا۔ شہزادے نے عقل کے تازیانے سے منہ موڑتے ہوئے جذبات انگیز لہجے میں کہا:

"شہزادی حکم دیں۔ جہانگیر سر دینے سے بھی انکار نہ کرے گا۔"

شہزادی ایک نامعلوم کیفیت سے جھوم اٹھی اور بولی:

"اگر شہزادے ہماری لشکر گاہ میں چل کر گھڑی دو گھڑی کی مہمانداری کا فخر عطا کریں تو عین نوازش اور احسان ہو گا۔"

شہزادہ جہانگیر تو تن من دھن نچھاور کرنے پر آمادہ ہو چکا تھا۔ مسرت کے کچھ اور لمحات کے حصول کے تصور سے اس کا چہرہ دمک اٹھا تھا۔

ابھی وہ تعمیلِ حکم کے اقرار کے لیے الفاظ تلاش کر رہا تھا کہ دور گرد کا ایک بادل سا اٹھتا ہوا دکھائی دیا جہانگیر کے گھوڑے نے کان کھڑے کر لیے۔ خود شہزادے کو بھی خطرے کا احساس ہوا اور اس نے بڑی سرعت سے کمان کاندھے سے اتار لی۔

دریا کے دوسری طرف جہانگیر کے پانچوں سوار اس کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے لیکن جب ان کی نظر اٹھتی گرد پر پڑی تو انہوں نے شہزادے کے حکم سے بے پروا ہو کر گھوڑے دریا میں ڈال دیے اور بہت جلد دریا پار اتر کر شہزادے کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے کچھ کہے بغیر شہزادے کو اپنے حلقے میں لے لیا اور کمانوں میں تیر جوڑ لیے۔

گرد چھٹی تو چالیس پچاس سوار تیزی سے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ سب کی نظریں ادھر لگی ہوئی تھیں۔ شہزادی اور اس کی سہیلیاں بھی پریشان تھیں۔

جب سوار قریب آئے تو شہزادی کے چہرے پر فکر کی بجائے مسرت دوڑ گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے جہانگیر سے کہا:

"شہزادے! فکر کی کوئی بات نہیں۔ ہمارے بابا آق صوفی تشریف لا رہے ہیں۔ آپ بالکل مطمئن رہیں۔ آپ تمام لوگوں کی حفاظت کے ہم ذمے دار ہیں۔ جب تک ہم زندہ ہیں آپ لوگوں کی طرف کوئی انگلی تک نہیں اٹھا سکتا۔"

شہزادے جہانگیر کو پتہ نہیں کیوں شہزادی کی بات کا اعتبار آ گیا۔ اس نے کمان کاندھے پر ڈال احتیاط کے طور پر شمشیر کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر آنے والوں کو دیکھنے لگا۔

سواران کے پاس پہنچ گئے۔ ادھیڑ عمر آق صوفی شہزادی کے قریب گھوڑا لاتے ہوئے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بولا:

"بیٹی! تم نے تو پریشان کر دیا۔ ہم تو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے۔"

پھر اس نے جہانگیر اور اس کے ساتھیوں پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے کہا:

"یہ لوگ کون ہیں؟ کیا چاہتے ہیں؟"

"محترم آق صوفی کی خدمت میں ہم سلامِ نیاز پیش کرتے ہیں۔" شہزادے جہانگیر نے باوقار گفتگو کا آغاز کیا۔

آق صوفی نے تیز نظروں سے جہانگیر کو دیکھا، پھر سر گھما کر نظروں ہی نظروں میں شہزادی سے سوال کیا جس کا چہرہ گلنار بنا ہوا تھا۔ اس نے ادب سے کہا:

"آق بابا! ان کا سلام قبول کیجیے۔ یہ ہمارے معزز مہمان، سمرقند کے امیر تیمور کے ولی عہد جہانگیر ہیں!"

"شہزادہ جہانگیر؟" آق صوفی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

آق صوفی فوراً گھوڑے سے اتر پڑا۔ وہ آہستہ آہستہ جہانگیر کے گھوڑے کے پاس گیا اور باگ پر ہاتھ رکھ کر بڑے ادب سے بولا:

"خوش نصیب کہ شہزادے یہاں تشریف لائے۔ میں امیر تیمور کے بہادر ولی عہد کو سرزمینِ خوارزم میں خوش آمدید کہتا ہوں اور تشریف آوری پر شکر گزار ہوں۔"

"محترم آق بابا!"

شہزادے نے شہزادی خانزادہ کے الفاظ دہرائے:

"ہمارا خیال تھا کہ آپ ہمیں اپنی سرزمین پر دیکھ کر ناراضگی کا اظہار کریں گے لیکن آپ نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ کے دل میں بابا تیمور کی طرف سے کوئی کدورت نہیں۔"

"بالکل نہیں شہزادے!"

آق صوفی فوراً بولا:

"ہم تو امیر تیمور کو قابلِ احترام سمجھتے ہیں۔ انہوں نے تاتاریوں کو مغلوں کی غلامی سے نجات دلائی ہے۔"

"پھر یہ دوری اور دشمنی کیوں؟"

شہزادے نے جیسے خود سے سوال کیا:

"آپ لشکر کے ساتھ دریا کے اس پار خیمہ زن ہیں اور دوسری طرف ہمارا لشکر موجود ہے۔"

شہزادے نے انکھیوں سے شہزادی کو دیکھتے ہوئے کہا:

"کیا یہ دونوں لشکر شیر و شکر نہیں ہو سکتے۔ کیا ہم ایک دوسرے کے گلے نہیں لگ سکتے؟"

"ہر چیز ممکن ہے شہزادے!"

آق صوفی نے جواب دیا:

"لیکن مسئلہ ہماری اور آپ کی حد تک نہیں۔ اگر شاہِ خوارزم اور امیر تیمور کے درمیان غلط فہمیاں دور ہو جائیں تو کیا نہیں ہو سکتا!"

"غلط فہمی تو کوئی مسئلہ نہیں ہے آق بابا!"

جہانگیر نے وضاحت کی:

"بابا تیمور کو شاہِ خوارزم سے یہ شکوہ ہے کہ انہوں نے اب تک مبارک باد کا پیغام نہیں بھیجا وہ تو تمام تاتاریوں کی ایک عظیم الشان حکومت کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں۔۔۔۔ شاہِ خوارزم ہی شاید وہ واحد حکمران ہیں جنہوں نے اب تک کوئی قدم نہیں اٹھایا جبکہ تمام تاتاری امیر ان کے جھنڈے تلے اکٹھے ہونے کو تیار ہیں۔"

"شہزادے بہادر۔"

آق صوفی نے ذرا توقف سے کہا:

"جہاں تک مجھے علم ہے شاہِ خوارزم نے مبارک باد کی سفارت بھیجنے کا ارادہ کیا تھا لیکن انہیں یہ شبہ ہے کہ کہیں ان کی سفارت کو امیر تیمور ذلیل نہ کرے۔ اس خیال کے تحت وہ اپنا ارادہ اب تک ملتوی کرتے چلے آ رہے ہیں۔"

"آق بابا!"

شہزادہ جہانگیر نے بڑے جذبے سے کہا:

"کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک ذرا سی غلط فہمی کی بنا پر تاتاریوں کے دو لشکر ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہیں۔ ہم آپ سے التماس کرتے ہیں کہ آپ شاہِ خوارزم کی غلط فہمی دور کریں اور انہیں سفارت بھیجنے پر آمادہ کریں۔ ہم دو دن بعد سمرقند جا رہے ہیں۔ ہماری موجودگی میں شاہِ خوارزم کی سفارت پہنچ گئی تو آپ دیکھیں گے کہ اس کی کتنی شاندار پذیرائی ہوتی ہے!"

"میں آپ کے خیال سے متفق ہوں شہزادے۔"

آق صوفی نے بڑی صاف دلی سے کہا:

"میں ایک قاصد کے ذریعے آپ کے خیالات سے شاہِ خوارزم کو آگاہ کروں گا اور ان سے درخواست کروں گا کہ وہ بلا تاخیر امیر تیمور کے دربار میں مبارکباد کا پیغام بھیجیں۔"

"آپ اس سلسلے میں پوری کوشش کریں۔"

شہزادہ رکا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا:

"محترم آق بابا آپ ہماری اس اتفاقیہ ملاقات کی خبر شاہِ خوارزم کو نہ ہونے دیں ورنہ ممکن ہے کہ غلط فہمی پیدا ہو جائے اور بنتی ہوئی بات بگڑ جائے۔ آپ انہیں کچھ ذرا الفاظ میں مشورہ دیجیے۔"

"میں شہزادے کی دور اندیشی کی داد دیتا ہوں۔"

آق صوفی خوش ہو کر بولا:

"میں آپ کو خوارزم کے علاقے میں دیکھ کر آپ کی بہادری کا قائل ہوا تھا لیکن اس ملاقات کو راز رکھنے کا جو مشورہ آپ نے دیا ہے یہ آپ کی فراست اور عقلمندی کی دلیل ہے۔"

شہزادے جہانگیر نے خانزادہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"شہزادی نے ہمیں اپنی لشکرگاہ میں چلنے کی دعوت دی تھی۔ اب آپ سے یہیں ملاقات ہو گئی ہم دعوت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے کسی اور وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ آپ ہمیں واپسی کی اجازت دیں خود بھی اس ملاقات کا کسی سے ذکر نہیں کرنا چاہیے۔ آپ بھی شہزادی اور دوسرے لوگوں کو رازدار [illegible] کر دیجیے۔"

شہزادہ مسکرایا۔ اس نے شہزادی اور اس کی سہیلیوں پر نظر ڈالی اور خدا حافظ کہہ کر گھوڑا [illegible] موڑ دیا۔

شہزادی کھوئی کھوئی نظروں سے شہزادے کو اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ دریا کے [illegible] نہیں پہنچ گیا۔

دوسری طرف پہنچ کے شہزادے نے ہاتھ ہلا کر الوداع کہا اور گھوڑا دوڑاتا ہوا اپنے ساتھیوں کے [illegible] شہزادی کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ شہزادی کا چہرہ اتر گیا۔

امیر تیمور گورگان ۱۳۳۶ء میں ملک تاتار کے ایک چھوٹے سے شہر، شہر سبز میں پیدا ہوا۔ وہ ایک معمولی سردار کا بیٹا تھا لیکن قدرت نے اسے جو صلاحیتیں بخشی تھیں انہیں بروئے کار لاتے ہوئے امیر تیمور نے ۲۵ سال کی عمر میں نہ صرف اپنے ملک کو چغتائی مغلوں کے قبضے سے آزاد کرا لیا بلکہ تاتاریوں کی ایک مضبوط حکومت کی بنیاد رکھ دی تھی۔

مغلوں کے بعد اسے اپنے عزیزوں سے جنگ کرنا پڑی اور ایک طویل خانہ جنگی کے بعد اس نے تاتار کے مختلف قبائل کو اپنے زیر نگیں کر لیا لیکن اب بھی بعض خود سر قبیلے تھے جو امیر تیمور کو تاتار کا حاکم اعلیٰ سمجھنے کے بجائے اپنے رشتے چغتائی مغلوں سے جوڑے ہوئے تھے۔ ان تاتاریوں میں سب سے بڑا قبیلہ جلائر سرفہرست تھا اور ان کے سردار حسین صوفی حاکم خوارزم نے امیر تیمور کی حاکمیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اس کی خواہش تھی کہ اسے خوارزم کا آزاد حکمران تسلیم کیا جائے۔ اسی وجہ سے اس نے اب تک امیر تیمور کو مبارک باد کا پیغام نہیں بھیجا تھا۔

امیر تیمور اب مزید کسی خانہ جنگی میں نہیں الجھنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ حسین صوفی بات چیت اور صلح صفائی سے راہِ راست پر آ جائے گا اور اسے خوارزم پر فوج کشی نہ کرنی پڑے گی۔

پھر اسے معلوم ہوا کہ حسین صوفی نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دی ہیں اور ایک لشکر اپنے چھوٹے بھائی آق صوفی کی سرکردگی میں دریائے آمو کے اس پار امیر تیمور کی سرحد کے قریب بھیج دیا ہے۔

یہ اطلاع ملتے ہی امیر تیمور نے شہزادہ جہانگیر کے ساتھ ایک فوج جنوب کی طرف بھیجی تاکہ اگر خوارزمی لشکر دریا پار کرنے کی کوشش کرے تو اسے روکا جائے۔ اس کے ساتھ ہی تیمور نے شہزادے کو تاکید کر دی کہ وہ خود جنگ میں پہل نہ کرے اور جہاں تک ہو سکے آق صوفی سے نہ الجھے۔

شہزادہ جہانگیر گزشتہ کئی ماہ سے دریائے آمو کے قریب پڑاؤ ڈالے پڑا تھا۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ شہزادہ شکار کا پیچھا کرتے ہوئے کنارِ دریا پہنچا اور آق صوفی کی حسین و جمیل بیٹی خانزادہ کا خود شکار ہو گیا۔

شہزادہ اس حادثے سے دوچار ہو کر اپنے پڑاؤ پر آیا اور سمرقند جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اسے امیر تیمور نے کسی ضرورت سے فوری طور پر سمرقند طلب کیا تھا۔

شہزادہ جہانگیر کو سمرقند جانے کی خوشی اس وجہ سے زیادہ تھی کہ وہ چاہتا تھا کہ خوارزم کی سفارت کے آنے پر وہ باپ کے دربار میں موجود ہو اور کوشش کرے کہ دونوں قبیلوں میں جنگ کے بجائے کوئی باعزت سمجھوتہ ہو جائے کیونکہ اسی صورت میں خانزادہ سے ملاقات کی کوئی صورت نکل سکتی تھی۔

شہزادہ جہانگیر کو سمرقند آئے ہوئے تین ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن خوارزم کی سفارت کا کوئی پتہ نہ

تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ آق صوفی یا تو اپنا وعدہ بھول گیا ہے یا اس کے بھائی حسین صوفی والی خوارزم نے
بھیجنے سے انکار کر دیا ہے۔

ایک غضب یہ اور ہوا تھا کہ امیر تیمور نے شہزادہ جہانگیر کو سمرقند میں روک لیا تھا اور اس کو
دریائے آمو کی کمان سپرد کر دی تھی۔ اس طرح شہزادہ جہانگیر کے لیے شہزادی خانزادہ سے ملاقات
بعید ہو گیا تھا۔

○

دن گزر رہے تھے اور جہانگیر کے دل میں خانزادہ کی محبت کی چنگاری آہستہ آہستہ شعلے کی شکل
تھی۔ وہ سست اور کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ امیر تیمور کو جہانگیر سے بے پناہ محبت تھی۔ جہا
کے دل میں اٹھنے والے طوفان کی غمازی کر رہا تھا لیکن اس کے دل میں کون جھانکتا۔ اس کی افسردگی
جسمانی بیماری سمجھا جا رہا تھا اور امیر تیمور کے حکم سے شہر کے تمام بڑے بڑے طبیب جہانگیر کے علاج
لیکن وہ سر توڑ کوشش کرنے کے باوجود اب تک مرض کی تشخیص کرنے سے قاصر تھے۔ انہوں نے شہزاد
والے تمام امکانی مرضوں کی دوا دی لیکن اسے کوئی فائدہ نہ ہوا بلکہ مرض روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ ان
کہ مرض عشق کا علاج دواؤں سے نہیں ہوا کرتا۔

شہزادہ جہانگیر فطرتاً کم گو اور شرمیلا تھا۔ سوائے میدانِ جنگ کے وہ ذاتی معاملات میں ہر وقت
میں چپ رہتا تھا، پھر بھلا وہ کیسے کہتا کہ اس مرض کا علاج سوائے شربتِ دیدار کے اور کوئی نہیں۔ وہ اند
گھلتا چلا جا رہا تھا مگر زبان پر تالے لگا رکھے تھے۔ اپنے سے زیادہ اسے خانزادہ کی بدنامی کا خیال تھا۔
آق صوفی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی ملاقات کا ذکر کسی سے نہیں کرے گا۔

شہزادے نے ساتھ کے پانچ سواروں پر کھلے الفاظ میں یہ واضح کر دیا تھا کہ اگر خانزادہ
ذکر کسی کی زبان پر آیا تو اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔

یہ حکم صرف شہزادہ جہانگیر کا نہیں بلکہ ولی عہد سلطنت کا تھا جس نے تیمور کے بعد اس عظیم سل
سنبھالنی تھی۔ پھر کوئی اس کی دشمنی کیوں مول لیتا۔ سواروں نے تو دریائے آمو کا نام لینا بھی ترک کر
شہزادہ جہانگیر کی بیماری نے امیر تیمور کو سخت پریشان کر دیا تھا۔ اس کے مزاج میں چڑچڑا

ارباب طبیبوں پر برستا جنہوں نے اب تک اس کے مرض کو معلوم نہ کیا تھا۔

جہانگیر کی سوتیلی ماں سرائے ملک خانم جو اس کی سگی ماں بھی تھی۔ ہر دم شہزادے کی پٹی سے لگی بیٹھی رہتی تھی اسے
بے بڑا پیار تھا لیکن ممتا کی تیمار داری اور خدمت بھی جہانگیر کے مرض میں کمی نہ کر سکی۔

امیر تیمور نے شہر سبز سے مولانا زین الدین اور اس دور کے تمام بزرگوں کو سمرقند بلا لیا۔ ایک طرف طبیب،
میں مصروف تھے دوسری طرف شب بیداری ہوتی۔ قرآن ختم کیے جاتے اور شہزادے کی تندرستی کی دعا مانگی جاتی۔
یہ مرض اوپر سے تو نہیں آیا تھا۔ شہزادے نے خود یہ مرض خریدا تھا۔ اس کا علاج تو صرف اسی صورت میں
تا جب شہزادہ اپنی زبان پر پڑے ہوئے تالوں کو کھولتا اور کچھ بتاتا مگر شہزادے نے قسم کھا رکھی تھی کہ
دنی گھٹ گھٹ کر مر جائے گا لیکن ایک با حیا لڑکی کو بدنام کرنے کی کوشش نہ کرے گا۔

امیر تیمور نے پورے ملک میں اعلان کرا دیا کہ جو شہزادے کو اس مرض سے نجات دلائے گا اسے منہ مانگا
دیا جائے گا۔

اس اعلان کی وجہ سے تمام طالع آزما اور لالچی طبیب سمرقند میں اکٹھے ہو گئے اور اپنی قابلیت کے جوہر
نے لگے لیکن کوئی بھی کامیاب نہ ہو سکا۔

تیمور کا دل دنیا سے اس درجہ مکدر ہوا کہ اس نے دربار میں آنا چھوڑ دیا۔ وہ اپنے عالی شان محل میں جسے اس
ہی دن بیشتر تعمیر کرایا تھا اکیلا پڑا رہتا اور جہانگیر کی شفا کی دعائیں مانگتا رہتا۔ اس کے سردار اپنی جگہ
تھے۔ انہیں یہ فکر لاحق تھی کہ اگر امیر تیمور امور سلطنت سے اسی طرح بیگانگی برتتا رہا تو اس نئی نئی
ت کو گھن لگ جائے گا اور دشمنوں کو پھر سر اٹھانے کا موقع مل جائے گا۔

عام تاتاری بھی اس صورت حال سے فکر مند تھے۔ ملک کے کونے کونے میں شہزادے کی بیماری کا چرچا
ہر جگہ اس کی سلامتی اور تندرستی کے لیے دعائیں مانگی جا رہی تھیں

سمرقند کے مضافات میں طبیب نام کے ایک گوشہ نشین حکیم رہتے تھے۔ نہایت دیندار اور پرہیزگار
ات میں لوگوں کا مفت علاج کیا کرتے تھے۔ اللہ نے ان کے ہاتھ میں شفا دی تھی۔ قرب و جوار کے لوگوں
پر بڑا اعتقاد تھا۔

ایک روز ان کے مطب میں شہزادے کی بیماری کا ذکر چھڑ گیا۔ حکیم صاحب خاموشی سے سب کی باتیں سنتے رہے
نے ان کے دل میں کیا آئی کہ وہ کسی سے کہے بغیر ایک دن سمرقند روانہ ہو گئے۔ سمرقند میں ان کا کوئی
سا نہ تھا اس لیے وہ سیدھے امیر تیمور کے دربار میں پہنچ گئے۔

دربار میں سب معمول سردار اور امیر روزانہ جمع ہوتے اور شام تک امیر تیمور کا انتظار کر کے واپس چلے

چلے جاتے تھے۔

حکیم طبیب سادہ لباس میں تھے اور صورت شکل بھی ایسی نہ تھی کہ لوگ ان کی طرف توجہ کر
دربان سے گفتگو کی اور پُر اعتماد لہجے میں کہا کہ وہ شہزادے کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔

دربان ان کی پُر اعتماد دلی سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے بھاگ کر امیر کے سرداروں کو خبر د
دربان کے ساتھ حکیم صاحب کے پاس آیا۔ حکیم موصوف نے موٹدارلات کو یقین دلایا کہ اگر ا
نبض دیکھنے کا موقع دیا جائے تو اسے اللہ کی ذات سے امید ہے کہ وہ شہزادے کا خاطر خواہ علاج

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ موٹدارلات کو ڈھارس ہوئی تو اس نے فوراً شہزادے کی
گیا۔ امیر تیمور کو بھی اطلاع دی گئی ایک حکیم بڑے اعتماد کے ساتھ شہزادے کا علاج کر
لیکن امیر نے کوئی توجہ نہ دی کیونکہ شہزادے کے علاج کے لیے آنے والا ہر حکیم اسی طرح
کرتا تھا۔

حکیم طبیب کو شہزادے کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ سردار موٹدلات ان کے ساتھ تھا۔
کیے پڑا تھا۔ اس کا چہرہ پژمردہ اور رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

حکیم صاحب کچھ دیر تک شہزادے کا چہرہ غور سے دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے اس کی نب
پر ہاتھ رکھتے ہی وہ چونک پڑے۔ اور سردار موٹدارلات کا ہاتھ پکڑ کر اسے دوسرے کمرے میں لے
میں نے شہزادے کا مرض معلوم کر لیا ہے۔" دوسرے کمرے میں پہنچ کر حکیم صاحب نے
وثوق کے ساتھ سردار ارلات کو بتایا۔

"یعنی۔ یعنی آپ جانتے ہیں کہ شہزادے کو کیا بیماری ہے؟" موٹدارلات نے بے یقینی
برتتے ہوئے پوچھا۔

"سردار۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن مجھے اپنی تشخیص پر اعتماد ہے۔"

حکیم صاحب بے جھجک بولے:

"اور یہ مرض ایسا نہیں کہ اس کا علاج نہ ہو سکے۔"

"بڑی حیرت کی بات ہے۔ شہر کے بڑے بڑے طبیب شہزادے کا مرض معلوم نہ کر سکے
سردار ارلات کو حکیم کی بات کا اعتبار نہ آ رہا تھا کیونکہ ان کے چہرے مہرے میں کوا
تھی جس سے سردار موٹدارلات متاثر ہوتا۔ پھر وہ اس کے اتنے بڑے دعوے پر کیسے یقین کر
"قبلہ حکیم صاحب! ذرا یہ تو فرمائیے کہ شہزادے کو وہ کون سا مرض لاحق ہوا ہے جسے

بڑے حکیم نہیں کر سکے اور آپ نے نبض پر ہاتھ رکھتے ہی معلوم کر لیا؟" موٹدارلات کا لہجہ بڑا طنزیہ
تھا۔

حکیم کو یہ انداز بہت شاق گزرا۔ انہیں غصہ آ گیا اور جھلا کر بولے:
"سردار۔ شمشیر زنی اور تیر اندازی کا فن نہیں یہ حکمت ہے۔ نبض حکمت کی بنیاد ہے۔ جو شخص نبض کی مختلف
اور اس کے زیر و بم سے واقف نہیں وہ حکمت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں تو میں جا رہا
رہا یاد رہے کہ شہزادے کو جس چیز کی خواہش ہے اگر وہ اسے مہیا نہ کی گئی تو وہ یونہی گھل گھل کر مر
گا!"

سردار موٹد گھبرا گیا۔ نرمی سے پوچھا:
"محترم! مجھے آپ کی توہین اور دل آزاری مقصود نہیں۔ میں تو صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ شہزادے کو مرض
ہے اور آپ کے خیال میں اس کا علاج کس طرح ممکن ہے؟"
"سردار۔"

حکیم صاحب بھی نرم پڑ گئے:
"یہ بات مجھے امیر تیمور کو بتانا چاہیے تھی لیکن آپ مجبور کر رہے ہیں تو بتا دیتا ہوں کہ شہزادہ کسی جسمانی
مرض کے بجائے "محبت" کے مرض میں گرفتار ہے۔"
"یہ بڑا ہی جھوٹ اور بہتان ہے۔"

سردار موٹد بگڑ اٹھا:
"شہزادہ جہانگیر بے انتہا کم گو اور شرمیلا ہے۔ وہ تو دوستوں کی محفل میں بھی نظریں نیچی کر کے بیٹھتا ہے
بھلا عشق میں وہ کیسے پھنس سکتا ہے؟"
"سردار۔ آپ نے میری بات کی تصدیق کر دی۔"

حکیم صاحب مسکرائے:
"شہزادہ اگر کم گو اور شرمیلا نہ ہوتا تو اب تک اپنا حال دل کھول کر بیان کر چکا ہوتا۔ اب مجھے پورا یقین ہے
تشخیص صحیح اور درست ہے۔"

سردار موٹدارلات سوچ میں پڑ گیا۔ حکیم نے جس مستقل مزاجی سے گفتگو کی تھی اس نے سردار موٹد کو فکر میں
ڈال دیا تھا۔ سردار نے کہا:
"حکیم صاحب! میں آپ کی بات رد نہیں کرتا لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ اگر آپ کی تشخیص غلط ثابت ہوئی تو امیر تیمور

آپ کو زندہ نہ چھوڑیں گے۔

"سردار۔ آپ بھی ایک بات ذہن نشین کر لیں۔"

حکیم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا:

"مجھے نہ تو انعام و اکرام کی پرواہ ہے اور نہ میں موت سے ڈرتا ہوں۔ میں تو شہزادے کا علا
کرنا چاہتا ہوں کہ امیر تیمور اس فکر سے آزاد ہو کر اپنی سلطنت کے کام میں مصروف ہو جائیں۔"

"حکیم صاحب!"

مونڈ لرات کو کچھ کچھ اس کی باتوں کا یقین ہو چلا تھا:

"فرض کیجیے کہ شہزادے کو کسی سے محبت ہو گئی ہے تو کیا وہ اس بات کا اقبال کرے گا۔
اس نے اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔"

"یہی بات مجھے بھی پریشان کر رہی ہے۔"

حکیم صاحب نے اعتراف کیا:

"لیکن جب میں نے مرض معلوم کیا ہے تو اس کا علاج بھی کروں گا۔ میں جانتا ہوں کہ شہزا
سے زبان نہیں کھولے گا لیکن انسان کی بے زبانی میں بھی ایک طرح کی زبان ہوتی ہے۔ میں اس را
پہنچنے کی کوشش کروں گا۔"

"کیا ایسا ممکن ہے؟" سردار مونڈ نے بے چینی سے پوچھا۔

"ممکن بھی ہے اور مجھے اپنی کامیابی کی امید بھی ہے۔" حکیم طیب میں بلا کا اعتماد تھا اور وہ یوں
جیسے یہ کام کوئی مشکل نہیں۔

"پھر آپ اپنی کوشش کیجیے۔"

سردار مونڈ نے اطمینان کا سانس لیا:

"میں امیر تیمور کو ان باتوں کی اطلاع اسی وقت دوں گا جب آپ کامیاب ہو جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔"

حکیم دروازے کی طرف بڑھا:

"آپ یہیں تشریف رکھیں۔ میں اپنا کام تنہائی میں کروں گا۔"

حکیم طیب شہزادے کے کمرے میں واپس آ گئے۔ شہزادہ اسی طرح آنکھیں بند کیے لیٹا تھا
کے بستر کے قریب بیٹھ گئے اور اس کی نبض پر ہاتھ رکھ کر بولے:

شہزادے جہانگیر۔ آپ بہت شرمیلے اور کم گو ہیں۔ انسان کی یہ خوبی تعریف کے قابل ہے لیکن بعض اوقات
بڑھی ہوئی شرم بہت مضر ثابت ہوتی ہے۔"

حکیم نے رک کر شہزادے کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ شہزادے کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا لیکن حکیم کو یہ
اندازہ ہوا کہ شہزادہ ہوش میں ہے اور اس کی بات غور سے سن رہا ہے۔

حکیم طیب نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہنا شروع کیا:

"آپ کو امیر تیمور سے بڑی محبت ہے ملکہ سرائے خانم کو بھی آپ بہت چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر آپ
کے والدین آپ کو کچھ سخت و سست بھی کہہ دیں تو آپ پروا نہیں کرتے مگر ہو سکتا ہے کہ آپ کے خاندان میں
اور ایسی ہستی ہو جس نے آپ سے کوئی ایسی بات کہہ دی ہو جس سے آپ کے خیالات منتشر اور دل پریشان
ہو۔"

شہزادے کا چہرہ اب بھی کسی تاثر سے خالی تھا۔ نبض کی رفتار میں بھی کوئی فرق نہ پڑا تھا۔ حکیم نے پھر کہنا
شروع کیا:

"شہزادے بہادر۔ آپ اس وقت سمرقند میں ہیں۔ آپ کے والدین کے علاوہ سمرقند میں کوئی اور ایسی ہستی
ہے جس میں آپ دلچسپی لیتے ہیں۔ اس سے گفتگو کرنا، اس سے قریب رہنا یا اسے اپنے قریب رکھنا آپ کو
اچھا لگتا ہوگا۔"

شہزادے کا چہرہ اب بھی بے تاثر تھا۔ نبض پہلے کی طرح چل رہی تھی۔ حکیم طیب نے بات آگے بڑھائی۔ بولے:
"شہزادے بہادر۔ تعجب ہے کہ سمرقند کی کوئی ہستی آپ کو متاثر نہ کر سکی۔ خیر۔۔۔۔ اب ہم سمرقند سے
باہر چلتے ہیں۔"

حکیم طیب نے ایک لمحہ انتظار کیا۔ پھر کہا:
"سمرقند سے آپ کو کوئی دلچسپی نہیں تو تبریز آپ کو ضرور پسند ہوگا۔"
حکیم ذرا دیر انتظار کرنے کے بعد بولے:
"عجیب شہر ہے۔ تبریز جانے کی بھی آپ کو خواہش نہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو بخارا ضرور پسند ہوگا۔ وہاں
کے باغیچے اور لوگ آپ کو ضرور یاد آتے ہوں گے۔"

بخارا کے نام پر بھی شہزادے کی طرف سے کسی تاثر کا اظہار نہ ہوا۔ نبض بدستور ایک ہی رفتار پر قائم تھی۔ اب تو
صاحب بھی پریشان تھے۔ انہیں علم تھا کہ وہ اس کے زور پر سردار مونڈ لرات کے سامنے اس قسم کا دعویٰ کر
چکے۔ انہوں نے ماوراء النہر (ملک تاتار) کے تمام بڑے بڑے شہروں میں جہانگیر کے مطلوب کو تلاش کرنے

کی کوشش کی لیکن شہزادے کے چہرے یا نبض نے ان کی کوئی مدد نہ کی۔ موشگافات نے انہیں دھکا د
یہ مرض غلط ثابت ہوا تو حکیم صاحب کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ حکیم صاحب کو جھرجھری سی آ گئی۔
کہتے ہیں کہ حکیم و ڈاکٹر اپنے مریض سے کبھی نا امید نہیں ہوتے اور آخری وقت تک کوشش کر
ہیں۔ پھر حکیم طبیب کس طرح ہار مان لیتا جبکہ ان کی ناکامی انہیں موت سے بھی ہمکنار کر سکتی تھی۔ انہوں نے د
علوم کو ذہن سے جھٹک دیا اور پھر کوشش میں لگ گئے۔
حکیم طبیب شہزادے کی نبض پر ہاتھ رکھ کر بولے:
"یوں لگتا ہے کہ شہزادے کو اپنے ملک کا کوئی منظر یا صورت پسند نہیں آئی۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے
نے ملک ملک کی سیر کی ہے۔ کیا پتہ کسی غیر ملک میں شہزادے کا دل اٹک گیا ہو اور وہاں کوئی ایسی ہستی
کی یاد ان کے دل میں چٹکیاں لے رہی ہو۔"
حکیم صاحب ایک دم خاموش ہو گئے۔ انہیں پہلی بار نبض کی رفتار میں قدرے تبدیلی محسوس ہوئی۔ ا
کے چہرے پر گئی تو وہاں بھی اک کرب اور بے چینی کی شکنیں دکھائی دیں۔ حکیم صاحب کا دل مسرت سے بھر
ہوئی منزل جیسے پلٹ کر آ گئی ہو۔
"شہزادے بہادر۔"
حکیم طبیب بڑے اطمینان سے بولے:
"مثل مشہور ہے کہ گھر کی مرغی دال برابر۔ اس مثل کی حقیقت کا ثبوت نہ ملا تھا لیکن آپ نے یہ
ثبوت بھی مہیا کر دیا۔ اس میں آپ کا بھی قصور نہیں۔ دل تو آخر دل ہی ہے جسے چاہے پسند کر لے۔ لیلیٰ
لیکن مجنوں کی نظروں نے اسے اس قدر حسین بنا دیا کہ دنیا والے لیلیٰ کی سیاہ رنگت کو بھول کر اسے
سمجھ بیٹھے۔ آپ نے بھی اچھا ہی کیا۔ گلوں سے خار بہتر ہوتے ہیں جو کم از کم دامن تو تھام لیتے ہیں لیکن
خوش نصیب سرزمین ہے جس کی رنگینی نے سمرقند و بخارا کو نیچا دکھا دیا۔"
شہزادے کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گئے۔ نبض نے بھی پلٹے کھائے لیکن شہزادے کی آنکھ
حکیم صاحب پڑھے لکھے آدمی تھے اور قرب و جوار کی تمام ممالک سے واقف بھی تھے۔ انہیں اپنی منزل بہت
تھی۔ انہوں نے شہزادے کی خاموشی کی ذرا بھی پروا نہ کی اور ملکوں کی گردان خود ہی شروع کر دی۔ جو ذرا
انداز میں بولے:
"کوہستان کا بھی اپنا ایک حسن ہوتا ہے مثلاً غزنی اور قندھار کا علاقہ قدرتی مناظر سے پُر
چیز میں ایک خاص قسم کی جاذبیت ہے۔"

شہزادے کا چہرہ پھر سے سپاٹ ہو گیا۔ نبض کی حرکت پہلے مقام پر آ گئی۔
حکیم طبیب غزنی و قندھار سے نکل کر ہرات پہنچ گئے۔ بولے:
"ہرات کا ملک تو لاجواب ہے۔ سبزوار کے مقام کو ملک ہرات میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس جگہ کئی رنگ
ہستیاں پیدا ہوئیں۔"
ہرات کا نام بھی شہزادے میں کوئی بے چینی پیدا نہ کر سکا۔
حکیم طبیب اور آگے بڑھے۔ بولے:
"آپ کی سرحدوں کے قریب ریگستان ہے لیکن یہ ریگستان قلعہ کی فصیل سے کسی طرح کم نہیں۔ یہاں کا حاکم
شاہ خوارزم بڑا خود سر ہے۔"
شہزادہ جہانگیر کی نبض اس گھڑی اس زور سے پھڑکی کہ حکیم طبیب کو نبض پر اپنی گرفت مضبوط کرنا پڑی۔ شہزادے
چہرے کی رنگت بھی بدل گئی تھی۔
حکیم طبیب مسکرائے۔ بولے:
"یقین ہے کہ اپنے شہزادے جہانگیر کو ملک خوارزم کا کوئی پھول پسند آ گیا ہے۔ خوارزم کی یاد نے شہزادے
بے چین کر رکھا ہے۔"
شہزادے نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ نحیف آواز میں بولا:
"حکیم صاحب۔ خدا کے لیے ہم پر رحم کیجیے۔ بس آپ خاموش رہیے۔"
"شہزادے!"
حکیم صاحب اکڑ گئے:
"میں اس منزل تک جان کی بازی لگا کر پہنچا ہوں۔ آپ کو بتانا ہوگا کہ آپ نے یہ ڈھونگ کیوں رچایا اور
رزم کی وہ کون ماہ پیکر ہے جو موت بن کر آپ کے دل پر سوار ہے۔"
"حکیم صاحب!"
شہزادے نے لجاجت سے کہا:
"یہ ڈھونگ نہیں۔ حقیقت ہے۔"
"پھر آپ نے اس حقیقت کو امیر سے کیوں نہیں بیان کیا؟"
حکیم طبیب کا لہجہ بتدریج تلخ ہوتا جا رہا تھا:
"مجھے آپ کی بیماری کی کوئی پروا نہیں۔ میں تو صرف امیر تیمور کی وجہ سے آپ کے علاج پر تیار ہوا تھا۔"

وہ ایک مستقل کرب میں مبتلا ہیں۔ انہوں نے دربار تک لگانا چھوڑ دیا ہے"۔

شہزادے نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کش مکش میں

"شہزادے جہانگیر!"

حکیم نہایت تلخ لہجے میں بولا:

"اگر آپ کو خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو امیر تیمور اس غم سے پاگل ہو جائیں گے اور یہ ملک پھر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ بلادِ شمال کا خانِ اعظم ایک بار پھر تاتاریوں کو غلام بنانے کے لیے سمرقند پر چڑھائی

شہزادے کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو رہی تھیں۔ حکیم صاحب گھبرا گئے۔ چہرے پر جا کر بولے:

"شہزادے! آپ کا راز میرے سینے میں رہے گا۔ کم از کم یہ تو بتا دیجیے یہ حادثہ کس جگہ ہوا۔ کے دارالسلطنت اور گنج، خیوہ یا قلعہ کرت میں؟"

شہزادے کے ہونٹ لرزے۔ وہ بہت نحیف آواز میں بولا:

"دریائے آمو کے کنارے"۔ پھر شہزادے پر غشی طاری ہو گئی۔

حکیم صاحب کے لیے اتنا اشارہ کافی تھا۔ اس نے شہزادے کو زیادہ پریشان کرنا مناسب

حکیم نے شہزادے کو سرگوشیوں میں یقین دلایا:

"شہزادے بہادر۔ آپ اپنی طبیعت سنبھالیے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا مطلوب اگر خوارزم کی دختر بھی ہے تو وہ آپ کے لیے حاصل کی جائے گی۔ خواہ اس کے لیے خون کی ندیاں ہی کیوں

شہزادے کے مرجھائے ہوئے چہرے پر رونق سی آ گئی۔

حکیم طبیب شہزادے کے پاس سے اٹھ کر موندارلات کے پاس آئے۔ موندارلات ان کے بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ حکیم نے دروازے میں قدم رکھا تو وہ دوڑ کر ان کے پاس آ گیا۔

"کہیے حکیم صاحب۔ کچھ کامیابی ہوئی؟" اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"مبارک ہو سردار۔ شہزادے نے آنکھیں کھول دی ہیں"۔ حکیم طبیب خوشی سے مسکرائے

"سچ؟"

موندارلات اور بے چین ہو گیا:

"شہزادے نے تو تین دن سے کھانا پینا بھی چھوڑ رکھا ہے۔ ان پر ہر وقت غشی سی طاری تو کمال کر دیا حکیم صاحب!"

"سردار کو یہ سن کر اور خوشی ہو گی کہ شہزادے نے اپنے مرض کا اقرار کر لیا ہے"۔

حکیم طبیب ہنستے ہوئے بولے:

"آپ چاہیں تو اب میری گردن اڑا سکتے ہیں"۔

سردار ارلات بڑے خلوص سے حکیم صاحب سے لپٹ گیا:

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ جی چاہتا ہے آپ کا منہ موتیوں سے بھر دوں۔ شہزادے نے کس طرح اقرار کر لیا؟ کسی کا نام بتایا انہوں نے؟"

"نہیں سردار"۔

حکیم طبیب نے نفی میں سر ہلایا:

"نام بتانے سے گریز کر رہے ہیں۔ شاید شرم مانع ہے لیکن انہوں نے جو اشارہ دیا ہے اس سے بہت کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے"۔

"اچھا تو چلیے"۔

موندارلات ان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا:

"ہم اسی وقت امیر سے ملتے ہیں۔ وہاں آپ تفصیل سے گفتگو کیجیے گا"۔

سردار ارلات، حکیم طبیب کو ساتھ لے کر باہر آیا۔ اسے معلوم تھا کہ امیر تیمور اسے ملاقات کی اجازت نہ دیں گے۔ امیر کے پاس سوائے سرائے خانم کے اور کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ حکیم صاحب کے آنے پر وہ شہزادے کے پاس سے اٹھ کر محل کے دوسرے حصے میں چلی گئی تھیں۔

موندارلات ان کے پاس پہنچا اور ایک کنیز کے ذریعے ملکہ سرائے خانم کو اطلاع بھجوائی کہ شہزادہ جہانگیر ہوش میں آ گئے ہیں اور انہوں نے حکیم صاحب سے بعض اہم باتیں کی ہیں۔ وہ باتیں امیر کے گوش گزار کرنا ضروری ہیں۔

ملکہ سرائے خانم کے لیے یہ بات نویدِ مسرت تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی امیر تیمور کے کمرے میں داخل ہوئی اور پھولی پھولی سانسوں کے درمیان بولی:

"امیر کو مبارک ہو۔ ایک حکیم شہزادے کو ہوش میں لے آیا ہے۔ شہزادے نے حکیم سے باتیں کی ہیں۔ حکیم شرفِ ملاقات کے لیے حاضر ہے"۔

امیر تیمور اس صدمے سے نڈھال پڑا ہوا تھا۔ اس خبر نے اس میں جان ڈال دی:

"کیا یہ خبر درست ہے سرائے خانم یا تم ہمیں خوش کرنے کے لیے کہہ رہی ہو؟" تیمور نے امید بھری

نظروں سے سراۓ خانم کو دیکھا۔

"امیر محترم!"

سراۓ خانم اپنی سانس درست کرتے ہوۓ بولی:

"سردار موئدارلات اور حکیم باریابی کی اجازت چاہتے ہیں۔ وہ پوری وضاحت سے بتائیں گے۔"

امیر تیمور نے فوراً پانی طلب کیا، منہ ہاتھ دھویا۔ لباس بدلا۔ پھر سردار موئدارلات کو اندر بلا بھیجا۔ سراۓ خانم دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ حکیم طبیب اور موئدارلات کمرے میں داخل ہو کر آداب بجالاۓ۔

"موئدارلات!"

امیر تیمور نے گداز لہجے میں کہا:

"کیا تمہارے ساتھ یہ وہی حکیم ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ شہزادے کو ہوش میں لاۓ ہیں۔ انہوں نے شہزادے سے باتیں بھی کی ہیں؟"

"اے تاتاریوں کے نجات دہندہ!"

حکیم صاحب نے بغیر یہ پرواکیے کہ تیمور نے موئدارلات کو مخاطب کیا ہے، خود بولنا شروع کر دیا:

"اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت اس حقیر بندے کو عطا کی کہ یہ حقیر بندہ شہزادے کا مرض معلوم کرنے میں کامیاب ہوا۔"

"خدا تمہیں جزاۓ خیر دے حکیم۔"

امیر تیمور بڑی رقت سے بولا:

"تم نے ایک باپ کے مغموم دل کو جو سکون بخشا ہے اس کا احسان ہم عمر بھر نہیں بھول سکیں گے۔ ہمیں امید ہے کہ جب تم نے مرض معلوم کر لیا ہے تو تم شہزادے کو اچھا کرنے میں بھی ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔"

"امیر محترم!"

حکیم نے مستقل مزاجی سے کہا:

"یہ ٹھیک ہے کہ میں مرض کی تہ تک پہنچ گیا ہوں اور شہزادے نے بڑی حد تک اس کی تصدیق بھی کر دی ہے لیکن افسوس کہ شہزادے کا علاج میرے پاس نہیں۔"

"کیا کہہ رہے ہو حکیم؟"

امیر تیمور بڑے اضطراب سے بولا:

"اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اس نے ہر مرض کا علاج اس کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ پھر تم کیسے حکیم ہو کہ مرض معلوم کرنے کے بعد علاج نہیں کر سکتے۔ محترم بزرگ! تم نے ہمیں امید کی کرن دکھا کر پھر اندھیرے میں دھکیل دیا۔"

"امیر محترم!"

حکیم طبیب نے وضاحت کرتے ہوۓ کہا:

"اللہ کے فرمان سے کون انکار کر سکتا ہے؟ میں یہ کب کہتا ہے کہ شہزادے کے مرض کا علاج نہیں میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ شہزادے کا علاج میرے اختیار میں نہیں۔ ان کی تکلیف اور درد کا درماں صرف آپ کر سکتے ہیں۔"

"ہم۔۔۔۔ ہم اس کا مرض دور کر سکتے ہیں؟"

تیمور نے حیران ہو کر پوچھا:

"جلد بتاؤ حکیم! ہم شہزادے کے لیے تو آسمان سے تارے بھی توڑ کر لا سکتے ہیں۔ ہم اس کے بدلے میں اپنی جان دے سکتے ہیں۔"

"اے شاہ عالی شان!"

حکیم نے تیمور سے نظریں ملا کر کہا:

"اس سلسلے میں ابھی وقت کچھ عرض کر سکتا ہوں کہ جب امیر میری بات پوری توجہ سے سماعت فرمانے کا اعلان کر دیں اور جب تک میں پوری تفصیل نہ بیان کر لوں، صبر و تحمل سے کام لیں۔"

"حکیم!"

تیمور بے چینی سے بولا:

"ہم ہر طرح کا اعلان اور وعدہ کرنے پر تیار ہیں مگر خدا کے لیے ہمارے بچے کا علاج کر کے اسے اچھا کرنے کی کوشش کرو۔"

"توجہ سے سنیے شاہ محترم!"

حکیم کی بات پر سب متوجہ ہو گئے۔ دوسرے کمرے میں بیٹھی ہوئی سراۓ خانم نے بھی پردے سے کان لگا دیے۔ حکیم نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہنا شروع کیا:

"شہزادے جہانگیر کو کسی طرح کی جسمانی بیماری نہیں ہے بلکہ وہ محبت کے موذی مرض میں مبتلا ہیں اور ان کی یہ محبت عشق کی حدوں میں پہنچ چکی ہے۔"

"نادان حکیم!" امیر تیمور کو اک دم جلال آ گیا۔ "اتنا معصوم اور لڑکیوں سے نظریں چرانے والا شہزادہ

کس طرح محبت کر سکتا ہے؟"

"امیرِ محترم!"

حکیم کو بھی غصہ آ گیا:

"یہ سوال آپ شہزادے سے کیجیے۔ انہوں نے اپنی محبت کا اقبال کر لیا ہے۔"

امیر تیمور کا جلال ابال کی طرح بیٹھ گیا۔ اس کا سر جھک گیا۔ پھر جیسے اس نے آہ و زاری میں شہزادے جہانگیر سے کہا:

"جہانگیر! تم نے باپ کی محبت کا اندازہ ہی نہیں کیا۔ ایسی بات تھی تو تم نے پہلے ہی دن کہہ دیا ہوتا۔ کیا ہم تمہارے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے تھے۔ تمہاری پسند کو ہم نے ہمیشہ مقدم رکھا۔ خوش قسمت ہے وہ لڑکی جو امیر تیمور گورگان کی بہو بنے گی۔"

پھر وہ اک دم چونکا اور حکیم سے مخاطب ہوا:

"کون ہے وہ خوش نصیب؟ کیا نام ہے؟ کس کی بیٹی ہے؟"

"امیرِ محترم تحمل سے کام لیجیے۔ یہ معاملات بہت نازک ہوتے ہیں۔"

حکیم نے ناصحانہ انداز میں کہا:

"شہزادے جہانگیر نے اس کا نام نہیں بتایا اور نہ اس پر نام معلوم کرنے کے لیے زور دیا جائے ورنہ ان کی دل شکستگی اور بڑھ جانے کا خطرہ ہے۔ انہوں نے کچھ اشارے ضرور کیے ہیں جن سے منزلِ مقصود تک پہنچا جا سکتا ہے۔"

"تم درست کہتے ہو حکیم۔"

تیمور کی آواز میں تھکن پیدا ہو گئی:

"تم سچے ہو۔ ہم نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی۔ ان اشاروں کی وضاحت کرو تاکہ کوئی صورت نکالی جا سکے۔"

"مجھے وضاحت کا موقع تو دیا جائے شاہ عالی مقام۔" حکیم نے بڑے مہذب طریقے سے امیر تیمور کو تنبیہ کی۔

"اگر امیر نے پدرانہ محبت سے مجبور ہو کر میری گفتگو کے دوران پھر بے چینی کا اظہار کیا تو اس بات بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔"

"تم بات پوری کرو حکیم!" تیمور نے حکیم طبیب کو اطمینان دلایا۔

"ہم اپنے جذبات پر قابو رکھیں گے اور گفتگو میں قطعی دخل نہ دیں گے۔"

"امیرِ محترم!"

حکیم نے اطمینان سے کہنا شروع کیا:

"میں نے بسم اللہ کہہ کر شہزادے کی نبض پر ہاتھ رکھا اور ان کے چہرے پر نظر کی تو چہرے کی افسردگی اور نبض نے فوراً اعلان کیا کہ شہزادے کو کوئی جسمانی بیماری نہیں بلکہ ان کے دل پر کسی کے فراق اور حرماں نصیبی کا شدید دباؤ ہے۔ میں جانتا تھا شہزادہ اپنی فطری شرم کی وجہ سے محبت کا اعتراف ہرگز نہ کرے گا۔ اس لیے میں نے نفسیات کا سہارا لیا اور شاہی محلات اور خانوادۂ تیمور کی عالی مقام خواتین کی تعریف و توصیف کا ذکر چھیڑا۔ تاکہ اس ستمگر کا کچھ اتہ پتہ پا سکوں جس کی جدائی نے شہزادے کا یہ حال بنا رکھا ہے لیکن شہزادے کی نبض یا چہرے نے خواتینِ تیموریہ کے تذکرے میں کسی دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ میرا کام قدرے مشکل ہو گیا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور شہزادے کے تصور کو سمرقند کے محلوں اور گلی کوچوں میں لے گیا۔ وہاں بھی ناکامی ہوئی تو اپنی خود کلامی کو وسعت دے کر شہزادے کے ذہن کو بلخ اور بخارا اور ملک تاتار کے تمام بڑے بڑے شہروں تک لے گیا مگر مجھے کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ اب میرے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا کہ گوہرِ مقصود کو آس پاس کی سلطنتوں میں تلاش کروں۔ میں نے ہرات کا ذکر کیا۔ شہزادے کی نبض و چہرے نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہ کیا لیکن جب میں شہزادے کے خیال کو بہاتا ہوا سلطنتِ خوارزم میں داخل ہوا تو شہزادے کا چہرہ ایک دم متغیر ہو گیا اور نبض نے پھڑک پھڑک کر اعلان کیا کہ بس آگے نہ بڑھنا جو کچھ ہے بس خوارزم میں ہے۔ اس یقین کے ساتھ ہی میں نے شہزادے پر ظاہر کر دیا کہ اس کا مسیحا خوارزم ہے اور اگر اس نے اب بھی زبان نہ کھولی تو خاکم بدہن شہزادہ اپنی جان کھو دے گا اور امیر تیمور نے جس سلطنت کی بنیاد رکھی ہے اس کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا۔ شہزادے نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور مجھ سے درخواست کی کہ اس کا ذکر کسی سے نہ کیا جائے اور نہ اس سلسلے میں مزید گفتگو ہو۔ میں نے بہت کوشش کی کہ شہزادے سے کچھ اور معلوم کر سکوں لیکن سوائے اس کے کہ یہ واقعہ یا حادثہ دریائے آمو کے کنارے پیش آیا ہے اور کچھ معلوم نہ ہو سکا۔"

حکیم طبیب یہ حقیقی افسانہ ایک منجھے ہوئے داستان گو کی طرح بیان کر رہا تھا۔ امیر تیمور اور سردار موبدارلات، ایسی توجہ اور دلچسپی سے سحر زدہ بیٹھے سن رہے تھے۔

"حکیم محترم!"

امیر تیمور نے پہلی بار حکیم طبیب کو عزت سے مخاطب کیا۔

"تمہارا بیان اگرچہ داستان گوئی کا ملکہ لیے ہے لیکن ہمیں اس کے لفظ لفظ کا یقین ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس لڑکی کا نام کس طرح معلوم کیا جائے۔ تمہارا یہ بھی مشورہ ہے کہ اس سلسلے میں شہزادے پر زور نہ ڈالا جائے لیکن

دریائے آمو کوہ ہندوکش سے نکل کر بحیرۂ ارال میں گرتا ہے۔ ہم اس کے کناروں کا کس طرح ا

اس وقت غلام نے حاضر ہو کر اطلاع دی کہ شہزادہ جہانگیر نے حکیم صاحب کو خود بلایا ہے۔ ا
اس اطلاع سے بڑی مسرت ہوئی۔ اسے یہ سوچ کر اطمینان ہوا کہ شہزادہ کم از کم اس قابل تو ہوا کہ
کر سکے۔

حکیم طبیب شہزادے سے ملنے گئے اور کچھ دیر بعد واپس آ گئے۔ وہ کچھ گھبرائے گھبرائے ت
نے انہیں پریشان دیکھ کر پوچھا:

"کیا ہوا حکیم محترم! شہزادہ خیریت سے تو ہے؟"

"الحمد للہ۔ شہزادہ بالکل خیریت سے ہے۔"

حکیم طبیب نے اپنی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے کہا:

"امیر عالی مقام! میں اپنا کام ختم کر چکا ہوں۔ مرض کی تشخیص ہو گئی ہے۔ علاج آپ کیجیے اور
جانے کی اجازت دیجیے۔"

"حکیم محترم!"

امیر تیمور بھی پریشان ہو گیا:

"آخر ہوا کیا؟ کیا شہزادے نے آپ کو واپس جانے کا حکم دے دیا ہے؟"

"ایسی بات نہیں ہے امیر محترم!"

حکیم طبیب نے سنبھل کر کہا:

"لیکن شہزادے جہانگیر نے مجھ سے قسم لی ہے کہ میں ان کے سلسلے میں آپ کو کوئی مشورہ
اپنی زبان بند رکھوں۔ میں مسلمان ہوں امیر۔ قسم کی پابندی مجھ پر فرض ہے۔"

"حکیم محترم! ہم قسم توڑنے کو ہرگز نہیں کہیں گے۔"

امیر نے نرمی سے سمجھایا:

"لیکن ہماری خواہش ہے کہ آپ شہزادے کی صحت یابی تک سمرقند میں قیام کریں۔"

○

بعض مسائل دیکھنے میں بہت الجھے نظر آتے ہیں لیکن جب ان پر یکسوئی سے غور کیا جائے تو وہ

سلجھتے چلے جاتے ہیں۔

امیر تیمور شہزادہ جہانگیر کی طرف سے بہت فکرمند تھا۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ جہانگیر کسی لڑکی کی
بت میں گرفتار ہے، یہ مسئلہ اب تیمور کے لیے دردِ سر بنا ہوا تھا۔ اس کی سب سے بڑی مجبوری یہ تھی کہ شہزادہ
ی محبوب کا نام بتانے پر رضامند نہ تھا اور اس سلسلے میں پوچھ گچھ کرنے سے اس کے مزاج برہم ہو جانے
بھی اندیشہ تھا۔

اس فکر میں ڈوبا ہوا جب امیر تیمور، سردار موئدارلات اور حکیم طبیب کو رخصت کر کے زنان خانے میں پہنچا
س کی طبیعت سخت پریشان تھی۔

سرائے خانم جو دوسرے کمرے میں ہونے والی گفتگو کے دوران پردے کے ساتھ لگی بیٹھی تھی وہ وہاں
ہٹ کر زنان خانے کے ایک دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔ امیر تیمور کو دیکھ کر وہ کمرے سے باہر
اور تیمور کو ساتھ لے کر اندر پہنچی۔

"سرائے خانم!"

تیمور نے مسہری پر بیٹھتے ہوئے فکرمند لہجے میں کہا:

"تم اگرچہ شہزادہ جہانگیر کی سوتیلی ماں ہو لیکن تمہارے خلوص کی بنا پر ہم تمہیں شہزادے کی سگی ماں ہی تصور
رتے ہیں۔ شہزادہ جہانگیر کا مسئلہ بہت الجھ گیا ہے۔ تم عورت ہو اور جہانگیر کے معاملے کا تعلق بھی ایک عورت
ہے اسی لیے ہمیں تمہارے مشورے کی ضرورت ہے۔"

"امیر ارشاد فرمائیں!"

سرائے خانم بالکل تیار ہو گئی:

"میں شہزادے کی سلامتی کے لیے ہر قدم اٹھانے پر تیار ہوں۔"

"سرائے خانم!"

تیمور غم سے چور چور تھا۔ اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا:

"ایک حکیم دانا نے یہ بتایا ہے کہ خود شہزادے نے اس کی تصدیق کی ہے کہ جہانگیر کسی لڑکی کے عشق
مبتلا ہے لیکن وہ اپنی نادانی کی وجہ سے اس کا نام بتانے سے گریز کر رہا ہے۔ صرف ایک مبہم سا اشارہ ملا ہے
سے یہ مسئلہ حل ہوتا نظر نہیں آتا۔"

"کہیے امیر!"

سرائے خانم جو تمام باتیں سن کر خود بھی ان پر غور کر چکی تھی، سنجیدگی سے بولی:

"جس بات کو آپ نادانی کہہ رہے ہیں وہ شہزادے کی شرافت اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ہے۔ اوّل تو ایک سعادت مند بیٹے کا اپنے باپ کے سامنے کسی لڑکی سے محبت کرنے کا اقرار کرنا ہی تہذیب کے خلاف ہے۔ دوم یہ کہ اگر شہزادے نے کسی انداز میں محبت کا اعتراف کر ہی لیا تو پھر اس کی شرافت کس طرح گوارا کرے گی کہ دوشیزہ کا نام اپنی زبان پہ لا کر اس کی بدنامی کا سبب بنے"۔

"تم نے سچ کہا سرائے خانم"۔

تیمور نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا:

"ہم نے اس پہلو پر تو غور ہی نہیں کیا تھا۔ ہمارا شہزادہ ایک باحیا جوان ہونے کے علاوہ شرافت کا پتلا بھی ہے مگر اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"اب اس کے سوا اور کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ امیر اس "اشارے" کی روشنی میں منزل تلاش کریں"۔

سرائے خانم یہ بات پہلے ہی سوچ چکی تھی:

"آپ وہ "اشارہ" ارشاد فرمائیں جو شہزادے کی گفتگو سے حاصل کیا گیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ میں اس سلسلے میں کوئی مفید رائے دے سکوں"۔

"شہزادے کی گفتگو سے اس بات کا شبہ ہوتا ہے کہ اس لڑکی کا تعلق خوارزم سے ہے"۔

امیر تیمور نے تشریح کی:

"شہزادے نے دبی زبان سے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ یہ واقعہ دریائے آمو کے کنارے پیش آیا تھا"۔

"یہ تو بڑے واضح اشارے ہیں امیر"۔

سرائے خانم نے ہنستے ہوئے کہا:

"اس راستے پر چلتے ہوئے تو ہم بڑی آسانی سے شہزادہ جہانگیر کی سسرال تک پہنچ سکتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ دونوں کی ملاقات دریائے آمو کے کنارے ہوئی اور دریائے آمو ہماری اور سلطنتِ خوارزم کی قدرتی سرحد ہے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ شہزادے کی محبوبہ خوارزم سے تعلق رکھتی ہے تو پھر اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ شہزادہ دریا پار کر کے اس سے ملاقات کے لیے جاتا ہوگا"۔

"سرائے خانم! بات اس کے برعکس بھی تو ہو سکتی ہے"۔

امیر تیمور نے بیٹے کی شرافت پر داغ آتے دیکھ کر فوراً مدافعت کی:

"یہ ضروری تو نہیں کہ شہزادہ دریا پار کر کے اس طرف گیا ہو۔ کیا پتہ وہ لڑکی دریا پار کر کے خود شہزادے سے ملنے آتی ہو"۔

"نہیں امیر۔ یہ بات ایک لڑکی کے کردار اور وقار کے خلاف ہے"۔

سرائے خانم نے بڑے فخر سے کہا:

"کیا یہ غلط ہے کہ شاہِ تاتار امیر تیمور خود چل کر سرائے خانم کے خیمے میں شادی کی درخواست لے کر آئے تھے حالانکہ سرائے خانم اُس وقت محض ایک بے حقیقت جنگی قیدی تھی"۔

امیر تیمور اس برجستہ اور برمحل جواب پر چونک اٹھا۔

"سرائے خانم! تم واقعی عقلمند ہو۔ ہم نے تمہارے انتخاب میں کوئی غلطی نہیں کی"۔

اور یہ حقیقت بھی تھی۔ جب سرائے خانم کا پہلا شوہر امیر حسین جو تیمور کا سالا بھی تھا، خانہ جنگی میں مارا گیا اور سرائے خانم قید ہو کر آئی تو تیمور نے سرائے خانم کے خیمے میں جا کر اسے شادی کا پیغام دیا تھا۔

تیمور کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا:

"سرائے خانم۔ دراصل ہم نے کبھی ان باتوں پر غور نہیں کیا ورنہ ہم اس قدر پریشان نہ ہوتے اور اس نتیجے پر پہنچ جاتے جس طرف کہ تم نے اشارہ کیا ہے"۔

"امیر اس سلسلے میں قصوروار نہیں"۔

سرائے خانم نے بڑے تیکھے پن سے کہا:

"امیر کو تو امورِ سلطنت سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ اپنے گرد حالہ کی ہوئی محبتوں پر غور کر سکیں"۔

"تم ہم پر طنز کر رہی ہو سرائے خانم"۔

امیر تیمور نے اس کی بات کا مفہوم فوراً بھانپ لیا:

"ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ اب ہم تم پہ پہلے سے زیادہ توجہ دیں گے۔ ہم اس بات پر بھی تمہارے شکر گزار ہیں کہ تم نے ہمیں ایک نئی راہ سجھائی ہے۔ اب یہ معلوم کرنا چنداں مشکل نہیں کہ شہزادے جہانگیر نے کب دریائے آمو کو عبور کیا اور خوارزم کی وہ کون سی لڑکی ہے جس سے شہزادے نے ملاقات کی تھی"۔

سرائے خانم نے جو گہرا طنز کیا تھا اس کا صلہ اسے مل گیا تھا۔ اس نے بڑے خلوص سے سر جھکا کر اسے قبول کر لیا۔

امیر تیمور پر اب دوسری ہی دھن سوار ہو چکی تھی۔ وہ زیادہ دیر تک اس کے پاس نہ بیٹھا اور کچھ دیر بعد اپنے خیمے میں واپس چلا گیا۔ امیر تیمور نے موبد ارلات اور حکیم طبیب کو سختی سے تاکید کر دی تھی کہ شہزادے کی حالت کا حال کسی پر ظاہر نہ کیا جائے لیکن شہزادے کے ہوش میں آنے کی خبر کو نہ چھپایا جا سکا جس کی اطلاع سب سے پہلے سرائے خانم کی کنیزوں کو ملی۔ سرائے خانم جب شہزادے کو دیکھ کر آئی تو اس کا چہرہ ہشاش بشاش تھا۔

مزاج شناس کنیزوں نے اسے خوش دیکھا تو ملکہ کے سر ہو گئیں۔ آخر سرائے خانم کو بتانا پڑا کہ شہزادہ آ گیا ہے۔ پھر یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح تمام محلات میں پھیل گئی۔ . . . . .

سرائے خانم نے صرف شہزادے کے ہوش میں آنے کا ذکر بڑے محتاط طریقے سے کیا تھا لیکن جب یہ خبر سمرقند کے کوچہ و بازار میں پہنچی تو اس میں یہ اضافہ بھی ہو گیا کہ شہزادے جہانگیر علاج سے اچھے ہو گئے ہیں۔ اور اب وہ محل کے اندر چہل قدمی بھی کرتے ہیں۔

پھر کیا تھا، امرا اور وزرا مبارکباد دینے کے لیے امیر تیمور کے محل پر جمع ہونے لگے۔ امیر پریشان ہوا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ شہزادے کے صحت یاب ہو کر چہل قدمی کرنے کی افواہ کہ اب یہ اس کے لیے مشکل تھا کہ وہ نصف خبر کی تصدیق اور نصف کی تردید کرتا۔ اس کے امرا اور اراکین سلطنت باریابی کی اجازت دی اور ان سے بڑی خندہ پیشانی سے ملا۔ بعض بہی خواہوں نے صدقہ خیرات اور جشن تیمور کو مجبوراً یہ حکم بھی جاری کرنا پڑا۔ حالانکہ شہزادہ اب تک صاحب فراش تھا۔ اتنا ضرور ہوا تھا کہ اب امیر سرائے خانم اس کی مزاج پرسی کے لیے آتے تو وہ ان کے شکریے کے رسمی الفاظ ادا کر دیا کرتا تھا۔

امیر تیمور نے شہزادے کی پوشیدہ بیماری کے سلسلے میں مولانا زین الدین کو بھی اپنے اعتماد میں لیا تیمور نے شہر سبز سے بلوایا تھا اور وہ اب تک سمرقند میں ہی مقیم تھے۔ امیر تیمور ہر اہم معاملے میں ان سے رہنمائی حاصل کرنے کا عادی تھا۔ غرض یہ کہ امیر تیمور نے مولانا زین الدین اور سردار موسیٰ ارلات کے مشورے خوارزم کی سرحد کے قریب متعین سردار فوج کو ایک خفیہ خط لکھا۔ فوج کا یہ سردار شہزادہ جہانگیر کے سمرقند آنے پر اس کی جگہ مقرر کیا گیا تھا۔

اس خط کا متن بڑے غور و فکر اور صلاح مشورے کے بعد طے ہوا تھا۔ امیر تیمور نے دریائے آمو کے سپہ سالار کو حکم دیا تھا کہ وہ نہایت خفیہ طور پر یہ بات معلوم کرے کہ شہزادہ جہانگیر دریائے آمو عبور کر کے خوارزم کی حدود میں کب داخل ہوا اور نیز یہ کہ خوارزم کے علاقے میں جب شہزادہ جاتا تھا تو اس کے ساتھ کون تھا؟ شہزادے کے ساتھ جانے والے ایسے تمام لوگوں کو حراست میں لے کر انہیں سخت پہرے اور حفاظت کے ساتھ دارالسلطنت روانہ کیا جائے۔

دریائے آمو کے لشکر کا سپہ سالار امیر تیمور کا یہ خط پا کر بہت گھبرایا۔ وہ اس لشکر میں نیا تھا اور لشکریوں کے حالات سے پوری طرح واقف نہ تھا۔ امیر نے اسے خفیہ تحقیقات کا حکم دیا تھا۔ اس لیے وہ کھل کر کسی سے بات بھی نہ کر سکتا تھا۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر شہزادہ جہانگیر کے ان سواروں کو پتہ چل گیا کہ انہیں تلاش کیا جا رہا ہے تو عین ممکن ہے کہ وہ خوف کھا کر بھاگ نہ کھڑے ہوں۔ اسے بڑی احتیاط سے کام لینا تھا اور امیر کو جواب دینا تھا۔

اس نے تحقیقات کا آغاز اپنے نائب سے کیا۔ ایک دن باتوں باتوں میں پوچھا:

"دریا کے اس پار خوارزم کا لشکر پڑا ہوا ہے۔ انہوں نے دریا پار کرنے کی کوئی کوشش کی ہے؟"

"نہیں سردار!"

نائب نے اس کے خیال کی سختی سے تردید کی:

"ایسی کوئی بات نہیں۔ نہ وہ دریا کے اس طرف آئے اور نہ کبھی ہم نے ادھر جانے کی کوشش کی۔ شہزادہ جہانگیر نے لشکر کو دریا پار کرنے کی سخت ممانعت کر دی تھی۔"

سردار لشکر کو پہلے ہی قدم پر ناکامی ہوئی۔ نائب کے جھوٹ بولنے کی کوئی وجہ اس کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی دوسری طرف امیر تیمور کے خط سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ شہزادے جہانگیر نے دریا عبور کیا ہے۔ بہت غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ شہزادے نے خفیہ طور پر اپنے معتمد سواروں کے ساتھ دریا عبور کیا ہو اور اس نے اس کی اطلاع اپنے نائب کو نہ دی ہو۔

اس نے اپنے اس خیال کو تقویت دینے کے لیے نائب کو ایک بار پھر ٹٹولا۔ سالار نے لاپروائی سے نائب سے پوچھا:

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ شہزادہ جہانگیر دشمن کا حال معلوم کرنے کے لیے پوشیدہ طور پر دریا پار جاتے ہوں اور انہوں نے کسی مصلحت کی بنا پر یہ بات نہ بتائی ہو۔"

"ہاں۔ ایسا ہو سکتا ہے سردار۔"

نائب نے شاید اپنے سردار کو خوش کرنے کے لیے کہا:

"اس کے ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ شہزادے بہادر نے اپنے بجائے اپنے کسی خاص سوار کو دریا پار دشمن کی صحیح تعداد معلوم کرنے کے لیے بھیجا ہو۔"

"تم نے ٹھیک کہا نائب!"

سردار نے اس کی حوصلہ افزائی کی:

"سردار فوج کا دشمن کے لشکر میں تنہا جانا کسی طرح مناسب نہیں۔ شہزادہ جہانگیر نے یہ کام ضرور اپنے خاص سرداروں کے سپرد کیا ہو گا۔"

"سردار۔ آپ بڑے اعلیٰ ظرف ہیں۔"

نائب خوش ہو کر بولا: "آپ نے اپنے نائب کے خیال سے اتفاق کر کے میری عزت افزائی کی ہے۔"

شہزادہ جہانگیر ولی عہد سلطنت ہیں۔ میں ان کے بارے میں کچھ نہیں کہنا لیکن یہ ضرور ہے کہ انھو[ں]
میں شریک نہیں کیا۔ ان کے تو بس پانچ یار تھے۔ انہیں کے ساتھ وہ مگن رہتے تھے"۔ نائب [illegible]
حاصل کرنے کے لیے شہزادے کی بے التفاتی کا شکوہ کر بیٹھا۔

سردارِ فوج اپنے نائب کی اس بات پر اچھل پڑا۔ اپنی خوشی ضبط کرتے ہوئے بولا:

"شہزادے کے وہ دوست کون ہیں۔ کیا شہزادہ انہیں اپنے ساتھ سمرقند لے گیا ہے؟"

"نہیں سردار۔ وہ تو اسی لشکر میں دندناتے پھرتے ہیں"۔

نائب کو شہ ملی تو اور کھل گیا:

"میں شہزادے بہادر کے لحاظ سے انہیں کچھ نہیں کہتا"۔

"کیا وہ خودسر ہو گئے ہیں؟" سردار نے اس انداز سے کہا جیسے وہ شہزادے کے [illegible]
ناراض ہو گیا ہو۔

"ایسی ویسی خودسری سردار"۔

نائب کو حوصلہ ملا تو وہ پھٹ پڑا:

"وہ تو کسی کو منہ ہی نہیں لگاتے۔ کسی کام سے بلواؤ۔ سو سو بہانے بناتے ہیں۔ [illegible]
ایک بار آتے ہیں"۔

"ایسے بدقماش اور خودسر لوگوں پر ہمیں نظر رکھنی ہو گی نائب!"

سردار مصنوعی غصے سے بولا:

"ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ ان پانچوں کو اسی وقت غیر مسلح کر کے الگ الگ خیمو[ں]
نائب کی تو مراد بر آئی۔ اسے جہانگیر کے ان منہ چڑھے لوگوں سے سخت پرخاش تھی[۔]
انہیں ان کی پلٹنوں سے الگ کر کے اپنے محافظ دستے میں شامل کر لیا تھا۔ ان کے قدم زمی[ن]
جب شہزادہ سمرقند چلا گیا اور اس کی جگہ نیا سردار آیا تو نائب نے فوراً موقع سے فائدہ اٹھایا[۔]
کی پرانی پلٹنوں میں بھیجنے کا حکم دے دیا۔ اس پر ان پانچوں نے بڑا واویلا مچایا اور سخت احتج[اج]
احتجاج خار بن کر نائب کے دل میں کھٹکتا تھا اور وہ انہیں مزید ایذا پہنچانے کی تدبیروں [میں]
گرفتاری کے حکم سے اسے دلی مسرت ہوئی۔

نائب تعمیلِ حکم کے لیے سردار کو سلام کر کے جانے لگا تو سردار نے اسے روک کر [illegible]

"مجرموں کو اسی وقت گرفتار ہونا چاہیے۔ خبردار کوئی فرار نہ ہونے پائے۔ [illegible]

[ہم]اری خیر نہیں۔ وہ سب امیر تیمور کے مجرم ہیں۔ ہم انہیں آج ہی سمرقند بھیج دیں گے"۔

"سردار اطمینان رکھیں"۔

نائب بڑے فخر سے بولا:

"میرے ہاتھ سے تو انہیں صرف موت ہی بچا سکتی ہے"۔

"نہیں۔ انہیں کوئی گزند نہ پہنچے"۔

"بہتر ہے سردار۔ ایسا ہی ہو گا"۔

نائب سردار نے باہر آ کر سواروں کے ایک دستے کو شہزادے کے دوستوں کو گرفتار کرنے کے لیے
[بھی]جا۔ شہزادے کے ہم پیالہ اور ہم نوالہ دوستوں کو سب ہی جانتے تھے۔ ان کی تلاش اور گرفتاری میں کوئی [دق]
[ق]ت نہ پیش آئی۔ نائب کا بھیجا ہوا دستہ ایک گھنٹے کے اندر اندر مطلوبہ اشخاص کو گرفتار کر کے نائب کے پاس
[لے] آیا۔ ان کے ہتھیار پہلے ہی چھین لیے گئے تھے۔

نائب کو دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ انہیں دشمنی کی بنا پر گرفتار کیا گیا ہے۔ انھوں نے احتجاج کرنا بے کار سمجھا اور
[ا]پنے انجام کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔

نائب سردار نے ان سے کوئی بات نہ کی اور انہیں لیے ہوئے سردارِ لشکر کے خیمے پر پہنچا۔ اندر پہنچ کر اس نے
[سر]دار کو اطلاع دی۔

سردار بڑی بے تابی سے ان کی گرفتاری کا منتظر تھا۔ اس نے انہیں فوراً پیش کرنے کا حکم دیا۔ نائب ان
[قیدی]وں کو اندر لایا۔ ان کے ہاتھ رسیوں سے بندھے تھے۔

"تم نے ان سے کچھ پوچھا تو نہیں۔ کوئی سختی تو نہیں کی؟" سردار نے نائب سے دریافت کیا۔

"نہیں سردار"۔

نائب نے جواب دیا:

"میں نے نہ کچھ پوچھا ہے اور نہ سختی کی ہے۔ آپ کے حکم کے مطابق گرفتار کر کے حاضر کر دیا ہے۔ جو
[ش]ہزادے [کے دوست] ہیں"۔

"تم جا سکتے ہو"۔ سردار نے حکم دیا۔

"میں۔۔۔۔ میں چلا جاؤں؟" نائب نے ہچکچاہٹ کے ساتھ کہا۔ وہ دراصل دیکھنا چاہتا تھا کہ شہزادے
[کے] ان منہ چڑھے لوگوں کو سردار کیا سزا دیتا ہے۔

"کہہ دیا کہ جاؤ۔ تمہارا کام ختم ہو گیا"۔ سردار نے اسے ڈانٹ پلائی۔

نائب چپ چاپ باہر نکل گیا۔

"تم شہزادے جہانگیر کے دوست ہو کیا؟" سردار نے انہیں نرمی سے مخاطب کیا۔

انہوں نے جواب دینے کے بجائے سر جھکا لیا۔

"جواب دو۔"

سردار غصے سے بولا:

"جان کی خیر چاہتے ہو تو سچ سچ جواب دو۔"

"ہاں سردار۔"

ایک نے مریل آواز میں جواب دیا:

"شہزادے بہادر ہم پر مہربان تھے۔"

"شہزادہ جہانگیر کتنی بار دریا پار گئے تھے؟"

انہوں نے پھر خاموشی اختیار کر لی۔

ذرا دیر کے بعد سردار دھاڑا:

"کمبختو۔ امیر تیمور کو معلوم ہو چکا ہے کہ شہزادہ جہانگیر دریا پار کر کے خوارزم کے علاقے میں گئے۔
جھوٹ بولو گے تو امیر تمہاری گردن اڑا دیں گے۔"

ان کے بدن لرز اٹھے۔

انہیں یقین ہو گیا کہ شہزادے کا معاملہ امیر تیمور کے سامنے کھل گیا ہے۔ اب جھوٹ بولنا بیکار
ہے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ایک نے کہا:

"شہزادہ جہانگیر صرف ایک بار پار گئے تھے۔ ہم نے بہت روکا مگر وہ نہیں مانے۔"

سردار نے آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر آنکھیں کھول کر بولا:

"شہزادہ تمہیں بھی ساتھ لے گیا ہو گا؟"

"جی ہاں سردار لیکن۔۔۔۔۔"

"بس بس۔ اب جو کہنا ہے امیر تیمور کے گوش گزار کرنا۔"

سردار اپنی کامیابی پر بڑا خوش تھا:

"ہم تمہیں اسی وقت امیر کے دربار میں بھیج رہے ہیں۔ خبردار جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کرنا۔
ورنہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔"

سردار نے ان کے جواب کا انتظار نہ کیا اور غلام کو بلا کر حکم دیا کہ نائب سردار کو پھر حاضر کیا جائے۔ غلام
چلا گیا۔

سردار کاغذ اور قلمدان لے کر کچھ لکھنے بیٹھ گیا۔ اس نے امیر تیمور کو مختصر سا جواب لکھا جس میں تحریر کیا کہ
شہزادہ جہانگیر نے صرف ایک بار دریا عبور کیا تھا۔ وہ پانچ دوست جو شہزادے کے ساتھ گئے تھے انہیں گرفتار
کر کے امیر کے دربار میں بھیجا جا رہا ہے۔ ان قیدیوں نے اس بات کا اعتراف کر لیا ہے۔ مزید تفصیلات ان
کی زبانی معلوم کی جا سکتی ہیں۔"

سردار خط لکھ کر فارغ ہوا تو اس کا نائب آ گیا۔ سردار نے حکم دیا:

"ان پانچوں کو دو سو سواروں کی حفاظت میں امیر تیمور کے دربار میں بھیج دو۔ ابھی اور اسی وقت۔"

"کیا مجھے ساتھ جانا ہو گا؟" نائب نے دبی آواز میں پوچھا۔

"تم نہیں جاؤ گے۔"

سردار نے اسے گھور کر دیکھا:

"جواب لے کر ہمارا غلام ساتھ جائے گا۔"

"جواب؟"

نائب نے حیرت سے سردار کو دیکھا،

"کس بات کا جواب؟"

"کچھ نہیں۔ تم جاؤ اور ان کے بھیجنے کا انتظام کرو۔ ہر بات میں دخل نہیں دیا کرتے۔" سردار نے بڑے
رعب سے کہا۔

نائب جانے لگا تو سردار نے کہا:

"ان کے ہاتھ کھول دو۔ دو سو سوار ان کی حفاظت کے لیے کافی ہیں۔"

نائب نے بڑی بے دلی سے ان کے ہاتھ میں بندھی ہوئی رسیاں کھول دیں۔

○

شہزادے کے محل میں چہل پہل ہو گئی تھی۔ امیر تیمور دن میں دو ایک بار اسے دیکھنے کے لیے آنے لگا۔ امراء

اور وزراء نے بھی عیادت کے لیے آنا جانا شروع کر دیا تھا۔

سرائے خانم کے سامنے تو شہزادہ شرمایا شرمایا رہتا تھا لیکن حکیم طیب سے وہ کافی بے تکلف ہو گیا۔ اس کے ہمراز تھے۔ دونوں خوب گھل مل کے باتیں کرتے تھے۔

شہزادے نے حکیم طیب کو بتایا تھا کہ شاہ خوارزم کی طرف سے ایک وفد دوستی کا پیغام لے کر آ رہا ہے۔ حکیم طیب نے اندازہ لگایا تھا کہ شہزادہ شاید شاہِ خوارزم کی بیٹی کے عشق میں گرفتار ہے لیکن جب اس طور پر معلومات کیں تو اسے بتایا گیا کہ شاہ خوارزم کی کوئی اولاد نہیں۔ حکیم صاحب کا یہ اندازہ غلط ہوا تو انہوں نے شہزادے کو کریدنا شروع کیا لیکن شہزادہ اپنے عہد پر قائم تھا۔ اس نے حکیم صاحب کو کچھ اور بتانے سے صاف انکار کر دیا۔

امیر تیمور کو شہزادے کی بحالیٔ صحت کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ وہ خود بھی جب شہزادے کو دیکھنے جاتا، شہزادہ بڑی تیزی سے تندرست ہوتا محسوس ہوتا۔ حکیم کی صحبت نے شہزادے پر بڑا خوشگوار اثر ڈالا تھا۔ اب دریائے آمو کے سردار کے جواب کا انتظار تھا۔ اس کے جواب کی روشنی میں ہی کوئی قدم اٹھا سکتا تھا کہ شہزادے درد کا مستقل درماں ہو سکے۔

پھر ایک دن امیر کو اطلاع ملی کہ دریائے آمو کے سردار کا معتمد غلام پانچ قیدیوں کو لے کر آیا ہے۔ قدمبوسی کا آرزومند ہے۔

تیمور کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے اپنی خوشی پر قابو رکھا۔ درباریوں کو رخصت کیا اور معتمد کو طلب کیا۔ احتیاط کے طور پر اس نے اپنے دربار کے چاروں طرف سخت پہرہ لگوا دیا اور تاکید کر دی کہ گفتگو میں کوئی مخل نہ ہونے پائے۔

دریائے آمو کے سردار کا معتمد غلام ڈرا ڈرا امیر تیمور کے دربارِ خاص میں داخل ہوا۔ پانچوں قیدی سواروں کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ امیر نے محسوس کیا کہ معتمد دربار کی شان و شوکت سے مرعوب ہو گیا ہے۔ غلام نے جھک کر تعظیم پیش کی اور جب سیدھے ہو کر اس نے بولنے کی کوشش کی تو رعبِ شاہی سے زبان گنگ ہو گئی۔

"گھبراؤ نہیں قاصد"۔

تیمور نے اسے تسلی دی:

"کیا پیغام دیا ہے سردار نے اور تمہارے ساتھ یہ قیدی کون ہیں؟"

معتمد کو کچھ حوصلہ ہوا۔

"اے تاتاریوں کے شہنشاہ!"

غلام نے بڑی کوشش کے بعد کہا:

"میرے سردار نے کوئی زبانی پیغام نہیں دیا اور نہ میں ان قیدیوں کے بارے میں کچھ جانتا ہوں"۔

پھر وہ جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا:

"سردار نے ایک خط شہنشاہِ عادل کے حضور میں پیش کرنے کا حکم دیا ہے"۔ غلام نے خط نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"ہمارے قریب آؤ۔ ہم اجازت دیتے ہیں"۔

تیمور اپنی گنگا جمنی چوکی پر بیٹھا تھا جس پر حاکمِ وقت کے نشان کے طور پر ایک سفید غندہ پڑا تھا۔

غلام لرزاں و ترساں تیمور کے قریب پہنچا اور خط امیر کی طرف بڑھایا۔

"تم نے یہ خط پڑھا ہے؟" تیمور نے بند خط اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا۔

"اے شہنشاہ! خط بند ہے"۔

غلام نے سنبھل کر جواب دیا:

"اگر خط کھلا بھی ہوتا تو میں شہنشاہِ تاتار کے نامے کو پڑھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا"۔

امیر تیمور نے خط پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔

"مجرموں کو فوراً ہمارے حضور پیش کرو"۔

تیمور خط پڑھتے ہی بولا:

"تم اپنے محافظ دستے کے ساتھ کچھ دن آرام کر کے واپس چلے جانا۔ تمہارے سردار کو کسی جواب کی ضرورت نہیں ہے"۔

امیر تیمور نے سردار کے قاصد کو ایک ہی حکم میں نمٹا دیا۔ شہزادے کے یارِ خاص اس تک پہنچ چکے تھے۔ تیمور کا ہی اتنے دنوں سے انتظار کر رہا تھا۔

غلام باہر آیا اور داروغۂ محل کو امیر کے حکم سے آگاہ کیا۔ . . . . داروغہ نے مجرموں کو اپنی حفاظت میں لیا اور دربار میں پہنچا۔

شہزادے کے یار اپنے انجام سے لرز رہے تھے۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ شہزادے کی دوستی انہیں موت سے دوچار کرے گی۔ جب وہ امیر کے سلام کے لیے جھکے تو ان میں سے ایک خوف سے اس قدر نڈھال ہوا کہ سیدھا ہونے کے بجائے زمین پر گر پڑا۔ اس کے ساتھی سمجھے کہ وہ معافی کے لیے امیر کے قدموں میں گرا ہے۔ وہ بھی فوراً

زمین پر گرے اور گڑگڑانے لگے۔

ایک نے قدموں میں پڑے پڑے کہا،

"اے شاہِ عادل! ہم خطاوار ہیں۔ ہم نے تیرے حکم کے خلاف دریائے آمو پار کیا۔ اس وقت ہماری زندگی تیرے اشارے کی محتاج ہے۔ تو چاہے تو ہمیں بخش سکتا ہے۔ ہمیں دوبارہ زندگی دے سکتا ہے"۔

امیر تیمور اس کا ایک ایک لفظ غور سے سن رہا تھا۔ اس نے پُررعب لہجے میں حکم دیا:

"زمین سے اٹھو اور سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔ ہم تمہاری جان بخشی کا وعدہ کرتے ہیں"۔

پانچوں کی جان میں جان آئی اور وہ امیر کو دعائیں دیتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

امیر تیمور نے پھر کہنا شروع کیا:

"ہم نے تمہاری جان بخشی کا وعدہ کیا ہے لیکن اس شرط پر کہ تم ہمارے تمام سوالوں کا جواب سچ سچ دو گے کوئی بات ہم سے پوشیدہ نہیں رکھو گے۔ اگر تم نے ہمیں مطمئن کر دیا تو ہم تمہاری خطا بھی معاف کر دیں گے ہو سکتا ہے کہ تمہیں پہلے سے زیادہ عظمت حاصل ہو جائے"۔

"اے امیر ذی مقام"!

پانچ میں سے ایک نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا،

"ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم اپنے غلط اقدام کی پوری تشریح کریں گے اور غلط بیانی سے قطعی کام نہیں لیں گے"۔

"پہلی بات تو تم یہ بتاؤ کہ تم نے یا شہزادے نے دریا پار کرنے کی غلطی کتنی بار کی تھی؟" امیر تیمور نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"اے شاہ! ہم سچ کہتے ہیں کہ دریا پار ہم صرف ایک مرتبہ گئے تھے"۔

شہزادے کے ایک دوست نے کہا:

"جہاں تک شہزادے بہادر کا تعلق ہے ان کے لیے بھی ہمیں یقین ہے وہ بھی صرف ایک ہی بار دریا پار گئے تھے ہم لوگ رات دن ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے اور سیر و شکار کو ساتھ ہی لے جاتے تھے۔ اگر شہزادے نے کبھی دوسری بار دریا پار کیا ہوتا تو وہ ہمیں ضرور بتاتے۔ اس لیے کہ ہم ان کے راز دار تھے۔ وہ کوئی بات نہ چھپاتے تھے"۔

"ہمیں تمہاری بات کا یقین آ گیا"۔ امیر نے انہیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا:

"اب یہ بتاؤ کہ خلاف ورزی کا یہ واقعہ کب اور کس طرح پیش آیا؟"

اے امیرِ تاتار"۔

ان میں سے کسی دوسرے نے بتانا شروع کیا:

"ہمیں معلوم تھا کہ دریا کے اس پار دشمن کا علاقہ ہے۔ کبھی کبھی خوارزم کے دو چار سوار بھی ہمیں دوسری جانب گھومتے پھرتے دکھائی دیتے تھے اس لیے ہم دریا سے دور ہی رہا کرتے تھے۔ لیکن ایک دن ایسا ہوا کہ شہزادے بہادر کسی شکار کا پیچھا کرتے ہوئے دریائے آمو کے کنارے پہنچ گئے۔ ہم ان سے پیچھے تھے۔ جب ہم قریب پہنچے تو شہزادے بہادر اپنا گھوڑا دریا میں ڈالے کھڑے تھے اور دوسری طرف خوارزم کے سپہ سالار آق صوفی کی بیٹی خانزادہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھڑی ان کا مذاق اڑا رہی تھی"۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ آق صوفی کی بیٹی تھی؟" تیمور سے ضبط نہ ہو سکا اور بات کاٹ کر سوال کیا۔

"جی ہاں امیر تیمور"۔

اس نے وثوق کے ساتھ کہا:

"یہ بات ہمیں اس وقت معلوم ہوئی جب خانزادہ نے خود اپنا تعارف شہزادے سے کرایا"۔

"ہوں"۔

تیمور نے زور سے ہنکارا بھرا:

"پھر کیا ہوا؟"

"اے شاہِ تاتار، ہم نے شہزادے کو بہت روکا کہ وہ دشمن کے علاقے میں نہ جائیں لیکن لڑکیوں نے انہیں بزدلی کا طعنہ دیا اور شہزادے ہمیں وہیں ٹھہرنے کی تاکید کر کے دریا پار چلے گئے اور دیر تک ان سے دریا پار جا کر باتیں کرتے رہے"۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم لوگ دریا پار نہیں گئے؟"

"ہم بھی گئے تھے اے شاہِ تاتار! لیکن مجبور ہو کر"۔

اس نے کہنا شروع کیا:

"شہزادے اور لڑکیوں کی گفتگو جاری تھی کہ ہمیں دریا پار دور سے گرد اڑتی دکھائی دی۔ چند لمحوں بعد چالیس پچاس سوار گھوڑے دوڑاتے آتے دکھائی دیے۔ اب ہم نے شہزادے کے حکم کی تعمیل نہ کی اور خطرہ سر پر دیکھ کر دریا پار کر کے شہزادے کے پاس پہنچ گئے۔ ان آنے والوں میں خانزادہ کا باپ آق صوفی بھی تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ شہزادہ جہانگیر اس کی بیٹی سے ہم کلام ہے تو شہزادے کے ساتھ بڑی عزت سے پیش آیا۔ وہ دیر تک باتیں کرتا رہا۔ ہم ان کی گفتگو نہ سن سکے کیونکہ شہزادے نے ہمیں دور ہٹ کر کھڑے ہونے کا حکم دیا تھا"۔

"بات صاف ہو گئی تھی۔ امیر تیمور کو یقین ہو گیا کہ شہزادہ جہانگیر خوارزمی سپہ سالار کی بیٹی خانزادہ کی
میں گرفتار ہے۔ پھر اس نے پوچھا:
"کیا آق صوفی کی بیٹی بہت خوبصورت ہے؟"
تیمور کے اس سوال پر وہ سب گھبرا گئے اور ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔
"گھبراؤ نہیں۔ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔"
تیمور نے انہیں پھر یقین دلایا:
"کیا شہزادہ جہانگیر، سپہ سالار کی بیٹی کی گفتگو میں دلچسپی لے رہا تھا؟"
"جی ہاں!"
ایک نے نظریں نیچی کر کے کہا:
"صرف شہزادے اور خانزادہ میں گفتگو ہو رہی تھی۔ سہیلیاں الگ کھڑی تھیں۔ شہزادے بہادر بھی
ہنس کر باتیں کر رہے تھے!"
"تم نے ہمیں پوری طرح مطمئن کر دیا ہے۔"
امیر تیمور نے ان کے جرم کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا:
"ہم تمہیں معاف کرتے ہیں اور تمہیں اپنے عہدوں پر بحال کیا جاتا ہے۔"
پانچوں دوستوں کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو ٹپکنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ تیمور کا شکریہ کن الفاظ
میں ادا کریں۔
"تم لوگ فی الحال ہمارے محافظ دستے میں رہو گے۔"
تیمور کی آواز ابھری:
"شہزادے کی طبیعت ابھی ناساز ہے۔ ان کے اچھا ہوتے ہی تمہیں ان کے ساتھ حسب سابق بھیج دیا
جائے گا مگر یہ خیال رہے کہ تم اپنی زبانیں بند رکھو گے اور کسی کو نہ بتاؤ گے کہ شہزادے سے دشمن کے علاقے
کی غلطی کی تھی۔ اس سے تمہارے شہزادے پر نااہلی کا دھبہ لگ جائے گا جو شاید تم بھی پسند نہ کرو کیونکہ
شہزادے کے بہی خواہ اور سچے دوست معلوم ہوتے ہو۔"
ایک نے سر نیچا کر کے ادب سے کہا:
"اے شاہ! خواہ ہماری گردنیں کٹ جائیں لیکن ہم اس واقعہ کا ذکر زبان پر نہ لائیں گے۔ شہزادے کی
اور عظمت ہماری جان سے زیادہ قیمتی شے ہے۔"

امیر تیمور نے شہزادے کی بدنامی اور نااہلی کا ذکر کر کے دراصل انہیں ہلا دیے میں ڈالا تھا تاکہ وہ شہزادے سے
اور خانزادہ کی ملاقات کو کوئی اہمیت نہ دیں اور ان کی سوچ شہزادے کے دریا پار کرنے کی غلطی سے آگے نہ بڑھے۔
در امیر تیمور اس معاملے میں پوری طرح کامیاب ہوا کیونکہ جب ان لوگوں نے آپس میں اس مسئلے پر گفتگو کی تو ان
میں سے کسی کا دھیان خانزادہ کی طرف نہیں گیا۔
امیر تیمور نے سردار موئڈارلات اور حکیم طبیب کو بتایا کہ شہزادے کے درد کا درماں خوارزم کے سپہ سالار
آق صوفی کی بیٹی خانزادہ کے پاس ہے بلکہ وہ خود اس مرض کی دوا اور مسیحا ہے۔
امیر تیمور نے جب اس سلسلے میں اپنی کوشش اور حکمت عملی کی تفصیل بتائی تو حکیم طبیب اور سردار ارلات
اس کی عقل و فراست کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔
شہزادے نے خانزادہ کا نام لبوں میں ہی رکھا تھا لیکن تیمور کی نظریں شہزادے کے دل تک پہنچ گئیں اور
خانزادہ کو ڈھونڈ نکالا۔
امیر تیمور نے دونوں رازداروں کے مشورے سے فیصلہ کیا کہ وہ شہزادہ جہانگیر کا رشتہ خانزادہ کے لیے
شاہ خوارزم کے پاس بھیجے گا تاکہ اسے شان و شوکت سے اپنی بہو بنا کر لائے۔ بظاہر اس میں اس کی سبکی تھی۔
شاہ خوارزم حسین صوفی اب تک خود سری اور سرکشی پر آمادہ تھا۔ اس نے مبارکباد کا رسمی پیغام تک نہ بھیجا تھا،
اب اسے اپنے پیارے بیٹے کے لیے اسی خود سر سے درخواست کرنی پڑ رہی تھی۔
موئڈارلات نے اس خیال و فیصلے کی مخالفت بھی کی لیکن حکیم طبیب نے سمجھا بجھا کر اسے رام کر لیا بلکہ شہزادے
کا پیغام لے کر جانے والے وفد کے قائد کے لیے اسی کا نام تجویز کیا۔ امیر تیمور نے بھی اسے پسند کیا۔
امیر تیمور نے اس سلسلے میں سرائے خانم کو بھی اعتماد میں لینا ضروری سمجھا کیونکہ وہ سوتیلی ہی سہی لیکن تھی تو
جہانگیر کی ماں۔ اولاد کی شادی بیاہ کے معاملات میں ماں کی رائے نہ لینا یوں بھی خلاف مصلحت تھا۔ اس سے سرائے
خانم کی دل آزاری ہوتی۔
"سرائے خانم۔ ایک خانگی معاملے میں تمہاری رائے مطلوب ہے۔" تیمور نے اس کے پاس پہنچ کر محبت سے کہا۔
"شکر ہے کہ امیر کو میرا خیال تو آیا۔"
سرائے خانم تلخ لہجے کو دباتے ہوئے بولی:
"اگر رائے شہزادے کی شادی کے بارے میں ہے تو میں امیر سے اتفاق کرتی ہوں۔ یہ قدم انہیں پہلے اٹھانا
چاہیے تھا۔"
امیر تیمور بھونچکا رہ گیا۔

"سرائے خانم تمہیں کس نے اطلاع دی؟" تیمور نے تعجب سے پوچھا۔

"اندازے بھی کوئی چیز ہوا کرتے ہیں امیر۔"

سرائے خانم سنجیدگی سے بولی:

"جوان بچوں کی بیماری، ماں کی نظروں سے نہیں چھپ رہتی۔"

"اگر جانتی تھیں تو تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

امیر تیمور بگڑ گیا:

"تمہیں کیا پتہ، ہمیں یہاں تک پہنچنے میں کن کن راہوں سے گزرنا پڑا۔ تم خاموشی سے ہمارا کود یکھتی رہیں۔"

"گستاخی معاف امیر۔"

سرائے خانم نے اس کے غصے کی کوئی پروا نہ کی:

"آپ نے خود جوان اولاد کی طرف سے تغافل برتا۔ میں اس خیال سے خاموش تھی کہ اگر میں شہزادے کی بات بتاتی تو آپ کو جلال آجاتا کیونکہ آپ امیر تاتار پہلے ہیں اور باپ بعد میں۔ پھر یہ بھی خدشہ تھا کہ آپ سمجھ بیٹھیں کہ میں باپ کو بیٹے سے جدا کرنا چاہتی ہوں۔"

سرائے خانم کے لہجے میں کچھ تلخی تھی لیکن اس کی ہر بات حقیقت پر مبنی تھی۔

تیمور نرم ہو گیا۔ بولا:

"تو کیا تمہاری بھی یہی رائے ہے کہ خانزادہ کے لیے شہزادے کا پیغام بھیجا جائے؟"

"خانزادہ؟"

سرائے خانم نے تیمور کو حیران نظروں سے دیکھا۔

"یہ کون ہے اور شہزادے کا اس سے کیا تعلق ہے؟"

سرائے خانم کو اپنی جاسوس کنیزوں کے ذریعے یہ تو معلوم ہو گیا کہ شہزادہ کسی لڑکی کو دیکھ کر روگ لگا بیٹھا ہے۔ اس کے خیال میں اس کا بہترین علاج یہ تھا کہ شہزادے کی فوراً شادی کر دی جائے تاکہ اس کا خیال بٹ جائے اور وہ کسی اور طرف توجہ دے سکے۔ خانزادہ کے بارے میں ابھی اسے اطلاع نہ ملی تھی۔ سرائے خانم کو تیمور نے پوری داستان اس کے سامنے دہرانا پڑی۔ سرائے خانم کی بھی سمجھ میں آ گیا کہ اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے اور شہزادہ سوائے خانزادہ کے کسی اور کی طرف توجہ نہ دے گا۔ اس لیے اس نے امیر تیمور سے پوری طرح اتفاق کیا۔

اکثر قدرت اس قدر مہربان ہوتی ہے اور اتنا کچھ دیتی ہے کہ پانے والے کو کوتاہ دامنی کا شکوہ ہو جاتا ہے۔ تیمور کو اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دیا تھا۔ عزت، شہرت اور مال و دولت۔ لیکن انسان کی خواہشیں پھر بھی پوری نہیں ہوتیں۔

امیر تیمور ابھی خانزادہ کا پیغام بھیجنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ قدرت نے چھپر پھاڑ کر اس کی یہ مراد بھی پوری کر دی۔ ایک شام اسے اطلاع دی گئی کہ خوارزم کا وفد شاہِ خوارزم کا مبارک باد کا پیغام لے کر آ رہا ہے اور ساتھ میں بیش بہا تحائف بھی لایا ہے۔

تیمور کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ سب سے زیادہ خوشی شہزادہ جہانگیر کو ہوئی۔ اس نے ابھی تک اپنے محل سے قدم نہیں نکالا تھا لیکن خوارزم کے وفد کی خبر سن کر اس میں اتنی توانائی آگئی کہ وہ نہا دھو کر لباسِ فاخرہ پہن کر دربار میں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

شہزادے نے حکیم طبیب کو بلا کر کہا:

"دیکھا آپ نے محترم حکیم۔ میں نہ کہتا تھا کہ خوارزم سے وفد ضرور آئے گا۔"

شہزادے کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔ اس کا چہرہ دمک اٹھا تھا۔ کوئی نہ اندازہ کر سکتا تھا کہ شہزادہ کسی سخت بیماری سے گزر رہا ہے۔

حکیم صاحب مسکرا کر بولے:

"مجھے آپ کی بات پر یقین تھا لیکن اس وفد کے آنے سے آپ کو کیا فائدہ ہو گا۔ اس کے آنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟"

شہزادہ گھبرا گیا۔ وہ کس طرح کہتا کہ اس نے وفد بھیجنے کے لیے خانزادہ کے باپ آق صوفی سے درخواست کی تھی۔ بات بنانے کے لیے کہا:

"فائدہ کیا ہو گا؟ دونوں سلطنتوں میں دوستی کے رشتے استوار ہو جائیں گے اور.... " وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا اور ادھر ادھر دیکھ کر رہ گیا۔

"جی ہاں شہزادے۔ آپ نے صحیح فرمایا۔"

حکیم طبیب اس کے چہرے پر نظریں جما کر بولے:

"اس سے یہ بھی فائدہ تو ہو سکتا ہے کہ خوارزم جانے کی راہیں آپ پر کھل جائیں اور پھر کسی دن دریائے آمو کے کنارے کسی کی انتظار بھری آنکھوں کو دیکھ سکیں۔"

شہزادے کو پسینہ آ گیا۔ وہ بغلیں جھانکنے لگا۔ انگلیاں چٹخاتے ہوئے بولا:

"آپ بابا تیمور سے کہہ کر مجھے دربار میں جانے کی اجازت دلا دیجیے۔ میں خود بھی وفد کے ارکان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"میں آپ کی آرزو بھری درخواست امیر کے حضور میں پیش کروں گا۔"

حکیم طبیب نے مسکراتے ہوئے کہا:

"امید ہے کہ درخواست منظور ہو جائے گی۔"

لیکن جب حکیم نے امیر تیمور سے شہزادے کے دربار میں جانے کی اجازت چاہی تو اس نے یہ درخواست سختی سے رد کر دی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شہزادے کے سامنے کوئی ایسی گفتگو ہو جس سے وفد والوں کو کوئی غلط فہمی ہو جائے۔ حکیم کو امیر کا انکار پسند نہ آیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ امیر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا:

"محترم حکیم! شہزادہ جوان عمر اور نادان ہے۔ سرِ دربار اس کے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکل گئی تو پورے منصوبے پر پانی پھر جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ شہزادے کو ہمارا انکار ناگوار گزرے گا۔ ہماری طرف سے اس کو یہ کہہ دیا جائے کہ خوارزم کا وفد دور سے سفر کر کے آیا ہے۔ اسے فی الحال مہمان خانے میں رکھا جائے گا۔ دو دن بعد جب وفد آرام کر لے گا تو اسے دربار میں حاضری کا حکم ہوگا۔ اس وقت شہزادے کو بھی بلوا لیا جائے گا۔"

امیر تیمور نے شہزادے کو حکیم کے ذریعے اس طرح مطمئن کر دیا۔ دوسری طرف اس نے رات کو وفد کو خفیہ طور پر اپنے محل میں طلب کر لیا۔

شاہ خوارزم حسین صوفی نے تیمور کے لیے ریشمی پارچہ جات، مرصع زیورات، خنجر، تلواریں، جن کے قبضوں اور دستوں پر جواہرات جڑے تھے اور نادر قسم کے ظروف تحفے میں بھیجے تھے۔ وفد نے مبارکباد دینے کے بعد تحائف امیر تیمور کے ملاحظے کے لیے پیش کیے۔

تیمور تحائف دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے وفد کے ہر رکن کو جواہرات کا ایک ایک ہار دیا جس کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں۔ وفد کو تیمور سے اس حسنِ سلوک کی امید نہ تھی۔ انہوں نے اس کی شان میں قصیدے شروع کر دیے۔

تیمور نے شاہ خوارزم اور اس کے افراد کی خیریت دریافت کی۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد ان الفاظ میں کہا:

"ہم شاہِ خوارزم کے خلوص سے بہت متاثر ہوئے۔ ہم چاہتے ہیں کہ سمرقند اور خوارزم کی دوستی میں اضافہ پیدا ہو۔ اس کا بہترین طریقہ ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ ہم شہزادہ جہانگیر ولی عہد سلطنت کا رشتہ حسین صوفی کے ہاں میں کریں۔"

نہایت نیک خیال ہے امیر عالی مقام کا۔"

ایک رکن بولا:

"اس رشتے سے دونوں ملک اور قریب آ جائیں گے۔"

"شاہ تاتار کی دور اندیشی پورے ملک تاتار میں مشہور ہے۔"

دوسرے رکن نے سنبھل کر کہا:

"خوارزم کی یہ خوش نصیبی ہوگی کہ ولی عہدِ سمرقند کا رشتہ وہاں کیا جائے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تمہیں ہماری رائے سے اتفاق ہے۔" امیر تیمور نے انہیں اپنا ہمنوا بنانے کے لیے کہا۔

"اس میں اتفاق رائے کا کیا سوال۔ ہم تو دل سے چاہتے ہیں کہ آپ اس مسئلے میں قدم اٹھائیں۔" ایک اور نے کہا۔

"تم لوگ سفر کی تھکان سے چور ہو گے۔"

تیمور نے ان کی دلجوئی کی:

"سمرقند میں خوب آرام کرو۔ چلتے وقت ہم شاہ خوارزم کے نام ایک خط دیں گے اور اس میں یہ تجویز پیش کریں گے۔"

وفد مہمان خانے میں واپس چلا گیا۔

تیمور نے اسی وقت سرائے خانم کو بلوا لیا اور اس کے ذریعے شہزادہ جہانگیر کو اطلاع بھجوائی کہ خوارزم سے آئے وفد کے ذریعے خانزادہ کا رشتہ شہزادے کے لیے مانگا جا رہا ہے۔ سرائے خانم خوشی خوشی شہزادے کے پاس پہنچی اور یہ مسرت انگیز خبر اسے سنائی۔

شہزادہ اس اطلاع پر سخت حیران ہوا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ سرائے خانم نے ایک بار پھر اپنی بات دہرا کر اسے یقین دلایا کہ یہ حقیقت ہے اور اس سلسلے میں امیر تیمور مجوزہ خط کا مسودہ تیار کر رہے ہیں .... شہزادے کی رہی سہی بیماری بھی دور ہو گئی۔ اب اسے وفد سے ملاقات کی کوئی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور سرائے خانم کو بھی اس سے آگاہ کر دیا۔

○

ایک ہفتے کے بعد جب خوارزم کا وفد جانے لگا تو امیر تیمور نے شاہِ خوارزم کے لیے اس کے بھیجے ہوئے

تحائف سے زیادہ قیمتی تحفے وفد کے ساتھ کیے۔ تیمور نے وفد کو وہ خط بھی دیا جس میں خانزادہ کا رشتہ [illegible]
تھا۔ وفد خوشی خوشی واپس ہوا اور قطعِ منازل کرتا ہوا جس وقت خوارزم کے صدر مقام اور گنج میں [illegible]
اس وقت شاہ خوارزم اپنے سرداروں کے ساتھ بیٹھا ہوا تیمور کی بڑھتی ہوئی طاقت کے بارے [illegible]
کر رہا تھا۔

اس نے وفد کو فوراً بلوالیا۔ وفد کے ارکان نے تیمور کے تحائف کو خوانوں اور کشتیوں [illegible]
دربار میں پہنچے۔ شاہ خوارزم اور اس کے درباری ان قیمتی تحفوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے [illegible]
ملاحظہ کے بعد شاہ خوارزم نے امیر تیمور اور اس کے اہل و عیال کی خیریت دریافت کی۔ وفد [illegible]
رکن نے جواب میں امیر تیمور کا خط شاہ کی خدمت میں پیش کیا۔

شاہ نے خط پڑھا تو اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ درباری شاہ کے چہرے کے اس [illegible]
فوری تغیر کا سبب نہ سمجھ سکے مگر وہ خاموش رہے اور شاہ خوارزم کے بولنے کا انتظار کرنے [illegible]
نے درباریوں پر نظر ڈالی اور سوائے چند اہم سرداروں کے باقی سب کو رخصت کر دیا۔

دربار میں شاہ خوارزم کے دونوں چھوٹے بھائی یوسف صوفی اور آق صوفی بھی موجود تھے۔ یو [illegible]
خوارزم کا ناظم تھا۔ یہ عہدہ وزیر اعظم کے برابر ہوتا تھا۔ چھوٹا بھائی آق صوفی سپہ سالار لشکر تھا۔ [illegible]
آمو کی جنوبی کمان سپرد کی گئی تھی۔ ان دنوں اسے شاہ خوارزم نے مشورے کے لیے اور گنج بلوایا تھا۔

شاہ خوارزم نے جلد ہی اپنے غصے پر قابو پالیا اور سنجیدگی سے بولا:

"تیمور نے خانزادہ کا رشتہ اپنے بیٹے جہانگیر کے لیے مانگا ہے۔ تمہاری کیا رائے ہے یوسف [illegible]

یوسف کو اس رشتے میں کوئی عیب نظر نہ آیا۔ اس نے فوراً تائید کی:

"اے شاہ خوارزم! اگر یہ رشتہ منظور کر لیا جائے تو اس سے دونوں سلطنتوں میں دو [illegible]
پیدا ہو جائیں گے اور حالتِ جنگ ختم ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ شہزادہ جہانگیر ولی عہد سلطنت بھی [illegible]
رد کرنے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔"

"تم تو ضرور خوش ہو گے آق صوفی؟"

شاہ خوارزم نے بڑے طنزیہ انداز میں اسے مخاطب کیا:

"تمہاری بیٹی شاہِ تاتار کی بہو بن جائے گی اور تیمور کے بعد اسے ملکہ کا درجہ حاصل ہو گا۔"

آق صوفی کو یہ تلخ انداز کچھ برا لگا۔ وہ ایک لمحہ کو شاہ کو حیران نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا:

"اے شاہ میری خوش قسمتی اور رضامندی آپ کے فیصلے کی تابع ہے۔ خانزادہ کو آپ کی بیٹی [illegible]

[illegible] ہے۔ آپ کا ہر فیصلہ اس کے لیے قابلِ قبول ہو گا۔ یوں شہزادہ جہانگیر۔۔۔"

[illegible] آق صوفی کہتے کہتے اک دم رک گیا۔ شاید وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ شہزادہ جہانگیر سے مل چکا ہے اور اس
[illegible] اور شجاعت سے متاثر ہے لیکن اس نے شاہ سے جہانگیر سے اپنی ملاقات کا ذکر نہ کیا تھا اور اس وقت
[illegible] کسی طرح مناسب نہ تھا۔

[illegible] سنو یوسف اور آق صوفی!"

[illegible] شاہ خوارزم بڑے جوش سے بولا:

[illegible] بے شک ہم نے مغلوں کی اطاعت قبول کی تھی لیکن وہ بلادِ شمال کے عظیم الشان بادشاہ تھے اور تیمور۔۔۔
[illegible] ایک چالاک لومڑی ہے۔ وہ جہانگیر کا خانزادہ سے رشتہ جوڑ کر خوارزم پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھ رہا ہے
[illegible] لیکن ہم اس کو اس کوشش میں کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ وہ خوارزم کو مغلوں کا مقبوضہ علاقہ سمجھتا ہے اور
[illegible] مت دے کر خوارزم کو اپنا علاقہ سمجھ بیٹھا ہے مگر خوارزم پہلے بھی آزاد تھا اور اب بھی خود مختار ہے۔ ہم برابری
[illegible] ں سے دوستی تو کر سکتے ہیں لیکن اس کی حاکمیت قبول نہیں کر سکتے۔"

[illegible] یوسف صوفی اور آق صوفی کو سانپ سونگھ گیا۔ انہوں نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔

[illegible] اس نے پھر بولنا شروع کر دیا:

[illegible] تیمور کے بیٹے کا رشتہ ہمارے قبیلے میں نہیں ہو سکتا۔ ہم جلائر ہیں اور ملکِ تاتار میں ہمارا قبیلہ سب سے
[illegible] بلند ہے۔ آق صوفی چاہے تو اپنی بیٹی بیاہ دے لیکن یہ شادی ہماری مرضی کے خلاف ہو گی۔"

[illegible] آق صوفی دل سے تو یہی چاہتا تھا کہ خانزادہ کی شادی شہزادہ جہانگیر سے ہو جائے لیکن خوارزم شاہ کی مخالفت
[illegible] ت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی کہنا پڑا:

[illegible] شاہ خوارزم کی مرضی کے خلاف قدم اٹھانے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ خانزادہ ہمیشہ کنواری بیٹھی رہے میں
[illegible] بان کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں جس سے ملک خوارزم کے مفاد کو نقصان پہنچنے کا ذرا بھی امکان ہو۔
[illegible] لہٰذا میں۔ وہ اس رشتے کے لیے سختی سے انکار کر دیں"۔

[illegible] یوسف صوفی کے دل میں چور تھا۔ اس نے تیمور اور امیر حسین کی جنگ کے دوران اس علاقے میں کئی مرتبہ
[illegible] کی۔ اسے خطرہ تھا کہ اگر تیمور سے دوستی ہو گئی تو تیمور اس سے ضرور باز پرس کرے گا۔ اس نے اپنے بعض
[illegible] کے بہت زور دینے پر انہیں خوش کرنے کے لیے تیمور کے دربار میں وفد بھیجا تھا ورنہ وہ تیمور کو ایک
[illegible] معمولی سردار سے زیادہ اہمیت دینے پر تیار نہ تھا۔

[illegible] خوارزم کے وہ سردار جنہوں نے شاہ خوارزم کو تیمور کے پاس وفد بھیجنے پر مجبور کیا تھا، جب ان کے دماغ میں

یہ بات بٹھائی گئی کہ امیر تیمور اس رشتے کی آڑ میں خوارزم پر قبضے کا خواہش مند ہے تو وہ بھڑک اٹھا
بھی شاہ خوارزم پر زور دیا کہ اس رشتے سے انکار کر دیا جائے۔

شاہ خوارزم کو اپنے سرداروں کا تعاون حاصل ہوا تو اس نے امیر تیمور کو جواب میں ایک ایسا
گستاخانہ خط لکھا جس کے آخری جملے سے پورے خط کی تلخی، گستاخی اور سختی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔
تیمور کو خط میں لکھا:

"میں نے خوارزم کا ملک تلوار سے فتح کیا ہے۔ اسے تلوار ہی سے
چھینا جا سکتا ہے۔"

اس جملے سے صرف خط کی تلخی کا ہی اندازہ نہیں ہوتا بلکہ اس سے تیمور کے اس ہیجان کا
کیا جا سکتا ہے جس میں وہ یہ خط پا کر مبتلا ہوا ہو گا۔ امیر تیمور دربار میں تلوار بلند کر کے پکارا

"جنگ۔ جنگ۔ جنگ!"

اس واضح اعلان کے بعد سمرقند میں جنگ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ امیر تیمور نے اپنے
فوجی کر فوراً سمرقند پہنچنے کا حکم دیا۔ عوام و خواص دونوں کو جنگی بخار ہو گیا۔ صرف علمائے دین اور
ایک ایسی جماعت تھی جو اس جنگ کو پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھتی تھی۔ ملکِ تاتار مسلسل خانہ جنگی
ملک کی معیشت تباہ ہو گئی تھی۔ ان کے خیال میں اب ملک کسی مزید خانہ جنگی کا بوجھ برداشت
باہر سے کوئی حملہ ہوا ہوتا تو یہ جماعت اعتراض کے بجائے حمایت کا اعلان کرتی لیکن یہ تو تاتاریوں
مقابلہ تھا۔ سب ہی تو تاتاری تھے۔

علما اور صوفیا کو مولانا زین الدین کے شہرِ سبز جانے کا بڑا افسوس تھا۔ وہ کچھ ہی دن پہلے
علما اور صوفیا نے غور و فکر سے ایک مجلس کا اہتمام کیا۔ ان سب کی ایک ہی رائے تھی:

"جنگ سے گریز کیا جائے اور صلح کی گفتگو کی جائے۔"

بحث و مباحثہ ہوا اور چند منٹوں کی گفتگو کے بعد طے ہوا کہ دو عالموں اور دو صوفیوں پر
تیمور سے ملاقات کرے اور اسے جنگ کی بجائے گفت و شنید کی ترغیب دے۔

دوسرے دن اس وفد نے امیر تیمور سے ملاقات کی اور بڑے تحمل اور بردباری سے اسلامی
کا حوالہ دے کر اسے جنگ سے قبل افہام و تفہیم پر آمادہ کرنا چاہا۔

امیر تیمور نے پہلے تو صاف انکار کر دیا لیکن جب وفد نے مولانا زین الدین کا نام لے کر
سے اس بات کا وعدہ لیا تھا۔ وہ ہر اہم معاملے میں علما اور صوفیائے کرام کا مشورہ بھی حاصل کر

پڑ گیا۔ اس نے جز بز ہو کر وفد سے پوچھا:

"آخر آپ لوگ چاہتے کیا ہیں؟"

"ہم تاتاری کے ہاتھوں تاتاری کا خون بہانا نہیں چاہتے۔"

وفد کے ایک رکن صوفی جلال الدین نے کہا:

"ہم امیر کو جنگ سے نہیں روکتے لیکن شاہ خوارزم سے سمجھوتے کی بات کی جائے۔ اگر وہ سمجھانے بجھانے
سے کسی بات سمجھوتے پر رضامند ہو جائے تو خانہ جنگی نہ کی جائے اور اگر وہ ضد پر اڑا رہے تو پھر اسے سزا دی جائے۔"

امیر تیمور کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا:

"ہم مولانا زین الدین سے کیے ہوئے وعدے سے انحراف نہیں کریں گے۔ آپ لوگ یہ کوشش بھی کر
دیکھیں!"

"ہم امیر کے شکر گزار ہیں۔"

جلال الدین نے کہا:

"میں خود خوارزم جا کر حسین صوفی کو سمجھاؤں گا۔ امید ہے کہ وہ راہِ راست پر آ جائے گا۔"

لیکن صوفیا اور علما اپنی کوششوں میں ناکام ہو گئے۔

صوفی جلال الدین نے رختِ سفر باندھا اور خوارزم پہنچ گئے۔ شاہ خوارزم ان سے بڑی عزت سے پیش آیا
لیکن جب جلال الدین حرفِ مدعا زبان پر لائے اور حسین صوفی کو اونچ نیچ سمجھا کر اسے صلح پر آمادہ کرنا چاہا تو شاہ کو
طیش آ گیا۔ اس نے امیر تیمور کو خوب گالیاں دیں اور صوفی جلال الدین کو قید خانے بھیج دیا۔

صوفی جلال الدین کی گرفتاری کی خبر بہت جلد تیمور کو ہو گئی۔ اس نے لشکر کو فوراً کوچ کا حکم دیا۔ شہزادہ جہانگیر
امید و بیم کے درمیان لٹک رہا تھا۔ جب اس کا پیغام خوارزم شاہ کو بھیجا گیا تھا تو وہ بہت خوش تھا لیکن شاہ کے
انکار سے اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ پھر جب صوفی جلال الدین خوارزم روانہ ہوئے تو اس کی امید دوبارہ بندھی۔
لیکن صوفی جلال الدین کی گرفتاری نے اس کی امید نے پھر دم توڑ دیا۔ اب جنگ کا اعلان ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی
تمام امیدیں خوارزم کی فتح سے وابستہ کر لیں۔

شہزادہ جہانگیر نے بھی اس جنگ میں حصہ لینے کی پوری تیاریاں کی تھیں۔ اس کے پانچوں یار بحال ہو
کر اس کے محافظ دستے میں پھر سے شامل ہو گئے تھے۔

امیر تیمور نے شہزادہ جہانگیر کو کوچ کے وقت اپنے پاس بلایا اور بڑے پیار سے سمجھایا:

"جنگ کے ایام میں شاہِ وقت اور ولی عہدِ سلطنت ایک ساتھ دار السلطنت سے دور نہیں رہ سکتے۔ ہم

خوارزم جا رہے ہیں۔ تمہاری دارالسلطنت میں موجودگی ضروری ہے۔ یوں بھی شاہ اور شہزادے دلہن کو بیاہ جایا کرتے۔ دلہن خود رخصت ہو کر ان کے پاس آتی ہے۔ تم اطمینان سے سمرقند میں قیام کرو اور امورِ سلطنت دو۔ ہم تمہاری دلہن کو رخصت کرا کے بہت جلد واپس آ جائیں گے"۔

شہزادے کو خوارزم نہ جانے کا افسوس تو ہوا لیکن اس نے نہایت سعادت مندی سے باپ کے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

شاہِ خوارزم حسین صوفی نے تیمور کو جواب بھجوانے کے بعد اپنی منتشر فوجوں کو حکم بھیج دیا تھا کہ وہ قلعوں میں پہنچ کر قلعہ بند ہو جائیں۔

حسین صوفی کا بھائی آق صوفی اپنی بیٹی خانزادہ کے ساتھ دارالسلطنت اورگنج آیا ہوا تھا۔ شاہ خو انہیں وہیں روک لیا تھا اور اس کا تمام لشکر قلعہ کرت، قلعہ خیوہ اور زاورگنج میں جمع ہو کر دفاعی جنگ کی میں مصروف تھا۔

امیر تیمور نے جب اورگنج کی طرف یلغار شروع کی تو وہ اس قدر تیز رفتاری سے بڑھا کہ اس کا لش رہ گیا اور وہ اپنی کچھ فوج کے ساتھ کرت کے قلعے پر پہنچ گیا۔

امیر تیمور جنگ کے معاملے میں اکثر و بیشتر عجلت پسندی سے کام لینے کا عادی تھا۔ کرت کے قلع اس نے لشکر کے آنے کا بھی انتظار نہ کیا اور فوراً حملے کا حکم دے دیا۔

قلعے کے گرد ایک گہری خندق تھی۔ تیمور کے فوجیوں نے درخت کاٹ کر اس کی لکڑی اور شاخوں پاٹ کر فصیل تک راستہ بنایا اور فصیل پر سیڑھیاں لگا کر چڑھنے لگے۔ قلعہ کے اوپر سے تیروں کی بارش تھی لیکن تیموری فوجی جان پر کھیل کر اوپر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس قلعہ پر حملے کے دوران تیمور کے جانباز سردار شیخ علی بہادر نے بے مثال شجاعت کا مظاہ جس سیڑھی سے فصیل پر چڑھ رہا تھا اس سیڑھی پر اس کا افسر مبارک خان بھی تھا۔ کہتے ہیں فصیل کی منڈیر پر پہلے شیخ علی بہادر کا ہاتھ پڑا۔ اس کا افسر مبارک خاں اپنے ماتحت کی یہ سبقت برداشت نہ کر سکا۔ اس نے شیخ کا گھٹنا پکڑا اور اسے نیچے کھینچ لیا۔ شیخ علی بہادر اس سے نیچے آ گیا اس طرح سب سے پہلے مبارک فصیل پر

شیخ علی بہادر اور دوسرے ساتھی بعد میں پہنچ گئے۔ کرت کے محافظ زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکے اور انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔

تیمور قلعہ فتح کر کے خیوہ کی طرف بڑھا۔ خیوہ سرخ ریگستان میں واقع تھا۔ اس بے آب و گیاہ میدان کو امیر اپنے بے سروسامانی کے دنوں میں پہلے بھی عبور کر چکا تھا۔ اب تو وہ ہر قسم کے سامان سے لیس تھا۔ اسے ریگستان پار کرنے میں کوئی خاص دقت پیش نہ آئی۔

خیوہ والے امیر تیمور کو اپنے سر پر دیکھ کر اس قدر گھبرائے کہ ایک معمولی جھڑپ کے بعد انہوں نے قلعے کے دروازے کھول دیے۔ تیمور نے تھوڑی سی فوج وہاں بٹھا دی اور اورگنج کا رخ کیا۔

خوارزم کا دارالسلطنت اورگنج، سمرقند سے شمال مغرب میں تقریباً چھ سو میل دور بحیرۂ ارال کے کنارے واقع ہے۔ اس جگہ دریائے آمو اس بحیرہ میں گرتا ہے۔ امیر تیمور جب یہ طویل سفر کر کے جس میں کرت اور خیوہ کی فتح بھی شامل تھی، اورگنج پہنچا تھا، اس نے شاہ خوارزم کو حیران کر دیا تھا۔ خوارزم کے دونوں مضبوط قلعے اس کے ہاتھ سے نکل چکے تھے اور تیمور نے قلعے کا محاصرہ کر کے حملے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔

ان تمام باتوں سے شاہ خوارزم حسین صوفی اس قدر پریشان ہوا کہ اس نے اپنے تمام سرداروں سے تیمور کے ساتھ صلح کرنے کا مشورہ کیا۔ اس کے سرداروں کو اپنی کھلی شکست نظر آ رہی تھی وہ فوراً صلح پر آمادہ ہو گئے لیکن ان کے امیر کیخسرو نے یہ صلح نہ ہونے دی۔

امیر کیخسرو ختلانی پہلے امیر تیمور کا حلیف اور ساتھی تھا لیکن اس نے خوارزم پہنچ کر خوارزم کے شاہ کو تیمور کے خلاف اور زیادہ بھڑکایا۔

ادھر تو صلح کی بات چیت میں کیخسرو ختلانی سائل ہو گیا۔ اُدھر امیر تیمور قلعہ شکن آلات اور منجنیقوں کی تیاری میں مصروف تھا۔ اورگنج کا قلعہ بہت مضبوط تھا اور اسے ان آلات کے بغیر قبضے میں لانا ممکن نہ تھا۔ اس محاصرے کے دوران ہی حسین صوفی کا انتقال ہو گیا اور یوسف صوفی خوارزم کا بادشاہ بن گیا۔ حسین صوفی کو اپنی بہادری پر بڑا ناز اور وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اسے اپنی شجاعت پر اس قدر گھمنڈ تھا کہ اس نے امیر تیمور کو دعوتِ مبارزت

اور گنج کے قلعہ کا دروازہ کھلا۔ ایک خوارزمی سوار نیزے پر سفید جھنڈا باندھے قلعے سے نکلا
لشکر کی طرف بڑھا۔ صلح کے اس پیامبر کو فوراً امیر تیمور کے خیمے میں پہنچا دیا گیا۔

پیامبر نے امیر کو سلام کرنے کے بعد کہا:

"اے امیر تاتار۔ میں اپنے بادشاہ، شاہ خوارزم یوسف صوفی کی طرف سے پیغام لایا ہوں۔
خوارزم کا امیر حسین صوفی ہے۔"

امیر تیمور نے اس کی بات کاٹ دی:

"یہ صوفی کون ہے اور اس نے ہمیں پیغام بھیجنے کی جرأت کیسے کی؟
اے امیر تاتار۔"

پیامبر نے سنبھل کر فوراً وضاحت کی:

"شاہ حسین صوفی، مرحوم ہو چکے ہیں اور اب ہمارے بادشاہ یوسف صوفی ہیں
ہیں۔"

تیمور ایک لمحہ خاموشی کے بعد بولا:

"کیا پیغام لائے ہو؟"

"شاہ خوارزم یوسف صوفی نے امیر تیمور کو پیغام دیا ہے۔"

پیامبر نے ذرا رک کر خیمے میں موجود سرداروں کو دیکھا پھر طنزیہ انداز میں کہنا شروع کیا:

"شاہ نے فرمایا ہے کہ اپنے فوجیوں اور سرداروں کا بلاوجہ خون بہانے کے بجائے امیر تیمور قلعے
والے میدان میں تنہا تشریف لائیں۔ ہمارے شاہ بھی قلعہ سے تنہا آئیں گے۔ دونوں میں دست بدست
جس کی شمشیر دوسرے کے خون سے رنگین ہو جائے وہی فاتح قرار پائے گا۔"

"اس مبارزت کے لیے کون سا وقت مقرر ہوا ہے؟" امیر تیمور نے سوال کیا۔

"آج دوپہر ڈھلے۔" پیامبر نے جواب دیا۔

"اچھا۔ تم واپس جا کر شاہ خوارزم سے کہہ دو....."

اسی وقت تیمور کے ایک امیر بیان نے دوڑ کر امیر تیمور کے پیر پکڑ لیے اور گڑگڑا کر التجا کی
"اے امیر۔ آپ کی جگہ تخت شاہی کے اوپر اور شاہی چتر کے نیچے ہے۔ جنگ کرنا ہم امیروں کا کام ہے
مقابلے کے لیے ہم میدان میں جائیں گے۔"

امیر تیمور کے دوسرے سرداروں نے بھی امیر بیان کی ہاں میں ہاں ملائی اور اپنی خدمات پیش کیں

بیان کو کھڑے ہونے کا حکم دیا اور امیروں کو سمجھاتے ہوئے کہا:

"اس پیامبر کے الفاظ پر غور کرو۔ شاہ خوارزم نے ہمارے کسی امیر کے بجائے ہمیں مبارزت کی دعوت
دی ہے۔"

پھر اس نے پیامبر سے کہا:

"جاؤ اور شاہ خوارزم سے کہہ دو کہ ہم وقتِ مقررہ پر تنہا مقابلے کے لیے پہنچیں گے۔"

پیامبر نے ایک حیرت بھری نظر تیمور پر ڈالی اور پھر اس کے امیروں کو دیکھتا ہوا خیمہ سے نکل گیا۔

امیر کے سرداروں میں سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ ان کے چہرے فق تھے۔ وہ ایک دوسرے کو نظروں ہی نظروں میں دیکھتے تھے مگر بات کرنے کا کسی میں یارا نہ تھا۔ امیر تیمور کا یہ فیصلہ اس کی بہادری اور شجاعت کا کھلا ہوا ثبوت تھا۔

دوپہر کا وقت ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا اسلحہ منگوایا۔ تمام امیر اور سردار اس کے خیمے میں جمع ہو گئے تھے۔ دوپہر ڈھلتے ہی امیر تیمور نے امیروں اور سرداروں کی موجودگی میں مسلح ہونا شروع کر دیا۔ اس نے ہلکی کڑیوں والی زرہ پہنی۔ تیغ بردار نے اس کے بائیں بازو پر ڈھال اونچی کر کے باندھی۔ تلوار پٹکے میں لگا دی۔ وہ سیاہ رنگ کا خود لے کر آیا۔ تیمور نے تیغ بردار سے خود لے کر اپنے ہاتھ سے سر پر جمایا۔ خود کی آہنی جھالر تیمور کی گردن اور شانوں پر شور کرتی ہوئی لٹک آئی۔

جب امیر تیمور مسلح ہو کر لنگڑاتا ہوا اور مسکراتا ہوا گھوڑے پر سوار ہونے کے لیے بڑھا تو بوڑھا امیر سیف الدین برداشت نہ کر سکا۔ اس نے بڑھ کر رکاب تھام لی اور گلوگیر آواز میں بولا:

"اے امیر آپ ایک معمولی سپاہی کی طرح میدان میں لڑنے کے لیے نہ جائیے۔"

تیمور نے جواب دینے کے بجائے پٹکے پر ہاتھ مار کر تلوار کھینچی اور الٹی طرف سے سیف الدین پہ وار کیا۔

سیف الدین گھبرا کر پیچھے ہٹا اور تیمور مسکراتا ہوا گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

اس کا گھوڑا ہزاروں تاتاری لشکریوں اور منجنیقوں کے درمیان سے گزر رہا تھا اور سوار و سپاہی سحر زدہ کھڑے اسے قلعہ کے میدان کی طرف جاتے دیکھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ قلعہ اور گنج کے صدر دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔

امیر تیمور نے قلعہ اور گنج پر نظر ڈالی۔ صدر دروازے اور برجوں کے اوپر ہزاروں تیر انداز کمانیں سنبھالے کھڑے تھے۔ ان کے جسم جیسے غیر متحرک ہو گئے تھے اور وہ پتھر کی مورتیاں معلوم ہوتے تھے۔ تیمور کی جرأت اور شجاعت نے انہیں ششدر کر دیا تھا۔ فولادی جسم اور آہنی عزم رکھنے والے تیمور نے رکابوں پہ زور دے کر اپنے

جسم کو گھوڑے کی پیٹھ پر ذرا بلند کیا اور چیخ کر پکارا :

"کہہ دو اپنے بادشاہ سے، تیمور اس کا انتظار کر رہا ہے۔"

اس کی آواز فصیل سے ٹکرائی۔ قلعہ والوں کے کانوں تک پہنچی۔ یوسف صوفی نے بھی اس کی آواز ضرور سنی ہوگی لیکن قلعہ والوں کے جسم میں خون جم کر رہ گیا۔ کسی میں اتنی ہمت بھی نہ ہوئی کہ اپنی زد میں آنے ہوئے تیمور کو تیر کا نشانہ بنائے۔ اسے چھلنی کر دے۔

تیمور دیر تک دروازے کے سامنے کھڑا یوسف صوفی کو للکارتا اور اسے مبارزت کے لیے پکارتا رہا لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا اور کوئی بھی قلعے سے باہر نہ آیا۔

تیمور کو سخت غصہ تھا۔ اس نے آخری بار آواز دی :

"ایسا بادشاہ جو عہد شکنی کرے۔ جسے اپنے وعدے کا پاس نہ رہے اس کے لیے اس ذلیل زندگی سے موت بہتر ہے۔"

پھر تیمور نے اپنا گھوڑا موڑا اور دل برداشتہ ہو کر اپنے لشکر میں واپس آ گیا۔ اس کے لشکریوں نے اس کا تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسائے اور فوج نے نعرے لگا لگا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔

منجنیقیں اور قلعہ شکن آلات تیار ہو گئے۔ تیمور نے آلات کو مناسب جگہ پر نصب کرا کے حملے کا حکم دے دیا۔ نقاروں پر چوٹ پڑی۔ زمین و آسمان دہل اٹھے۔ لیکن نقاروں کی پہلی بازگشت ختم نہ ہوئی تھی کہ اورگنج کے قلعے کا دروازہ کھل گیا۔ آق صوفی اپنے سرداروں کے ساتھ امن کا پرچم بلند کیے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ تیموری لشکر میں پہنچ گیا۔

تیمور نے آق صوفی کو گھوڑے سے اترتے دیکھا تو خود بھی گھوڑے سے اترا۔ آق صوفی اور اس کے سرداروں نے شکست کے اظہار کے طور پر تلواریں گلے میں لٹکا رکھی تھیں۔ تیمور، آق صوفی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے خیمے میں لے آیا اور اسے عزت سے بٹھایا۔

جنگ کے بادل چھٹ گئے تھے۔ آق صوفی نے قلعہ کی چابیاں تیمور کو پیش کر دیں۔ تیمور نے شاہ خوارزم یوسف صوفی کو موت کا طعنہ دیا تھا۔ شاید یہ اسی کا اثر تھا کہ یوسف صوفی آج مر گیا تھا اور اس کا چھوٹا بھائی، خانزادہ کا چچا آق صوفی اسے دفن کر کے قلعہ کی چابیاں لیے تیمور کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔

تیمور قلعہ میں داخل ہوا۔ صوفی سیف الدین جنہیں حسین صوفی نے قید کر دیا تھا، تیمور کے حضور میں

پہنچے۔ خانزادہ کو محل میں دلہن بنایا گیا۔ سردار شیخ علی بہادر نے شہزادہ جہانگیر کی قائم مقامی کی اور صوفی سیف الدین نے خانزادہ اور جہانگیر کا عقد پڑھایا۔

اس طرح اورگنج والوں کو جنگ سے نجات ملی اور تیمور اور اس کے لشکریوں کو اورگنج کی فتح کے ساتھ ولی عہد سلطنت شہزادہ جہانگیر کی خوبصورت دلہن خانزادہ کی رخصتی کی خوشی بھی حاصل ہوئی۔

امیر تیمور کی بہو اور جہانگیر کی تسکینِ دل جس وقت سمرقند میں داخل ہوئی، وہ منظر دیکھنے کے قابل تھا۔ تیمور پرانے سمرقند کے بجائے ایک خوبصورت سمرقند کی تعمیر پہلے ہی کر چکا تھا۔ خانزادہ کے استقبال کے لیے پورے شہر کو نہایت نفاست سے آراستہ کیا گیا تھا۔ راستے میں اطلس و کمخواب کا فرش بچھا تھا۔ مغربی دروازے کے خیابان کو قالینوں سے ڈھک دیا گیا تھا۔ امیروں، وزیروں اور تمام اراکینِ سلطنت نے دروازے سے باہر نکل کر خانزادہ کے جلوس کو خوش آمدید کہا۔

شہزادی خانزادہ ایک سفید اونٹ پر شغدف میں بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ ایک باریک نقاب میں پوشیدہ تھا جس سے پھوٹنے والی کرنیں، استقبال کرنے والوں کے درمیان کھڑے ہوئے شہزادہ جہانگیر کے دل میں اتر رہی تھیں۔ شہزادی کی سواری کے گرد شہسوار دستے تھے اور عقب میں بار برداری کے وہ اونٹ اور گھوڑے تھے جن پر اس کا جہیز لدا ہوا تھا۔

اور پھر اسی شب شہزادہ جہانگیر نے جب حجلۂ عروسی میں خانزادہ کے چہرے سے نقاب اٹھایا تو شہزادی کے حسن کی تابش سے اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔

○

چھوٹی بیگم

نقارے پر چوٹ پڑی۔ طبل اور قرنے کے شور سے سمرقند گونج اٹھا۔ امیر تیمور نے فکر سے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ دربار میں بیٹھے ہوئے تمام سردار یوں جیسے خواب سے چونک پڑے۔ نقارے کی آواز اور طبل کی گونج یہ تو ظاہر کرتی تھی کہ ملکہ سرائے خانم کے بطن سے تیمور کا پہلا بچہ پیدا ہوا ہے اور زچہ و بچہ دونوں خیریت سے ہیں لیکن بچے کی جنس سے لوگ اب تک بے خبر تھے۔

یوں تو امیر تیمور کے پہلے ہی تین بیٹے شہزادہ جہانگیر، شہزادہ شیخ عمر اور شہزادہ میراں شاہ پل بڑھ کر جوانی کی حدود میں داخل ہو چکے تھے لیکن تیمور کو اب بھی بیٹے ہی کی خواہش تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ سرائے خانم کے بطن سے پیدا ہونے والا یہ بچہ بھی اولادِ نرینہ ہو۔

تاریخ کے مطالعے سے یہ دلچسپ مگر جاہلانہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مسلمان شہنشاہوں اور بادشاہوں نے سوائے بیٹوں کے بیٹی کی پیدائش کے لیے کبھی دستِ دعا دراز نہیں کیا اور نہ بچی کی پیدائش پر کبھی جشن کا اہتمام کیا۔ دراصل شاہوں کی اس خواہش میں ان کی رعونت اور تکبر کو زیادہ دخل تھا۔ وہ کسی کو داماد بنانا پسند نہ کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ شہزادیاں اکثر و بیشتر محلات اور قلعوں کی طلائی دیواروں کے پیچھے بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو جاتیں۔ ان کے سر کے پھول نہ کھلتے اور وہ کنواری ہی انتقال کر جاتیں۔

شاید یہی فکر تیمور کو بھی بے چین کر رہی تھی۔

طبل اور قرنوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ درباری امرا اور وزرا تیمور کو مبارک باد دینے کے لیے مضطرب تھے لیکن تیمور کے چہرے کا تفکر ان کی زبانیں بند کیے ہوئے تھا۔ تیمور کا چہرہ امید و بیم کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ کبھی

امید کی کرن پھوٹتی نظر آتی مگر فوراً ہی مایوسی کی سیاہی دوڑ کر اس کرن کو دبا دیتی اور درباریوں کے ہونٹ تھرتھرا کر رہ جاتے۔

آخر بوڑھے امیر سیف الدین سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے ہمت کر کے زبان کھولی:

"اے امیر عالی مقام!"

"ٹھہرو سیف الدین۔"

تیمور نے فوراً اس کی بات کاٹ دی:

"ابھی مبارکباد کا وقت نہیں آیا۔ ہم جاننا چاہتے ہیں کہ خدا نے ہمیں چوتھا ولی عہد دیا ہے یا۔۔۔"

تیمور رک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید اسے کسی کا انتظار تھا۔ حرم سرا سے اب تک کوئی نہیں آیا تھا۔ حالانکہ حرم سرا کے دروازے پر رکھی ہوئی نوبت بج رہی تھی۔ قرنے اور نقارے چیخ چیخ کر کسی نومولود کے آنے کی خبر دے رہے تھے۔

تیمور نے چوتھے ولی عہد کا نام یوں لیا تھا کہ تاتاری دستور کے مطابق پہلے چار بیٹے اپنے باپ کی وراثت کے حق دار ہوتے تھے۔ عام طور پر باپ کے مرنے پر پہلے چار بیٹوں میں اس کا اثاثہ تقسیم کر دیا جاتا لیکن بادشاہت تقسیم نہ ہوتی بلکہ چاروں بیٹے ولی عہد سلطنت ہوتے اور ایک کے بعد ایک تخت پر بیٹھتے۔ اگر چاروں ولی عہد مر جاتے یا مارے جاتے تو پانچواں بیٹا تخت پر دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت سرداروں کو اختیار ہوتا کہ جسے چاہیں اپنا بادشاہ منتخب کر لیں۔

محل سے اطلاع آنے میں دیر ہوئی تو امیر تیمور کا تردد بڑھا۔ وہ نہایت خاموشی سے اٹھا اور پچھلے دروازے سے بھاری بھاری قدموں کے ساتھ اندر کی طرف چل دیا۔ کنیزوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ امیر کی آمد کا غلغلہ اٹھا۔ محل سرا کی تمام کنیزیں امیر کی پیشوائی کے لیے راہداریوں میں قطار باندھ کر کھڑی ہو گئیں۔

تیمور کے قدم محل سرا کے اس کمرے کی طرف اٹھ رہے تھے جسے زچہ خانہ میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ تیمور کمرے کے دروازے کے قریب پہنچا تو بوڑھی دائی جسے تیمور کے دادا اور بیٹوں کی دایہ گیری کا فخر حاصل تھا، مسکراتی ہوئی کمرے سے نکل کر تیمور کی طرف بڑھی۔

تیمور نے نظر اٹھا کر دائی کو دیکھا تو اس کے مسکراتے چہرے نے تیمور کی دھڑکنوں کو سکون بخشا۔ دائی نے تعظیم کے لیے سر جھکایا اور ادب سے بولی:

"شہنشاہ تاتار کو شہزادہ مبارک ہو!"

تیمور کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ اور مسکراہٹ لبوں سے پھوٹ پڑی۔ اس نے فوراً گلے سے جواہرات کا ہار

اتارا اور دائی کی طرف بڑھا دیا۔ دائی نے پھر جھک کر سلام کیا اور تیمور سے ہار لے کر پہلے اسے چوما پھر اپنے گلے میں ڈال لیا۔

تیمور نے مسکرا کر دروازے کی طرف قدم بڑھائے لیکن دائی اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ تیمور نے گھور کر دائی کو دیکھا۔ اس کی نظروں میں شاہانہ جلال اور ایک سوال بھی تھا۔ دائی نے ادب ملحوظ رکھتے ہوئے کہا:

"اے شہنشاہ تاتار۔ ایک حقیر دائی کی کیا مجال ہے کہ وہ امیر عالی مقام کا راستہ روک سکے لیکن یہ حقیر یہ کہنے میں کوئی خوف محسوس نہیں کرتی کہ شہنشاہِ تاتار سے بڑا ایک اور بادشاہ ہے جو شہنشاہوں کا شہنشاہ اور دونوں جہانوں کا خالق ہے۔ وہی خالق جس نے اس ننھی سی جان میں روح پھونکی ہے جسے دیکھنے کو آپ اس قدر بے تاب ہیں۔ اے شہنشاہ! کیا یہ اس خالق کا حق نہیں کہ اس کام کی ابتدا اس کے نام سے کی جائے جبکہ ہم ہر کام کا آغاز اسی کے نام سے کرتے ہیں۔"

خالقِ حقیقی کا نام سنتے ہی تیمور کا بدن، جلالِ خداوندی سے کانپ اٹھا۔ دائی کی تنبیہ نے امیر تیمور جلیل القدر بادشاہ کا وجود ہلا کر رکھ دیا۔ وہ دائی کا اشارہ سمجھ گیا اور نرمی سے بولا:

"تم نے ہمیں کوتاہی کا احساس دلایا۔ ہم تمہارے شکر گزار ہیں۔"

پھر اس نے محل کی خاتون داروغہ کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا:

"قاضیِ شہر کو اطلاع دی جائے کہ وہ آ کر نومولود کے کان میں اذان دیں۔"

قاضیِ شہر دربار میں موجود تھے۔ خاتون داروغہ نے انہیں پردے کے پاس پہنچ کر اندر بلایا اور انہیں امیر تیمور کے حکم سے آگاہ کیا۔

قاضیِ شہر نے فوراً پلٹ کر درباریوں کو شہزادے کی پیدائش کی نوید دی۔ پھر داروغہ کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے محل سرا میں پہنچے۔

امیر تیمور اندر جانے کے بجائے دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا تھا۔ قاضیِ شہر کو دیکھ کر وہ باہر نکلا اور انہیں ساتھ لے کر زچہ خانے میں داخل ہوا۔ ملکہ سرائے خانم کی مسہری کے گرد حریر کے پردے تھے۔ امیر تیمور اور قاضی کے لیے مسہری کے قریب زرنگار کرسیاں بچھا دی گئی تھیں۔ دائی خود شہزادے کو گود میں لیے مسہری کے قریب کھڑی تھی۔ قاضیِ شہر بیٹھ گئے تو دائی نے نرم گدے میں لپٹے ہوئے شہزادے کو ان کی گود میں دے دیا۔ قاضی نے شہزادے کو اپنے ہاتھوں میں ذرا بلند کیا اور اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر نہایت خوش الحانی سے اللہ اکبر کی صدا بلند کی اور آہستہ آہستہ اذان کے کلمات سے اس کے دل کو گرم کیا۔

اذان کے اختتام پر امیر تیمور نے شفقت سے اپنے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے آواز دی:

"شہزادے بیٹے!"

شہزادے کی مٹھیاں اور آنکھیں بند تھیں۔ امیر تیمور نے قریب کھڑی دائی کو مخاطب کیا:

"شہزادہ آنکھیں نہیں کھولتا۔ ہماری آواز پر بھی اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔"

"بچے فرشتے ہیں امیر محترم!"

دائی نے برجستہ جواب دیا:

"فرشتے، شہنشاہوں کا حکم نہیں مانا کرتے۔"

امیر تیمور بوڑھی دائی کے جواب سے بہت خوش ہوا اور اسے دوسرا ہار بھی انعام میں دے دیا۔ اسی وقت ننھے شہزادے نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کا رخ امیر تیمور کی طرف تھا۔ قریب ہی ملکہ کی صبا نامی شوخ اور منہ پھٹ کنیز کھڑی تھی، اس نے کہا:

"امیر، توجہ فرمائیں۔ شہزادے نے آنکھیں کھول دی ہیں اور ان کی نظریں شاہ کے رخ کا طواف کر رہی ہیں۔"

تیمور نے خوش ہو کر ننھے شہزادے کی طرف دیکھا پھر کچھ سوچتے ہوئے قاضیِ شہر سے کہا:

"آپ نے غور فرمایا۔ کنیز نے کیا کہا ہے؟"

قاضیِ شہر گھبرا کر بولے:

"کنیز نے شاید، امیر کی توجہ شہزادے کی طرف دلائی تھی۔"

"نہیں......"

تیمور مسکرایا اور کنیز سے کہا:

"کنیز! پھر کہنا کہ تم نے شہزادے کا کیا نام لیا تھا؟"

کنیز کی ساری خوشی غائب ہو گئی:

"شہزادے کا نام؟"

اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ پھر جلدی سے بولی:

"اے امیر۔ میں نے شاید یہ کہا تھا کہ شہزادے کی نظریں رخِ شاہ کا طواف کر رہی ہیں۔"

"ہاں ہاں، یہی۔"

امیر نے قاضی کی طرف کہا:

"کنیز کہتی ہے رُخِ شاہ اور ہم کہتے ہیں شاہ رخ۔ کیا کنیز نے شہزادے کو "شاہ رخ" کا نام دے کر ہمارا کام آسان نہیں کر دیا؟"

"سبحان اللہ"

قاضیٔ شہر بولے:

"کیا خوبصورت اور مبارک نام ہے، شاہ رخ!"

کنیز جو اب تک کھڑی کانپ رہی تھی۔ اس کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" امیر نے کنیز سے پوچھا۔

"صبا۔ اے شاہِ عالی مقام" کنیز نے سنبھل کر جواب دیا۔

"خوب۔ تم نے ہمارا دل خوش کیا۔"

یہ کہہ کر امیر تیمور نے نہایت قیمتی ہار کنیز کے حوالے کیا اور قاضیٔ شہر سے بولا:

"آپ کی مبارک خدمت کا حساب ہم دربار میں کریں گے۔ شام کو عام اجلاس ہو گا تاکہ عوام کو پیش کرنے میں پریشانی نہ ہو۔"

قاضی صاحب چلے گئے۔ کنیزوں نے حریری پردے کھینچ دیے۔ سراے خانم نے اوپر کی طرف آہستہ سے بولی:

"شاہِ تاتار کو شہزادہ مبارک ہو۔"

"صرف شہزادہ نہیں۔ ولی عہد کہو سراے خانم۔ تاتاری دستور میں چوتھا بیٹا بھی ولی عہد ہوا کرتا ہے۔

خدا نے اسے زندگی دی تو امیر کی غلامی پر فخر کرے گا۔"

سراے خانم نے کہا:

"یوں آپ کی اولاد اور خون ہے۔ امیر کے ہاتھ پارس ہیں، چاہیں تو لوہے کو سونا بنا سکتے ہیں۔"

سراے خانم نے اٹھنے کی کوشش کی۔

"نہیں سراے خانم"۔

تیمور نے اسے روکا:

"تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ ہم تمہیں دیکھنے پھر آئیں گے۔" تیمور اٹھ کر چلنے لگا۔

"میرے سرتاج!"

سراے خانم کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ حالانکہ وہ تیمور کو ہمیشہ امیر یا امیر عالی مقام یا بادشاہ کہا کرتی تھی۔ تیمور چونک پڑا۔ اس کے قدم رک گئے:

"کہو سراے خانم۔ ہم سن رہے ہیں۔"

"میرے سرتاج! اس سے بڑی بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ آج میں آپ کا استقبال نہ کر سکی۔" سراے خانم کی زبان سے الفاظ یوں ادا ہو رہے تھے جیسے کوئی غیبی طاقت اس سے کہلوا رہی ہو۔

تیمور کو اپنی پہلی بیوی الجائی خاتون یاد آ گئی۔ ایک روز جب وہ مرغزار گیستان میں الجائی خاتون کے ساتھ تھا اور الجائی نے کہا تھا:

"میرے سرتاج! اس سے بڑی بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ آج آپ پیدل چل رہے ہیں۔"

تیمور کی نظریں سراے خانم پر جم کر رہ گئیں۔ کس قدر مماثلت تھی الجائی اور سراے خانم کی طبیعتوں میں۔

"سراے خانم۔ تم اس محل کا سب سے خوبصورت گلاب ہو۔ استقبال کے لیے تو ہم خود چل کر تمہارے پاس آئے۔"

سراے خانم کے مضمحل چہرے پر بحالی آ گئی۔ سراے خانم حقیقی معنوں میں تیمور کی بیوی اور حرم سرا کی ملکہ تھی۔ تیمور نے اسے دربار لگانے کی اجازت دے رکھی تھی۔ جب تیمور ہرات کی مہم پر گیا تھا تو سراے خانم باقاعدہ دربار لگاتی تھی اور دربار میں موجود تمام امراء اسے تعظیم پیش کرتے تھے۔ اس کا تعلق سپاہ گروں کے خاندان سے تھا۔ اچھی تیرانداز ہونے کے علاوہ وہ شکار کی بھی شوقین تھی اور تیمور کے ساتھ شکارگاہ میں ضرور موجود ہوتی۔

تیمور نے سراے خانم کو یہ تاثر دیا تھا کہ وہ اس کے پاس سے اس لیے جلد واپس جا رہا ہے تاکہ وہ مکمل آرام کر سکے لیکن یہ صرف ایک بہانہ تھا۔ اسے دراصل جلدی اس بات کی تھی کہ وہ باہر پہنچ کر اس خوشی کے موقع پر جشن اور جشن و ضیافت کا ایسا اہتمام کرائے کہ یہ تقریب ایک یادگار بن جائے۔

سراے خانم اس کے سالے امیر حسین، والیٔ غزنی کی بیوی تھی جس کے قتل کے بعد تیمور نے اس سے باقاعدہ شادی کی تھی۔ تیمور کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ سراے خانم سے شادی کے بعد سے اب تک وہ اس سے بے التفاتی برت رہا ہے۔ حالانکہ اس کی اصل وجہ اس کی بے پناہ مصروفیات تھیں لیکن سراے خانم کا یہ گلہ بجا تھا اور اس نے ایک بار تو اس کا کھلے الفاظ میں اظہار بھی کر دیا تھا۔ ان تمام شبہات کو دور کرنے کے لیے وہ اعلیٰ پیمانے پر جشن منانے کا خواہشمند تھا۔

وہ باہر آیا تو اس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ اس کے چہیتے بیٹے شہزادہ جہانگیر کی سیاہ بالوں والی خوبصورت بیوی کنیزوں میں پارچہ جات تقسیم کر رہی تھی۔ ریشمی کپڑوں کے سینکڑوں خوان اس کی کنیزیں سروں پر اٹھائے کھڑی تھیں۔ خانزادہ ایک ایک کنیز کو دو دو خوان بانٹ رہی تھی۔

تیمور کو دیکھ کر تمام کنیزیں جہاں تھیں وہیں ٹھٹک کر کھڑی ہو گئیں۔ بکھری ہوئی مسکراہٹیں اور گونجتے قہقہے تھم گئے۔ ہر طرف خاموشی طاری ہو گئی۔ خانزادہ اپنے کام میں مصروف تھی۔ کنیزوں کے ایک دم چپ ہو جانے سے

وہ پریشان ہوگئی۔ اس نے گھبرا کر سوالیہ نظروں سے اپنی کنیزوں کو دیکھا۔

"شاہِ تاتار۔ امیر تیمور"۔ قریب کھڑی ایک کنیز نے سرگوشی کی۔

خوارزم کی حسین شہزادی نے جلدی سے ریشمی چادر کا پلو سر پر کھینچا۔ پھر پلٹ کر اس طرف دیکھا جس طرف اشارہ کیا تھا۔ امیر تیمور زچہ خانے کے دروازے پر کھڑا بڑی دلچسپی سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ شفقت بھری مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

امیر تیمور کی بہو سر جھکائے آگے بڑھی اور جھک کر آداب بجا لائی۔

"اے شاہ تاتار نو مولود شہزادے کے لیے دلی مبارکباد"۔

"یوں نہیں خانزادہ"۔

تیمور نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اور اس کے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"ہم اپنی بہو کی مبارکباد محل میں قبول کریں گے"۔

"مگر شاہِ تاتار کو اس کے لیے ایک طویل مدت انتظار کی زحمت گوارا کرنا پڑے گی"۔ خانزادہ بے دھڑک تھی۔ وہ تیمور کے غصے سے لاپروا ہو کر جو اس کے منہ میں آتا تھا کہہ جاتی تھی۔

"ہم انتظار کریں گے خانزادہ"۔ تیمور کا لہجہ شفقت سے بھرا ہوا تھا۔

"مگر کب تک اے امیرِ عالی؟"

خانزادہ اسی طنطنے سے بولی:

"کنیزوں سے فارغ ہونے کے بعد مجھے شہزادے اور ملکہ مہربان کا صدقہ اتارنا ہے۔ میں آپ کو انتظار کی زحمت دینا آدابِ شاہی کے خلاف سمجھتی ہوں"۔

"ہم تمہیں اس حاضر جوابی اور آدابِ شاہی کی اجازت دیتے ہیں"۔

تیمور مسکرایا:

"ہمیں تو یہ بھی خوشی ہے کہ شہزادہ جہانگیر نے غلط انتخاب نہیں کیا۔ تم یقیناً اس مرتبے کی ہو۔ اطمینان رکھو تم جب تک واپس نہیں آؤ گی ہم محل سے باہر نہیں جائیں گے"۔

تیمور نے فوراً قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ جانتا تھا کہ خانزادہ آسانی سے قائل ہونے والی نہیں۔ اسے خانزادہ کی دل خوش کن گفتگو پسند بھی تھی لیکن یہاں کنیزوں کے درمیان کھڑے ہو کر باتیں کرنا ایک شاہ کے خلاف تھا۔ چنانچہ وہ خانزادہ کو چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

خانزادہ کے منہ میں آئی ہوئی بات اس کے ہونٹوں تک پہنچ کر رک گئی۔ ایک لمحہ وہ تیمور کو

پلٹ کر اپنے کام میں لگ گئی۔

○

یمور کو اپنے وطن شہرِ سبز سے بہت محبت تھی۔ شہرِ سبز یوں بھی بڑا دلکش مقام تھا۔ سب کو یہ خیال تھا کہ تیمور ن کا صدر مقام شہرِ سبز کو بنائے گا۔ اس نے شہرِ سبز میں خوبصورت عمارتیں بنوائی تھیں۔ اپنے مٹی کے محل یداینٹوں کا ایک وسیع اور عالی شان محل تعمیر کرایا تھا۔ اس میں کئی بڑے بڑے صحن تھے اور اس کے صدر ی بڑی محراب دور سے نظر آتی تھی۔ تاتاریوں نے اس محل کو آق سرائے یا قصرِ سفید کا نام دیا تھا۔ اس قصر میں ے اپنی پیاری بیوی الجائی خاتون کے ساتھ ایک طویل عرصہ گزارا تھا۔ اسی شہر میں اس کے باپ کی قبر تھی جسے بڑے مقبرے میں تبدیل کر دیا تھا۔ لیکن ان باتوں یادوں اور دلکشیوں کے باوجود اس نے سمرقند کو یح دی تھی۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ سمرقند سب سے بڑا شہر تھا بلکہ یہ کہ بخارا کے مدرسوں، کتب خانوں اور ا سے علوم کا گہوارا بنا دیا تھا۔

رقند کو دار السلطنت بنانے کی اصل وجہ اس شہر کی تاریخی حیثیت تھی۔ سمرقند ہی وہ شہر تھا جہاں یونانی فاتح نے کلائیٹوس کو شکست دے کر اس کا خاتمہ کیا تھا اور اسی شہر کے باغوں میں تیمور سے صرف ڈیڑھ سو سال ں کے طوفانی لشکر نے قیام کیا تھا۔

ر سیاح ابنِ بطوطہ نے اپنے سفر نامہ میں سمرقند کی تعریف کرتے ہوئے لکھا:

"سمرقند دنیا کے عظیم ترین اور پُر شکوہ شہروں میں سے ایک ہے۔ یہ دریائے صغد کے ے آباد ہے جس پر لاتعداد پن چکیاں ہیں اور اس سے نہروں کے ذریعے پانی کھینچ ر باغوں کو سیراب کیا جاتا ہے۔ یہاں کے لوگ قرمز کا کپڑا بنتے ہیں۔ اونچے بالاخانے ہیں ن کے جھروکوں سے دریا کا نظارہ کیا جاتا ہے۔ یہاں کا کاغذ دنیا بھر میں مشہور ہے ں کے لوگ آبی گھڑیوں سے وقت کا شمار کرتے ہیں۔ یہ گھڑیاں خود ان کی ایجاد ہیں اللہ کے مزار یادگاریں ہیں لیکن ان میں بیشتر کھنڈر بن چکی ہیں۔ محلات بوسیدہ ہو گئے ہیں۔ نہ شہر پناہ ہے نہ شہر کے دروازے ہیں۔ امتدادِ زمانہ نے انہیں سرنگوں کر ہے"۔

ے ان بوسیدہ محلات کی جگہ وسیع محلات تعمیر کرائے۔ سڑکیں چوڑی ہوئیں۔ کوچہ و بازار کو وسعت

دی گئی۔ غرضیکہ تیمور نے سمرقند کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ اس شہر کو لوگ دور دور سے دیکھنے آتے ا
ہمتی کی داد دیتے۔

تیمور فطرتاً سیماب صفت تھا۔ وہ نچلا بیٹھنا نہیں جانتا تھا۔ چوگان یا شطرنج کے سوا ا
نہ تھا۔ وہ ہر وقت کوئی نہ کوئی کام کرتا رہتا یا پھر غور و فکر میں ڈوبا ہوا مستقبل کے منصوبے
آج وہ بہت خوش تھا۔

خانزادہ کو سرائے خانم کے پاس بھیج کر وہ محل میں آیا۔ اس نے یہ محل بھی سمرقند کے اند
گرا کر بنوایا تھا۔ کشادہ دالان، راہداریاں، وسیع کمرے تھے . . . . . تیمور اس محل میں یوں گھوم رہا
اسے پہلی بار دیکھا ہو۔ وہ ہر کمرے میں جاتا اور اس کے در و دیوار کو اس طرح دیکھتا جیسے وہ کو
کنیزیں اسے آتا دیکھ کر سمٹ کر ادھر ادھر ہو جاتیں اور آپس میں کھسر پھسر کرتیں۔

"امیر کو آج کیا ہو گیا ہے۔ اپنے ہی محل میں اس طرح گھوم رہے ہیں جیسے کوئی باغ میں
آج امیر کو کوئی کام نہیں ؟"

ادھر کنیزوں کی یہ کھسر پھسر، دوسری طرف شاہی خاندان کی کتنی ہی خواتین اسے مبارکبا
یہاں تک کہ شہزادہ جہانگیر بھی باپ کی قدمبوسی کو حاضر ہوا تھا لیکن تیمور نے سب کو کہلوا دیا کہ وہ
انتظار کریں کیونکہ اس وقت امیر بہت مصروف ہیں۔ حالانکہ تیمور کو کوئی مصروفیت نہ تھی، وہ
خانزادہ کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے خانزادہ سے انتظار کا وعدہ کیا تھا لیکن یہ وعدہ ایسا نہ
سکتا ہو۔ خانزادہ کو تو وہ بلوا کر اور کسی وقت بھی گفتگو کر سکتا تھا۔ پھر خانزادہ اسے شہزا
عزیز نہ تھی جسے اس نے مہمان خانے میں انتظار کرنے کا حکم بھجوا دیا تھا!

دراصل آج تیمور نے اپنی شاہانہ ذمہ داریوں سے کچھ دیر کے لیے فرار اختیار کیا تھا۔ وہ
کر بھرپور خوشی کا لطف اٹھانا چاہتا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ اسے خانزادہ سے کچھ خاص باتیں کرنا تھیں
کو بھی مرتب کرنا تھا لیکن اس کی یہ فضول چہل قدمی دیکھنے والوں کے لیے ضرور تعجب خیز تھی۔

خانزادہ کو سرائے خانم کے پاس اپنے اندازے سے کچھ زیادہ ہی وقت لگ گیا۔ سرائے
آنے کی اطلاع دی گئی تو اسے بڑا تعجب ہوا۔ خانزادہ اور سرائے خانم کے اپنے الگ الگ محل تھے
محلوں میں دربار لگاتیں۔ ان درباروں میں زیادہ تر کنیزوں کے آپس کے جھگڑوں کے مقدما
سنے جاتے۔ شہادتیں گزاری جاتیں اور پھر ناقابلِ تنسیخ فیصلے ہوتے . . . . . ان محفلوں
سکتی تھی۔

دونوں اپنی حدود کی ملکہ اور مختارِ کل تھیں۔ اس سلسلے میں ملکہ سرائے خانم کو فوقیت حاصل تھی کہ وہ تیمور کی
عدم موجودگی میں شاہانہ دربار لگانے کی مجاز تھی اور تمام امیروں اور وزیروں پر اس کی تعظیم فرض تھی۔

خانزادہ اگرچہ ملکہ نہ تھی لیکن شہزادہ جہانگیر کی بیوی تھی جو ولی عہدِ سلطنت تھا اور تیمور کے بعد سلطنتِ تاتار
کا وارث اسی کو ہونا تھا اس لیے خانزادہ بھی خود کو ملکہ ہی سمجھتی اور سرائے خانم کی ہمسری اور برابری کی دعوے دار تھی۔
ان دونوں کا بہت کم سامنا ہوتا۔ ملتیں تو اجنبیوں کی طرح۔ ذاتی تمکنت کی دیوار ان کے درمیان حائل رہتی ــــ
سرائے خانم کو بھی اس کا احساس تھا لیکن اس نے جہانگیر کو ہمیشہ اپنا بیٹا سمجھا اس لیے وہ خانزادہ کی خود سری کو
ار دے جاتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان کے اختلاف کی خبر امیر تیمور تک پہنچے اور باپ بیٹے میں ناچاقی ہو مگر
تیمور ان باتوں سے بے خبر نہ تھا۔ اسے ان دلی کدورتوں کا علم تھا اور وہ ہمیشہ یہ خیال رکھتا تھا کہ کوئی بات اپنی زبان سے
نکالے جس سے کسی کو احساسِ کمتری کا شکار ہونا پڑے۔ وہ سرائے خانم کو ملکہ اور خانزادہ کو بہو کے مرتبے پر رکھتا۔
ان کا اسی طرح خیال رکھتا تھا۔

سرائے خانم اب تک بستر پر لیٹی تھی۔ خانزادہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی اور کچھ اتنے خلوص اور پیار سے
اسے تعظیم پیش کی کہ وہ حیران رہ گئی۔ خانزادہ اسے رسمی طور پر سلام کر کے ادھر ادھر ہو جاتی تھی لیکن اس وقت
سلام کر کے وہ بڑی بے تکلفی سے سرائے خانم کی پائنتی بیٹھ گئی تھی اور اس کے پیروں پر اس طرح ہاتھ رکھے جیسے
اس کے پیر دبانا چاہتی ہو۔

سرائے خانم نے تکیے سے ذرا سر اونچا کر کے دیکھا اور جلدی سے پیر سمیٹ لیے:
"کیا غضب کرتی ہو شہزادی۔ یہ کام تمہارا نہیں۔"
"کیا آپ شہزادہ جہانگیر کی ماں نہیں ؟" خانزادہ مسکرا کر ادب سے بولی۔
"کیوں نہیں شہزادی !"
سرائے خانم نے کہا۔ پھر نومولود بچے کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی:
"خدا بہتر جانتا ہے کہ میں نے شہزادے کو ہمیشہ اپنا بیٹا ہی سمجھا اور اس پر اپنی ممتا نچھاور کرتی رہی۔"
خانزادہ اس سوال و جواب اور اس ملاقات کے لیے پوری طرح تیار ہو کر آئی تھی۔ فوراً بولی:
"ملکہ عالم۔ اگر آپ جہانگیر کی ماں ہیں تو میری بھی مادرِ مہربان ہیں۔ ماں کی خدمت کرنا ہر بیٹی کا فرض ہے۔
ماں کے قدموں تلے جنت بیان کی جاتی ہے۔ پھر میں اس نعمت سے کیوں محروم رہوں ؟"
سرائے خانم شرم سے پانی پانی ہوئی جاتی تھی۔ اس کے دل کی کدورت یکدم صاف ہو گئی۔ اسے ان کنیزوں پہ
غصہ آیا جو اسے خانزادہ کے خلاف دن رات بھڑکایا کرتی تھیں۔

سرائے خانم نے بڑی محبت سے کہا:

"نیک وسعادت مند بیٹی! خدا تمہیں ہمیشہ خوش وخرم رکھے۔ اگر دنیا کی بہویں تمہارے جیسی
ہیں تو ساس بہو کا جھگڑا ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ تمہاری جگہ میرے دل میں ہے۔ میرے سر
سرہانے تم آکر بیٹھو۔"

"بہتر ہے ملکۂ عالم۔"

کہتے ہوئے خانزادہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ پھر کچھ سوچ کر بولی:

"لیکن پہلے مجھے ایک بات کی اجازت دیجیے کہ ننھے شہزادے اور آپ کا صدقہ اتاروں۔"

سرائے خانم کو بتایا گیا کہ شہزادی باہر کی کنیزوں میں بیش قیمت پارچہ جات تقسیم کر چکی ہے۔ اس
خوش دلی سے صدقہ اتارنے کی اجازت دیدی۔

خانزادہ کی کنیزیں سامان سے بھرے خوان اور تھال لیے باہر انتظار کر رہی تھیں۔ خانزادہ
صرف اس کی کنیزِ خاص اندر آئی تھی۔ خانزادہ نے اس سے کچھ سرگوشی کی۔ کنیز اٹھ کے باہر گئی۔ چند لمحوں
آئی تو ایک بڑا تھال اٹھائے ہوئے چار کنیزیں اس کے پیچھے داخل ہوئیں۔ یہ وزنی تھال سونے کا
اس پر گنگا جمنی کامدار خوان پوش ڈھکا تھا۔ خوان پوش ہٹایا گیا تو دیکھنے والوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گ
سرائے خانم کو کنیزوں کے پُرحیرت چہرے دیکھ کر اشتیاق ہوا کہ وہ بھی خوان میں رکھی ہوئی اس چیز کو دیکھے ج
کنیزوں کو اس قدر حیران کر دیا تھا۔

سرائے خانم نے کنیزوں کو اشارہ کیا۔ کنیزوں نے اسے تکیوں کے سہارے بٹھا دیا۔ طلائی تھال
طلائی ترازو تھا۔ سرائے خانم نے سونے کے اس ترازو کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ خانزادہ نے حکم دیا کہ ترا
کیا جائے۔ ترازو میں چار پائے لگے تھے جن کے سہارے ترازو کو زمین پر کھڑا کر دیا گیا۔ ترازو کے د
گول پیالوں کی شکل کے تھے۔ ہر پلڑے کا قطر ڈیڑھ فٹ تھا۔ خانزادہ کے اشارے پر کنیزیں
باہر سے دو خوان اور لے آئیں۔ ان پر بھی زرنگار خوان پوش پڑے تھے۔

"ملکۂ عالم!"

شہزادی ہاتھ باندھ کر ادب سے بولی:

"نومولود شہزادے کو ایک پلڑے میں لٹانے کی اجازت دی جائے۔"

سرائے خانم کی سمجھ میں کچھ نہ آیا پھر بھی اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کنیزوں نے دو
پیالے میں نرم گدّوں والا بستر بچھا دیا اور پھر نہایت احتیاط سے بچے کو تکیوں کے سہارے سونے کے

ترازو میں بٹھایا یا لٹایا گیا۔ شہزادے کے بوجھ سے پیالہ جھک گیا۔

خانزادہ نے پھر اشارہ کیا۔ اس کی کنیزوں نے لائے ہوئے دونوں خوانوں سے خوان پوش ہٹا دیے سب
کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ دونوں خوان جواہرات سے بھرے ہوئے تھے۔ کنیزوں نے ترازو کے دوسرے پیالے
میں جواہرات بھرنا شروع کر دیے۔ یہاں تک کہ دونوں پلڑوں کا وزن برابر ہو گیا۔ تولنے والی کنیز نے خانزادہ
کی طرف دیکھا۔ خانزادہ نے اسے منع کرنے کے بجائے پیالے کو اور بھرنے کا حکم دیا۔ پیالہ آہستہ آہستہ بھرتا اور
نیچے کی طرف جھکتا رہا۔

سرائے خانم حیرت سے دیکھتی رہی۔ تولنے کے بعد شہزادے کو بستر پر پہنچا دیا گیا۔

اس کے بعد خانزادہ کی کنیزیں ڈھکے ہوئے آٹھ اور خوان اندر لائیں۔ یہ سب خوان طلائی سکوں سے
بھرے ہوئے تھے۔ خانزادہ ادب سے بولی:

"مادرِ مہربان۔ ان خوانوں پر ہاتھ لگا کر صدقے کو شرفِ قبولیت بخشیے۔"

ایک ایک کرکے آٹھوں خوان ملکہ سرائے خانم کے قریب لائے گئے۔ اس نے ہر خوان پر ہاتھ رکھ کر اسے
وداع کیا۔ اس کے بعد تمام خوان اور پیالے کے وہ جواہرات جن سے شہزادہ تولا گیا تھا کمرے سے باہر بھیج دیے
اور انہیں شہزادی خانزادہ کے حکم کے مطابق کنیزوں میں لٹا یا گیا۔ کنیزوں میں اودھم مچ گیا۔ وہ جواہرات لوٹنے کے
لیے ایک دوسرے پر چڑھی جاتی تھیں۔ گری پڑتی تھیں۔ کئی کنیزیں تو اس اودھم پچھاڑ میں زخمی ہو گئیں۔

شہزادی خانزادہ کی اس دریا دلی اور خلوص کو دیکھ کر سرائے خانم کو چپ سی لگ گئی۔ اسے اس بات کا ملال تھا
کہ وہ خواہ مخواہ شہزادی سے کدورت رکھتی تھی۔

شہزادی خانزادہ وہاں کچھ دیر اور بیٹھی اور ملکہ اور بچے کی تندرستی کے لیے کئی مشورے دیے اور ادویہ
بتائیں۔ شہزادی سلام کرکے واپس جانے لگی تو سرائے خانم نے اسے دعا دی:

"خوش رہو شہزادی۔ خوب پھلو پھولو۔ خدا تمہاری گود ہری کرے۔"

سرائے خانم کے ان دعائیہ کلمات سے خانزادہ کے دل پر جیسے چوٹ سی پڑی۔ اس کی شادی کو ایک سال
سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن وہ اب تک اولاد کی نعمت سے محروم تھی۔ بزرگ عورتیں اپنی نوبیاہتا دلہنوں کو اسی
قسم کی دعائیں دیتی تھیں۔ سرائے خانم نے اسے بڑے خلوص سے دعا دی تھی لیکن اس کے الفاظ خانزادہ کے سینے میں
تیر کی طرح لگے اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے سرائے خانم نے دعا کے پردے میں اس کی محرومی کا طعنہ دیا ہے۔ اسے
اپنی محرومی کا پہلے ہی احساس تھا لیکن اس وقت اسے اس احساس میں اور زیادہ شدت محسوس ہوئی۔

خانزادہ خوشی خوشی آئی تھی لیکن سرائے خانم کے پاس سے اٹھی تو ایک درد اور کسک لے کر اٹھی۔ باہر آکر

اسے معلوم ہوا کہ امیر تیمور اس کا انتظار کرتے کرتے آرام کرنے چلے گئے ہیں اور اب وہ سو رہے ہیں۔ خانزادہ
نے امیر کو جگوانا مناسب نہ سمجھا اور دل برداشتہ ہو کر اپنے محل میں واپس چلی گئی۔

خانزادہ کی کنیزِ خاص چاندنی اس کے ساتھ تھی۔ اس نے دونوں خواتین کی گفتگو بڑے غور سے سنی تھی
اور جب اس نے سرائے خانم کی دعا سے شہزادی کا مزاج بگڑتے دیکھا تو سمجھ گئی کہ خانزادہ کو یہ الفاظ برے لگے ہیں
اور اس نے یقیناً اس کا الٹا ہی مطلب نکالا ہوگا۔ محلاتی سازشوں میں کنیزوں، خواجہ سراؤں اور غلاموں کا بڑا دخل ہوتا
ہے۔ یہ فرقہ اپنے آقا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے لگائی بجھائی کرتے تھا وہ اکثر ایسی حرکتیں کر جاتا ہے جو
بڑے بڑے فتنوں کا سبب بن جاتی ہیں۔

چاندنی کو خانزادہ کی افسردگی سے فائدہ اٹھانے کا موقع ہاتھ آ گیا اور اس نے فوراً خانزادہ کے معمولی زخم
کو کریدنا اور اس پر نمک پاشی کرنا شروع کر دیا۔

ایک دن شہزادی کو بہت افسردہ پایا تو سر جھکا کر بولی:

"واری جاؤں شہزادی کے۔ اس میں افسردگی اور ملال کی کیا ضرورت ہے۔ آپ نے تو ساس کی دلداری کے
لیے اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا۔ کیا کچھ نچھاور نہیں کیا شہزادے اور ملکہ پر۔ اتنا صدقہ تو شاہ تاتار بھی نہیں دے سکے
لیکن کیا ملا اس کا صلہ، طنز اور طعنوں کے تیر۔ میرا دل تو چاہتا تھا کہ سرائے خانم کا منہ نوچ لوں۔ کیا حق تھا انہیں
آپ کو اولاد کا طعنہ دینے کا۔"

"چاندنی!"

خانزادہ نے اسے جھڑکا:

"گستاخی مت کر۔ ہر شخص اپنے فعل کا ذمے دار ہے۔ ہم سے جو ہو سکا ہم نے کیا۔ ہم نے صلے کی خواہش
کب کی تھی؟"

"صدقے جاؤں آپ کی ایسی محبت پر۔"

چاندنی مٹک کر بولی:

"انسان احسان کا بدلہ نہ دے۔ محبت کے دو بول تو منہ سے نکل ہی سکتے ہیں اور سرائے خانم بولیں
معلوم ہوا جیسے مردہ کفن پھاڑ کر بولتا ہے۔ ایک بچہ کیا جنا ہے کہ دماغ عرشِ معلّیٰ پر پہنچ گیا ہے۔۔۔۔
بڑی بوڑھیاں ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ سوتیلا آخر سوتیلا ہی ہوتا ہے۔۔۔۔ سرائے خانم اگر سوتیلی ساس نہ ہوتیں تو
ایسے جملے منہ سے ہرگز نہ نکالتیں۔ انہوں نے یہ بھی خیال نہ کیا کہ آپ ولی عہد کی بیوی ہیں۔ آپ کا رتبہ ان سے
بلند ہے۔ پھر ابھی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن۔ یہ مزدوری تو نہیں کہ پہلے ہی سال گود

ہو جائے۔ میں تو کہتی ہوں شہزادی۔ اگر دو تین سال بچہ نہ ہو تو بھی پریشانی کی ضرورت نہیں۔"

"بس اب چپ بھی ہو جا۔"

شہزادی الجھتے ہوئے بولی:

"کیوں میرے زخموں کو کریدتی ہو؟"

"زخم کھائیں آپ کے دشمن۔"

چاندنی خاموش ہونے کے بجائے اور ٹرائی:

"اللہ نے چاہا تو آپ کے اتنے بیٹے ہوں گے کہ پورے محل میں بھاگتے پھر رہے ہوں گے۔ کوئی چادر کھینچے گا تو
کوئی چوٹی۔"

"چاندنی، خدا کے لیے۔"

شہزادی نے ٹھنڈی سانس بھری:

"وہ دن آئے گا تو تیرا منہ موتیوں سے بھر دوں گی۔"

⊙

شہزادے شاہ رخ کی پیدائش پر ایک ہفتہ تک عظیم الشان جشن منایا گیا۔ تیمور نے عوام اور خواص پر انعام کی
بارش کر دی۔ کسی امیر کو جاگیر دی تو کسی کا رتبہ بلند کیا۔ خوب خوب ضیافتیں ہوئیں۔ رقص و سرود کی محفلیں جمیں۔
خانزادہ دل میں اک درد لیے ان تمام خوشیوں میں شریک ہوتی رہی۔ وہ ہر وقت اپنے چہرے پر مسرت سجائے رکھتی
اور کسی پر یہ ظاہر نہ ہونے دیتی کہ ایک چبھن اس کے دل میں کانٹا بن کے کھٹکتی رہتی ہے۔ وہ حسبِ معمول روزانہ
سرائے خانم کی مزاج پرسی کے لیے جاتی۔

سرائے خانم زچہ خانہ سے اپنی حرم سرا میں منتقل ہو گئی تھی۔ اس کے یہاں شاہی خاندان اور امرا کی
بیگمات کا ہر وقت جمگھٹا لگا رہتا۔ تحائف پیش ہوتے۔ نذریں نیازیں ہوتیں۔ صدقے اتارے جاتے۔ خانزادہ
ہنستی، مسکراتی، قہقہے لگاتی ہر تقریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی۔ سرائے خانم بھی اس پر بہت مہربان ہو گئی تھی۔ وہ
خانزادہ سے بہت پیار سے گفتگو کرتی لیکن اکثر ایسا ہوتا کہ سرائے خانم، شہزادی کا دل رکھنے کی خاطر اسے "اولاد"
کی دعا دیتی اور امید دلاتی کہ وہ جلد شادکام ہوگی۔ ایسے موقعے پر شہزادی خانزادہ کے دل میں دبی ہوئی چنگاری

بھڑک اٹھتی اور وہ ضبط کے باوجود اپنی بھیگی آنکھوں کو پوشیدہ نہ رکھ سکتی۔ سرائے خانم ہنس کر اسے پھر تسلی دیتی لیکن سرائے خانم کا خلوص اس پر نشتر کا کام کرتا اور وہ گھبرا کے وہاں سے اٹھ آتی۔

سرائے خانم اور خانزادہ محلات میں بڑی اور چھوٹی بیگم کے نام سے مشہور تھیں اور یہ عوامی خطابات ان کے لیے موزوں تھے۔ خانزادہ ہمسری کا دعویٰ کرنے کے باوجود چونکہ عمر میں چھوٹی تھی اس لیے وہ چھوٹی بیگم کے خطاب سے خوش تھی۔ دونوں خطابوں میں "بیگم" کا لفظ مشترک تھا جو خانزادہ کی طمانیت کے لیے کافی تھا اور وہ سمجھتی تھی کہ دوسروں کی نظروں میں سرائے خانم اور اس کا مرتبہ برابر ہے لیکن ادھر کچھ دنوں سے اسے ایک وہم سا ہو گیا تھا۔ جب اسے کوئی "چھوٹی بیگم" کہہ کر مخاطب کرتا تو اسے اپنا مرتبہ کم نظر آنے لگتا۔ وہ خود اپنی ہی نظروں میں حقیر دکھائی دیتی۔ حالانکہ اس کا یہ وسوسہ قطعی بے بنیاد تھا۔ کیا ہوا اگر سرائے خانم ایک شہزادے کی ماں بن گئی تھی۔ اس کا شوہر بھی ولی عہدِ سلطنت تھا اور ملکِ تاتار پر سب سے پہلا حق اس کا تھا مگر اسے یہ بات کون سمجھاتا۔ اس کی کنیزیں، خاص کر چاندنی اس کے غموں، دکھوں اور احساسِ محرومی کو اپنی بدگوئیوں اور چکنی چپڑی باتوں سے شدید تر کرتی رہتی تھی۔ خانزادہ اپنے اوپر بہت قابو رکھتی اور بات بات پر چاندنی کو ٹوکتی رہتی لیکن جب اس کے محل کی دوسری کنیزیں چاندنی کی ہاں میں ہاں ملاتیں تو خانزادہ کا دل ڈولنے لگتا۔

محلاتی سازشوں کی یہ گونج یک طرفہ نہ تھی۔ سرائے خانم کے محل میں بھی سازشوں کا جال بنا جاتا۔ ہتھکنڈے اور منصوبے تیار ہوتے اور ہر وہ قدم اٹھانے کی کوشش ہوتی جس سے خانزادہ کا وقار مجروح ہو اور درمیانی فاصلوں میں اور دوریاں ہو جائیں۔ ان سازشوں میں سرائے خانم کی خاص کنیز آفتابی پیش پیش تھی۔ خانزادہ کی چاندنی میں تو کچھ دھیما پن اور خنکی تھی لیکن آفتابی نہایت گرم مزاج اور سورج ہی کی طرح آگ کا گولہ تھی۔ بڑی سخت مزاج اور چرب طرار۔ قد شہتیر کی طرح لانبا۔ بڑے بڑے ڈگ بھرتی چلتی تو یوں معلوم ہوتا جیسے کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہو۔ سرائے خانم نے شاید اس کے قد کاٹھ کو دیکھتے ہوئے اپنی مسلح کنیزوں کی سردارنی بنایا تھا۔ شہزادہ شاہ رخ پیدا ہوا تو اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی سرائے خانم نے اسے سونپ دی۔ آفتابی ایک اچھی دائی اور کھلائی بھی تھی۔ اس نے وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شہزادے کی حفاظت کے ساتھ اس کی کھلائی کا کام بھی اپنے سر لے لیا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ یہ دونوں کام بڑے احسن طریقے سے انجام دے رہی تھی۔ وہ شہزادے کی اس طرح نگہبانی کرتی جیسے مرغی اپنے چوزوں کو پروں میں چھپائے رکھتی ہے۔ شہزادے کو ذرا تکلیف ہوتی تو اپنا آرام تج دیتی اور رات بھر گود میں اٹھائے ٹہلاتی رہتی۔ سرائے خانم کی مہربانیاں بھی اس پر روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں۔

کہتے ہیں چور چوری سے جائے نہ کہ ہیرا پھیری سے۔ آفتابی بدطینت اور حاسد تھی۔ جب بھی موقع ملتا اپنی بدطینتی کا اظہار ضرور کرتی۔ خانزادہ سے اسے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ جب تک خانزادہ سرائے خانم کے پاس رہتی

آفتابی شہزادے کو اٹھائے اٹھائے دور ہی رہتی۔ اگر خانزادہ شہزادے کو گود میں لے کر پیار کرنے کی خواہش کرتی تو وہ پاس آ کر شہزادے کو خانزادہ کے ہاتھوں میں اس طرح لرزتے ہوئے دیتی جیسے وہ کسی ڈائن کو دے رہی ہو۔ پھر خانزادہ کے واپس جاتے ہی شہزادے سے شاہ رخ کی نظر اتارتی۔ صدقہ دیتی اور مسجد کے پیش امام کو بلوا کر اس پر پھونک ڈلواتی۔ سرائے خانم بیٹھی ہنستی رہتی لیکن اسے منع نہ کرتی۔ سرائے خانم بھی آخر ماں تھی سو ہر اس عمل اور بات کو پسند کرتی ہے جو اس کی اولاد کی سلامتی اور بھلائی کے لیے کیا جائے خواہ وہ روایتی یا مذہبی انداز سے مختلف اور غلط ہی کیوں نہ ہو۔

آفتابی کے دل میں خانزادہ کے خلاف جو لاوا پک رہا تھا، اس سے ہلکی ہلکی چنگاریاں خانزادہ کی بدگوئی کی صورت میں پھوٹتی ہی رہتی تھیں لیکن یہ لاوا اس دن پوری طرح پھٹ پڑا جب خانزادہ سرائے خانم کے سمجھانے بجھانے اور تسلی دینے پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

آفتابی شہزادے کو کاندھے سے لگائے دور کھڑی سخت نظروں سے خانزادہ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے واپس جاتے ہی آفتابی تیزی سے سرائے خانم کے پاس آئی اور شہزادے کو اس کی گود میں دیتے ہوئے بلکہ پٹختے ہوئے غصے سے بولی،

"ملکہ عالیہ! سنبھالیے شہزادے کو۔ میں شہزادے کی حفاظت سے باز آئی۔" اور دو ہی لمبے ڈگ بھر کر دروازے تک پہنچ گئی۔

"کیا ہوا آفتابی؟"

ملکہ کا منہ حیرت سے کھل گیا: "ادھر آ کے بتاؤ۔" اس نے کہا۔

آفتابی کے قدم دروازے کے پاس جا کے خود ہی رک گئے تھے اور وہ اسی حکم کی منتظر تھی۔ آہستہ آہستہ واپس آئی اور سسکی بھرے لہجے سے بولی؛

"ملکہ عالیہ! یہ نحوست ہے، شیر خوار شہزادے کے کانوں میں رونے تک کی آواز نہیں جانی چاہیے۔ ابھی سے اس پر غموں کا سایہ پڑ گیا تو آئندہ....؟

"خدا نہ کرے۔" ملکہ نے بات کاٹ دی؛

"آفتابی تم ایسی فضول باتیں کیوں سوچتی ہو؟"

"واہ ملکہ عالیہ!" آفتابی بھڑک اٹھی:

"آپ تو مجھے ہی الٹا ڈانٹ رہی ہیں سو تو اپنے بچوں کو ایسی ڈائنوں سے بچاتی ہیں ــ اگر شہزادے کو خدانخواستہ....؟"

"آفتابی!" ملکہ چیخ پڑی:

"خبردار جو تو نے شہزادے کے بارے میں کوئی برا لفظ نکالا۔ تو خواہ مخواہ خانزادہ کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ وہ دکھی ہے۔ اولاد کی محرومی نے اس کا دل گداز کر دیا ہے جبھی تو اسے ذرا ذرا سی بات پر رونا آ جاتا ہے۔"

اور آفتابی لگی فیل مچانے۔ اس نے سر کے بال نوچ ڈالے اور چیخیں مار مار کر رونے لگی:

"ہائے اللہ کیا زمانہ آ گیا ہے۔ کرے نیکی اور پکڑا جائے بدی میں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں کنیز ناچیز ہوں تاہم آپ میری بات پر دھیان نہیں دیتیں۔ کسی سے پوچھیے تو بانجھ کیا ہوتی ہے۔ وہ تو بلا ہوتی ہے، بد روح۔ وہ دوسرے کا بھانجا ہے تو دل گھٹ جاتا ہے۔ کبھی آپ نے یہ بھی سوچا کہ وہ کیوں روتی ہے۔ وہ بچے کے لیے اپنی قسمت پر روتی ہے۔ شہزادے کو دیکھ کر اس کا کلیجہ سلگ اٹھتا ہے کہ ایک اور وارث پیدا ہو گیا۔ اب تک تو دو شہزادوں کو دیکھ کر اس کے سینے پر سانپ لوٹتے تھے اور اللہ نے آپ کو بیٹا دیا تو اس کی تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔ اسے تو بادشاہت اور حکومت کا قلق ہے۔ اس کے گھر سے تو بادشاہت نکل گئی۔ اب منحوس روئے گی نہیں تو اور کیا کرے گی۔"

کہنے سننے سے تو دیواریں اپنی جگہ چھوڑ دیتی ہیں ملکہ تو آخر انسان تھی۔ روز کی ان باتوں کا کب تک اثر قبول نہ کرتی۔ پھر آفتابی جو کہہ رہی تھی وہ خانزادہ کی بدگوئی سہی لیکن تھی حقیقت ہی۔ خانزادہ کے بیٹا ہوتا تو جہانگیر کے بعد وہی تخت پر بیٹھتا۔ تیمور نے جس طرح اپنے بیٹے کو سلطنت کا وارث قرار دے دیا تھا اسی طرح جہانگیر بھی عمل کرتا اور اس طرح جہانگیر کی نسل میں بادشاہت چلتی رہتی۔ یہ بات ملکہ کے دل میں بھی آخر بیٹھ ہی گئی اور اسے اپنے خیالات پر نظر ثانی کرنی پڑی۔

"دیکھو آفتابی" سرائے خانم منفعل ہو کر بولی:

"یہ تو ہو نہیں سکتا کہ خانزادہ کو یہاں آنے سے میں روک دوں۔ ہاں وہ خود ہی یہاں آنا چھوڑ دے تو میں نہیں بلاؤں گی۔"

"اس کا انتظام میں خود کر لوں گی۔" آفتابی سینے پر ہاتھ مار کر بڑے وثوق سے بولی:

"آپ بس ایک بار زبان سے یہ کہہ دیں کہ خانزادہ کا یہاں آنا مناسب نہیں۔ پھر میں جانوں اور خانزادہ جانے۔ ۔ ۔ ۔"

"آفتابی! میری ایک بات غور سے سنو۔" ملکہ کا غصہ ختم ہو چکا تھا۔

"خانزادہ کو اگر روکا گیا تو یہ بات امیر تک ضرور پہنچے گی۔ اس وقت میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ ہو گا۔"

"ملکہ عالیہ۔ مجھے جواب مل گیا۔" آفتابی خوش ہو کر بولی:

"اب آپ دیکھتی رہیے کہ میں کس طرح خانزادہ کا پتہ کاٹتی ہوں۔ ایسا کام کروں گی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

دوسرے دن خانزادہ ملاقات کے لیے آئی تو سرائے خانم کے کمرے کے باہر آفتابی کھڑی دکھائی دی۔ وہ قریب پہنچی تو آفتابی نے قدرے تلخ لہجے میں کہا:

"شہزادی صاحبہ۔ مجھے افسوس ہے کہ آج آپ ملکۂ عالیہ سے ملاقات نہ کر سکیں گی۔ ان کی طبیعت ناساز ہے۔"

خانزادہ شاید آفتابی کے تلخ لہجے کو محسوس نہ کر سکی:

"تم اندر جا کر مادر مہربان کو میرے آنے کی اطلاع کر دو۔ میں انہیں کھڑے کھڑے دیکھ کر واپس چلی جاؤں گی۔"

"میں نے عرض کیا ہے شہزادی صاحبہ۔"

آفتابی کا لہجہ اور تلخ ہو گیا:

"ملکۂ عالیہ آج کسی سے ملاقات نہیں کریں گی۔ انہوں نے مجھے تاکید کی ہے کہ کسی کو اندر نہ آنے دوں۔ مجھے گستاخی پر مجبور نہ کیجیے شہزادی!"

خانزادہ ایسے تلخ اور کرخت لہجے کی عادی نہ تھی۔ اس نے تعجب سے آفتابی کو دیکھا۔ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر خود ہی ارادہ بدل دیا اور خاموشی سے سر جھکائے واپس چلی گئی۔

آفتابی کا منصوبہ پورا ہو رہا تھا۔ اس نے ملکہ کو زبردستی بیمار ڈال دیا تھا تاکہ وہ خانزادہ کو اس بہانے اندر جانے سے روک سکے۔ خانزادہ کے جانے کے بعد آفتابی مسکراتے ہوئے اندر چلی گئی۔

"ملکۂ عالیہ۔ آپ ملکہ عالم ہیں۔"

آفتابی سرائے خانم کی گھبراہٹ پر چڑ گئی:

"آپ امیر تیمور شاہِ تاتار کی بیوی ہیں۔ ایک شہزادے کی ماں ہیں۔ پھر آپ کیوں گھبرائی ہیں۔ یہ سب آپ کے ماتحت ہیں۔ آپ حاکمہ ہیں۔ یہ کنیزیں اور غلام ہیں۔"

ملکہ نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے آفتابی کے منصوبے سے اختلاف ہے۔

اگلے دن بھی کچھ اسی طرح کا واقعہ پیش آیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خانزادہ کے ساتھ آفتابی کا رویہ بڑا سخت اور گستاخانہ تھا

وہ شہزادی کو دیکھتے ہی بغیر سلام کلام کے بولی:

"شہزادی صاحبہ۔ آپ ملکہ عالیہ کو کیوں پریشان کرنے آجاتی ہیں۔ وہ بیمار ہیں۔ کسی سے نہیں مل سکتیں۔ اب آپ تشریف نہ لائیں۔ ملکہ عالیہ جب آپ کو یاد کریں گی تو آپ کو اطلاع کردی جائے گی۔"

آفتابی نے اسے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ بولتی بھی تو کیا۔ آفتابی کے منہ لگ کر اور زیادہ رسوائی ہوتی۔ اچھا ہوا کہ وہ خاموش رہی اور چپ چاپ واپس چلی گئی لیکن اس دن وہ اپنے محل میں پہنچ کر خوب روئی۔ کل کے واقعہ کا اس نے کسی سے تذکرہ نہیں کیا تھا۔ وہ تو یہی سمجھی تھی کہ سرائے خانم بیمار ہوگئی ہیں اور انہوں نے ملاقاتیوں کو روک دیا ہے۔ جہاں تک آفتابی کے کھردری اور تلخ گفتگو کا سوال تھا، شہزادی نے اس لیے نظر انداز کر دیا کہ آفتابی تمام محلات میں اپنی بد زبانی اور بد دماغی میں مشہور تھی لیکن آج جو کچھ ہوا وہ ناقابل برداشت تھا۔

شہزادی غصے سے تلملاتی ہوئی آئی اور تکیے میں منہ دے کے رونا شروع کر دیا۔ کنیزوں میں تہلکہ مچ گیا۔ اس کے گرد اکٹھی ہوگئیں۔ چاندنی نے شہزادی کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ وہ آہستہ آہستہ سر دباتی جاتی اور رونے کا سبب پوچھتی جاتی لیکن وہاں تو جیسے دریا کا بند ٹوٹ گیا تھا۔ شہزادی کے آنسو تھمنے ہی میں نہ آتے تھے۔

رو دھو کر جب دل ذرا ہلکا ہوا تو شہزادی نے سسکیوں کے درمیان بتایا:

"میری توہین کی ہے۔ میرا مذاق اڑایا ہے اس نے..."

"کون، آفتابی؟" چاندنی نے چمک کر پوچھا:

"کیا سمجھتی ہے اپنے آپ کو وہ..... ٹانگیں نہ توڑ کر رکھ دوں تو میرا نام چاندنی نہیں۔"

خانزادہ کو اپنی بے عزتی پر پھر رونا آگیا۔ سنبھل کر بولی:

"کل میں سرائے خانم سے ملنے گئی تو وہ ذلیل دروازے پر چوکیدار بنی کھڑی تھی۔ کہنے لگی ملکہ عالم سے کوئی نہیں مل سکتا۔ وہ بیمار ہیں۔"

"تو آپ بھی جھاڑو پھیرتے ملکہ کے منہ پر۔" چاندنی نے غصے سے کہا۔

"وہ اپنے نخرے امیر کو دکھائیں۔ آپ پر ان کا کیا زور۔ نہیں ملتی تو نہ ملیں۔ کیا آپ ان کی ملاقات کی بھوکی ہیں۔ اور کیا کہا تھا آفتابی نے؟"

"چاندنی!" شہزادی ٹھنڈی سانس لے کر بولی:

"غلطی میری بھی ہے۔ کل کی بے عزتی کے بعد میں آج کیوں گئی۔ مجھے نہیں جانا چاہیے تھا مگر میں تو اس خیال سے چلی گئی تھی کہ شاید سرائے خانم واقعی بیمار ہوں اور میں نہ جاؤں تو شکوہ کریں۔"

شہزادی نے ایک لمبی سانس لے کر بتایا:

"لیکن چاندنی! آج تو اس بدبخت نے مجھے یوں دھتکارا جیسے میں فقیرنی ہوں یا اس کی لونڈی ہوں۔ ...کر بولی..... واپس جائیے۔ ملکہ نہیں ملیں گی۔ جب انہیں ضرورت ہوگی تو بلوا لیا جائے گا۔ ہائے اس ...نے مجھے کیسا ذلیل کیا۔ میں...... میں....."

"شہزادی بی بی۔"

چاندنی نے اسے تسلی دی:

"اب آپ تو خاموش ہو کر بیٹھیے اپنے محل میں اور پھر دیکھیے تماشہ۔ ایسا تگنی کا ناچ نچاؤں گی آفتابی کو کہ ...یاد کرے گی۔"

"میرا تو جی چاہتا ہے اسے قتل کرادوں۔"

شہزادی کو غصہ آگیا:

"ہماری بھی منہ چڑھی کنیزیں ہیں لیکن انہیں یہ اجازت تو نہیں دی جاسکتی کہ شاہی خاندان کے کسی فرد کی اس طرح توہین کریں۔" اس نے کہا۔

"آپ اپنے آپ کو گراتی کیوں ہیں شہزادی!" چاندنی نے فوراً کہا:

"آپ شاہی خاندان کی کوئی عام خاتون نہیں۔ آپ خاندانی شہزادی ہیں اور اس وقت ولی عہد سلطنت کی بیگم ہیں۔ ...نے چاہا تو ایک دن وہ آئے گا کہ شہزادے بہادر ملک تاتار کے بادشاہ بنیں گے اور آپ ان کے پہلو میں ...بیٹھیں گی۔"

"آمین...... آمین....." دوسری کنیزوں نے فوراً آواز بلند کی۔

شہزادی کو کچھ تسلی ہوئی تو بولی:

"چاندنی اب ہمیں بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ پانی سر سے اونچا ہوا جارہا ہے۔ آفتابی کا تو ضرور کچھ علاج ہونا چاہیے۔"

اور آفتابی کا علاج دوسرے ہی دن ہوگیا۔

وہ کسی ضرورت سے شہزادی کے محل کے دروازے پر داروغہ کے پاس آئی۔ ان دونوں میں یارانہ تھا۔ ...اکثر اس سے ملاقات اور باتیں کرنے آیا کرتی تھی۔ خانزادہ کی کنیزیں تو تاک میں لگی ہی تھیں۔ آفتابی اپنے ...بانکپن کے ...اٹھلاتی اور ادائیں دکھاتی داروغہ کے پاس آئی اور ابھی اس نے داروغہ سے ہنس ہنس کر دو چار ...باتیں کی تھیں کہ محل کے اندر سے دس بارہ کنیزیں بھرا مار کے نکلیں اور آفتابی کو شہد کی مکھیوں کی طرح چمٹ گئیں۔

آفتابی اس اچانک حملے سے گھبرا گئی۔ اس نے کھڑے ہونے کی بہت کوشش کی۔ اگر وہ کھڑی ہو
مزہ چکھا دیتی لیکن خانزادہ کی کنیزوں نے اسے اتنا موقع ہی نہیں دیا۔ چار نے اس کی دو
ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔ باقی کنیزوں نے اس کی وہ پٹائی کی کہ بس اللہ دے اور بندہ لے۔

آفتابی چیختی چلاتی رہی اور دہائی دیتی رہی مگر اس کی مدد کو کون آتا۔ دروازے کے دو
میں دبک گئے۔ داروغہ بھاگ کر ایک کوٹھری میں گھس گیا اور اندر سے زنجیر چڑھالی۔ غرض چاندنی ا
مار مار کے آفتابی کا بھرکس نکال دیا۔ وہ بے دم ہو گئی اور اس پر غشی طاری ہو گئی۔ تب کہیں جا
اور پھر اسی طرح لپ جھپ کرتی محل میں گھس گئیں۔

آفتابی دیر تک لہولہان، بے ہوش پڑی رہی۔ دیر تک اس کے پاس کوئی نہ آیا۔ پھر پہ
ہوا کہ کہیں آفتابی مر نہ جائے۔ آخر کو وہ ملکہ کی کنیز تھی اور کنیز بھی بڑی منہ زور اور منہ پھٹ۔ پھر
اس کے پاس آئے۔ آفتابی بھی اس وقت تک ہوش میں آچکی تھی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر
پہرے داروں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ اس نے کھڑے ہوتے ہی چاندنی کو گالیاں دینی شرو

"آفتابی زبان بند کرو"۔ ایک پہرے دار نے غصے سے کہا:

"چاندنی واپس آگئی تو زندہ بچ کر نہ جا سکو گی"۔

"واہ . . . کیا میرے ہاتھ نہیں"۔ آفتابی غرائی لیکن جب ہاتھ جھٹکا تو درد سے ب

"اب تو میں بدلہ لے کر رہوں گی"۔

"چپ رہو آفتابی"۔ دوسرا پہرے دار بھی بگڑ گیا:

"یہ تمہارا علاقہ نہیں، شہزادی کا محل ہے۔ خاموشی سے چلی جاؤ۔ ورنہ دوسرا ہنگامہ کھ

اتنے میں داروغہ بھی کوٹھری سے نکل کر آفتابی کے پاس آ گیا۔ آفتابی اس پر برس پ

"نامرد کہیں کا۔ مجھے پٹتا دیکھتا رہا اور کچھ نہ بولا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ تو اتنا بزدل ہے

"تو تو میرے لیے جنجال بن گئی ہے"۔

داروغہ بھی بھرا ہوا آیا تھا:

"مجھے نکلوا کر رہے گی نوکری سے۔ لاکھ بار منع کیا کہ یہاں نہ آیا کر مگر جب دیکھو منہ

وقت اور موقع تو دیکھنا چاہیے"۔

"تو کیا میں چور ہوں جو چھپ کر آؤں؟" آفتابی اکڑ کر بولی:

"تجھ سے شادی کر رہی ہوں۔ کوئی عیب تو نہیں کر رہی۔ میں آؤں گی۔ ہزار بار آؤں گ

بی بی، ہمیں اپنی نوکری پیاری ہے"۔

پہرے دار کو تاؤ آ گیا:

شق کا ڈرامہ ہم یہاں نہیں ہونے دیں گے۔ آفتابی نے اب ادھر کا رخ کیا تو اچھا نہ ہوگا"۔

ابی نے جب سب کو اپنا مخالف دیکھا تو بھنا کر بولی:

اب نہیں آؤں گی، نہیں آؤں گی۔ تم پر تھوکنے بھی نہیں آؤں گی"۔

ر داروغہ کو دیکھتے ہوئے بولی:

تیری وجہ سے آئی تھی۔ تو نے میرا یہ حال کرا دیا۔ اب میں تجھ سے شادی بھی نہیں کروں گی"۔

ہا . . . تو شادی نہیں کرے گی تو کیا میں کنوارہ رہ جاؤں گا"۔ داروغہ بھی دھاڑا:

جھتی کیا ہے اپنے آپ کو۔ ملکہ کی کنیز نہ ہوتی تو کوئی تجھ سے بات بھی نہ کرتا"۔

ئے اللہ . . . . کیا تو مجھ سے اس وجہ سے شادی کر رہا ہے کہ میں ملکہ کی کنیز ہوں؟ وہ تیری

ا، وہ وعدے سب جھوٹے تھے؟ تو مجھے دھوکہ دے رہا تھا؟"

کے نام پر داروغہ گھبرا گیا۔ اس نے آفتابی سے وعدے کیے تھے شادی خانہ آبادی کے۔ باتیں کی

بت کی۔ اسے واقعی آفتابی سے محبت تھی۔ وہ بے ڈول اور بدصورت سہی، اسے آفتابی سے محبت

ت تو بس ہو جاتی ہے۔ یہ نہ صورت شکل دیکھتی ہے نہ ذات برادری۔

آپی!"

غہ کا پیار امڈ آیا:

معاف کر دے۔ پتہ نہیں غصے میں کیا کیا کہہ گیا؟"

کی محبت بھی پھوٹ پڑی۔ فوراً بولی:

مجھے معاف کر دے مجھے نہیں آنا تھا یہاں لیکن . . . . "

کا مزاج پھر بگڑ گیا۔ سر سہلاتے ہوئے بولی:

ن سے تو میں بدلہ لے کے رہوں گی۔ ملکہ کے سامنے مقدمہ پیش کروں گی۔ پھر امیر کے پاس

دار بڑی دلچسپی سے دونوں کی باتیں سن رہے تھے۔ ہنس رہے تھے اور ایک دوسرے کو کنکھیوں

تے۔ آفتابی اسی طرح سر سہلاتی، ہاتھ دباتی، لنگڑاتی اور بڑبڑاتی چلی گئی۔

جھگڑا کچھ زیادہ ہی طول پکڑ گیا۔ وہ جب روتی پیٹتی سرائے خانم کے پاس پہنچی تو اسے آفتابی کی ہیئت کذائی

دیکھ کر افسوس بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔

سرائے خانم نے تسلی دیتے ہوئے پوچھا،

"کس بدبخت نے یہ تیرا حال کیا ہے۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ تو ملکہ کی کنیز اور شہزاد
کھلائی ہے؟"

"ملکہ عالم۔ کیا کہوں یہ سب آپ کی مہربانیوں اور محبت کی وجہ سے ہوا ہے۔"

آفتابی نے ملکہ کے غصے کو بھڑکانے کے لیے نمک مرچ لگا کر کہنا شروع کیا:

"میں آپ کی کنیز ہوں نا اور جب سے شہزادے کی خدمت میرے سپرد ہوئی ہے
کنیزیں مجھ سے جلنے لگی ہیں۔ راہ چلتے چھیڑ دیتی ہیں۔ طعنے دیتی ہیں اور وہ کلموہی چاندنی آج
ذرا ادھر گئی تھی کہ چاندنی پچاسی کنیزوں کے ساتھ مجھ پر ٹوٹ پڑی۔"

"آخر کوئی بات تو ہوئی ہوگی؟"

"ملکہ عالیہ۔ قسم لے لیجیے جو کوئی بات ہوئی ہو۔" آفتابی نے واردات کو بچانے کی کوشش

"میں نے نہیں دیکھا کہ وہ کب اور کدھر سے آئیں۔ بس ایک دم ہلہ بول دیا۔ اتنا مارا
دو کنیزیں پکڑ کے لائی ہیں مجھے۔ ساری وجہ یہ ہے کہ آپ مجھ پر مہربان کیوں ہیں۔ ش
کیوں نہیں ملی؟"

"چاندنی کو اس کی سزا ملنی چاہیے۔ آخر کیا سمجھ رکھا ہے اس نے؟" ملکہ کو طیش آگیا۔

"خان زادہ پر پھولتی ہے وہ۔"

آفتابی نے جلتی پر تیل چھڑکا۔

"اسے زعم ہے کہ اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تبھی تو سینے پر مونگ دلتی ہے۔"

"اس معاملہ میں خانزادہ بھی ملوث ہے۔" سرائے خانم نے خود کلامی کے انداز میں کہا

"ہمیں امیر سے بات کرنا ہوگی۔"

"خانزادہ ہی تو اصل جڑ ہے ملکہ عالیہ۔"

آفتابی نے موقع سے فائدہ اٹھایا:

"مجھے دیکھتے ہی تیوریاں چڑھ جاتی ہیں ان کی۔ آپ کی وجہ سے ان کا بس نہیں چلا
دیں مجھے۔"

آج سے پانچ چھ صدی پہلے علم نفسیات کو باقاعدہ علم کا درجہ حاصل نہ تھا۔ ل

واقف تھے۔ علم نفسیات خصوصاً انسانی دل و دماغ اور ذہن و فکر پر تحقیق اس دور میں بھی
حکومتوں میں تو بغیر مزاج شناسی کے بادشاہ کی قربت حاصل کرنا ناممکن سمجھا جاتا تھا.....
عام لوگوں کی نفسیات سے بھی لوگوں کو گہری دلچسپی تھی۔

ایک پرانے دانشور نے کنیزوں اور غلاموں کی نفسیات کے بارے میں ایک بڑی دلچسپ
کہا ہے کہ:

"زمانہ قدیم سے ہی ان غلاموں اور کنیزوں کو شاہی محلات اور امراء کے گھروں میں
کی بہ نسبت زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے جنہیں بچوں اور خاص طور پر شیرخوار بچوں
پرورش پر مامور کیا جاتا تھا۔ بچے ان سے اس قدر مانوس ہو جاتے تھے کہ وہ ایک لمحے
اپنی کھلائی سے جدا ہونا پسند نہیں کرتے تھے اور اگر ذرا دیر کو ان کی گود بدل جاتی تو
قیامت برپا کر دیتے تھے۔ اس بے پناہ انسیت کا سبب معلوم کرنے کے لیے میں نے
کھلائیوں اور غلاموں سے گفتگو کی..... تو یہ عقدہ کھلا کہ ہر دائی اور کھلائی بچے
سے مانوس کرنے کے لیے اسے کسی ایک خاص عادت میں مبتلا کر دیتی تھی۔ کوئی بچے کو
کے لیے دھیمے سروں میں گنگناتی تھی۔ کوئی پیٹھ پہ ہاتھ پھیرتی رہتی تھی اور کوئی بچے کی
میں ایک انگلی سے گدگداتی تھی۔ بچہ آہستہ آہستہ اس کا عادی ہو جاتا اور جب کھلائی کے
کسی دوسری گود میں دیا جاتا تو بے تحاشا رونے لگتا۔ اس کی یہ بے چینی اس وقت تک قائم
جب تک اس کی عادت کے مطابق اسے کھلایا یا سلایا نہ جاتا۔ یہ بات آج بھی موجود ہے
گھرانوں کی کھلائیاں اپنے اسی ہتھیار سے بچے کے والدین کو اپنے قابو میں رکھتی ہیں۔"

(۳)

شہزادہ شاہ رخ صبح ہی سے اپنی پرانی گود سے جدا تھا۔ آفتابی کی کل پٹائی ہوئی تھی اس کا
تھا اور چلنے پھرنے سے بھی معذور نظر آتی تھی۔ آفتابی کے بجائے چار چار کنیزیں شاہ رخ کی
لیکن ننھے شہزادے نے جو صبح سے رونا شروع کیا تو اب تک دم نہیں لیا تھا۔ کنیزیں لاکھ
بار بار گودیں بدلتیں لیکن شہزادے کو جیسے ہر گود کانٹوں کا بستر محسوس ہوتی۔ اس کا منہ بسورنا

اور ریں ریں کرنا کسی طرح بند نہیں ہو رہا تھا۔

آفتابی کی کوٹھری غلام گردش میں تھی لیکن یہ مکار بار بار کھڑکی سے جھانکتی کنیزوں سے شہزادے کا حال پوچھتی۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ شہزادہ مسلسل روئے جا رہا ہے، سنبھالے نہیں سنبھل رہا ہے، ہر کنیز سے اسے یہی اطلاع ملتی کہ شہزادے نے نہ تو ابھی تک کچھ کھایا ہے نہ سویا ہے۔ اس اطلاع سے اسے بڑا سکون ملتا اور وہ دل ہی دل میں مسکراتی اور اسے اپنی احساس ہوتا۔ امیر اور سرائے خانم پر اپنی اہمیت جتانا ہی اس کی مکاری کا اصل مقصد تھا۔

حرم سرا میں قیامت برپا تھی۔ سرائے خانم کا منہ فق تھا اور وہ گھبرائی گھبرائی دوڑی گئی۔ پیش امام اور موذن کو بلا کر دم کرایا گیا لیکن شہزادے کو کسی طور آرام نہ آیا۔ دو، ہوا جا رہا تھا۔

سرائے خانم نے مجبور ہو کر امیر کو اطلاع کرائی۔ امیر تیمور دربار خاص میں اپنے شمال مغربی سرحد پر ایک شورش کے سلسلے میں گفتگو کر رہا تھا۔ دربار خاص میں وہ کسی کی تھا لیکن کنیز نے شہزادے کی بے چینی اور چیخ و پکار کا کچھ اس انداز سے ذکر کیا کہ امیر پڑا۔ وہ فوراً حرم سرا میں داخل ہوا۔ سرائے خانم سر جھاڑ منہ پھاڑ اس کے استقبال کو موجود تیز قدم اٹھاتا ہوا شہزادے کے کمرے میں پہنچ گیا۔

شہزادے کے بلک بلک کر رونے سے تیمور بھی پریشان ہو گیا۔ اس نے فوراً طبیب نے شہزادے کا معائنہ کیا۔ پھر غور و فکر کے بعد بولا:

"امیر عالی مقام۔ خدا کے فضل سے شہزادے کو کوئی بیماری نہیں۔ نبض بالکل ٹھیک میں کچھ تیزی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے شہزادے بہادر کسی طرح کی بے چینی محسوس کر کہ اس کا سبب کوئی خوف ہو یا شہزادے کسی چیز کو دیکھ کر ڈر گئے ہوں۔ شہزادے کی خد روشنی ڈال سکے گی۔ اسے طلب کیا جائے۔ میں خود اس سے دریافت کروں گا۔"

طبیب کی زبان سے نکلتے ہی وہ چار کنیزیں جو آفتابی کی جگہ مامور کی گئی تھیں آ گئیں۔ طبیب نے ان پر ایک سرسری نظر ڈالی اور پوچھا:

"تم میں سے کس کنیز کا زیادہ وقت شہزادے کے پاس گزرتا ہے؟"

کنیزیں اس کا کیا جواب دیتیں۔ انہیں تو اس خدمت پہ چند گھنٹے پہلے ہی ما کے بجائے وہ پریشان ہو کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں۔

سرائے خانم چلمن کے پیچھے بیٹھی تھی۔ اس نے شاہی آداب کا لحاظ نہ کرتے ہوئے وہیں سے جواب دیا:

طبیب سے کہہ دیا جائے کہ شہزادے کی خدمت گار کنیز بیمار ہے۔ یہ تمام کنیزیں نئی ہیں۔ انہیں شہزادے بات کا کوئی علم نہیں۔"

طبیب کے کان میں ملکہ کی آواز آئی تو اس نے بھی شاہی آداب بالائے طاق رکھ دیے اور بولا:

"ملکہ عالیہ سے دریافت کیا جائے کہ شہزادے کی یہ حالت کب سے ہے؟"

"صبح سے۔"

"خدمت گار کنیز کب سے غیر حاضر ہے؟"

"صبح سے۔"

"کیا شہزادہ کنیز کی موجودگی میں بالکل ٹھیک تھا؟"

"طبیب کا خیال درست ہے۔ کنیز کے جاتے ہی شہزادے کی یہ حالت ہو گئی۔"

سرائے خانم اور طبیب میں براہ راست اور بلاواسطہ سوال و جواب ہوتے رہے۔ تیمور بڑے غور اور خاموشی رہا تھا۔ یہ گفتگو شاہی اصول و آداب کے خلاف تھی لیکن تیمور نے دخل نہیں دیا۔ اس گفتگو سے امیر کو یاد آیا کہ شاہ رخ کی دیکھ بھال پر سرائے خانم نے اپنی خاص کنیز کو لگایا تھا۔ وہ کنیز کا نام نہیں جانتا تھا اس نے دیکھا ضرور تھا۔

امیر تیمور اس کنیز کے بارے میں سرائے خانم سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اسی وقت اس کا سوال طبیب کے منہ پہ طبیب نے تیمور سے درخواست کی:

"شاہ والا! صرف چند لمحوں کے لیے شہزادے کی کنیز کو طلب کیا جائے وہ صبح سے شہزادے کے پاس موجود تھی۔ اس قدر بیمار نہیں ہو سکتی کہ بستر سے اٹھ کر یہاں تک نہ آ سکے۔ اس کا بلوانا بہت ضروری ہے۔"

امیر تیمور نے چلمن کی طرف رخ کر کے حکم دیا:

"شاہ رخ کی کنیز، جس حالت میں ہو اسے حاضر کیا جائے۔"

سرائے خانم نے فوراً کئی کنیزیں آفتابی کو بلوانے اور لانے کے لیے ایک ساتھ بھیج دیں۔

آفتابی نے بھی اپنی ہمدرد کنیزیں جاسوسی کے لیے لگا رکھی تھیں۔ امیر نے جیسے ہی اس کو بلوانے کا حکم دیا، اس جاسوس کنیز فوراً بھاگ کر اس کے پاس پہنچی اور اس کی طلبی کی خبر سنا دی۔ آفتابی کوٹھری کی کھڑکی سے لگی تھی یہ اطلاع ملتے ہی وہ فوراً بستر پر بیماروں کی طرح دراز ہو گئی اور ہائے ہائے کرنے لگی۔

ذرا دیر بعد کوٹھری کے دروازے پر دستک ہوئی۔ آفتابی نے نحیف آواز بنا کر دستک دینے والی کو اندر

بلایا۔ یہ سرائے خانم کی ایک اور کنیز تھی۔ اس نے آتے ہی امیر کے حکم سے اسے آگاہ کیا اور فوراً اس کو ا
کو کہا۔

"امیر کا حکم ہے تو جانا ہی پڑے گا۔" آفتابی نے کراہتے ہوئے کہا۔ پھر لنگڑاتی ہوئی کنیز کے ساتھ
آفتابی امیر کے سامنے پہنچی تو اس نے سر میں پٹی، ہاتھ پر پٹی اور پتہ نہیں کتنی پٹیاں باندھ رکھی تھ
اسے سہارا دیے ہوئے تھیں۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ امیر حیران نظروں سے اسے دیکھ رہا تھ

طبیب نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا:

"تم کیسی کھلائی ہو کر شہزادے کو روتا چھوڑ کر چلی گئیں؟"

"اے صاحب! بھلا میں شہزادے کو روتا چھوڑ کر کیسے جا سکتی تھی۔"

آفتابی نے بڑے کرارے لہجے میں طبیب کی بات کی تردید کی:

"شہزادے بہادر تو رونا جانتے ہی نہیں۔ ملکہ عالیہ سے دریافت کر لیجیے۔ انہوں نے کبھی شہزاد
کی آواز سنی ہے۔ میں تو انہیں ہنستا کھیلتا چھوڑ گئی تھی۔"

اسی وقت چلمن کے پیچھے سے شہزادے کے رونے کی آواز آئی۔ سرائے خانم نے اسے اندر منگوا لیا
سے چمٹائے بیٹھی تھی۔ شہزادے کا رونا تو چند لمحوں کے لیے کم ہوا تھا لیکن منہ برابر بسور رہے جا رہا تھا۔ پھر
رونے کا سلسلہ شروع ہوا تو پھر کسی کے سنبھالے نہ سنبھلا۔

طبیب بڑے غور سے آفتابی کی حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا۔ اس نے آفتابی سے کہا:

"کیا تم اتنی بیمار ہو کہ شہزادے کو گود میں نہیں لے سکتیں؟"

"کیوں نہیں جی۔"

آفتابی مکاری بھول کے فوراً تڑ اُٹھی:

"شہزادے تو میری جان ہیں، جگر ہیں۔"

آفتابی دو کنیزوں کے سہارے کھڑی تھی۔ انہیں تو اس نے دھکا دیا اور ڈگ بھرتی چلمن کی طرف بڑ
اس طرح بلک رہا تھا جیسے کوئی اسے سوئیاں چبھو رہا ہو۔

آفتابی نے اندر پہنچ کر:

"ہائے میرے شہزادے" کہتے ہوئے شہزادے کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ شہزادہ شاہ رخ
پہنچ کر اس طرح چپ ہو گیا جیسے اس کے جسم کی تمام سوئیاں نکال کر کسی نے مرہم لگا دیا ہو۔ آفتابی
جھولا جھلا رہی تھی اور شہزادہ چپ چاپ ہچکولے کھا رہا تھا۔

اور کنیزیں دم بخود آفتابی کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں تو شہزادہ پارے کی طرح تڑپ رہا تھا۔
ان کے ہاتھوں میں جانے کیا جادو تھا کہ شہزادہ بالکل گونگا ہو گیا۔ اس کی ایک معمولی سی سسکی بھی نہیں نکلی۔
آفتابی اسی طرح شہزادے کو کھلاتی چلمن کے باہر آ گئی۔

امیر تیمور اور کنیزوں نے اسے تعجب سے دیکھا۔ ایک تو شہزادہ بالکل خاموش تھا، دوسرے آفتابی کے پیروں کی
لڑکھڑاہٹ دور ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر پہلے جیسی مردنی نہیں تھی اور وہ تندرست دکھائی دے رہی تھی۔

امیر کا طبیب واحد شخص تھا جسے شہزادے اور کنیز کی حالت تبدیل ہونے پر کوئی تعجب نہیں تھا۔ اسے یہ اندازہ
لگانے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ شہزادے کا رونا صرف اپنی کھلائی کی عدم موجودگی کے سبب تھا۔ جس گود میں وہ کھیلتا تھا اس
کے تبدیل ہونے سے اس میں بے چینی پیدا ہونا ضروری تھا۔ طبیب کو یہ بھی یقین ہو گیا کہ شہزادے کی کنیز اس قدر
بیمار نہیں ہے جتنا وہ ظاہر کر رہی تھی بلکہ اس نے اپنے اوپر مکاری کا غلاف اوڑھ رکھا تھا۔

طبیب نے سب کچھ سمجھنے کے باوجود اس مسئلے پر تبصرہ کرنا مناسب خیال نہیں کیا۔ وہ محلاتی سازشوں سے خوب
واقف تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ ملکہ کی کنیز اور شہزادے کی کھلائی کی مخالفت مول لے کر کسی مصیبت سے دوچار ہو۔ چند
لمحوں بعد اس نے سکوت توڑتے ہوئے کہا:

"امیر عالی مقام! غلام کو جانے کی اجازت دی جائے۔"

تیمور خیالات سے چونکا، بولا:

"شہزادے کو سکون تو مل گیا ہے مگر ممکن ہے کہ یہ وقتی سکون ہو۔ طبیب کچھ دیر اور انتظار کریں۔"

"حکم عالی ہے تو میں کیا عذر کر سکتا ہوں۔"

طبیب زیر لب مسکرایا،

"ورنہ شہزادے کا مرض دور ہو چکا ہے۔ شہزادہ اپنی کھلائی کو نہ پا کر مضطرب ہو گیا تھا۔ یہی سبب اس کے رونے
کا تھا۔ کنیز کو حکم دیا جائے کہ وہ شہزادے سے جدا نہ ہو ورنہ شہزادہ پھر نفسیاتی بے چینی میں مبتلا ہو جائے گا۔"

آفتابی کا سر غرور سے اکڑ گیا۔

تنہائی ہوئی تو امیر تیمور نے کہا:

"سرائے خانم! شہزادے کا خاص خیال رکھا کرو۔ شاہ رخ تمہاری کنیز سے بہت مانوس ہو گیا ہے۔ کس بری طرح
رو رہا تھا۔ کنیز کو ایک لمحے کے لیے اس کے پاس سے نہ ہٹنے دیا جائے۔"

"اے امیر! اس میں نہ میری غفلت کا دخل ہے اور نہ کنیز کی خطا ہے۔" سرائے خانم کی آواز سے غصہ چھلکا،
"وہ بے چاری اپنی کوٹھری میں نہ جاتی تو کیا کرتی۔ اس کی تو مار مار کر ہڈیاں پسلیاں توڑ دی گئی ہیں۔"

"کیا کہا؟"

تیمور نے چونک کر پوچھا: "کس نے مارا ہے اسے؟"

"کیا عرض کروں امیر!" سرائے خانم افسردگی سے بولی:

"زبان کھولوں گی تو امیر سمجھیں گے کہ میں شکایت کر رہی ہوں۔ سوتیلی کا جو داغ ہے میری پیشانی پر....

"سرائے خانم!"

امیر تیمور کو جلال آ گیا:

"ہمیں سوتیلے سگے کے جھگڑے چکانے کا وقت نہیں۔ جو پوچھا گیا ہے اس کا جواب دیا جائے اور...

جواب مختصر ہو۔"

"خانزادہ کی کنیز چاندنی نے پچاس کنیزوں کے ساتھ آفتابی کو گھیر کر مارا ہے۔" سرائے خانم اپنا غصہ دبا

کے بولی:

"یہ صرف امیر کے سوال کا جواب ہے۔ میں شکوہ یا شکایت نہیں کر رہی ہوں۔"

"جھگڑے کی بنا کیا تھی؟" امیر نے تحقیقات شروع کر دی۔

"میں بات کو بڑھانا نہیں چاہتی امیر!"

سرائے خانم اب سنبھل چکی تھی، اس نے اطمینان سے کہا:

"آفتابی مار کھا کر سیدھی میرے پاس آئی تھی۔ میں نے اس بات کی تحقیق کر لی ہے۔ آفتابی کو واقعی مارا گیا ہے اور

کو مارنے والی تمام کنیزوں کا تعلق خانزادہ کے محل سے ہے۔ اس کے بعد میں نے بات کو وہیں ختم کر دیا۔"

"ہمیں کیوں نہیں اطلاع دی گئی؟" امیر تیمور نے فوراً اس کی بات پکڑ لی۔

سرائے خانم ذہین اور سمجھدار تھی، فوراً بولی:

"میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ ایک معمولی بات کو شاہِ تاتار کے کانوں تک پہنچا کر ان کی اہم مصروفیات

مخل ہوں۔"

"لیکن ہم ایسی باتوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔" تیمور تیوریاں چڑھا کر بولا:

"ہم شاہی محلات میں اس قسم کی بے ہودگیاں پسند نہیں کرتے۔ کل مقدمہ ہمارے سامنے پیش ہو۔ ضرو

ہوئی تو ہم خانزادہ کو بھی طلب کر لیں گے۔"

"میں شاہِ تاتار سے درگزر کرنے کی درخواست کرتی ہوں۔" سرائے خانم اوپری دل سے بولی:

"میں نے آفتابی سے کہہ دیا ہے کہ وہ اس واقعہ کی تشہیر اور تشریح نہ کرے۔ مجھے یہ بھی پسند نہیں کہ کنیزوں کے جھ

...سلطنت کی بیوی ایک فریق کی حیثیت میں پیش ہو۔ یہ شاہی خاندان کی بیگمات کے وقار، مرتبے اور شان

...کے منافی ہے۔"

امیر تیمور نے اس کی ایک نہ سنی اور جب سرائے خانم کے پاس سے اٹھا تو حکم دیا:

"خانزادہ کو اطلاع دی جائے کہ وہ اپنی کنیز چاندنی اور دوسری ان تمام کنیزوں کو ہمارے سامنے پیش کرے

...جنہوں نے آفتابی کو مارنے میں حصہ لیا ہے۔"

○

یہ خبر جب خانزادہ کے محل میں پہنچی تو وہاں رونا پیٹنا پڑ گیا۔ ہر کنیز کو اپنی موت نظر آنے لگی۔ سب چاندنی کو

...ملامت کرنے لگیں۔ شہزادی خانزادہ بھی پریشان ہو گئی۔

سرائے خانم نے اپنے طور پر امیر کو اس جھگڑے کی تفصیل بڑی احتیاط سے بتائی تھی تاکہ خانزادہ پر الزام نہ آئے

...خانزادہ کو اس کی کنیزوں نے آ کر بتایا کہ سرائے خانم نے امیر کے کان بھرے ہیں اور وہ سخت برہم ہیں۔

...اس معاملے میں وہ خود کو سرائے خانم سے پہلے ہی کمتر سمجھتی تھی۔ اب اسے خطرہ ہوا کہ وہ کہیں امیر کی نظروں سے

...بالکل گر جائے۔

"کم بخت! میں نے یہ کب کہا تھا کہ تو آفتابی کی ہڈیاں پسلیاں توڑ دے۔" خانزادہ نے چاندنی کو ڈانٹتے ہوئے کہا:

"کل تیرا جو حشر ہو گا سو ہو گا لیکن امیر کی نظروں میں، میں ہمیشہ کے لیے ذلیل ہو جاؤں گی۔"

"شہزادی بیگم! آپ تو یونہی ڈری جا رہی ہیں۔" چاندنی بڑی بے خوفی سے بولی:

"میں نے اور میری ساتھیوں نے آفتابی کی مرمت کی ہے۔ سب کی طرف سے میں امیر کو جواب دوں گی۔"

شہزادی نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔ پوچھا:

"آخر تو امیر سے کیا کہے گی؟ مجھے بھی تو بتا!"

"اس بات کا مزہ تو آپ کو کل ہی آئے گا۔" چاندنی مسکرا کر بولی:

"لیکن آپ کا حکم ہے تو بتائے دیتی ہوں۔ جب امیر مجھ سے پوچھیں گے کہ تو نے آفتابی کو کیوں مارا تو امیر سے

...صاف کہوں گی کہ اے شاہِ تاتار! آپ آفتابی سے دریافت فرمائیں کہ یہ ہمارے محل کے صدر دروازے پر

...کیا کر رہی تھی اور جس وقت ہم نے اس کی پٹائی کی تو یہ کس کے قریب بیٹھی تھی؟"

شہزادی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ کچھ سوچنے کے بعد بولی:

"چاندنی۔ بات تو تو نے بڑے پتے کی کہی ہے مگر آفتابی بڑی چالاک ہے۔ اگر وہ کہہ دے کہ وہ
کے پاس کسی کا پیغام لے کر گئی تھی، پھر تو کیا کرے گی؟"

"شہزادی صاحبہ! آفتابی کو یہ جواب سوجھے گا ہی نہیں۔" چاندنی نے جواب دیا:

"اور اگر اس نے یہی جواب دیا تو میں داروغہ کے تمام ساتھیوں کو پیش کر دوں گی جو امیر کے
گواہی دیں گے کہ آفتابی روزانہ داروغہ سے ملنے آتی ہے اور دونوں گھنٹوں ہنسی مذاق کرتے رہتے ہیں۔
آفتابی کو سولی پر چڑھوا دے گی۔"

"خدا کرے ایسا ہو۔"

شہزادی نے اطمینان کا سانس لیا:

"مگر دیکھ چاندنی! میرا نام اس جھگڑے میں بالکل نہ آنے پائے۔ تمام کنیزوں کو اچھی طرح سمجھا دے۔"
دوسری کنیزیں غور سے چاندنی کی باتیں سن رہی تھیں۔ شہزادی کو مطمئن دیکھ کر انہیں بھی کچھ اطمینان ہوا
کا خوف کچھ کم ہو گیا۔

جس وقت خانزادہ کے باپ آق صوفی نے امیر تیمور کے سامنے ہتھیار ڈال کر قلعہ کی چابیاں تیمور کے
کی تھیں، اس وقت خوارزم والوں کو اپنی شکست کے باوجود یہ طمانیت تھی کہ خوارزم کی حکومت انہی کے ہاتھوں میں
کیونکہ صلح کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ خوارزم کی شہزادی خانزادہ کی شادی امیر تیمور کے بیٹے جہانگیر سے ہوگی۔ ا
اس پر عمل بھی کیا اور خانزادہ کو بہو بنا کر سمرقند لے آیا۔

شہزادہ جہانگیر چونکہ ولی عہد سلطنت تھا اس لیے خوارزم کے سرداروں اور امیروں کو امید تھی کہ جہانگیر اور
اولاد ملک تاتار کے تخت و تاج کی وارث ہوگی۔ اسی طرح خانزادہ سے رشتہ داری کے ناتے وہ حکومت میں حص
ان کا یہ خیال ایک حد تک درست بھی تھا کیونکہ تیمور کے بعد جہانگیر اور اس کے بعد اس کی اولاد ہی کو
میں اوّلیت حاصل ہوتی لیکن نہ تو قدرت کے معاملوں میں کوئی دخل دے سکتا ہے اور نہ شخصی حکومتوں میں
کی پابندی ممکن ہے۔ بادشاہت میں تو جس کی لاٹھی اس کی بھینس پر عمل ہوا کرتا تھا۔ ادھر اب تک جہانگیر کے

نہیں ہوئی تھی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ خوارزم کے سرداروں میں بے چینی پیدا ہو گئی۔

خوارزم کا صدر مقام اور گنج، سمرقند سے کافی فاصلے پر تھا۔ راستے میں سرخ ریگستان کا ناقابل عبور خطہ تھا جہاں
ریت کی بے حد باد [illegible] تھیں۔ پھر خوارزم کے ترکمان بڑے مغرور، خود سر اور شورہ پشت واقع ہوئے تھے۔ ان کا
قبیلہ جلائر تاتاریوں میں سب سے بڑا قبیلہ تھا اور ترکمان سواروں کی تعداد بھی سب سے زیادہ تھی۔

یہی وہ باتیں تھیں جنہوں نے خوارزم کے ترکمانوں کو ایک بار پھر تیمور کے سامنے کھڑا کر دیا۔ آق صوفی نے
انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ سرکشی اور شورش سے باز نہ آئے۔ آق صوفی نے مجبور ہو کر چند سرداروں کو
گرفتار کر لیا۔ اس سے خوارزم میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی اور آق صوفی کو قلعہ بند ہو کر اپنی مدافعت کرنا پڑی۔ آق نے
قاصد کے ذریعے امیر تیمور کو اطلاع دی اور مدد کی درخواست کی۔

تیمور اس طرح کی بغاوتوں سے بہت چڑا ہوا ہوتا تھا۔ اس نے فوراً لشکر تیار کرنے کا حکم دیا۔ اس کا خیال تھا
کہ وہ لشکر کو شہزادے جہانگیر کی کمان میں روانہ کرے گا کیونکہ خوارزم کا علاقہ اس نے جہانگیر کو جاگیر کے طور پر
دے دیا تھا اور اس کا رسمی طور پر اعلان بھی ہو گیا تھا۔

ابھی یہ لشکر روانہ نہ ہو پایا تھا کہ خوارزم کا ایک اور قاصد سمرقند پہنچا۔ اس نے بتایا کہ صدر مقام اور گنج کے
قلعہ پر باغی سرداروں کا دباؤ بڑھ گیا ہے اور اگر کوئی مدد نہ پہنچی تو نہ معلوم کیا ہو جائے۔

تیمور ابھی کوئی اور فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ خوارزم سے قاصدوں کے آنے کا تانتا بندھ گیا۔ روز ایک قاصد سمرقند
پہنچتا اور مدد کی درخواست کرتا۔ آق صوفی نے تو یہاں تک کہلوایا تھا کہ اگر امیر خود لشکر لے کر تشریف نہ لائے تو قلعہ
ان سے نکل جائے گا۔

تیمور کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ خود اور گنج جا کر باغیوں کا قلع قمع کرے۔ تیمور نے سمرقند کی حکومت
شہزادے جہانگیر کے حوالے کی اور ایک زبردست لشکر لے کر اور گنج کی طرف چلا۔

امیر تیمور نے اور گنج کی مہم پر جانے کا اعلان اُس شب کو کیا جس کی صبح کو اس کے سامنے آفتابی کا مقدمہ پیش ہونا
تھا۔ اس طرح محل میں کسی اور کو خوشی ہوئی ہو یا نہ لیکن خانزادہ کی کنیزیں امیر تیمور کے خوارزم چلے جانے سے بہت خوش
ہوئیں۔ چاندنی نے انہیں اطمینان تو دلا دیا تھا کہ وہ انہیں امیر تیمور کے عتاب سے بچا لے گی لیکن وہ بہت خوف زدہ تھیں اور
یوں امیر تیمور کے جانے سے کچھ دنوں کے لیے ٹل گیا تھا۔

خوارزم جانے والا ریگستانی راستہ بڑا دشوار گزار تھا لیکن امیر تیمور ان راستوں کا اب عادی ہو گیا تھا۔ اس نے
اس ریگزار کو پہلے بھی دو بار عبور کیا تھا۔ ایک بار تو اپنی جدوجہد کے آغاز میں جب اس کے پاس ایک مریل گھوڑا اور
ایک کمزور اونٹ تھا۔ اس وقت کیفیت یہ تھی کہ گھوڑے پر اس نے اپنی وفادار بیوی الجائی اور ننھے جہانگیر کو

بٹھایا تھا اور خود اونٹ کی مہار پکڑے پیدل چل رہا تھا۔

دوسری بار اس نے خوارزم کا یہ راستہ تاتاریوں کے امیر کی حیثیت سے طے کیا تھا اور خوارزم اس کے قدموں میں آ گیا تھا۔ اب تیمور نے خوارزم جانے کے کچھ آسان راستے بھی دریافت کر لیے تھے اور انہی راستوں سے وہ اپنے لشکر کو لیے جا رہا تھا۔

امیر تیمور ابھی اور گنج سے ایک منزل دور تھا کہ خوارزم کے باغی جی چھوڑ بیٹھے۔ وہ تیمور کی آمد سے گھبرائے کہ قلعے کا محاصرہ چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئے۔

تیمور کو ان پر سخت غصہ تھا۔ اس نے اور گنج پہنچتے ہی ان پر حملہ کر دیا۔ امیر کا لشکر تھکا ماندہ تھا اور دفاعی جنگ لڑ رہے تھے لیکن تیمور کا عزم جوان تھا۔ اس میں جذبہ و جوش تھا۔ لشکر کو اس پر کامل اعتماد تھا۔ پہلے ہی حملے میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہزاروں قتل ہوئے۔ تیمور نے باغیوں کا خوارزم کی سرحد تک تعاقب جنگلوں میں مار بھگایا۔

ترکمانوں کے کئی سردار گرفتار کر لیے گئے جنہیں تیمور اپنے ساتھ سمرقند لے آیا۔ تیمور نے سمرقند واپسی قلعے کی فصیلوں کو اور مضبوط کیا اور آق صوفی کی مدد کے لیے ایک لشکر چھوڑ دیا۔

امیر تیمور کی یہ مہم مختصر تھی۔ ترکمانوں نے صرف ایک ہی بار جم کر مقابلہ کیا تھا پھر بھی تیمور کو سمرقند واپسی میں ایک ماہ لگ گیا۔ پھر جب تیمور فتح کے ڈنکے بجاتا سمرقند واپس آیا تو اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ وہ کئی سرداروں کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس کا اثر سمرقند والوں پر اچھا پڑا۔ استقبال کرنے والوں میں بڑے سردار موجود تھے۔ انہوں نے خوارزم کے سرداروں کو پابہ زنجیر دیکھا تو ان پر بڑا رعب پڑا۔ جلائر قبیلہ کا بڑا کے حشر کو دیکھ کر انہیں یقین ہو گیا کہ اگر انہوں نے کبھی تیمور کے خلاف تلوار اٹھائی تو ان کا بھی یہی انجام ہو

ترکمان سرداروں میں بعض سردار خانزادہ کے بہت قریبی رشتہ دار تھے لیکن تیمور نے ان سے کوئی رعایت کی۔ انہیں عام قیدیوں کی طرح طوق و سلاسل پہنایا گیا۔

تیموری سرداروں نے سمرقند کی سرحد پر اس کا شاندار استقبال کیا اور جلوس کی شکل میں محل کے دروازے اس کے ساتھ آئے۔ صدر دروازے پر شاہی خاندان کے سبھی لوگ درجہ بدرجہ کھڑے تھے۔ خاندان کی خواتین جہانگیر، سرائے خانم سب نے اس کا پرجوش استقبال کیا۔ محلات کی کنیزیں اور غلام طلائی سکے نچھاور کر رہے تھے تاشے پیٹے جا رہے تھے۔ ہر طرف خوشی کا ایک عجب سماں تھا لیکن تیمور کی بے چین نگاہیں استقبال کرنے والوں کو تلاش کر رہی تھیں۔

اسے خانزادہ نظر نہ آئی تو اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

وہ گھوڑے سے اترا اور بڑی برہمی سے جہانگیر کو مخاطب کیا:

"شہزادی نظر نہیں آئی جہانگیر!"

جہانگیر نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر نظریں جھکا لیں۔

"جواب دو جہانگیر۔"

تیمور کا مزاج بگڑ گیا:

"کیا اسے صدمہ ہے کہ ہم نے خوارزمیوں کی سرکشی کو کیوں ختم کیا؟"

"یہ بات نہیں، ابا حضور!" شہزادہ گھبرا کر بولا۔ لیکن وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے خانزادہ کی عدم شرکت کا کوئی جواز پیش نہیں کیا۔

"شہزادے!" تیمور گرجا۔

"جاؤ اور خانزادہ سے کہہ دو کہ باغی ہماری نظر میں صرف باغی ہے خواہ وہ ہمارا بیٹا جہانگیر کیوں نہ ہو۔ اسے یہ بھی اطلاع دے دو کہ ہم اس کے تمام باغی رشتے دار قید کر کے لائے ہیں کل انہیں قتل کیا جائے گا۔ اور خانزادہ یہ منظر دیکھنے کے لیے موجود ہو گی۔ یہ ہمارا حکم ہے۔"

تیمور کو اس قدر غصہ آ گیا تھا کہ اس نے کسی اور سے بات نہیں کی اور اندر کی طرف چلا۔ وہ دو سیڑھیاں طے کر پایا تھا کہ کسی طرف سے آواز آئی:

"عالی جاہ۔ کنیز کو عرضِ حال کی اجازت دی جائے۔"

تیمور نے پلٹ کر دیکھا۔ خانزادہ کی کنیز چاندنی سر جھکائے کھڑی تھی۔ تیمور نے اسے گھور کے دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کی لیکن محلات میں تو بے شمار کنیزیں تھیں۔ وہ کس کس کو پہچانتا۔ سرائے خانم نے یہ موقع غنیمت جانا اور آگے بڑھ کے سرگوشی کے انداز میں کہا:

"اے امیر۔ یہ خانزادہ کی کنیزِ خاص چاندنی ہے۔"

"او۔ تو ہی ہے وہ چاندنی جس نے شاہ رخ کی کھلائی کو پیٹا تھا؟" تیمور سیڑھیوں پر گھوم کر کھڑا ہو گیا۔

"اے شاہِ تاتار۔ میرا مقدمہ ابھی تک آپ کے حضور پیش نہیں ہوا۔ میں اپنی صفائی پیش کرنے کو تیار ہوں لیکن......"

چاندنی ایک طویل سانس لے کر بڑی جرأت سے بولی:

"لیکن اس وقت شہزادیِ خوارزم کی صفائی پیش کرنا چاہتی ہوں۔"

"گستاخ کنیز۔" تیمور کی برہمی انتہا کو پہنچ گئی:

"تو نے ہمارے قدم روکے ہیں۔ بغیر اجازت کے ہمیں مخاطب کرنے کی گستاخی کی ہے۔ ہم حکم دیتے ہیں کہ تیری زبان تراش دی جائے تاکہ آئندہ کوئی ہمارے سامنے اس طرح گستاخی نہ کر سکے۔"

"کنیز، شاہِ تاتار کے حکم پر سرِ تسلیم خم کرتی ہے۔"

چاندنی نے جیسے سر پہ کفن باندھ لیا تھا:

"لیکن زبان کے تراشے جانے سے پہلے کنیز وہ بات کہہ دینا چاہتی ہے جس کے اظہار سے ہم جھجکتے ہیں۔ اے امیرِ عالی مقام! آپ کی بہو اور ولی عہد بہادر کی شریکِ حیات شہزادی خوارزم صاحب فراش ہیں۔ شدید بیماری اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ بستر سے اٹھ کر شاہِ محترم کے استقبال کو آ سکیں۔"

شہزادی کی بیماری کی خبر سے امیر تیمور کا غصہ ایک دم ٹھنڈا ہو گیا۔ اس نے پہلے شہزادے کو اور پھر سرائے خانم کو گھورتے ہوئے بولا:

"سرائے خانم! ہم یہ کیا سن رہے ہیں؟"

"امیرِ محترم!" سرائے خانم گھبرا کر بولی:

"یقین کیجیے کہ مجھے شہزادی کی بیماری کی مطلق خبر نہیں۔ شہزادی پہلے شاہ رخ کو دیکھنے آیا کرتی تھیں۔ مہم پر جانے کے بعد انہوں نے میرے محل میں آنا چھوڑ دیا ہے۔ پھر بھی اگر مجھے شہزادی کی بیماری کی اطلاع ہوتی تو میں انہیں ضرور دیکھنے جاتی۔"

شہزادی نے اپنی بیماری پر خود پردہ ڈال رکھا تھا۔ اس نے تمام کنیزوں کو خبردار کر دیا تھا کہ اس کے بارے میں ملکہ کے محل تک کوئی اطلاع نہ جانے پائے۔ شہزادے جہانگیر کو بھی اس نے تاکید کر دی کہ امیر کی واپسی کے وقت انہیں بیماری کی اطلاع نہ دے۔

دراصل اس نے ایک خاص مصلحت کی بنا پر یہ فیصلہ کیا تھا کہ جب امیر کو اس کی بیماری کی اطلاع کسی سے ملے گی اور وہ اسے دیکھنے آئے گا تو وہ خود اس راز پر سے پردہ اٹھائے گی لیکن امیر نے خانزادہ کی اس وقت عدم موجودگی کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور فوراً تحقیقات شروع کر دی۔ شہزادے سے سوال کیا تو وہ تذبذب میں پڑ گیا لیکن چاندنی نے بات بگڑتے دیکھی تو شہزادہ کی صفائی پیش کی۔

"سرائے خانم!" امیر نے ترش لہجے میں کہا:

"ہمیں تمہاری بے خبری اور شہزادی کی طرف سے عدم توجہی پر افسوس ہے۔ کم از کم تم ہی اس کی خبر رکھتیں، اس حالت میں جبکہ شہزادی شدید علیل ہے۔"

"امیرِ محترم۔ میں اپنی غلطی پر نادم ہوں۔" سرائے خانم نے تکرار سے گریز کیا:

"جہاں تک امیر کو اطلاع دینے کا تعلق ہے تو اس کے لیے عرض ہے کہ اگر میں بیماری سے باخبر بھی ہوتی تو بھی اطلاع آپ تک نہ پہنچنے دیتی، کیونکہ امیر کا یہ عام حکم ہے کہ کسی مہم کے دوران انہیں کوئی بھی ایسی خبر نہ پہنچائی جائے جس سے ان کا ذہن کسی انتشار میں مبتلا ہو جائے۔"

تیمور نے واقعی یہ سخت حکم دے رکھا تھا کہ جنگ کے دوران اگر اس کا کوئی قریبی عزیز بھی انتقال کر جائے تو اس کی اطلاع نہ دی جائے۔ چنانچہ جس وقت وہ شمال کے جتہ مغلوں کے مقابلے میں پسپا ہو کر شہرِ سبز پہنچا تو اسے بتایا گیا کہ اس کی چہیتی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ الجائی کی بیماری اور وفات کی اطلاع امیر تیمور کو نہیں بھیجی گئی تھی۔

اب امیر تیمور نے پھر چاندنی کی طرف دیکھا اور حکم دیا:

"جا اور اپنی شہزادی کو اطلاع دے کہ ہم سب سے پہلے اس کے محل میں عیادت کے لیے آ رہے ہیں۔"

چاندنی خوش ہو کر آداب بجا لائی۔ پھر فوراً بولی:

"کنیز امید رکھتی ہے کہ شاہِ تاتار اپنے پہلے حکم پر نظرِ ثانی فرمائیں گے۔"

تیمور مسکرا دیا۔ بولا:

"چاندنی! تو اپنی شہزادی سے زیادہ حاضر جواب ہے۔ ہم نے تیرا قصور معاف کیا۔ شہزادی کو اطلاع پہنچا دے۔"

شہزادی خوارزم کی حاضر جوابی تمام محلات میں مشہور تھی۔ وہ امیر تیمور کو بھی فوراً جواب دے دیتی تھی اور تیمور مسکرا کر اس کی شوخ گفتاری کو نظر انداز کر دیتا تھا۔

امیر تیمور شہزادے جہانگیر اور سرائے خانم کو ساتھ لیے خانزادہ کی خواب گاہ پر پہنچا۔ دفعتاً اس کی نظر خواب گاہ کے دروازے پر پڑی۔ وہاں طلائی حروف میں لکھا ہوا ایک طغریٰ آویزاں تھا۔ اس نے دروازے میں قدم رکھا تو کچھ عجیب رنگ کی بھینی بھینی خوشبو محسوس ہوئی۔ خانزادہ کی کنیزیں اس کی مسہری کو گھیرے ہوئے تھیں۔ کچھ عمر رسیدہ دایاں بھی خواب گاہ میں تھیں۔

شہزادی مسہری سے سر ٹیکے تکیوں کے سہارے آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ اس کے سرخ و سفید چہرے پر اس وقت ہلکی زردی کی آمیزش ہو رہی تھی۔ بال کھلے تھے اور دوپٹہ ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔

امیر کو اندر آتے دیکھ کر سرہانے کھڑی چاندنی نے فوراً شہزادی کے بکھرے بال سمیٹے۔ دوپٹہ درست کیا اور آہستہ سے اس کے کان میں کہا:

"شاہِ تاتار خواب گاہ میں داخل ہو چکے ہیں۔"

شہزادی نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا اور اس طرح کسمسائی جیسے تعظیم کے لیے اٹھنا چاہتی ہو۔ شہزادی کی نقاہت اس کی بیماری ظاہر کر رہی تھی۔

تیمور نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اٹھنے سے منع کیا:

"اٹھنے کی ضرورت نہیں۔ تم بہت کمزور معلوم ہو رہی ہو۔"

شہزادی کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

"کس کا علاج ہو رہا ہے شہزادے؟" تیمور نے جہانگیر کی طرف گھومتے ہوئے پوچھا۔

"جی..... وہ..... ابا حضور..... دراصل....." شہزادے کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔

اسی وقت شہزادی نے زور کی سانس لی۔ پھر اسے اُچھو ہوا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا جی اور ابھی اُلٹ جائے گا۔ کنیزیں ادھر اُدھر بھاگیں اور چاندی کے آفتابے اور اگالدان لے آئیں۔

سرائے خانم کی نظریں خانزادہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور اس کا دل زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ اسے شہزادی کی بیماری کا علم ہو چکا تھا۔

"سرائے خانم!" امیر فکرمند ہو کر بولا۔

"شہزادی تو بہت بیمار معلوم ہوتی ہے۔"

سرائے خانم نے امیر کے کانوں کے پاس منہ لے جا کر کہا:

"مبارک ہو امیر۔ خانزادہ کی گود ہری ہونے والی ہے۔"

امیر تیمور اس انکشاف پر اچھل پڑا۔ جب سے شہزادہ شاہ رخ پیدا ہوا تھا، امیر تیمور کو جہانگیر کی اولاد کی آرزو دامن گیر تھی۔ وہ اس وقت خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔

"شہزادی بیٹی!" تیمور جذبات سے بے قابو ہو گیا:

"ہم بے حد خوش ہوئے ہیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ....."

"شاہِ تاتار۔" خانزادہ اپنی حالت پر قابو پا چکی تھی۔ وہ اپنی روایتی شوخی سے بولی:

"خدا کا شکر ادا کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کی راہ میں صدقہ دیا جائے اور خیرات بانٹی جائے۔ غریبوں کی ضرورت پوری کی جائے۔ مصیبت زدوں کو مصیبت سے نجات ملے۔"

"یہ سب کچھ ہو گا شہزادی بیٹی!"

تیمور مسرت سے کھلا جا رہا تھا:

"اس کے علاوہ بھی کوئی خواہش ہو تو بیان کرو۔ ہم تمہاری ہر آرزو پوری کریں گے۔"

شہزادی کی ہمت بندھی۔ اس نے فوراً کہا:

"اے امیر! فاتح کو چاہیے کہ وہ امیر و غریب، شاہ و گدا، ہر ایک کو بخش دے اور اگر وہ غلطی کریں تو عفو و درگزر سے کام لیتے ہوئے ان کی کوتاہیوں اور غلطیوں کو معاف کر دے۔ اس لیے کہ اگر کوئی معافی کی درخواست پیش کرے تو پھر وہ دشمن نہیں رہتا۔ فاتح کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ جب کوئی چیز کسی کو بخش دے تو پھر اس کے بدلے کسی اور چیز کی خواہش نہ کرے کیونکہ وہ کسی فرد کی دوستی اور تعاون کا محتاج نہیں ہوتا۔ فاتح سے بڑا کوئی نہیں بلکہ سب لوگ اس سے کمتر ہوتے ہیں اس لیے فاتح کو کسی ایک دشمن پر عتاب نازل نہیں کرنا چاہیے۔"

امیر تیمور، شہزادی کے ایک ایک لفظ پر غور کر رہا تھا۔ اس کے خاموش ہونے پر بولا:

"اے ذہین شہزادی! ہمیں اپنے اور جہانگیر کے انتخاب پر فخر ہے۔ ہم تمہارا مطلب پا گئے۔ درخواست قبول کی جاتی ہے۔ ترکمانوں پر رحم ہو گا..... اور تمہارے رشتے دار رہا کر دیے جائیں گے اور انہیں انعام و اکرام دے کر خوارزم بھیج دیا جائے گا۔"

"اے امیر!" شہزادی اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی:

"کاش میں سر جھکا کر خلوصِ دل سے آپ کا شکریہ ادا کر سکتی۔"

"نہیں آرام اور صرف آرام کی ضرورت ہے۔"

تیمور چلنے کے لیے تیار ہوا:

"ہم پھر تمہیں دیکھنے آئیں گے۔"

ترکمانوں کی بغاوت کچلنے کے بعد امیر تیمور پورے ماوراء النہر کا بلا شرکتِ غیرے امیر اور بادشاہ ہو گیا۔ کسی امیر کی جرأت نہ تھی کہ امیر تیمور کے سامنے زبان کھولے یا اس کی حکم عدولی کرے۔ سلطنت ہرات کو فتح کرنے سے اس کی سلطنت جنوب میں کافی دور تک پھیل گئی تھی لیکن ابھی تک تیمور نے اپنے علاقے سے باہر قدم نہیں نکالے تھے۔ وہ مطمئن اور خوش تھا۔ قدرت نے اسے دنیا دی..... آسائشوں سے پوری طرح نوازا۔ اس کی ذاتی زندگی بھی قابلِ رشک تھی۔ اسے اپنی بیوی الجائی خاتون سے بے حد محبت تھی۔ اس کی وفات کے بعد تیمور نے اپنی زندگی میں ایک خلا محسوس کیا تھا لیکن سرائے خانم نے اس خلا کو جلد ہی پورا کر دیا۔ شہزادہ جہانگیر اس کا ولی عہد تھا اور تیمور کی غیر موجودگی کے زمانے میں پورے وقار کے ساتھ انتظامی امور سرانجام دیتا تھا۔ جہانگیر کو اپنا دربار لگانے

طبل اور علم رکھنے کی اجازت تھی۔

امیر تیمور کو اگر کوئی فکر تھی تو جہانگیر کی تھی۔ شہزادے کی شادی کو جوں جوں زمانہ گزر رہا تھا جاتی تھی۔ اس کی آرزو تھی، خانزادہ کے بطن سے جہانگیر کی اولادِ نرینہ پیدا ہو تا کہ وہ جہانگیر کی جا قدرت نے اس کی یہ آرزو بھی پوری کر دی۔

خانزادہ نے ایک خوبصورت بچے کو جنم دیا۔

اس بچے کی پیدائش پر سمرقند میں جو جشن منایا گیا اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا کی نصف آبادی اسے مبارک باد دینے سرخ ریگستان کو پار کر کے پہنچی۔ تیمور نے خانزادہ کی قدر خاطر مدارات کی کہ وہ عش عش کر اٹھے۔ یہاں تک کہ خوارزم سے آنے والوں کو فرداً فرداً خلعتیں دی گ طلائی سکوں سے بھری ایک ایک تھیلی بھی دی گئی۔

تیمور نے اپنے پوتے کا نام پیر محمد رکھا۔ پیر محمد کی پیدائش پر سب ہی خوش تھے لیکن ہوتے ہی محلاتی سازشوں میں اضافہ ہو گیا۔ خانزادہ کا احساسِ محرومی ختم ہو چکا تھا۔ وہ ایک بار پھر مقابلے پر آ گئی۔ دونوں محلات میں کشیدگی اس قدر بڑھی کہ کنیزوں اور غلاموں کی بھی ایک دوسرے آمد و رفت بند ہو گئی۔ خانزادہ کی کنیز چاندنی اور سرائے خانم کی کنیز آفتابی میں ہر وقت ٹھنی رہتی ا پنچا دکھانے میں معروف رہتیں۔

آخر سرائے خانم کو بھی خانزادہ کے مرتبے کا احساس کرنا پڑا۔ اب وہ کوشش کرتی کہ کوئی بات کے کانوں تک بات پہنچے۔

امیر تیمور اپنے نئے سمرقند میں مست تھا۔ یہاں شہتوت کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ باغ ہرا خوش و خرم اور چاق و چوبند رہتے تھے۔ دریا پر بند باندھ کر اونچی جگہ ایک جھیل بنائی گئی تھی۔ اور میٹھا پانی جیسے کے نلوں کے ذریعے سمرقند کے مکینوں کو پہنچایا جاتا تھا۔

تیمور جب خنگ اوغلن (سنہری گھوڑا) پر سوار ہو کر خیابانوں سے گزرتا تو لوگ راستہ میں کھڑے ہو جاتے۔ اس کے ارد گرد اس کے امراء اور وزیر صبا رفتار گھوڑوں پر سوار ہو کر چلتے۔ امیر کی شان و شوکت اور اس کے سرداروں کی آن بان دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑتے۔ نماز کے بعد باہری محراب کے نیچے اوپری منزل پر کھڑا ہوتا تو علماء اس کی تعریف کرتے، دعائیں دیتے اور ثنا

...کہ اس وقت اور عروج حاصل ہوا جب اس کے ہاں دوسرا بچہ پیدا ہوا۔ امیر نے اس بچے کا نام سلطان محمد ... خانزادہ اب جہانگیر کے دو ولی عہدوں کی ماں بن گئی تھی۔

... ایک وقت تھا کہ سرائے خانم سے ملنے کے لیے خانزادہ جایا کرتی تھی اور اب اس وقت خانزادہ کی ... پایہ جاں تھا۔ اگر کسی محفل میں سرائے خانم کا سامنا ہو جاتا تو منہ پھیر کر نکل جاتی۔ وہ سرائے خانم کو سلام کرنا بھی ... گوارا نہ تھی۔

امیر تیمور کو سرائے خانم اور خانزادہ کے اختلاف کا علم تھا لیکن اس کے خیال میں یہ کوئی ایسی بات نہیں ... سنجیدگی سے غور کیا جائے کیونکہ امیر اور بادشاہ وہ خود تھا اور مقدمہ اسی کے سامنے پیش ہونا تھا لیکن ... کا ایک طویل زمانے تک نوبت نہ آئی۔

تیمور کا اب سمرقند میں کم ہی قیام رہتا۔ وہ لشکر لے کر شمال اور شمال مغرب کی طرف نکل جاتا۔ اس کا قول تھا ... حملہ آور سے محفوظ رکھنے کا بہترین جنگی اصول یہ ہے کہ دشمن کی سرحدوں پر حملے کرتے رہو تا کہ اسے ... پر مجبور ہونا پڑے اور حملہ کرنے کا وہ تصور بھی نہ کر سکے۔

... جب وہ مہم پر ہوتا تو سانڈنی سوار یا سرحدی محافظ قاصد بن کر سمرقند پہنچتے رہتے اور اپنے امیر کے ... بیان کر کے محفلوں کو گرماتے تھے۔ اگر تیمور کوئی نیا ملک فتح کرتا تو وہ بے شمار تاوانِ جنگ سمرقند بھیجتا تھا۔ ... ہوتا کہ وہ مغرب میں خراسان کی تاریخی شاہراہ پر چل پڑتا۔ نیشاپور اور مشہد کی زیارت گاہوں سے گزر کر ... (کیسپین) کے کنارے پہنچ جاتا۔ اس کے کنارے کنارے گھنے جنگل تھے جہاں ہزاروں سال سے ... آباد تھے۔ یہ وحشی اکثر خوارزم کی سرحدوں میں گھس آتے اور قیامت برپا کر دیتے۔ یہ بت پرست تھے اور ... کے علاوہ ان کا گوشت بڑی رغبت اور لذت سے کھاتے تھے۔ خوارزم والوں کو ان کے حملوں کے لیے بڑے انتظامات کرنے پڑتے پھر بھی ان کا داؤ چل جاتا۔ اور وہ کسی نہ کسی سرحدی قصبے میں گھس کر ... تباہ و برباد کر دیتے۔

... قبیلے سُربداری قوم کے نام سے مشہور تھے اور خود کو شمال مغربی بادشاہوں کا رشتے دار بتاتے تھے۔ پھر ... سمرقند میں ایک سانڈنی سوار قاصد آیا اور اس نے وہیں سے چلا چلا کر کہنا شروع کیا:

... اے امیر کا اقبال بلند ہو۔ وحشی سُربداری قوم کا قلع قمع کر دیا گیا۔ ان کے تمام سردار گرفتار ہو کر قتل ... ان کے سروں کا مینار بنا دیا گیا۔"

... خوارزم والوں نے ان کے خاتمے پر جشن منایا۔ سمرقند والے بھی اس بلا کے قصے سنا کرتے تھے۔ انہیں بھی ان ... اطمینان ہوا۔ اس طرح تیمور نے بلادِ شمال کے جتہ مغلوں (چغتائی) کے خلاف فوج کشی کی۔ تیمور کی شمالی

مہمات کے بارے میں تفصیلی حالات کہیں دستیاب نہیں ہو سکے۔ وہ ہر سال مغلوں پر حملہ کرتا اور انہیں شمال اور
میں دور دور تک پسپا کرتا رہتا تھا۔ جتہ مغلوں کا زوران پیہم حملوں سے ٹوٹتا رہا۔ تیمور کا سلسلے سے مقا
کے ساتھ ہوا تھا۔ یہ مغلوں کا آخری بادشاہ یا خانِ اعظم تھا۔ اس نے تیمور کی یلغار کو روکنے کی کوشش کی لیکن
زبردست شکست ہوئی۔ اور اسے اپنا صدر مقام یعنی حصار المالیق بھی چھوڑنا پڑا۔ اور اس نے بھاگ کر صحرائے گ
پناہ حاصل کی۔

یہ وہی علاقہ تھا جہاں سے ڈیڑھ سو سال پہلے چنگیز خان ہلاکت و بربریت کا طوفان بن کر اٹھا تھا اور
جس علاقے سے متعلق تھے انہیں پھر اسی جگہ واپس آنا پڑا۔ اور انہیں واپس کرنے والا تاتار کا امیر تیمور تھا جو
رگوں میں خود بھی مغلوں کا بعض قبیلوں کا خون دوڑ رہا تھا۔

امیر تیمور جس وقت مغلوں کو صحرائے گوبی کی طرف پسپا کر رہا تھا تو اس نے سمرقند میں اس فتح کی اطلاع
پھر جب اسے مغلوں پر مکمل فتح حاصل ہوئی تو اس نے اپنا خاص قاصد شہزادے جہانگیر کے پاس بھیجا۔ یہ
ہزار میل کا سفر طے کر کے سمرقند پہنچا، تو لوگوں نے اسے گھیر لیا لیکن وہ سیدھا ولی عہد کے محل پہ آیا اور اپنی
اطلاع کرائی۔ جہانگیر فوراً اس سے ملنے آیا اور اسے بڑی عزت سے بٹھایا۔

قاصد نے سلام کے بعد جہانگیر کو امیر تیمور کا پیغام دیا۔ اس نے کہا:

"اے ولی عہد سلطنتِ تاتار۔ میرے آقا امیر تیمور نے پیغام دیا ہے کہ پہلے ہم نے جتہ مغلوں کی
چنگاریاں بجھائی تھیں لیکن اب ان کی آگ کو ہمیشہ کے لیے سرد کر دیا ہے۔ ہم نے اس خاکستر میں ایک چنگاری
نہیں چھوڑی۔"

جہانگیر ان دنوں بیمار تھا اور طبیب نے چلنے پھرنے سے منع کر دیا تھا لیکن اس نے یہ گوارا نہ کیا
کے قاصد کو محل میں بلا کر باپ کا پیغام سنے۔ جہانگیر نے بڑے تحمل سے امیر کا پیغام سنا اور قاصد کو انعام دیا
نے سمرقند میں جشنِ عام کا اعلان کرایا۔ اس نے حکم دیا کہ یہ جشن اس وقت تک جاری رہے گا جب تک امیر
واپس نہیں آ جاتے کیونکہ قاصد نے یہ بھی بتایا تھا کہ امیر اب واپسی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

جشن کا آغاز ہو گیا۔

سب کا خیال تھا کہ امیر ہفتے عشرے میں واپس آ جائیں گے لیکن ان دنوں ایک ہزار میل کا راستہ
آسان کام نہیں تھا۔ ادھر جشن جاری تھا ادھر تیمور، شاہراہ حفا پہ ایک ہزار میل کا سفر طے کرتا ہوا واپس آ
مغلوں پر مکمل فتح حاصل ہوئی تھی اس لیے وہ بہت خوش تھا اور راستے میں شکار سے دل بہلاتا آ رہا تھا۔ یہ
بہت عظیم فتح تھی لیکن اس فتح کی اسے بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔

سمرقند امیر تیمور کے امرا نے اپنے فاتح کا سمرقند کے بیرونی باغوں میں استقبال کیا مگر ان کے
چہرے اترے ہوئے تھے اور زبانیں گنگ ہو گئی تھیں
استقبال کرنے والے امرا کی پیشوائی امیر سیف الدین کر رہا تھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے امیر تیمور کی طرف
اس کے پیچھے تمام بڑے بڑے سردار تھے اور ان سب نے اپنے کپڑوں پہ خاک ڈال رکھی تھی۔ امیر
کے قریب پہنچ کر گھوڑے کی رکاب تھام لی۔
تیمور کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے پہلو میں ایک درد سا محسوس
نے سیاہ کپڑوں میں ملبوس امیروں پر نظر دوڑائی۔ اس کے دانت ایک نامعلوم خوف سے بھینچ گئے۔ آخر
تیمور کو سنبھالا اور سیف الدین کو مخاطب کیا:
"کیا تم خوف زدہ ہو؟"
تیمور کی آواز لرز رہی تھی:
"بولو سیف الدین بولو... بولو... خوف مت کھاؤ۔"
"میں خوف زدہ نہیں ہوں امیر!"
سیف الدین نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:
"شہزادہ جہانگیر جوانی کی بہاریں بھی نہ دیکھ سکا اور ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا۔"
حسب دستور اور خود امیر کے اعلان کے مطابق شہزادے کی بیماری کی خبر امیر کو نہیں بھیجی گئی تھی۔ شہزادہ
سخت بیمار ہوا اور تیمور کے سمرقند واپس آنے سے صرف چند روز پہلے انتقال کر گیا۔
تیمور کو محسوس ہوا کہ اس نے شمالی مہم میں جو کچھ حاصل کیا تھا اس سے زیادہ اس نے کھو دیا ہے۔ ہر شخص
کا باپ بھائی یا شوہر ہوتا ہے۔ امیر تیمور کتنا ہی بڑا فاتح کیوں نہ ہو لیکن آخر وہ بھی باپ تھا۔ اسے جہانگیر
کے انتقال کا بہت صدمہ ہوا لیکن اس نے اس صدمے پر قابو پا لیا اور صرف چند لمحوں کی خاموشی کے بعد امیر
نے حکم دیا:
"گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔"
امیر تیمور نے فوج کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ فوج کو شہزادے کی جواں مرگی کا علم ہو چکا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ
داخل ہوئی۔ سب کے چہرے پھیکے اور دل رو رہے تھے۔
امیر تیمور نے جہانگیر کے نقارے اور طبل منگوا کر توڑ دیے تاکہ اس کے بیٹے کی موت کے بعد کوئی اور
انہیں بجا سکے

پھر جہانگیر کی بیوہ شہزادی خانزادہ اپنے دونوں بچوں کو لے کر آئی۔
امیر تیمور نے ماتمی لباس میں غمزدہ شہزادی کو دیکھا تو اس کے منہ سے ایک ہلکی سی سسکی نکل گئی۔
نظریں نیچی کر لیں۔
نہ خانزادہ بولی اور نہ امیر تیمور نے کچھ کہا۔ وہ بولتے بھی تو کیا۔ ان کے پاس کہنے کو کیا رہ گیا تھا!

○

خاقانِ مشرق

بیس گاڑیاں، سو گھوڑے اور دس اونٹ، وہ قیمت تھی جو چشمانیہ خاتون کے باپ نے خود مقرر کی تھی اور شمال
کے شہزادے پارس خان نے اس قیمت کو بے چون و چراں تسلیم کرتے ہوئے اس کی ادائیگی کا وعدہ بھی کر
لیکن شہزادہ اب بھی بے چین تھا۔
"چشمانیہ!"
شہزادہ پارس نے گھوڑے سے اترتے ہوئے کہا:
"یہ دس دن مجھے دس سال معلوم ہو رہے ہیں۔ میں اب جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔"
"جدائی..... "خوش جمال چشمانیہ مسکرائی۔
وہ بھی گھوڑے سے اتر گئی اور بولی:
"ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ اسے جدائی کیوں کہہ رہے ہیں؟"
"چشمانیہ! تم نہیں سمجھ سکتیں۔" شہزادہ جذباتی ہو گیا:
"اس طرح کا ساتھ جدائی سے بھی زیادہ کربناک ہے۔ میں تمہارے پاس ہوتے ہوئے بھی خود کو تم سے دور
محسوس کرتا ہوں۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آج شام واپسی پر میں اس سلسلے میں تمہارے باپ سے بات کروں گا۔"
اس نے زین میں اڑسی ہوئی لپٹی ہوئی چادر کھینچ کر زمین پر بچھا دی۔
"نہیں شہزادے!" چشمانیہ گھبرا گئی:
"جو بات طے ہو چکی ہے آپ کو اس کی پابندی کرنی چاہیے۔ میرے باپ نے آپ سے انکار تو نہیں کیا؟" چشمانیہ

چادر کے ایک کونے پہ بیٹھ گئی۔

"یہ تو ٹھیک ہے چشتانیہ" شہزادہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا:

"لیکن بیس دن گزرنے کے باوجود کوئی بھی تمہاری قیمت میں اضافہ نہیں کر سکا۔ میں تو اور بھی زیادہ دینے کو تیار ہوں۔ پھر تم میرے حوالے کیوں نہیں کی جاتیں؟"

"مجھے معلوم ہے شہزادے" چشتانیہ نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا،

"آپ شمالی علاقوں کے خاقان کے ولی عہد ہیں۔ یہ قیمت آپ کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی لیکن ہم رسم و رواج سے محبت کرتے ہیں۔ ہم اس کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔"

"مگر میں کب کہتا ہوں کہ تم اپنے رسم و رواج کو چھوڑ دو" شہزادے نے الجھتے ہوئے کہا،

"میں خود کوئی زیادتی نہیں کرنا چاہتا۔"

"پھر آپ میرے باپ سے کیا کہیں گے؟" چشتانیہ نے اسے برق پاش نظروں سے دیکھا۔

"میں ان سے کہوں گا..... میں کہوں گا....."

شہزادہ اس کی غزالی آنکھوں میں کھو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔ پھر ذرا سنبھل کر بولا:

"میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" چشتانیہ تیز لہجے میں بولی:

"ابھی مقررہ وقت میں دس دن باقی ہیں اور آپ نے بولی کا سامان بھی ادا نہیں کیا۔ اگر میرے غریب باپ نے آپ کے رعب میں آ کر مجھے رخصت کر دیا تو ہمارے پرانے رسموں کے تانے بانے بکھر جائیں گے۔ دور والے طعنے دیں گے کہ ملک شمال کا شہزادہ چشتانیہ کو زبردستی اٹھا کے لے گیا۔ میں یہ بے شرمی برداشت نہیں کر سکوں گی۔ یہ طعنے مجھ سے سہے نہیں جائیں گے۔ مجھے آپ سے اس ظلم کی امید نہیں شہزادے" چشتانیہ کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔

"گھبراؤ نہیں چشتانیہ" شہزادہ چشتانیہ کو غمگین دیکھ کر پریشان ہو گیا:

"اگر تمہارے خیال میں یہ ظلم ہے تو میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا جس سے تم یا تمہارے قبیلے کی بدنامی ہو۔ یہ بات یقیناً افسوس ناک ہے کہ لوگ میری زبان کا اعتبار نہیں کرتے۔"

"میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں شہزادے۔"

چشتانیہ نے ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کو بڑی مشکل سے روکا:

"میں جانتی ہوں کہ آپ کے مقابلے پر کوئی نہیں آئے گا اور اگر کوئی دعوے دار کھڑا بھی ہوا تو میرا ایمان ہے کہ وہ کامیاب نہیں ہوگا۔ میں آپ کو دل سے اپنا شوہر تسلیم کر چکی ہوں۔ اب میرا مرنا جینا آپ کے ساتھ ہے۔"

"میں بھی تمہارا شکر گزار ہوں چشتانیہ" شہزادے نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"تم نے مجھے اپنا سمجھا ہے تو تم بھی میری ہو۔ میں تمہیں جان دے کے بھی حاصل کروں گا۔"

⊙

وسطی ایشیا کی اس وسیع اور ویران سطح مرتفع کی دوشیزاؤں کی عام قیمت دو گاڑیوں یا دس گھوڑوں سے زیادہ ادا نہ کی جاتی تھی۔ چشتانیہ نے بھی ایک غریب قبیلے میں آنکھ کھولی تھی اور جوان ہونے پر وہ بھی اسی قیمت کی مستحق تھی لیکن اس غریب لڑکی نے شہزادیوں جیسی شکل و صورت پائی تھی۔ اس کا سراپا دستِ قدرت کا تراشا شہکار تھا۔ حسن و جمال کی اس خوبی کے علاوہ چشتانیہ کا رجحان بچپن ہی سے رقص و موسیقی کی طرف تھا اور ان دونوں فنون میں اس نے جوان ہونے سے پہلے ہی مہارت حاصل کر لی تھی۔ اس کے والدین کو اس پر بجا طور سے ناز تھا۔ اس کے باپ نے اعلان کر دیا تھا کہ چشتانیہ کو بیوی بنانے کا قصد صرف وہ شخص کرے جس میں ایک شہزادی خریدنے کی ہمت ہو اور منہ مانگی قیمت ادا کر سکے۔

لڑکی کے بالغ ہوتے ہی شادی کے پیغامات یعنی اس کی قیمت لگنا شروع ہو جاتی تھی لیکن چشتانیہ کے لیے اب تک کوئی پیغام نہیں آیا تھا۔ دور و نزدیک کے قبیلوں میں سے کسی نے بھی چشتانیہ کے باپ سے اس کی قیمت پوچھنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ حالانکہ اسے بالغ ہوئے کئی ماہ گزر چکے تھے۔ چشتانیہ ہر دل کی دھڑکن اور آرزو تھی لیکن وہ سوائے حسرت بھری نظروں سے دیکھنے کے اس کی قیمت پوچھنے کی بھی ہمت نہ کرتے تھے۔

جب اس طرح کئی ماہ گزر گئے تو قبیلے کے بزرگوں کو اس کی فکر ہوئی۔ آخر بزرگوں نے چشتانیہ کے باپ کو مجبور کیا کہ وہ اپنی حسین بیٹی کی، جسے عام طور پر شہزادی کہا جاتا تھا، خود ہی قیمت مقرر کرے تاکہ اس کی تشہیر کر کے چشتانیہ کو کسی کے حوالے کیا جا سکے۔

پھر چشتانیہ کے باپ نے اس کی قیمت بیس گاڑیاں، سو گھوڑے اور دس اونٹ مقرر کی اور یہ شرط بھی لگا دی کہ یہ کم از کم قیمت ہے اور اسے قبول کرنے یا نہ کرنے کا بھی اسے اختیار ہے۔

عام لڑکیوں کی قیمت کا فیصلہ ایک ہفتے میں ہو جایا کرتا تھا لیکن چشتانیہ کے باپ نے یہ مدت ایک ماہ مقرر کی تھی۔

چشتانیہ کی قیمت کا اعلان ہوا تو تمام آرزومندوں کی تمنائیں سرد پڑ گئیں۔ ان کے خیال میں چشتانیہ رقاصہ اور جاذب نظر دوشیزہ کی یہ قیمت بھی کم تھی لیکن اس کی ادائیگی سوائے کسی بڑے سردار یا بادشاہ کے کسی کے بس میں نہیں تھی۔ سو گھوڑوں اور دس اونٹوں کا تو شاید کوئی قبیلہ انتظام کر لیتا لیکن بیس گاڑیوں کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

وسط ایشیا میں شمال سے جنوب اور جنوب مغرب تک پھیلے ہوئے یہ مغل قبائل خانہ بدوش زندگی بسر کرتے۔ یہ گھر بناتے تھے اور نہ بستیاں آباد کرتے تھے بلکہ چراگاہوں کی تلاش میں نقل مکانی کرتے رہتے اور ان کی بستیاں بیشتر وقت متحرک رہتیں۔ یہ اپنے گھر بیل گاڑیوں پر بناتے۔ ہر بیل گاڑی بیس فٹ لمبی اور اتنی ہی چوڑی ہوتی تھی۔ بائیس بائیس بیل اس گاڑی کو کھینچتے تھے۔ گاڑی کے اوپر بانسوں کا ڈھانچہ تیار کر کے اس پر نمدہ منڈھا جاتا تھا۔ ہر مغل اس گھر میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ گھر یعنی گاڑی چلتی رہتی اور چولہا جلتا اور کھانا تیار ہوتا رہتا۔ انہی گاڑیوں پر مغلوں کی چوبی گنبد نما مسجدیں بھی بار ہوتی تھیں۔

یہ مغل اپنی تمام تر وحشی جبلتوں اور قدیم رسموں کی پابندی کے باوجود مسلمان تھے۔ کہیں قیام کرتے تو ان کو زمین پر اتار تے اور نماز ادا کرتے تھے۔ امیر تیمور نے تو لکڑی کی اتنی بڑی مسجد بنوائی تھی جسے کئی حصوں میں کر کے بہت سی گاڑیوں پر رکھا جاتا تھا۔ اس کی یہ مسجد ہر معرکے میں اس کے ساتھ رہتی تھی۔ جب اس مسجد کے حصے جوڑ کر زمین پر رکھے جاتے تو اس مسجد میں کئی سو آدمی بیک وقت نماز ادا کرتے تھے۔

چشتانیہ کے باپ نے جو بیس گاڑیاں طلب کی تھیں، اس سے اس کی مراد یہی متحرک گھر تھے۔ ظاہر ہے بیس گھروں کی تیاری کسی معمولی آدمی کے اختیار میں نہیں تھی لیکن پھر ایک دن ایسا ہوا کہ چشتانیہ کا خریدار آ کر اس کے پڑاؤ پر پہنچ گیا۔

یہ تھا مغلوں کے نیلے اور سفید غول کے خاقان اُرس خان کا نوجوان بیٹا پارس خان۔ خاقان اُرس خان کی عملداری شمال میں برفستان ٹنڈرا تک پھیلی ہوئی تھی۔

یہ روس کے ایشیائی علاقے سائبیریا کا وہ خطہ ہے جسے پرانے زمانے میں "سرزمین آسیب" کہا جاتا تھا۔ ایشیا کا یہ علاقہ ہمیشہ سے ناقابل تسخیر کہا جاتا ہے اور آج بھی روس سے ٹکرانے والی ہر طاقت اس خطے تک پہنچ کر بعد بے بس ہو جاتی ہے۔

خاقان اُرس خان کی جنوبی سرحد کریمیا سے ملتی تھی۔ کریمیا کا حاکم بھی ایک مغل شہزادہ تو قتمش تھا۔ تو قتمش بدخو اور ظالم تھا۔ اُرس خان اور تو قتمش میں ہمیشہ جھگڑا رہتا تھا۔ شہزادہ پارس خان نے جب باپ سے جنوب میں شکار کھیلنے کی اجازت مانگی تو ارس خان نے صاف انکار کر دیا۔ اسے خطرہ تھا کہ کہیں شہزادے اور تو قتمش کا

سامنا نہ ہو جائے لیکن شہزادہ بضد رہا اور ارس خان کو مجبور ہو کر اجازت دینا پڑی۔ احتیاط کے طور پر شہزادے کے ساتھ پانچ سو سوار کر دیے۔

شہزادہ پارس خان جنوبی علاقے میں دور تک چلا گیا۔ خاقان نے اسے نصیحت کی تھی کہ کریمیا کے علاقے میں داخل نہ ہونا اور تو قتمش کا سامنا ہو جائے تو جھگڑے سے گریز کرنا لیکن جوان خون بزرگوں کی نصیحت کب مانتا ہے۔ شہزادہ شکار کھیلتا ہوا کریمیا کی سرحد میں داخل ہو گیا۔ چونکہ سرحدیں نہ تو قدرتی تھیں اور نہ کوئی اور شناخت موجود تھی، اس لیے شہزادے یا اس کے ساتھیوں کو اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ کریمیا کے علاقے میں پہنچ چکے ہیں۔

آجکل کی طرح اس زمانے میں شہر اور بستیاں آباد نہیں تھیں جن سے شناخت ہو سکے۔ مغل قبائل کے متحرک گھر ایک جگہ دو چار ماہ قیام کرتے پھر چارے کی تلاش میں ادھر ادھر ہو جاتے۔

چشتانیہ کے پڑاؤ پر پہنچتے ہی اس کے کان میں چشتانیہ کے حسن و جمال کی بھنک پڑی۔ شہزادے کو اشتیاق پیدا ہوا اور وہ چشتانیہ کے پڑاؤ میں پہنچ گیا۔

خیمے والوں کو جب معلوم ہوا کہ یہ خاقان ارس خان کا بیٹا ہے تو انہوں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ شہزادے کی خواہش پر اسے چشتانیہ کے باپ کے خیمے پر پہنچا دیا گیا۔ چشتانیہ اس وقت باہر تھی۔ پردے کا رواج نہیں تھا۔ چشتانیہ کسی سہیلی سے مل کر آ رہی تھی۔ اس نے خیمے کے سامنے ایک خوبصورت نوجوان کو گھوڑے سے اترتے دیکھا تو ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ نسوانی حجاب نے اسے اجازت نہ دی کہ خیمے میں جائے۔ وہ وہیں سے سہیلی کے ہاں واپس چلی گئی۔

اس کی سہیلی بہت شوخ اور سمجھ دار تھی۔ چشتانیہ کی اڑی اڑی رنگت دیکھ کر بھانپ گئی کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ اس نے چشتانیہ کو چھیڑا اکرید الیکن چشتانیہ نہ کھلی اور بات ٹال گئی۔ اسے سہیلی کے پاس بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ باپ کا بلاوا آ گیا۔

شہزادے نے رسمی گفتگو کے بعد چشتانیہ کو دیکھنے کی خواہش کی۔ چشتانیہ کے باپ کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے اپنی بیٹی کے لیے کسی ایسے ہی شہزادے کا خواب دیکھا تھا اور اب وہی شہزادہ اس سے چشتانیہ کو دیکھنے کی درخواست کر رہا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اگر شہزادے کو چشتانیہ پسند آ گئی تو نہ صرف مالا مال ہو جائے گا بلکہ اس کی بیٹی ولی عہد کے ساتھ بیاہ کر اسے ہم چشموں میں ایک عظیم مقام عطا کر دے گی۔ اس نے فوراً چشتانیہ کو تلاش کرایا اور اسے خیمے میں آنے کا حکم دیا۔

اسی تلاش کے دوران پڑاؤ میں یہ بات پھیل گئی کہ خاقان ارس خان کا بیٹا، چشتانیہ کا آرزومند ہے۔ پڑاؤ

کی تمام دوشیزاؤں کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ بعض نے اس کی قسمت پر رشک کیا لیکن بیشتر پر سلگ اٹھیں۔

تلاش کرنے والی عورت نے چیشمانیہ کے پاس پہنچ کر اسے بھی آگاہ کردیا۔ چیشمانیہ کی سہیلی اس پر بہت خوش ہوئی۔ اس نے چیشمانیہ کا بناؤ سنگھار خود اپنے ہاتھ سے کیا اور اپنا ایک خوبصورت جوڑا پہنا کر اسے خراماں خراماں اس خیمے کی طرف لے چلی جہاں اس کا عظیم الشان خریدار خیمے کے دروازے پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

پھر چیشمانیہ شعلہ جوالہ بنی، نظریں نیچی کیے، لجاتی شرماتی، خیمے میں داخل ہوئی۔ شہزادے کی اس پر نظر پڑی تو وہ اس حسن مجسم کو دیکھ کر مبہوت ہوکر رہ گیا۔ اس کی نظریں چیشمانیہ کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ سہیلی نے چیشمانیہ کو شہزادے کے مقابل بٹھادیا اور شہزادے کی محویت کو دلچسپی سے دیکھنے لگی۔

شہزادہ دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر تھا۔ اس کی نظریں حسن کے پیکر کا طواف کر رہی تھیں اور دل نکلنا چاہتا تھا۔

"عالی نسب شہزادے۔ یہ ہے میری بیٹی چیشمانیہ۔" چیشمانیہ کے باپ نے دھیمی آواز میں کہا:

"چیشمانیہ رقص و موسیقی میں بھی اپنا جواب آپ ہے۔"

شہزادہ چونک پڑا۔ جیسے کسی گہرے خواب سے اسے جھنجھوڑ کر بیدار کیا گیا ہو۔ اس نے پہلے باپ کو دیکھا۔ پھر چیشمانیہ کو خواب ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا:

"مجھے منظور ہے محترم بزرگ!"

چیشمانیہ کی سہیلی کا دل کھل اٹھا۔ اس نے جھک کر چیشمانیہ سے سرگوشی کی۔ چیشمانیہ نے جھجکتے ہوئے نظریں اٹھائیں۔ یہ نظریں شہزادے کی بے تاب و بے قرار نظروں سے ٹکرائیں اور فوراً جھک گئیں۔

"بیس گاڑیاں، سو گھوڑے اور دس اونٹ شہزادے کو منظور ہیں؟" اس کے باپ نے تو پوچھا۔ وہ ہر بات پہلے ہی واضح اور صاف کر لینا چاہتا تھا۔

"ہاں محترم۔ مجھے سب کچھ منظور ہے۔" شہزادے نے چیشمانیہ کے چہرے سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔

"تو مجھے بھی منظور ہے۔"

چیشمانیہ کے باپ نے بھی رضامندی کا اظہار کردیا لیکن فوراً ہی اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا: "شہزادے۔ اگر ایک ماہ کے اندر اس قیمت سے زیادہ ادا کرنے والا کوئی دوسرا شہزادہ آ گیا تو چیشمانیہ کو شہزادے بہادر کے ساتھ رخصت کردیا جائے گا۔"

"میں اس سے زیادہ قیمت ادا کرنے پر بھی تیار ہوں۔" شہزادے نے فوراً اعلان کیا:

"آپ دخصتی کا اعلان کریں۔ جتنی قیمت چاہیں گے وہ ادا کردی جائے گی۔"

"شہزادے بہادر،" چیشمانیہ کے باپ نے اور وضاحت کی:

"رسم کے مطابق میں اپنی مقرر کی ہوئی قیمت کو بڑھا نہیں سکتا۔ اس میں کوئی دوسرا ہی اضافہ کرسکتا ہے۔ آپ نے اس قیمت کو منظور کرلیا ہے۔ اس لیے اس میں شہزادے آپ بھی کوئی اضافہ نہیں کرسکتے۔ چونکہ فروخت کی مدت ایک ماہ مقرر ہوئی ہے اس لیے شہزادہ محترم ایک ماہ تک ہم آپ کی مہمان نوازی کا فخر حاصل کریں گے اور اس عرصے میں شہزادے، مطلوبہ چیزیں بھی مہیا کرلیں گے۔"

چیشمانیہ کے باپ نے گفتگو کے تمام دروازے بند کردیے تھے۔ شہزادے کو سوائے خاموشی اختیار کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ پھر بھی اس نے چیشمانیہ سے ملنے جلنے اور سیر و تفریح کی اجازت حاصل کرلی۔ شہزادے پارس نے اسی وقت اپنے باپ کے پاس ایک تیز رفتار قاصد روانہ کیا تاکہ وہ چیشمانیہ کے ساتھ اپنی شادی کی رسمی اجازت حاصل کرلے۔ اس قاصد کو شہزادے نے ایک اور خط دیا جس میں مطلوبہ چیزوں کے علاوہ دوسرے سامان عشرت کی ایک طویل فہرست تھی۔ یہ خط اس نے قریب کے ایک سردار کو پہنچانے کا حکم دیا تاکہ باپ کی اجازت کے ساتھ ہی تمام سامان اس تک پہنچ جائے اور وہ چیشمانیہ کو شاہانہ انداز میں رخصت کرا کے اپنے ساتھ لے جائے۔

چیشمانیہ سے وہ رات کے سوا ہر وقت ملاقات کرسکتا تھا لیکن چیشمانیہ سے ہر ملاقات اس کے دل کی بے چینی میں اضافہ کردیتی تھی۔ قاصد کو گئے ہوئے یہ بیسواں دن تھا کہ شہزادہ خود پر قابو نہ رکھ سکا اور اس نے چیشمانیہ سے اظہار کردیا کہ وہ اس کے باپ سے مل کر فوری رخصتی کی درخواست کرے گا لیکن سمجھدار چیشمانیہ نے اسے دلیلوں سے قائل کرکے اس ارادے سے باز رکھا اور جب وہ سیر سے واپس آئے تو شہزادہ پرسکون تھا اور چیشمانیہ اپنی کامیابی پر خوش تھی۔ چیشمانیہ اپنی سہیلی سے شہزادے سے اپنی ملاقات کا حال بیان کرتی تھی۔ آج کی ملاقات کی تفصیل سن کر اس کی سہیلی شہزادے کی بے چینی پر خوب ہنسی۔

چیشمانیہ اور شہزادے پارس خان کے درمیان اور تلخ اور شیریں گفتگو کے چوتھے روز شہزادے کا منگوایا ہوا تمام سامان شمال سے آگیا۔ اس نے صرف بیس گاڑیاں منگوائی تھیں لیکن مشفق باپ نے چالیس گاڑیاں بھیج دی تھیں اسی طرح گھوڑوں اور اونٹوں کی تعداد میں بھی اضافہ کردیا تھا۔ شادی اور رخصتی کے لیے بھی خاقان نے بہت سامان بھیجا تھا اور شہزادے کو تاکید کردی تھی کہ بیوی کو شاندار طریقے سے رخصت کرائے اور اس کا ڈولا پوری شان و شوکت لوٹ مار نہ کرائے جلوس کی صورت میں خاقان کے مستقر تک لایا جائے۔

سامان کے ساتھ خاقان نے ایک سو مزید سواروں کو بھی روانہ کیا تھا کیونکہ شہزادے کے قاصد نے چیشمانیہ کے ہر لڑکی کہ جگہ نشاندہی کی تھی وہی سرحدی پٹی تھی اور خاقان کے خیال میں وہی متنازعہ علاقہ تھا نیلے اور سفید خیل کے

خاقان اُرس خان کا مرتبہ توقتمش جیسے علاقائی حاکم سے بہت بلند تھا لیکن توقتمش اور مغلوں کے خاقانِ اعظم [illegible]
میں قریبی رشتہ داری ہونے کی وجہ سے توقتمش کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا اور اُرس خان سے ہمسری کا دعویٰ [illegible]

چشتمانیہ کے باپ کی ایک ماہ کی مدت ختم ہونے میں ایک ہفتے سے بھی کم عرصہ باقی رہ گیا تھا۔ اس لیے جب شہزادے نے چشتمانیہ کی قیمت ادا کرنے کی پیش کش کی تو چشتمانیہ کے باپ نے بلا تکلف اسے قبول کر لیا اور شمال سے آنے والا سامان اس کے حوالے کر دیا گیا۔

بظاہر اب شادی میں کوئی چیز مانع نہیں تھی۔ دونوں طرف شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور پڑاؤ کے ہر [illegible] خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔

چشتمانیہ کو اس سامان میں سب سے زیادہ گھوڑے پسند آئے۔ یہ گھوڑے نہایت اعلیٰ نسل کے تھے۔ اس [illegible] گھوڑے رفتار کے لحاظ سے تیز ترین سمجھے جاتے تھے۔ ہر گھوڑا انٹے ساز سے آراستہ تھا۔ چشتمانیہ ایک اچھی شہسوار [illegible] یہ فن بھی اس نے دل لگا کر سیکھا تھا۔ اس نے اپنی خاص سواری کے لیے ایک گھوڑا پسند کیا اور اس گھوڑے پر [illegible] وہ شہزادے پارس خان کے ساتھ سیر کو جانے لگی۔

مشہور ہے کہ تقدیر نہ چاہے تو تدبیر کی تمام کوششیں دھری رہ جاتی ہیں۔ چشتمانیہ کی رخصتی میں صرف [illegible] باقی تھے کہ ایک نیا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا۔ شہزادے کو اس پڑاؤ پر ٹھہرے ہوئے ایک مہینہ ہونے والا تھا۔ خاقان اُ[رس] کے بیٹے کا پانچ سو سواروں کے ساتھ سرحدی علاقے میں اتنے طویل عرصے تک پڑاؤ ڈالے رکھنا السا نہ تھا جو کریمیا کے حاکم توقتمش کو نہ پہنچتی۔

خبر دینے والے نے اپنی کارکردگی کے اظہار کے لیے اس اطلاع میں خوب نمک مرچ لگایا اور توقتمش [کو بتا] دیا کہ شہزادے پارس نے کریمیا کے سرحدی علاقے میں ایک بڑے قطعے پر قبضہ کر لیا ہے اور وہ کریمیا میں مزید [پیش قدمی] کی تیاریاں کر رہا ہے۔

توقتمش تو شمالی خاقان کے پہلے ہی خلاف تھا۔ اس خبر کو سن کر وہ بھڑک اٹھا اور فوراً دو ہزار کا لشکر [لے کر] سرحد کی طرف چل پڑا۔

توقتمش دو ہزار سواروں کے ساتھ جس وقت شہزادے کے پڑاؤ کے سامنے خیمہ زن ہوا تو مخنی خانہ بدوشوں [کے] خیموں میں تہلکہ مچ گیا۔ سب کو اپنی اپنی جانوں کی فکر پڑ گئی۔ شادی کی پرکیف اور خوشگوار فضا پر جنگ کے [بادل] چھا گئے۔ اور شادیانوں کی آواز کے بجائے جنگی بگل کا انتظار ہونے لگا۔

توقتمش کو وہاں پہنچتے ہی شہزادے اور چشتمانیہ کی ہونے والی شادی کی پوری تفصیل معلوم ہو گئی۔ اس معاملے کو تو ایک طرف رکھ دیا اور ایک قاصد کے ذریعے شہزادے کو اطلاع بھیجی کہ اس نے کریمیا کی حدود میں داخل [ہو کر]

[ہو کر] معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے اس لیے شہزادے کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ فوراً کریمیا کی حدود سے باہر [چلا] جائے۔

شہزادہ اس لشکر کو دیکھ کر پہلے ہی گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے کوئی سخت جواب دینے کے بجائے نرم رویّہ اختیار [کیا] اور جواب میں صرف یہ کہلوایا کہ اسے علم نہیں تھا کہ یہ علاقہ کریمیا کی حدود میں ہے ورنہ وہ ہرگز یہاں نہ ٹھہرتا۔ اس کے [ساتھ ہی] اس نے توقتمش سے یہ درخواست کی کہ اسے صرف دو دن کی مہلت دی جائے تاکہ وہ چشتمانیہ سے شادی کر کے [اسے] رخصت کرا سکے۔

توقتمش تو شہزادے کو نیچا دکھانے پر تُلا ہوا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ شہزادے کے ساتھ صرف پانچ سو سوار [ہیں۔] اس نے فوراً چشتمانیہ کے باپ کو اپنے خیمے میں طلب کیا اور اسے چشتمانیہ کی قیمت سے دوگنا سامان ادا کرنے کی پیش کش [کی۔] چشتمانیہ کا باپ لالچی ہونے کے علاوہ گرگِ باراں دیدہ تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ انکار کی صورت میں توقتمش زبردستی چشتمانیہ [کو] حاصل کر لے گا اس لیے اس نے توقتمش کی پیش کش بغیر حیل و حجت تسلیم کر لی۔ اور توقتمش کے حکم پر پڑاؤ میں جا کر [اعلان] کر دیا کہ اس نے شہزادے پارس کے ساتھ اپنی بیٹی کا رشتہ منسوخ کر کے توقتمش کے ساتھ اس کا رشتہ منظور کر [لیا] ہے کیونکہ توقتمش نے چشتمانیہ کی قیمت دوگنی کر دی ہے۔

شہزادے نے یہ اعلان سنا تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ اپنے ملک سے دور تھا اس لیے [اس] کے سلسلے میں وہ توقتمش کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے یہ بھی علم ہو گیا کہ یہ حرکت توقتمش نے اسے زک دینے [کے] لیے کی ہے۔

اس کا دل ٹوٹ گیا۔ پھر ایک آخری کوشش کے طور پر اس نے ایک بڑا عجیب اور قطعی دانشمندانہ قدم اٹھایا۔ ان [باتوں] میں تمام دن گزر گیا تھا۔ شام ہوتے ہی شہزادہ گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس کے ساتھیوں نے خیال کیا کہ شاید وہ چشتمانیہ کے باپ سے ملنے جا رہا ہے اس لیے انہوں نے اس کی کوئی فکر نہیں کی۔

شہزادے نے اپنے گھوڑے کا رخ چشتمانیہ کے خیمے کی طرف کیا۔ وہ اس کے خیمے کے قریب بھی پہنچ گیا لیکن [جب] اس نے یہ دیکھا کہ چشتمانیہ کے خیمے پر توقتمش کے مسلح سوار پہرہ دے رہے ہیں تو اس نے اپنا گھوڑا روک کر ایک [لمحے] کے لیے کچھ سوچا پھر گھوڑا بھگا کر توقتمش کے پڑاؤ کی طرف چل پڑا۔ پتہ نہیں یہ شہزادہ پارس کی غیر معمولی جراُت تھی یا [چشتمانیہ] کے لیے بے پناہ محبت۔ جو اسے دشمن کے خیمے کی طرف کشاں کشاں لیے جا رہی تھی مگر اس کے اس اقدام کو مصلحت یا [دانشمندی کا] نام ہرگز نہیں دیا جا سکتا۔

توقتمش کو جب شہزادے پارس خان کے اپنے خیمے پر تنہا اور بے دھڑک آنے کی اطلاع پہنچائی گئی تو وہ گھبرا [گیا] اور اس نے دل ہی دل میں شہزادے کی جراُت کی داد بھی دی۔ توقتمش کچھ ایسا متاثر اور مرعوب ہوا کہ دل نہ چاہتے

کے باوجود اس نے خیمے سے نکل کر اس کا استقبال کیا اور اپنے ساتھ لے کر خیمے میں واپس آیا اور
اس نے اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا۔

شہزادے پارس کے تو دل کو لگی ہوئی تھی، اس نے بغیر کسی تمہید کے معذرتانہ لہجے میں کہا:
"اے حاکم کریمیا! شہزادہ توقتمش!! میں آپ کے پاس معذرت پیش کرنے آیا ہوں۔"
"شہزادے پارس!" توقتمش مسکرایا:
"آپ کی زبان سے معذرت کا لفظ سن کر تعجب ساہوتا ہے۔ مغلوں کی روایت ہے کہ وہ کسی ...
کے بجائے اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہیں۔ میں آپ کو ایک بہادر جوان سمجھتا تھا لیکن آپ تو میرے ...
کی طرح حاضر ہوئے ہیں اور آپ کو معلوم ہے کہ مغل اپنے مجرم کو معاف نہیں کیا کرتے۔"

توقتمش نے شہزادے کو بزدلی کا طعنہ دیا تھا اور صاف الفاظ میں مجرم کہا تھا لیکن شہزادے ...
کا ثبوت دیا اور ذلت کی پروا نہ کرتے ہوئے نرمی سے بولا:
"معزز توقتمش! میرے خیال میں اسے بہادر ہرگز نہیں کہا جاسکتا جو اپنی بھول یا غلطی کو صحیح ...
لیے تلوار کا سہارا لے۔ یقیناً یہ میری غلطی تھی کہ میں بغیر تحقیق کے کریمیا کے علاقے میں داخل ہوا۔
نیت نیک تھی۔"

"شہزادے پارس!" توقتمش ایک دم تیز ہوگیا:
"کسی کے علاقے میں پانچ سو سے زیادہ سواروں کو لے کر نہایت خاموشی کے ساتھ داخل ہونا ...
اسے بھول تو اس وقت کہا جاسکتا تھا جب آپ غلطی کا احساس کر کے فوراً واپس چلے جاتے۔ کیا آپ نے ...
کو زنگ آلود سمجھ لیا ہے کہ ایک ماہ سے میرے علاقے میں رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔"
"نہیں محترم توقتمش!" شہزادے پارس نے غصے کو پوری سختی سے دباتے ہوئے کہا:
"میں نے شرافت کے خلاف کوئی کام نہیں کیا۔ چشتانیہ کو میں نے باقاعدہ قیمت ادا کر کے خریدا ...
رنگ رلیوں کا نام نہیں دیا جاسکتا۔"
"بس شہزادے خاموش ہو جایئے۔" توقتمش قبضۂ شمشیر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا:
"چشتانیہ کا نام آپ نہ لیجیے۔ اس کا رشتہ مجھ سے طے ہو چکا ہے۔"
"محترم توقتمش!"
شہزادے پارس کا لہجہ ذرا سا تیز ہوا:
"میں نہیں چاہتا کہ ایک عورت کے لیے بدمزگی پیدا ہو۔ چشتانیہ کو پہلے میں نے خریدا ہے اور ...

... قیمت ادا کر دی ہے۔ میں اس سلسلے میں شہزادے توقتمش سے بھی درخواست کرنے پر آمادہ ہوں۔ چشتانیہ
... کرنے کے عہد و پیمان ہو چکے ہیں اس لیے آپ براہِ کرم ہمارے درمیان نہ آیئے اور اپنا دعویٰ واپس
... لیجیے۔ یہ آپ کا مجھ پر ایسا احسان ہوگا جسے میں عمر بھر نہ بھول سکوں گا۔"
شہزادے پارس نے منت و خوشامد کا انداز اختیار کیا تھا اور اپنی محبت کا حوالہ بھی دیا تھا لیکن توقتمش کا
دل نہ پسیجا۔ وہ پہلے جیسے تلخ لہجے میں بولا:
"شہزادے پارس! چشتانیہ بکاؤ مال ہے جو بڑی بولی دے گا اس کی وہ کنیز بن جائے گی۔ میں نے دگنی قیمت
دے ... اس پر میرا حق ہے۔ میں اپنے حق سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔"
"اے حاکم کریمیا! آپ یہ تو غور کریں کہ چشتانیہ پہلے ہی فروخت ہو چکی ہے۔ اس کے باپ نے مجھ سے اس کی
قیمت وصول کر لی ہے۔"
پارس نے اسے پھر سمجھانے کی کوشش کی:
"چشتانیہ کے باپ کو قیمت وصول کرنے کے بعد اسے دوبارہ فروخت کرنے کا کوئی حق نہیں۔"
"حق کیوں نہیں ہے شہزادے پارس!"
توقتمش غرایا:
"چشتانیہ کی فروخت کی مدت ایک ماہ مقرر ہوئی تھی۔ میں نے مدت ختم ہونے سے دو دن پیشتر اس کا سودا
... ہے۔ اس کا باپ بااختیار ہے۔"
شہزادہ پارس بھی آخر مغل تھا۔ اس کی رگوں میں بھی نیلے اور سفید غول کے خاقان کا خون دوڑ رہا تھا۔ آخر
الامک ضبط کرتا اسے بھی غصہ آگیا اور تلخی سے بولا:
"حاکم کریمیا! آپ اپنے دو ہزار سواروں کے زور پر مجھے مرعوب کر کے اپنی من مانی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ یہ بھی
... سوچیے کہ میں خود چل کر آپ کے پاس آیا ہوں حالانکہ میں خاقانِ مشرق و مغرب کا ولی عہد ہوں۔ اگر چشتانیہ کی
... خاطر اسے حاصل کرنا ہے تو میں اسے آپ سے چار گنی قیمت دے کر خریدنا چاہتا ہوں۔ میں تو رفع شر کے
لیے ایسا کر رہا ہوں ورنہ چشتانیہ پر میرا پہلا حق ہے اور۔۔۔۔"
"پارس۔۔۔۔۔"
توقتمش نے چیخ کر اس کی بات کاٹ دی:
"تم چار گنا قیمت دے سکتے ہو تو میں آٹھ گنا قیمت کی بولی دیتا ہوں۔ میں نہ تم سے ہٹتا ہوں اور نہ تمہارے
... سے ڈرتا ہوں۔ تمہارے باپ نے تو میرا علاقہ دبا رکھا ہے۔ اگر تحقیق کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تمہارے

نیلے اور سفید غول میں میرے مغلوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے"۔

پارس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ تو قتمش کی اس بے ہودہ گفتگو سے وہ اس قدر چراغ پا ہوا
ہاتھ بھی بے ساختہ اپنی تلوار پر گیا۔

تو قتمش اس پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اس نے بھی خود کو مدافعت اور حملے کے لیے تیار کر لیا
پارس کو فوراً وقت کی نزاکت کا احساس ہو گیا۔ اس نے تلوار سے ہاتھ ہٹا لیا اور نرمی سے بولا:

"حاکم کریمیا۔ اس طرح قیمت بڑھانے سے سوائے چشتانیہ کے لالچی باپ کے اور کسی کو فائدہ نہ ہو
کون فیصلہ کرے گا کہ کس کی قیمت زیادہ ہے اور وہ اسے ادا بھی کر سکتا ہے"۔

"اس کا فیصلہ بہت آسان ہے شہزادے"۔ تو قتمش نے ہلکا سا لیکن خوف ناک قہقہہ لگایا۔

"وہ آسان فیصلہ بیان کیجئے۔ شاید وہ مجھے بھی قابلِ تسلیم ہو"۔ شہزادے نے بھی احترام اور شرا
دامن نہ چھوڑا۔ اس کا لہجہ غصے سے پاک تھا۔

"بہادروں کا ہر اہم فیصلہ نوکِ تلوار سے ہوا کرتا ہے"۔

تو قتمش نے زانو پر رکھی تلوار کو ذرا سا بلند کیا:

"تلوار کھینچو۔ ابھی فیصلہ ہو جائے گا"۔

"ہاں حاکم کریمیا۔ آپ نے درست فرمایا"۔ شہزادہ بڑے پر سکون لہجے میں بولا:

"بے شک بہادر اسی طرح اپنے ذاتی معاملات نمٹایا کرتے ہیں لیکن سوچنا یہ ہے کہ آخر اس کا
ہو گا۔ ظاہر ہے کہ ہم دونوں میں سے ایک مارا جائے گا۔ اگر آپ میرے ہاتھ سے قتل ہوئے تو یہ مغلوں
عظیم بہادر سردار کی موت ہو گی جس کے لیے میں قطعی تیار نہیں۔ اگر میں مارا گیا تو میرے ساتھ ہزاروں بے
کا خون بہے گا۔ میرا باپ ارس خان پورے کریمیا کو روند کے رکھ دے گا۔ مغلوں کا کوئی غول آپ کی حما
نہیں نکلے گا اور آپ کو خود اپنی سرزمین پر کسی جگہ پناہ نہیں ملے گی"۔

"پارس۔ تم اپنی بزدلی کا جواز دلیلوں میں تلاش کر رہے ہو"۔

"اور مجھے آپکی ناعاقبت اندیشی کا شکوہ ہے"۔

شہزادے پارس کو یقین ہو گیا کہ تو قتمش کسی طور بھی مصالحت پر آمادہ نہیں اور اگر اس سے زبان
کی گئی تو سوائے بدمزگی کے اور کچھ حاصل نہ ہو گا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور خیمے کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا:

"امید ہے کہ حاکم کریمیا اس ناگوار ملاقات کو بھولنے کی کوشش کریں گے اور اپنی تلوار کو کسی او

...ے آدن کرنے کے لیے محفوظ رکھیں گے"۔

...لیکن مجھے ...... "

...لیکن کی ضرورت نہیں معزز تو قتمش ...... "

...شہزادے نے اس کی بات کاٹ دی:

...میں آپ سے مزید کوئی معذرت نہیں کرنا چاہتا اور نہ کسی رعایت کا خواہاں ہوں۔ میں نے اپنے مقام
...پہنچ کر آپ سے درخواست کی اور کچھ مراعات کا خواہش مند ہوا لیکن آپ نے میری ہر بات اور ہر
...ردی۔ اس لیے میری دور اندیشی مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں صبح کو پہلی کرن پھوٹنے سے پہلے ہی آپ کا علاقہ
واپس چلا جاؤں"۔

...ٹھیک ہے"۔

تو قتمش نے غرور سے گردن اکڑا لی:

...میں صبح کو اپنے علاقے میں تمہارا کوئی آدمی نہیں دیکھنا چاہتا۔ تمہیں صرف آج کی رات مہلت دی جا سکتی ہے"۔

...حاکم کریمیا مطمئن رہیں"۔ شہزادے نے لاپرواہی سے کہا:

...میں نے جو زبان سے کہا ہے اسے پورا کروں گا"۔

...سنو پارس خان۔ ایک اور بات ذہن نشین کر لو"۔ تو قتمش نے آواز دے کر کہا۔

...شہزادہ پارس خیمے کے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے پلٹ کر تو قتمش کو دیکھا اور طنزیہ لہجے میں
...

...کوئی اور نیا حکم ہو تو وہ بھی سنا دیجیے۔ میں اسے بھی بسر و چشم بجا لاؤں گا"۔

...حکم نہیں بلکہ تمہاری بھلائی کی بات ہے"۔ تو قتمش نے جواب دیا:

...اگر تمہارے ذہن کے کسی گوشے میں چشتانیہ کا ذرا سا بھی خیال ہو تو اسے کھرچ پھینکو۔ اگر اسے حاصل
...کوشش کی تو نقصان اٹھاؤ گے۔ شاید تم نہیں جانتے کہ میں اپنے دشمنوں کو نہیں بخشا کرتا"۔

...قدرت کا یہ کیا نرالا نظام ہے"۔

...شہزادہ مسکرایا:

...آپ دشمن کو بخشا نہیں کرتے اور میں دشمنوں کو معاف کر دینے کا عادی ہوں۔ چشتانیہ کے سلسلے میں یہی کہا جا
...ایک شہزادے نے دوسرے شہزادے سے محبت کی بھیک مانگی مگر دوسرا شہزادہ اس کی خالی جھولی نہ بھر
...فرمایا ہے کہ بہادروں کا ہر اہم فیصلہ تلوار سے ہوا کرتا ہے۔ اگر چشتانیہ کی خواہش ہوئی تو

آپ تلوار میرے ہاتھ میں دیکھیں گے"۔

شہزادہ پارس چلا گیا اور توقتمش اس عجیب و غریب دشمن کے بارے میں سوچنے لگا۔
پہلے تو اسے یہی خیال ہوا کہ شہزادہ پارس بزدل ہے لیکن شہزادے نے نرم لہجے میں جس [illegible]
جواب دیے تھے وہ اس کی شجاعت اور بہادری کا کھلا ہوا ثبوت تھے۔ یہاں تک کہ شہزادے نے
کا نام بھی لیا تھا جس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ نچلا نہیں بیٹھے گا اور اپنی توہین کا بدلہ لینے آئے گا لیکن
نے شہزادے کی دلیری کو پھر بھی تسلیم نہ کیا۔
اس نے خیمے کے ہلتے ہوئے پردے پر نفرت سے نظر ڈالی اور پھر ایک زوردار قہقہہ بلند [illegible]
کا مذاق اڑا رہا ہو یا پھر اپنی کامیابی پر نازاں ہو۔

حاکم کریمیا توقتمش کے آنے سے مغل خیموں میں پہلے ہی ہلچل مچ گئی تھی۔ شہزادہ پارس وہاں
تھا۔ اس کے پاس لشکر تو نہ تھا لیکن پانچ سو سوار بھی بہت ہوتے ہیں۔ پھر جب توقتمش نے پارس
خیمے لگائے تو پڑاؤ ایک میدانِ جنگ کی صورت اختیار کر گیا۔
شہزادہ پارس اور حاکم کریمیا کے درمیان نامہ و پیام بھی جنگی نوعیت کے ہوئے۔ پھر جب چ[illegible]
توقتمش نے طلب کیا تو یہ بات مشہور ہو گئی کہ پارس خان اور توقتمش میں چشمانیہ کے لیے جھگڑا [illegible]
خیمہ نشین مغلوں کا اندازہ ٹھیک ہی تھا۔ توقتمش نے چشمانیہ کے باپ کو مجبور کر دیا کہ وہ چشمانیہ کا فیصلہ
کرے۔ حالانکہ شہزادے نے مطلوبہ چیزیں بھی اس کے حوالے کر دی تھیں اور توقتمش نے صرف زبا[نی]
کیا تھا لیکن وہ جو کہا جاتا ہے کہ بندھا ہوا مار کھاتا ہے، یہی بات چشمانیہ کے باپ پر صادق آتی [illegible]
چشمانیہ تو ہاتھ سے جاتی ہی، ساتھ میں پورے قبیلے پر آفت آجاتی۔ شہزادے پارس سے اس نے
لی تھی۔۔۔۔ مگر آئی ہوئی چیزوں کی واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس لیے اس نے توقتمش کی زبانی [illegible]
کر لیا اور اس کے حکم پر پارس سے رشتہ توڑ کر توقتمش سے رشتہ جوڑ دیا۔
چشمانیہ کے باپ کی اس عہد شکنی کو قبیلے کے بعض غیور اور سمجھدار لوگوں نے پسند نہ کیا [illegible]
توقتمش کے چنگل سے پھنسے ہوئے تھے۔ حالات یہ بھی ظاہر کر رہے تھے کہ اگر پارس اور توقتمش میں جنگ [illegible]

[illegible] رہے گا۔ ان باتوں کو سوچتے ہوئے چشمانیہ کے باپ کو کسی نے نہ تو ٹوکا اور نہ مخالفت کی لیکن اس
[illegible] غریب چشمانیہ پر قیامت گزر گئی۔
چشمانیہ ایک سیدھی سادی لڑکی تھی۔ وہ ایک اچھی رقاصہ بھی تھی لیکن اس کا رقص عام طور سے خانہ بدوش
[illegible] محدود رہا تھا۔ وہ نہ پڑھی لکھی تھی اور نہ ہی محلوں کی پروردہ تھی۔ اس کی سہیلیاں بھی اسی کی طرح الہڑ اور
[illegible] چشمانیہ نے لیلیٰ و قیس اور شیریں و فرہاد کے قصے کبھی بھی ترتیب سے نہ سنے تھے کہ عشق و محبت کے
[illegible] محسوس کرتی۔ اس نے تو بس شہزادے پارس کو گھوڑے سے اترتے دیکھا تھا۔ شہزادہ اسے اچھا لگا
[illegible] ہوا اور وہ شہزادے پارس کے ساتھ گھومنے پھرنے لگی۔ اس نے اب تک نہ تو عشق کی چوٹ کھائی تھی
[illegible] منزل سے گزری تھی۔
لیکن جب توقتمش کے حکم سے اس کے خیمے پر پہرہ لگ گیا اور اس کے باپ نے شہزادہ پارس سے ملنے سے سختی
[illegible] کر دیا تو اس کے دل میں محبت کی آگ ایکدم بھڑک اٹھی اور اسے پہلی بار معلوم ہوا کہ عشق کا درد کیسا ہوتا
[illegible] فراق کسے کہتے ہیں۔
چشمانیہ کی بہت کم سہیلیاں تھیں۔ ان میں سے بھی صرف یاسو ایسی تھی جس پر وہ اعتماد کر کے اسے اپنا راز [illegible]
[illegible] تھی۔ یاسو کو بھی چشمانیہ سے بہت پیار تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اسے چشمانیہ سے عشق تھا۔ اسی نے چشمانیہ
[illegible] کار کیا تھا اور اپنے کپڑے پہنا کر شہزادے پارس سے ملانے لے گئی تھی ورنہ اس کی بعض سہیلیاں تو اس خبر
[illegible] تھیں کہ چشمانیہ کو دیکھنے کے لیے خاقانِ شرق و غرب کے بیٹے نے طلب کیا ہے۔
"[illegible] یاسو!" چشمانیہ، یاسو کو خیمے میں داخل ہوتے دیکھتے ہی دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔۔۔۔ اور
[illegible] لگی۔
"سیدھی ہو کر بیٹھو چشمانیہ!" یاسو اسے پرے ہٹاتے ہوئے بولی:
"اس طرح آنسو بہانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تجھے کچھ پتہ بھی ہے کہ باہر کیا ہوا ہے؟"
یاسو کا لہجہ اتنا سخت تھا کہ چشمانیہ سہم کر دور جا بیٹھی۔ پھر افسردگی سے بولی:
"ہاں مجھے معلوم ہے میرے باپ نے میرا رشتہ شہزادے سے توڑ دیا ہے"۔
"[illegible] رشتہ توڑا ہی نہیں بلکہ تیرا رشتہ کریمیا کے حاکم سے جوڑنے کا اعلان بھی کیا ہے"۔ یاسو نے
[illegible]

"ہاں، میں نے یہ اعلان سنا ہے جبھی سے تو پریشان ہوں"۔
چشمانیہ نے سسکی لی: "میں تیرے پاس آنے والی تھی لیکن اب تو مجھے باہر نکلتے ڈر لگتا ہے"۔

"میرے پاس تو آ بھی نہیں سکتی تھی۔"

یاسو کچھ نرم پڑی:

"باہر جھانک کر دیکھ۔ تجھے خیمے میں قید کر دیا گیا ہے۔ تو باہر نہیں نکل سکتی۔"

"مگر کیوں؟ میں نے کیا کیا ہے؟" چشمانیہ نے گھبرا کر پوچھا:

"کریمیا کے سردار کا میں نے کیا بگاڑا ہے؟"

"وہ تجھے اپنی کنیز سمجھنے لگا ہے۔" یاسو منہ بنا کر بولی:

"بڑا آیا ہے سردار بن کر۔ ایک کوڑی ادا نہیں کی اور خواہ مخواہ تیرا مالک بن گیا۔ میں نے اسے دیکھا ہے۔ شکل سے پورا بندر لگتا ہے۔"

"میں۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ اس سے شادی نہیں کروں گی۔" چشمانیہ نے ہکلاتے ہوئے کہا:

"میں نے شہزادے سے وعدہ کیا ہے۔ میں اس کے لیے زندہ رہوں گی اور۔۔۔۔"

"کیا تجھے شہزادے سے واقعی اتنی محبت ہے؟" یاسو نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں یاسو!" چشمانیہ سنبھل کر بولی:

"اگر کسی اور نے میرے قریب آنے کی کوشش کی تو میں اسے قتل کر دوں گی۔"

"تجھ میں اتنا حوصلہ ہے بھی؟" یاسو نے طنز کیا۔

"یاسو۔ تو دیکھ لینا۔ میں جان سے گزر جاؤں گی لیکن سوائے شہزادے کے اور کسی کا منہ نہیں دیکھوں گی۔" چشمانیہ نے بڑی مستقل مزاجی سے کہا۔

"چشمانیہ۔ اگر تجھے شہزادے سے واقعی محبت ہے اور تجھ میں حوصلہ بھی ہے تو دھیان سے سن! میں تجھے بتاتی ہوں کہ باہر کیا کچھ ہوا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔"

یاسو نے ایک لانبا سانس لیا۔

چشمانیہ ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گئی۔

"کریمیا کے حاکم نے یہاں پہنچتے ہی تیرے باپ کو بلوا بھیجا۔"

یاسو نے کہنا شروع کیا:

"اس نے حکم دیا کہ تیری نسبت شہزادے پارس سے توڑ کر اس سے کر دی جائے۔ تیرا باپ لالچ میں آ گیا۔ شہزادے سے تیرا رشتہ ختم کر دیا اور دوسری طرف اس نے شہزادے پارس کو ایک آدمی کے ذریعے حکم دیا کہ وہ یہ علاقہ خالی کر کے اپنی حکومت میں چلا جائے۔ شہزادے اور حاکم کریمیا کے درمیان دیر تک پیام آتے جاتے رہے

لیکن کیا فیصلہ ہوا لیکن اس دوران تیرے خیمے پر پہرہ لگ گیا اور تیرے باپ کو دوسری جگہ قید کر دیا گیا۔ میں شہزادے کی ڈھونڈ میں تھی اس لیے تیرے پاس نہیں آ سکی۔ اب جو آئی ہوں تو اس پہرے دار سے ایک گھنٹہ جھک جھک کی۔ میں نے بھی خوب سنائی ہیں اسے۔ کہتا تھا کہ اس خیمے میں تو چشمانیہ کا باپ بھی نہیں جا سکتا مگر میں بھی اپنے نام کی یاسو ہوں۔ میں آ کے رہی اور اب ہر وقت آتی جاتی رہوں گی۔ مجھے کوئی نہیں روکے گا۔"

چشمانیہ دم بخود بیٹھی سن رہی تھی۔

یاسو سانس لینے کے لیے رکی تو اس نے پوچھا:

"کچھ شہزادے کے بارے میں بھی معلوم ہوا۔ وہ کیا کہتے ہیں؟"

"وہ۔۔۔۔ وہ بھی شاید تیری طرح پریشان ہے۔"

یاسو مسکرائی:

"وہ پریشان ہو کر تیرے پاس آیا تھا۔"

"میرے پاس؟" چشمانیہ گھبرا کر بولی:

"نہیں۔ دھوکا ہوا ہے یاسو۔ یہاں تو صبح سے کوئی بھی نہیں آیا۔"

"تجھے پتہ نہیں چشمانیہ۔"

یاسو نے بتایا:

"شہزادہ جب کریمیا کے حاکم کی باتوں سے مایوس ہوا تو گھوڑے پر سوار ہو کر تیرے خیمے پر آیا تھا لیکن خیمے پر پہرہ دیکھ کر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور گھوڑا موڑ کر کریمیا کے حاکم کے پاس چلا گیا۔"

"کس کے پاس؟"

چشمانیہ پریشان ہو گئی:

"کیا شہزادے، حاکم کریمیا کے پاس گئے ہیں؟"

"ہاں ہاں۔ اسی بندر کے پاس گئے تھے۔" یاسو نے جواب دیا:

"میں خیمے کے قریب ہی کھڑی کریمیا کے سواروں سے باتیں کر رہی تھی۔ شہزادے جب کریمیا کے حاکم سے ملاقات کر کے واپس آئے تو تھکے تھکے اور پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ وہ خاموشی سے گھوڑے پر سوار ہوئے اور اپنے پڑاؤ کی طرف چلے گئے۔"

"اللہ! اب کیا ہوگا یاسو؟" چشمانیہ کی پریشانی اور بڑھ گئی۔

"کیا باتیں ہوئیں وہاں۔ کہیں جنگ نہ ہو جائے؟"

"باتوں کا تو میں پتہ نہیں لگا سکی۔"

یاسو نے انکار میں سر ہلایا:

"میں نے سوچا تھا کہ شہزادہ جب واپس آئے گا تو اس سے ملنے کی کوشش کروں گی لیکن اس کا موقع مل سکا۔ ایک تو وہاں بہت سے آدمی موجود تھے۔ پھر شہزادے نے گھوڑے پر سوار ہوتے ہی گھوڑے لگا دی تھی۔"

"پھر کیسے معلوم کیا جائے کیا ہونے والا ہے، کون بتلائے گا؟" چشتانیہ کو پسینے لگ گئے۔ اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔

"ابھی تو کچھ پتہ نہیں لگ سکتا۔ ہاں رات ہو جانے دو تو میں شہزادے کے پاس جاؤں گی۔" یاسو نے دلبری سے کہا:

"اب تُو اپنے دل کا حال بتا۔ تُو کیا چاہتی ہے؟"

"میں کیا چاہتی ہوں یاسو۔ تُو مجھ سے پوچھتی ہے؟"

چشتانیہ تیز تیز سانسیں لینے لگی:

"معلوم نہیں یہ بندر کہاں سے آ کے مر گیا۔ دو دن اور نہ آتا تو اس کا کیا بگڑتا۔ میں اپنے لگ جاتی!"

"ان باتوں کو چھوڑ۔ یہ بتا کہ تُو کرنا کیا چاہتی ہے؟"

یاسو نے اسے جھڑکا:

"ابھی تو شہزادہ یہیں ہے۔ کل کلاں وہ واپس چلا گیا تو عمر بھر روتی رہے گی۔ پھر کچھ بنائے نہ"

"ہائے میں کیا کروں؟"

چشتانیہ انگلیاں چٹخانے لگی:

"تُو ہی بتا میں کیا کروں۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ بس..... کسی طرح اڑ کر پارس کے پاس پہنچ"

"تُو اس کے پاس جانا چاہتی ہے؟"

"ہاں..... مگر....."

"مگر وگر نہیں۔ صرف ہاں یا نہیں میں جواب دے۔"

"ہاں۔ اگر وہ مجھے لینے آ گیا تو میں انکار نہیں کروں گی۔"

"اگر وہ یہاں نہ آ سکا تو پھر.....؟"

"پھر کیا..... پھر میں کیا کروں گی؟"

"تجھے وہاں جانا ہو گا۔"

"بھاگ کر.....؟"

چشتانیہ نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے:

"نہیں یاسو۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔ تمام قبیلے میں بدنام ہو جاؤں گی۔ میرے باپ کی ناک کٹ جائے گی۔"

"تیرے باپ نے عہد شکنی کر کے اپنی ناک تو پہلے ہی کٹوا لی ہے۔" یاسو غصے سے بولی:

"پورے قبیلے والے لعنت بھیج رہے ہیں اس پر۔ وہ تو کہتے ہیں کہ اگر کریمیا کا حاکم نہ آیا ہوتا اور تیرا باپ اس طرح وعدہ خلافی کرتا تو وہ خود اپنے ہاتھوں سے تیرا ہاتھ شہزادے کے ہاتھ میں دے دیتے۔ پورا قبیلہ شہزادے کی طرف ہے مگر خوف کی وجہ سے خاموش ہیں۔ کریمیا کے حاکم کے پاس دو ہزار ہیں۔ کون مقابلہ کر سکتا ہے؟"

چشتانیہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

"کن خیالوں میں کھو گئی ہو؟"

یاسو نے اسے چونکایا:

"میں یہ نہیں کہتی کہ تو اسی وقت شہزادے کے پاس چلی جا۔ ابھی تو مجھے شہزادے کا حال معلوم کرنا ہے۔ آخر اس کا کیا ارادہ ہے۔ ہاں اگر ایسا موقع آ گیا تو پھر شہزادے کو حاصل کرنے کی یہی صورت ہو گی۔ تیرے خیمے پر پہرہ ہے۔ شہزادہ یہاں نہیں آ سکتا۔ فوراً جنگ شروع ہو جائے گی۔"

"مگر میں بھی تو باہر نہیں جا سکتی۔" چشتانیہ پریشانی سے بولی:

"پہرے دار مجھے کب جانے دیں گے۔"

"اس کی تُو فکر نہ کر..... بس اپنا دل کڑا کر لے۔"

پھر یاسو نے اس سے سرگوشیوں میں کچھ کہا۔ چشتانیہ اس دوران کبھی سر ہلاتی اور کبھی آنکھیں پھیلا پھیلا کر تعجب کا اظہار کرتی رہی۔

سرگوشیوں کے بعد یاسو اٹھ کر خیمے سے باہر چلی گئی اور چشتانیہ پھر سوچ میں کھو گئی۔

رات کو یاسو لوگوں کی نظریں بچاتی شہزادے کے پڑاؤ میں پہنچ گئی۔ شہزادے نے دل برداشتہ ہو کر سامان بندھوانا شروع کرا دیا تھا۔ آدھے سے زیادہ خیمے اکھاڑے جا چکے تھے اور سامان گاڑیوں پر لادا جا رہا تھا۔

شہزادے کو خبر کی گئی کہ چشتانیہ کی سہیلی یاسو آپ سے ملنا چاہتی ہے تو وہ خود خبر دینے والے کے ساتھ بھاگا چلا آیا اور یاسو کو ایک خیمے میں لے جا کر بٹھایا۔

"شہزادے بہادر۔"

یاسو نے فوراً بات شروع کر دی:

"مجھے نہیں معلوم کہ کریمیا کے حاکم اور آپ کے درمیان کیا بات ہوئی لیکن خیمے اکھاڑے جانے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ واپس جا رہے ہیں۔"

"ہاں یاسو"، شہزادہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا:

"میں نے توقتمش سے مصالحت کی بہت کوشش کی۔ میں نے اپنے وقار کی بھی پروا نہیں کی۔ خوشامد سے بھی دریغ نہ کیا لیکن وہ مغرور دو ہزار سواروں پر پھولا ہوا ہے۔ اس نے میری ایک نہ مانی اور مجھے رات کے اندر اندر اپنی حدود سے نکل جانے کا حکم دیا ہے۔"

"مگر شہزادے بہادر۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔"

یاسو نے طنزیہ لہجہ اختیار کیا:

"یہ تو کوئی دوستی اور محبت نہ ہوئی۔ آپ چشتانیہ کو بے یار و مددگار چھوڑے جا رہے ہیں۔ کیا یہی عہد و پیمان ہوئے تھے آپ دونوں میں؟"

"کیا کروں یاسو۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں"، شہزادے نے افسردگی سے کہا:

"میں توقتمش سے وہ بدلہ لوں گا کہ دنیا دیکھے گی۔ وہ میرے ہاتھ سے بچ نہ سکے گا۔"

"شہزادے آپ تو بچوں جیسی باتیں کر رہے ہیں"، یاسو جل کر بولی:

"کریمیا کا حاکم جب چشتانیہ کو اپنی لونڈی بنا لے گا تو پھر آپ لاکھ کچھ کرتے رہیں، سب بے کار ہوگا۔ سانپ نکل جائے تو پھر لکیر پیٹنے سے کیا حاصل ہوگا!"

"میری مجبوری بھی دیکھو یاسو۔"

شہزادے کی آواز گہرے غم میں ڈوبی ہوئی تھی:

"میرا اکیلا معاملہ ہوتا تو میں لڑ بھڑ کے مر جاتا لیکن پانچ سو سواروں کو دو ہزار سے لڑا دینا موت کو دعوت دینا ہے۔ ایک بھی زندہ نہیں بچ سکے گا۔"

"تو پھر یوں کہیے کہ آپ کو چشتانیہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔"

یاسو نے تیوریاں چڑھا لیں:

"اسے آپ کھلونا سمجھ کے کھیل رہے تھے۔ ذرا سی مصیبت پڑی تو پیٹھ دکھا کر چل دیے۔"

شہزادہ بڑا جزبز ہوا۔ بولا:

"اچھا یہ بتاؤ، چشتانیہ کیا چاہتی ہے؟ اگر وہ کہتی ہے کہ میں توقتمش سے جنگ کروں تو میں اپنی آن کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اسی وقت توقتمش پر حملہ کر دوں گا اور چشتانیہ پر ثابت کر دوں گا کہ میں اس سے وفادار ہوں۔"

"چشتانیہ یہ ہرگز نہیں چاہے گی کہ آپ ایک بے کار سی جنگ کر کے خود کو اور اپنے سواروں کو ہلاکت میں ڈال دیں۔"

یاسو نے مستقل مزاجی اور سنجیدگی سے کہنا شروع کیا:

"وہ تو آپ کی اور آپ کے سواروں کی زندگی کی خواہش مند ہے۔ آپ ایسا قدم اٹھائیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

"یاسو، تم سمجھتی ہو کہ میں نے کوشش نہیں کی؟" شہزادہ بڑے کرب سے بولا:

"یقین کرو کہ میں نے توقتمش کو رام کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا لیکن وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ اب صرف جنگی حربہ ہی رہ جاتا ہے اور اس کے لیے بھی میں تیار ہوں۔"

"شہزادے بہادر۔ ابھی وقت ہے۔ آپ چاہیں تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔"

یاسو شہزادے کی طرف سے بالکل مطمئن ہونے کے بعد مطلب پر آئی:

"آپ تیار ہوں تو یہ مسئلہ جنگ کے بغیر بھی حل ہو سکتا ہے۔ بس ذرا ہمت کی ضرورت ہے۔"

"میں ہر طرح تیار ہوں یاسو"، شہزادے نے بے چینی سے کہا:

"چشتانیہ کے لیے میں ہر قدم اٹھا سکتا ہوں۔"

"شہزادے بہادر۔ آپ کا سامان بندھ رہا ہے۔ رات کے کسی بھی پہر آپ کوچ کر سکتے ہیں۔" یاسو کہتے کہتے رکی اور اس نے شمع کی روشنی میں شہزادے کو غور سے دیکھا۔

"رکو مت یاسو۔ میں سن رہا ہوں"، شہزادہ اضطراب سے بولا۔

"میرا مطلب ہے جہاں اتنا سامان لے جا رہے ہیں وہاں اس میں ایک سامان کا اور اضافہ کر لیجیے۔"

"میں سمجھ نہیں سکا یاسو"، شہزادے نے الجھتے ہوئے پوچھا:

"تم کسے سامان سمجھنا چاہتی ہو؟ کتنا وزن ہے اس کا؟"

"شہزادے۔ چشتانیہ کا وزن کچھ زیادہ نہیں۔"

یاسو نے زیر لب تبسم کیا:

"اسے تو آپ اپنے گھوڑے پر پشت کے ساتھ بھی بٹھا سکتے ہیں۔"

"کیا چشتانیہ......؟"

شہزادے کا منہ حیرت سے کھل گیا:

"کیا وہ اپنے باپ کو چھوڑ کر میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہے؟"

"شہزادے بہادر۔ باپ کا گھر تو ہر بیٹی کو ایک نہ ایک دن چھوڑنا پڑتا ہے"۔ یاسو نے سنجیدگی سے کہا۔ "کبھی خوشی اور کبھی آج جیسے حالات کی مجبوری سے۔ آپ کو شاید پتہ نہیں کہ چشتانیہ کے باپ کو ایک الگ خیمے میں قید کر دیا گیا ہے۔ اسے چشتانیہ سے ملنے کی بھی اجازت نہیں، پھر اسے چھوڑنے نہ چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"۔

شہزادے کا دماغ بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اسے اس کام میں بڑے خطرات نظر آ رہے تھے لیکن چشتانیہ کا پیکر اس کی نظروں میں گھوم رہا تھا جو شہزادے کو ہر خطرے سے لاپروا کر رہا تھا۔ یاسو نے بات ختم کی تو اس نے ایک سدشے کا اظہار کیا:

"یاسو۔ تم جانتی ہو کہ چشتانیہ کے خیمے پہ پہرہ ہے۔ اگر وہاں سے نکلتے ہوئے کچھ گڑبڑ ہو گئی اور چشتانیہ کو نقصان پہنچا تو کیا ہو گا؟"

"شہزادے۔ دل میں وسوسوں کو جگہ نہ دیجیے"۔ یاسو اطمینان سے بولی: "خطرہ تو ہر کام میں ہوتا ہے اور بہادروں کا کام ہی خطرات سے کھیلنا ہے۔ آپ بس چشتانیہ کو ساتھ لے جانے کی حامی بھر لیجیے اور باقی باتیں قسمت پر چھوڑ دیجیے"۔

"میں تیار ہوں یاسو"۔

شہزادے نے فیصلے کا اعلان کر دیا:

"چشتانیہ کے بغیر میری زندگی بھی ادھوری ہے"۔

"آپ کس وقت کوچ کے لیے تیار ہو جائیں گے"۔ یاسو نے پوچھا۔ وہ چاہتی تھی صحیح وقت معلوم ہو جائے تاکہ وہ اپنا اگلا قدم بھی اس کے مطابق اٹھائے۔

"زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے"۔ شہزادے نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"چشتانیہ کے لیے ایک الگ گھوڑا تیار رکھیے گا"۔ یاسو نے اسے تاکید کی: "چشتانیہ اچھی شہسوار ہے۔ پھر بھی سفر کے دوران آپ اسے اپنے سے آگے رکھیے گا"۔

شہزادے نے سر ہلا کر یاسو کو مطمئن کر دیا۔

یاسو اٹھلاتی ہوئی چشتانیہ کے خیمے میں پہنچی۔ یاسو اور پہرے داروں میں پہلے تکرار ہو چکی تھی اس لیے انہوں نے کچھ نہیں کیا۔ چشتانیہ بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے یاسو کو دیکھا۔ یاسو نے کچھ کہنے کے بجائے مسکرا کر سر ہلا دیا۔ چشتانیہ کا دھڑکتا ہوا دل اپنی فطری رفتار پر آ گیا۔

یاسو نے اپنے کپڑے اتار کر چشتانیہ کو پہنا دیے اور چشتانیہ کا ایک جوڑا نکال کر خود پہن لیا۔ اس کام کے دوران وہ آہستہ آہستہ چشتانیہ کو وہ باتیں بھی بتاتی رہی جو اس کے اور شہزادے پارس کے درمیان ہوئی تھیں۔

چشتانیہ اپنی سہیلی کی بڑی احسانمند تھی اور بار بار کبھی اس کے ہاتھ اور کبھی محبت سے اس کا منہ چوم لیتی تھی۔ پروگرام کے مطابق جب ایک گھنٹے سے زیادہ وقت ہو گیا تو یاسو نے چشتانیہ کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ چشتانیہ اپنی وفادار اور مخلص سہیلی سے گلے ملی اور پھر بسم اللہ کہہ کر خیمے سے قدم نکالا۔ باہر نکلتے وقت اس کے پیر لرز رہے تھے لیکن اس نے فوراً پیروں پر قابو پا لیا اور قدم جما کے چلنے لگی۔ یاسو پردے سے لگی کھڑی تھی اور دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی۔

رات کا وقت تھا۔ پھر صرف ایک شمع ٹمٹما رہی تھی۔ چشتانیہ کے بدن پر یاسو کے کپڑے تھے۔ کسی پہریدار کو شبہ نہیں ہوا اور چشتانیہ صرف دو گز کے فاصلے سے پہریدار کے پاس سے بے جھجک نکل گئی۔ آگے اندھیرا تھا۔ اندھیرا ہی چشتانیہ کا پردہ اور مددگار بن گیا۔ وہ شہزادے کے پڑاؤ کو جانے والے ہر موڑ اور راستے سے واقف تھی اس لیے وہاں تک پہنچنے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

شہزادہ پارس روانگی کے لیے بالکل تیار تھا۔ تمام خیمے ڈیرے بار کیے جا چکے تھے۔ ہر طرف تاریکی پھیلی تھی۔ اسی اندھیرے میں چشتانیہ سامان کی گاڑیوں کے پاس سے گزرتی ہوئی شہزادے کے قریب پہنچ گئی لیکن تاریکی کی وجہ سے شہزادہ اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔

چشتانیہ نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ایک گاڑی کے پاس ایک آدمی شمع لیے کھڑا تھا اور اس کی ہلکی روشنی میں گاڑی پر سامان بار کیا جا رہا تھا۔ چشتانیہ اس کی طرف بڑھی۔ اسے سب ہی پہچانتے تھے لیکن اس وقت وہ کپڑے پہنے ہوئے تھی جو دو گھنٹے پہلے اس کی سہیلی شہزادے سے ملنے آئی تھی۔ شہزادے کے آدمیوں نے ٹمٹماتی روشنی میں چشتانیہ کو دیکھا تو انہیں گمان ہوا کہ وہ چشتانیہ کی سہیلی یاسو ہے۔

ان میں سے ایک آدمی بھاگتا ہوا شہزادے کے پاس گیا اور آہستہ سے کہا:

"شہزادے بہادر۔ وہی عورت پھر آئی ہے"۔

"کون عورت؟" شہزادہ بے چینی کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ اس کے قدم رک گئے۔

"وہی عورت شہزادے۔ اُن کی سہیلی" آدمی چشتانیہ کا نام لیتے ہوئے ہچکچایا۔

"چشتانیہ کی سہیلی یاسو۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔" شہزادے کا دل دھک سے رہ گیا۔

"جی ہاں۔ وہی دوبارہ آئی ہے"۔

شہزادہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے ساتھ ہو لیا۔

چشتانیہ گاڑی سے ہٹ کر قدرے تاریکی میں کھڑی ہوگئی تھی۔ اس نے شہزادے کو آتے دیکھا تو دوڑ کر شمع کے پاس آگئی۔

شہزادے کی نظر اس پر پڑی تو بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا:

"ارے تم۔۔۔۔"

اور وہ جلدی سے شمع اور چشتانیہ کے درمیان آکر کھڑا ہوگیا:

"یہاں روشنی ہے۔ تم گاڑی کے پیچھے ہو جاؤ"۔ شہزادے نے سرگوشی کی۔

شہزادے نے یہ احتیاط اس لیے برتی کہ اگر توقتمش کا کوئی آدمی اس کی روانگی دیکھنے کہیں چھپا ہو تو وہ چشتانیہ کو نہ دیکھ سکے۔

چشتانیہ گاڑی کے پیچھے ہوگئی۔ شہزادہ بھی وہیں پہنچ گیا۔ بولا:

"چشتانیہ! میں تو گھبرا گیا تھا۔ میرے آدمی نے مجھے خبر دی تھی کہ یاسو دوبارہ آئی ہے"۔

"میں یاسو کے کپڑے پہن کر آئی ہوں"۔ چشتانیہ نے آہستہ سے کہا:

"میں سمجھ گئی تھی کہ انہیں مجھ پر یاسو کا شبہ ہوا ہے لیکن مجھے انہیں بتانا اور اپنی شناخت کرانا مناسب نہ معلوم ہوا"۔

"تم نے بہت اچھا کیا"۔ شہزادے نے بھی آواز دبا کر کہا:

"میں تمہیں اسی لیے اندھیرے میں لے آیا ہوں۔ اب بتاؤ کیا ارادہ ہے؟"

"آپ میری مرضی پوچھ رہے ہیں"۔ چشتانیہ لرزتے لہجے میں بولی:

"میں تو اپنی دنیا اجاڑ کے آپ کے پاس آگئی ہوں۔ جو حکم دیں گے بجا لاؤں گی"۔

"گھبراؤ نہیں چشتانیہ"۔ شہزادے نے سنجیدگی سے کہا:

"میں نے تم کو اپنا کہا ہے۔ تم میری ہو۔ میں تمہاری خوشنودی اور حفاظت پر اپنی جان بھی گنوا دوں گا"۔

"ایسا نہ کہیے شہزادے۔ یہ بدشگونی کے الفاظ ہیں"۔ چشتانیہ نے اسے بزرگانہ نصیحت کی۔

"اچھا تو آؤ میرے ساتھ"۔

شہزادہ اس کو ساتھ لیے ہوئے وہاں پہنچا۔ جہاں دو گھوڑے تیار کھڑے تھے۔ شہزادے کے کئی سردار بھی وہاں

"تمہارے لیے الگ گھوڑا تیار کرا دیا گیا ہے"۔ شہزادے نے کہا:

"اگر چاہو تو میرے ساتھ گھوڑے پر بھی سفر کر سکتی ہو"۔

"نہیں شہزادے"۔

چشتانیہ نے انکار کر دیا:

"مجھے الگ گھوڑے پر سفر کرنا زیادہ پسند ہے۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ میں آپ سے پیچھے نہیں رہوں گی"۔

"چشتانیہ! تم تو سب سے آگے رہو گی"۔

شہزادے نے سہارا دے کر اسے گھوڑے پر سوار کرایا:

"یاسو نے کہا تھا کہ تمہیں آگے ہی رکھا جائے"۔

"اس کی ضرورت نہیں"۔

چشتانیہ سنبھل کر بیٹھ گئی:

"یاسو مجھے گھڑسواری میں اناڑی سمجھتی ہے اس لیے کہہ دیا ہوگا۔ میں آپ کے گھوڑے سے گھوڑا ملا کر

شہزادے پارس کا خیال ٹھیک تھا۔ توقتمش نے اپنے ایک آدمی کو شہزادے پارس کے پڑاؤ پر بھیجا تھا کہ وہ اس وقت تک موجود رہے جب تک شہزادہ پڑاؤ سے چلا نہیں جاتا۔ توقتمش کا آدمی شہزادے کے پڑاؤ کے قریب چھپ گیا تھا۔

شہزادے نے توقتمش کے پاس سے آتے ہی روانگی کا حکم دے دیا تھا اور خیمے اکھڑنا شروع ہوگئے تھے۔ توقتمش کا آدمی یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ جب اندھیرا پھیل گیا تو پڑاؤ کے ذرا اور قریب آگیا۔ سامان لادنے کے لیے شمعیں روشن کی گئی تھیں لیکن جوں جوں سامان نمٹتا گیا شمعیں بھی گل ہوتی گئیں۔ آخر شہزادے کے خیمے کی چوبیں اور سامان سے لدی ہوئی بیل گاڑیاں کھڑکھڑاتی اور شور مچاتی شمال کی طرف چل پڑیں۔

توقتمش کا آدمی پھر بھی وہاں اس وقت تک کھڑا رہا جب تک اس کے کانوں میں گاڑیوں کے شور کی آواز آتی رہی۔ اطمینان کر لینے کے بعد کہ شہزادہ پارس پڑاؤ سے دور نکل گیا ہے اور اس کے واپس آنے کا کوئی امکان نہیں ہے تو واپس توقتمش کے پاس پہنچا۔

توقتمش کو شہزادے کے واپس جانے کی اطلاع سے بڑی مسرت ہوئی۔ اس نے اپنے خیال میں شہزادے کو

خوب ذلیل کیا تھا۔ اسے اب کوئی دھڑکا یا خوف نہیں رہ گیا تھا۔ اس لیے اس نے حکم دیا کہ چشتانیہ کو اس کے سامنے حاضر کیا جائے۔

اس نے چشتانیہ کے حسن و جمال اور رقص کی بہت تعریف سنی تھی۔ اس نے سوچا کہ شہزادے پار پر کو شکست دینے کی خوشی میں کیوں نہ جشن منایا جائے اور اس بہانے چشتانیہ کے رقص کے کمال سے بھی محظوظ ہوا جائے۔ اسے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اسے تو بس شہزادے کو شکست دینا تھی اور اس میں وہ کامیاب رہا تھا۔

اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر چشتانیہ اس کے گلے پڑ ہی گئی تو وہ اسے اپنی کنیزوں میں داخل کر لے گا اور اس کی کنیزوں میں ایک کنیز کے اضافے سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔

تونمتش کے چار ذاتی محافظ شمعیں اٹھائے ہوئے چشتانیہ کو لینے اس خیمے پر پہنچے جہاں وہ قید تھی۔ ان محافظوں کو چشتانیہ کے خیمے پر پہرہ دینے والے سوار پہچانتے تھے۔ شاہی محافظ ہونے کی وجہ سے ان کا مرتبہ سواروں سے بلند تھا۔ سواروں نے فوراً انہیں سلام کیا اور آنے کا سبب پوچھا۔ انہیں بتایا گیا کہ حاکم کریمیا نے چشتانیہ کو فوراً طلب کیا ہے۔ چشتانیہ کے پہریداروں کو کیا عذر ہو سکتا تھا۔ ان میں سے ایک شمع لیے ہوئے خیمے کے دروازے پر پہنچا اور تحکمانہ لہجے میں بولا:

"چشتانیہ باہر آؤ۔ حاکم کریمیا نے تمہیں طلب کیا ہے۔"

ذرا دیر خاموشی رہی۔ پھر خیمے کا پردہ اٹھا اور یاسو باہر آئی۔ یاسو کو دیکھ کر پہرے دار گھبرا گیا۔ اس نے شمع کو چہرے کے بالکل قریب کر دیا اور اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

"کیا گھور گھور کر دیکھ رہے ہو۔ کیا میں کوئی تماشا ہوں؟" یاسو کمر پہ ہاتھ رکھ کر کڑک کر بولی۔

"تم...... تم ہو...... مگر وہ...... وہ" پہریدار بدحواس ہو گیا۔

"کیا تم تم...... وہ وہ...... لگا رکھی ہے"۔ یاسو ذرا اکڑ گئی۔

حاکم کریمیا کے محافظ جو ذرا دور کھڑے تھے وہ یہ تو تو میں میں سن کر شمعیں لیے قریب آ گئے۔

"تم نہیں۔ چشتانیہ کو باہر بھیجو"۔ پہرے دار نے سنبھل کر اپنی آواز میں رعب پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"چشتانیہ اندر نہیں ہے"۔ یاسو نے بڑی لاپروائی سے جواب دیا۔

"اندر نہیں ہے تو پھر کہاں گئی؟"

"اپنے باپ کے پاس گئی ہے"۔

"تو جھوٹ بول رہی ہے"۔ پہریدار چیخ کر بولا۔ پھر شاہی محافظوں کو دیکھتے ہوئے کہا:

"صاحبو۔ یہ جھوٹی ہے۔ چشتانیہ اندر ہے۔ آپ اندر چل کر اسے پکڑ لیجیے"۔

...ظوں کی سمجھ میں تو کچھ نہ آیا۔ انہیں تو چشتانیہ چاہیے تھی۔ وہ بے دھڑک خیمے کے اندر گھس گئے۔ مشعلوں کا ...ر ہو رہا تھا۔ محافظوں نے خیمے کا سامان الٹنا پلٹنا شروع کر دیا۔ تمام سامان خیمے میں بکھر گیا مگر چشتانیہ ...نہ آئی۔

...ہمیں چشتانیہ چاہیے"۔ ایک محافظ نے خیمے کے پہریداروں کو مخاطب کیا:

...تانیہ جہاں سے بھی ہو پیدا کرو۔ ورنہ تمہاری گردنیں اڑا دی جائیں گی۔ یہ حاکم کریمیا کا حکم ہے"۔

...ے دار کو یاسو کی خیمے میں موجودگی سے کچھ شبہ تو پڑ گیا تھا لیکن شبہ کے اظہار سے وہ خود مجرم بن جاتے ...ے طوطا و بلوں کا سہارا لینا شروع کیا۔

...پہرے دار نے یاسو کی گردن پکڑ لی اور چیخ کر بولا:

...بتا چشتانیہ کو کہاں چھپایا ہے ورنہ میں تیرا گلا گھونٹ دوں گا"۔

...نے واقعی یاسو کا گلا دبانا شروع کر دیا تھا اور اس غریب کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔ ایک محافظ کو ...گیا۔ اس نے دھکا دے کر اسے یاسو سے الگ کیا۔

...تانیہ کہاں ہے لڑکی؟" محافظ نے نرمی سے پوچھا:

...چشتانیہ چاہیے۔ تجھے کچھ نہیں کہا جائے گا"۔

...ا تو رہی ہوں"۔ یاسو گلا سہلاتے ہوئے گھٹی گھٹی آواز میں بولی:

...تانیہ مجھے خیمے میں بٹھا کر باپ سے ملنے گئی ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ حاکم کریمیا نے اسے باپ سے ملنے کی ...ہے۔ بس آتی ہی ہو گی۔ ذرا دیر کے لیے کہہ کر گئی ہے۔ یہ تو خوا مخواہ میرا گلا دبا رہے ہیں۔ شرم نہیں ...بڑا ہاتھ اٹھاتے ہوئے"۔

...سسکیاں لینے لگی۔

...نے چشتانیہ کو فرار ہونے کا مشورہ دیا تھا تو جانتی تھی کہ جب بات کھلے گی تو ساری مصیبت اسی پر آ پڑے گی ...سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں لیکن چشتانیہ کو فرار کرانے کا یہی طریقہ تھا کہ یاسو اسے اپنے کپڑے پہنا کر ...فراہم کرے۔ اس نے یہ مصیبت خود مول لی تھی۔ وہ چشتانیہ کی عزیز ترین سہیلی تھی اور اسے دل سے ...شہزادے کے پڑاؤ سے گاڑیوں کی روانگی کا شور بھی سنا تھا اور اپنی کامیابی پر خوش بیٹھی تھی کہ وہ بلا ...صبح سے پہلے امکان نہیں تھا۔ وہ پھر بھی حوصلے سے کام لے رہی تھی اور گفتگو کو زیادہ سے زیادہ ...کوشش کر رہی تھی تاکہ شہزادہ اور چشتانیہ ان لوگوں کی پہنچ سے دور نکل جائیں۔

...سسکیاں بھر چکی تو ایک محافظ نے پوچھا: "چشتانیہ کا باپ کہاں رہتا ہے؟"

"سردار۔ مجھے کیا پتہ کہ اس کا باپ کہاں ہے؟"

یاسو نے انہیں اور الجھانے کی کوشش کی:

"اس کا گھر تو یہی خیمہ ہے۔ چشتانیہ اور اس کا باپ اسی میں رہتے تھے لیکن اسے آپ کے بازار
تھا جب سے اس کا کوئی پتہ نہیں۔ ہم کو تو بس یہی معلوم ہے کہ چشتانیہ کے باپ نے آپ کے بازار
چشتانیہ کو فروخت کر دیا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ آپ کے بادشاہ کے پاس ہو اور چشتانیہ اس سے ملنے وہیں گئی

"یہ لڑکی بہت باتونی معلوم ہوتی ہے"۔ ایک محافظ نے جھلا کر کہا:

"اس کے ساتھ سر کھپانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ چشتانیہ کے باپ کا پتہ لگاؤ اس کے پاس چلے"

ایک محافظ ان سے دور کھڑا تھا، قریب آکر بولا:

"مجھے معلوم ہے اسے کس خیمے میں رکھا گیا ہے۔ میں نے کچھ دیر وہاں پہرہ دیا تھا۔ م
پہنچا سکتا ہوں"۔

محافظ تمام پہرے داروں کو ساتھ لے کر چشتانیہ کے باپ کے خیمے کی طرف چل دیے۔

یاسو چیخ کر بولی:

"چشتانیہ مل جائے تو اس سے کہنا کہ جلدی واپس آجائے۔ میں اکیلے بیٹھے بیٹھے گھبرا گئی ہوں
خیمے میں اکیلی ہے اور میرا بھائی بیمار ہے۔ مجھے جلدی واپس جانا ہے"۔

"جہنم میں جا تو لڑکی!"

ایک محافظ کو غصہ آگیا:

"تو نے تو بک بک کرکے دماغ چاٹ لیا ہے"۔

یاسو نے موقع غنیمت جانا اور اپنے خیمے کی طرف چل پڑی۔

چشتانیہ کے باپ کے خیمے میں نیا جھگڑا ہو گیا۔ اس کے خیمے پر سخت پہرہ لگا تھا۔ ایک محافظ
وہاں کے پہریداروں سے بڑے رعب سے کہا:

"چشتانیہ کو اندر سے بلاؤ۔ ہم اسے ساتھ لے جائیں گے"۔

"اندر سے کوئی باہر نہیں آسکتا"۔ ایک پہریدار نے اسے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"پھر ہم خود اندر جاکر اسے پکڑ لائیں گے"۔

"خیمے کے اندر بھی کوئی نہیں جا سکتا"۔ پہریدار نے صاف انکار کر دیا۔

"ہم شاہی محافظ ہیں۔ کیا تم ہمیں پہچانتے نہیں؟"

ے والے نے بھی تلخی سے جواب دیا:

یہ ہماری حفاظت میں دیا گیا ہے اور کریمیا کے حاکم کا حکم ہے کہ نہ کوئی خیمے کے باہر آنے پائے اور نہ
لنے دیا جائے۔ ہم اندر جانے کی کسی کو اجازت نہیں دے سکتے"۔

ر اور اس کے ساتھ آنے والے پہریدار تذبذب اور الجھن میں گرفتار ہو گئے۔ محافظوں میں ایک
لے نے خیمے کے محافظ کو سمجھانے کے لیے کہا:

ر ساتھیو۔ ہم اور تم دونوں ہی کریمیا کے حاکم کے نمک خوار ہیں۔ تمہیں اس خیمے کی حفاظت پر رہے اور
نیہ کو لینے بھیجا ہے۔ ہم چشتانیہ کے خیمے پر گئے تھے۔ وہاں کے پہریداروں نے بتایا ہے کہ چشتانیہ
نے اس خیمے میں آئی ہے۔ یقین نہ ہو تو ان پہریداروں سے پوچھ لو"۔

یدہ آدمی نے چشتانیہ کے خیمے کے پہریداروں کی طرف اشارہ کیا:

ی اس بات کی تصدیق کریں گے کہ چشتانیہ اپنے باپ سے ملنے آئی ہے"۔

پہریدار بظاہر اس عمر رسیدہ محافظ کی باتیں بڑے غور سے سننے لگے لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا
ہے۔

بعد عمر رسیدہ آدمی نے پوچھا:

لنے کیا فیصلہ کیا۔ امید ہے کہ تمہیں ہماری باتوں پر اعتبار آگیا ہوگا۔ وقت بہت گزر چکا ہے حاکم ہمارا
الگے، تم ہمیں اندر جانے دو یا پھر آواز دے کر چشتانیہ کو بلا دو۔ ہم اس سے خود نمٹ لیں گے"۔

راروں نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

بھائیو۔ کچھ تو جواب دو"۔ عمر رسیدہ محافظ نے ملتجیانہ لہجے میں کہا:

ا کام نہیں ہے۔ ہم بھی حاکم کے حکم سے آئے ہیں"۔

یا جواب چاہتے ہیں آپ لوگ . . . . ؟" پہریدار ترشی سے بولا:

دیا ہے نہ کوئی اندر جا سکتا ہے اور نہ باہر نکل سکتا ہے۔ جب تک حاکم خود ہمیں حکم نہ دے گا، ہم
باہر ہونے دیں گے"۔

ں کو غصہ آگیا۔ انہیں یہ زعم تھا کہ وہ حاکم کریمیا تو حتمش کے ذاتی محافظ ہیں۔ انہیں چشتانیہ کے حاصل
ئی۔

ر اندر جانے لگے۔ ایک محافظ نے تلوار کھینچ لی۔
ری انہی کی طرح اجڈ مغل تھے۔ وہ بھی تاؤ میں آگئے اور سب نے تلواریں نکال لیں۔

ایک پہریدار بولا:
"جس نے اندر جانے کی کوشش کی اس کی گردن اڑا دی جائے گی"۔
دونوں طرف سے تلواریں بلند ہوئیں اور قریب تھا کہ وہ ٹکرا کر ایک دوسرے کا خون بہا
محافظ نے ایک بار پھر دخل دیا۔ اس نے پہریداروں کو مخاطب کیا:
"جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنی اپنی تلواریں نیام میں کر لو۔ یہ کوئی اتنا اہم مسئلہ نہیں
مغل دوسرے مغل کا خون بہائے"۔
عمر رسیدہ مغل کی یہ بات سب کی سمجھ میں آئی۔ انہوں نے تلواریں نیام میں ڈال لیں۔
بوڑھے محافظ نے پوچھا:
"پہریدار دوستو۔ تمہارا اعتراض یہ ہے کہ حاکم کریمیا کے حکم کے بغیر تم کسی کو اندر جانے
نکلنے کی اجازت دو گے؟"
"ہاں ہاں۔ بالکل یہی"۔ ایک پہریدار نے کہا۔
"مگر یہ تو سوچو دوستو"۔
بوڑھے نے انہیں سمجھایا:
"حاکم کریمیا خود تو چل کے یہاں نہیں آئے گا۔ وہ کسی کے ذریعے اپنا حکم بھیجے گا۔ اب میں
نے چشتانیہ کو لانے کا حکم دیا ہے۔ وہ اس خیمے میں موجود ہے۔ ہم اسے حاکم کریمیا کے حکم سے
"تم کچھ بھی کہو مگر ہم کسی کو اندر نہیں جانے دیں گے"۔ پہریداروں نے ان کی ایک نہ سنی
تیار ہو گئے۔
آخر بوڑھے محافظ نے پہریداروں کو ایک بات پر راضی کر لیا۔ طے یہ ہوا کہ ایک محافظ
کے پاس جا کر حالات سے آگاہ کرے اور اگر حاکم اجازت دے تو محافظ چشتانیہ کے باپ کے
سکتے ہیں۔
تو قتمش نے یہ باتیں سنیں تو غصے سے بھنا گیا۔ اس نے چیخ کر پوچھا:
"چشتانیہ کے خیمے پر پہرہ تھا پھر وہ باپ کے پاس کیسے پہنچ گئی؟"
"پتہ نہیں حاکم"۔ ساتھ آنے والے محافظ نے کہا:
"پہرے داروں نے ہمیں بتایا ہے کہ چشتانیہ اپنے باپ سے ملنے گئی ہے اور اسے
اجازت دی ہے"۔

کس نے اجازت دی ہے۔ کون کہتا ہے۔ اسے لاؤ میرے سامنے"۔ تو قتمش شیر کی طرح غرایا۔
"اے حاکم! جو پہریدار چشتانیہ کے باپ کے خیمے پر کھڑے ہیں انہوں نے بتایا تھا"۔ محافظ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔
"اس کا مطلب ہے کہ چشتانیہ کے خیمے پر اب کوئی پہرہ نہیں؟" تو قتمش نے چیخ کر پوچھا۔
"اے حاکم! ہم نے اس خیمے کی اچھی طرح تلاشی لی تھی"۔
محافظ نے اپنی کارکردگی بیان کرنا شروع کی:
"ایک ایک سامان الٹ دیا۔ صندوق بھی کھول کر دیکھے۔ چشتانیہ وہاں نہیں تھی۔ اس کی سہیلی نے تصدیق
کی کہ چشتانیہ اپنے باپ سے ملنے گئی ہے"۔
"کون سہیلی۔ کس کی سہیلی؟"
تو قتمش غصے میں بل کھاتا ہوا کھڑا ہو گیا:
"ہم نے حکم دیا تھا کہ چشتانیہ کو کسی سے نہ ملنے دیا جائے۔ پھر اس کی سہیلی اس کے پاس کیوں گئی اور چشتانیہ کو
اس کے باپ کے پاس کیوں جانے دیا گیا۔ پہریداروں کو بلاؤ۔ ہم انہیں قتل کرا دیں گے"۔
محافظ گھبرا کے مڑا اور خیمے کے دروازے کی طرف چلا۔ تو قتمش کو کچھ خیال آیا۔ اس نے محافظ کو روک
لیا:
"کیا تجھے یقین ہے کہ چشتانیہ اپنے باپ کے پاس ہے"۔
"حضور سب یہی کہتے ہیں"۔
پھر محافظ نے اپنے ساتھ آئے ہوئے پہریدار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:
"یہ اس خیمے کا پہریدار ہے جہاں چشتانیہ کا باپ قید ہے۔ اسے معلوم ہو گا؟"
"کیا تم نے چشتانیہ کو خیمے کے اندر جاتے دیکھا تھا؟"...... تو قتمش نے پہریدار سے کڑکتی آواز
میں دریافت کیا۔
"نہیں، میں نے نہ تو چشتانیہ کو دیکھا ہے اور نہ اس کے باپ کو"۔ پہریدار نے سادگی سے کہا:
"ہمیں حکم دیا گیا تھا کہ اس خیمے کے اندر نہ کسی کو جانے دیا جائے اور نہ اندر سے کوئی باہر آسکے۔ ہم اس حکم کی
تعمیل کر رہے ہیں۔ اس وقت تک سوائے شاہی محافظوں کے اور کسی نے خیمے کے اندر جانے کی کوشش نہیں کی۔
آپ حکم دو تو ہم محافظوں کو اندر جانے دیں گے"۔
"تم سب بے وقوف ہو"۔
تو قتمش مضمحل ہو کر بیٹھ گیا:

"کسی کمبخت کو یہ نہیں معلوم کہ چشتانیہ اپنے باپ کے خیمے میں ہے بھی یا نہیں اور جھگڑا اس بات پر ہوا خیمے میں کسی کو جانے دیا جائے یا منع کر دیا جائے۔ جاؤ دور ہو جاؤ ہماری نظروں سے۔ چشتانیہ جہاں بھی ہو اسے لاؤ۔ ورنہ ایک ایک کا دماغ درست کر دیا جائے گا اور ہاں۔ چشتانیہ کی سہیلی کو بھی پکڑ کر لے آؤ۔"

محافظ اور پہرے دار دونوں سر پہ پیر رکھ کے بھاگے۔ چشتانیہ کے باپ کے خیمے پر سب ان کی راہ دیکھ رہے تھے۔ انہیں حاکم کر مبیا کا حکم سنایا گیا تو ان کے حواس جاتے رہے۔ جب سے سب ایک ساتھ خیمے پر گئے چشتانیہ کا باپ ایک طرف پڑا اپنی قسمت پر آنسو بہا رہا تھا۔ اس نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ خیمے کے باہر بستہ موجود ہیں لیکن باہر جھانکنے اور صورت حال معلوم کرنے کی اسے اس میں ہمت نہ تھی۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے نکالا تو کہیں کوئی اور مصیبت نہ کھڑی نہ ہو جائے۔

مغلوں نے اندر جاتے ہی سامان الٹنا پلٹنا شروع کر دیا۔ چشتانیہ کا باپ گھبرایا ہوا حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس خیمے میں کوئی سامان نہ تھا۔ پانچ منٹ میں پورے خیمے کی تلاشی ہو گئی۔ مغلوں کے ہاتھ چشتانیہ نہ آ سکی۔

ایک مغل نے بڑھ کر چشتانیہ کے باپ کی داڑھی پکڑ لی۔ غصے سے بولا:

"بتا بڈھے! چشتانیہ کو کہاں چھپایا ہے ورنہ تیری داڑھی اکھاڑ پھینکوں گا۔"

چشتانیہ کا باپ داڑھی کھینچے جانے سے چیخنے لگا:

"مجھے چھوڑ دو۔ میں نے چشتانیہ کو نہیں چھپایا۔ وہ تو اس خیمے میں آئی ہی نہیں۔ اسے تو تم نے گھر میں تلاش کیا۔"

"تو مکار ہے۔ جھوٹا ہے۔" ایک مغل گرجا:

"چشتانیہ کی سہیلی نے بتایا ہے کہ وہ تیرے پاس آئی ہے۔ کہاں ہے وہ۔ نکال اسے جہاں چھپایا ہے۔"

"مجھے نہیں پتہ۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں بے گناہ ہوں۔"

چشتانیہ کا باپ درد کی شدت سے چلانے لگا۔ پھر وہ اک دم چپ ہو گیا اور اس کا سر ڈھلک کر داڑھی پکڑنے والے کے ہاتھوں سے ٹکرایا۔ اس نے گھبرا کر داڑھی چھوڑ دی۔ اس کے ساتھ ہی چشتانیہ کا باپ ایک جھٹکے سے زمین پہ گر پڑا۔

"کہیں مر تو نہیں گیا؟" ایک مغل بولا:

"اگر مر گیا تو حاکم کو کیا جواب دیں گے؟"

داڑھی پکڑنے والا مغل فوراً جھک کر اس کی سانس دیکھنے لگا۔ سانس آہستہ تھی مگر چل ضرور رہی تھی۔

"مرا نہیں۔ بے ہوش ہو گیا ہے۔"

مغل نے اطمینان کا سانس لیا۔

چشتانیہ اس خیمے میں بھی نہیں ملی تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ ابھی تک محافظوں اور پہرے داروں میں آن بن تھی۔ وہ ایک دوسرے سے بولتے نہیں تھے لیکن مصیبت آئی تو سب کے سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور صلاح مشورہ کرنے لگے۔ حاکم کر مبیا نے حکم دیا تھا کہ چشتانیہ کو جہاں اور جس طرح ہو سکے وہ پکڑ کے ان کے حوالے کرے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ خانہ بدوشوں کے پورے پڑاؤ کی تلاشی لی جائے۔ ممکن ہے کہ چشتانیہ کسی خیمے میں چھپی ہوئی مل جائے۔

پھر درجنوں شمعیں ایک ساتھ جل گئیں۔ خانہ بدوشوں میں شور پڑ گیا۔ یہ لوگ ایک ایک خیمے میں گھستے اور سامان کو الٹ پلٹ کر چشتانیہ کو ڈھونڈنے لگے۔ شاہی محافظ چشتانیہ کو نہ پہچانتے تھے۔ انہوں نے خانہ بدوشوں کی تمام لڑکیوں کو پکڑ کے ایک جگہ اکٹھا کر لیا۔ پھر پہرے داروں سے ایک ایک کی شناخت کرائی۔ کئی لڑکیوں پر شبہ کیا گیا۔ انہیں خوب مارا پیٹا گیا کہ وہ چشتانیہ ہونے کا اقبال کر لیں۔ وہ لاچار پٹتی رہیں اور دہائیاں دیتی رہیں۔ لڑکیوں کے ماں باپ خوشامدیں کرتے تھے مگر ان کی ایک نہ چلتی۔ گھنٹوں انہیں مارتے رہے۔

یہ ہنگامہ رات گئے شروع ہوا تھا اور اب دن ہو گیا تھا لیکن محافظ اور پہرے دار اب تک تلاشی لینے اور مار پیٹ کرنے میں مصروف تھے۔ ان کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ خالی ہاتھ کس منہ سے حاکم کے پاس جائیں۔ وہ اس لیے اور پریشان تھے کہ چشتانیہ کی سہیلی بھی کہیں غائب ہو گئی تھی۔ وہ مل جاتی تو شاید ان کی بچت ہو جاتی لیکن سہیلی تو اس طرح غائب ہوئی تھی جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

یاسو کو چشتانیہ کے پاس گئے بہت دیر ہو گئی تھی۔ جب وہ واپس پہنچی تو اس کی ماں نے اسے خوب ڈانٹا۔ یاسو نے جواب نہ دیا۔ بھائی کے ماتھے پہ ہاتھ رکھا تو وہ بخار سے تپ رہا تھا۔ یاسو وید کے پاس سے دوا لانے کے لیے جانے لگی تو ماں نے منع کیا:

"رات کا وقت ہے وید سو گیا ہوگا۔"

یاسو نہ مانی اور دوا لینے چلی گئی۔

وید واقعی سونے کی تیاری کر رہا تھا مگر یاسو کو دیکھ کر رک گیا اور جڑی بوٹیوں سے بنی ہوئی چند گولیاں اس کے حوالے کر دیں۔

یاسو خیمے میں واپس آئی بھائی کو پانی کے ساتھ دو گولیاں کھلائیں اور سرہانے بیٹھ کر اس کا سر دبانے لگی۔

گولیاں کھانے سے بھائی کا بخار کچھ کم ہو گیا۔ یاسو کی ماں ایک طرف کونے میں لیٹ گئی لیکن یاسو کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ طرح طرح کے خیالات اسے گھیرے ہوئے تھے۔ چشتانیہ کو روانہ کیے ہوئے اسے کئی گھنٹے ہو چکے تھے لیکن خطرہ ابھی ختم نہ ہوا تھا۔ بات کسی حد تک کھل چکی تھی اور چشتانیہ کی تلاش جاری تھی۔

وہ انہی خیالات میں کھوئی ہوئی تھی کہ باہر شور ہوا۔

اس نے خیمے سے جھانک کر دیکھا۔ لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ اس نے ایک آدمی سے اس افراتفری کی وجہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ کریمیا کے حاکم نے تمام خیموں کی تلاشی کا حکم دیا ہے اور اس کے سپاہی خیموں کا سامان الٹ پھینک رہے ہیں اور جوان لڑکیوں کو پکڑا جا رہا ہے۔

یاسو کو خطرہ محسوس ہوا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ پکڑی گئی تو خیر نہیں۔ وہ پلٹ کے خیمے میں آئی ایک چادر سر پر ڈال کے باہر نکلی۔ پڑاؤ سے کچھ ہی دور اونچی اونچی پہاڑیاں تھیں۔ یاسو نے ادھر ہی کا رخ کیا اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی پہاڑیوں تک پہنچ گئی۔ وہ ایک اونچی جگہ بیٹھ گئی۔ یہاں سے پڑاؤ صاف نظر آ رہا تھا۔ سینکڑوں مشعلیں جلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

یاسو تمام رات پہاڑی پر بیٹھی تماشہ دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ سویرا ہو گیا لیکن پڑاؤ میں جانے کی اس کی ہمت نہ ہوئی۔ دوپہر کے وقت اس نے دیکھا کہ کریمیا کے تمام سوار اس طرف جا رہے ہیں جدھر شہزادہ پارس اور اس کے ساتھی گئے تھے۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ حاکم کریمیا شہزادے کے تعاقب میں جا رہا ہے۔

یاسو کو قدرے اطمینان ہوا۔ کیونکہ شہزادہ پارس اس وقت تک اتنی دور نکل چکا ہوگا کہ یہ لوگ اسے نہیں پا سکیں گے۔

جب کریمیا کا لشکر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے پلٹ کر پڑاؤ کی طرف دیکھا۔ اسے اب بھی افراتفری نظر آئی۔ لوگ جلدی جلدی خیمے اکھاڑ رہے تھے اور سامان اونٹوں اور گاڑیوں پر لادا جا رہا تھا۔

یاسو پہاڑی سے اتر کر سیدھی اپنے خیمے پر پہنچی۔ اس کی ماں یا تو اسے گالیاں دے رہی تھی یا اب اسے دیکھ کر اس سے لپٹ گئی۔ اس کی ماں نے بتایا کہ اس نے صبح کو یاسو کو خیمے میں موجود نہ پایا تو یہ خیال کیا کہ وہ کسی مغل کے ساتھ بھاگ گئی ہے اس لیے وہ اسے گالیاں دے رہی تھی۔

یاسو کی ماں نے اسے یہ بھی بتایا کہ کریمیا کا حاکم شمال میں خاقان سے جنگ کرنے گیا ہے اور مغل یہاں سے کسی اور جگہ لے جا رہے ہیں تاکہ اس جنگ سے محفوظ رہیں۔

یاسو کا باپ مر چکا تھا اور اس کا چچا ان ماں بیٹے اور بیٹی کی پرورش کر رہا تھا۔ وہ اپنا سامان گاڑی پر بار کر کے جب فارغ ہوا تو بیوہ بھاوج کے پاس آیا۔ یاسو نے چچا کی مدد سے اپنا سامان باندھا اور گاڑی پر بار کر دیا۔

جب گاڑیاں تیار ہو گئیں تو سردار نے عورتوں کو گاڑیوں میں بیٹھنے کا حکم دیا۔ مرد کچھ پیدل کچھ گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور پھر خانہ بدوش اپنے روایتی سفر پر روانہ ہوئے۔ ان کا رخ شمال یا جنوب کی طرف ہونے کے بجائے مغرب کو تھا۔ ان کے سردار نے اعلان کر دیا تھا کہ مغلوں میں خانہ جنگی شروع ہونے والی ہے اس لیے عام راستوں سے ہٹ کر مغرب کی طرف سفر کیا جا رہا ہے تاکہ قافلہ جنگ کی ہلاکتوں سے محفوظ رہے۔

○

حاکم کریمیا تو قتمش کو چشتانیہ کی زیادہ فکر نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے چشتانیہ کے باپ کو مجبور کر کے چشتانیہ کو اپنے حق میں فیصلہ کرایا ہے اس لیے چشتانیہ کا ناراض ہو کر کہیں چھپ جانا ایک فطری ردعمل تھا۔ چونکہ اب شہزادہ پارس واپس جا چکا تھا اور چشتانیہ کا باپ بھی قید میں تھا اس لیے اس کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکا کہ اگر وہ اس وقت گرفتار نہ ہو سکی تو اسے دن میں بآسانی تلاش کر لیا جائے گا۔ اس نے یاسو کی گرفتاری کا حکم بھی دے دیا تھا۔

خیال یہی تھا کہ یاسو کو اگر چشتانیہ کے بارے میں کچھ بھی علم ہے تو وہ حاکم کریمیا کے سامنے جھوٹ نہ بول سکے گی اور اس کی مدد سے چشتانیہ کو پکڑا جا سکے گا۔

تو قتمش سونے کے لیے چلا گیا مگر طبیعت کچھ بے چین سی تھی اس لیے اسے دیر تک نیند نہ آ سکی۔ رات کے پچھلے پہر وہ سویا تو صبح کو دیر سے آنکھ کھلی۔ اس نے سب سے پہلے چشتانیہ کے بارے میں پوچھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ خانہ بدوشوں کے تمام خیموں میں اسے تلاش کر لیا گیا لیکن وہ کہیں نہ مل سکی۔ اس کے ساتھ ہی جب اسے یہ بھی بتایا گیا کہ چشتانیہ کی سہیلی یاسو بھی رات سے غائب ہے تو وہ غصے سے جل اٹھا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ چشتانیہ اور یاسو دونوں کسی سازش کے تحت پڑاؤ سے غائب ہوئی ہیں اور شہزادے نے اسے روانگی کا فریب دے کر چشتانیہ کو اڑا لیا ہے۔

زیادہ غور کرنے پر اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ شہزادے نے اپنے سواروں کو روانہ کر دیا ہوگا اور خود پڑاؤ کے پاس چھپ گیا ہوگا اور موقع پاتے ہی چشتانیہ اور اس کی سہیلی کو لے گیا ہوگا۔ اس نے اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا کہ چشتانیہ ابھی زیادہ دور نہ جا سکے گی اور اگر اس کا پیچھا کیا جائے تو اسے آسانی کے ساتھ پکڑا جا سکتا ہے۔

توقتمش غصے سے جلا بھنا خیمے سے باہر آیا اور اس نے فوراً روانگی کا حکم دیا۔ حکم دے کر وہ خود فوراً
پچاس سواروں کو ساتھ لے کر شمالی راستے پر چل پڑا اور حکم دیتا گیا کہ اس کا لشکر تیار ہو کر اس کے
توقتمش بڑی تیزی سے گھوڑا اڑاتا آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ شہزادے
اس کی روانگی کے دوران تقریباً دس گھنٹے کا فرق تھا اور دس گھنٹے میں شہزادہ کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہو

شہزادہ پارس اپنی محبوبہ چشتانیہ کو لے کر خود بھی اتنی ہی تیزی سے چلا تھا بلکہ تعاقب کے خطرے
اس کی رفتار کچھ زیادہ ہی تیز تھی۔ اس نے سامان کی گاڑیوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا اور برق رفتاری سے اپنے
کی طرف بڑھ رہا تھا۔

صبح ہوتے ہوتے شہزادہ دشمن کی سرحد سے نکل کر اپنے علاقے میں داخل ہو چکا تھا۔ یہاں اسے اپنے
بھی شمال سے آتے ہوئے ملے۔ ان سواروں کو اس کے باپ خاقان آرس خان نے یہ پیغام دے کر بھیجا تھا کہ
ہو کے استقبال کے لیے خود بھی ایک لشکر لے کر جنوب کی طرف روانہ ہونے والا ہے۔

اس اطلاع سے شہزادے کو بڑا اطمینان ہوا لیکن اس کی چھٹی حس ابھی تک خطرے کا اعلان کر رہی
اس نے پڑاؤ کرنے کے بجائے اپنا سفر اسی تیز رفتاری سے جاری رکھا اور دوپہر ڈھلنے تک مسلسل سفر
لیکن اب اس نے محسوس کیا کہ گھوڑے مسلسل سفر کرنے سے تھک چکے ہیں اور انہیں آرام کی ضرورت ہے۔
کا دل تو نہ چاہتا تھا لیکن اسے مجبور ہو کر پڑاؤ کا حکم دینا پڑا۔

سامان پیچھے رہ گیا تھا اس لیے انہیں درختوں کے سائے میں ٹھہرنا پڑا۔ گھوڑوں کو چرنے کے لیے
گیا۔ شہزادہ پارس اور چشتانیہ قریب بنے اس چشمے کے کنارے آ بیٹھے اور خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔
چشتانیہ دونوں بہت خوش تھے۔ دونوں کو اطمینان تھا کہ وہ خطرے سے دور نکل آئے ہیں اور اب ان کے در
کوئی حائل نہیں ہو سکتا۔

شہزادہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ چشتانیہ خوشی سے کھلی جا رہی تھی۔ اسے اپنا قبیلہ چھوڑنے کا کوئی غم
کیونکہ اب وہ خاقانِ شرق و غرب کی بہو، ولی عہدِ سلطنت کی بیوی بننے والی تھی۔ اسے اپنے باپ کا بھی خیال آیا
اس نے چشتانیہ کو توقتمش کے حوالے کرنے کا جو اعلان کیا تھا اس سے وہ بہت دلبرداشتہ تھی اور اسے اپنے

یا اور وعدہ خلافی پر بہت افسوس تھا۔
شام کے وقت سامان کی گاڑیاں پہنچ گئیں۔ خیمے نصب کر دیے گئے۔ سب سے پہلے شہزادے کا خیمہ لگایا
یہ دونوں خیمے میں آ گئے۔
پڑاؤ میں جلدی جلدی کھانا تیار کیا گیا۔ صبح سے کسی نے کچھ نہ کھایا تھا اس لیے سب نے خوب سیر ہو کر کھایا۔
شاہی کھانا کھانے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ اس کے لیے یہ کھانا نیا تھا۔ شہزادہ کھانے کے دوران ہر کھانے
بتاتا جاتا اور چشتانیہ مزے لے لے کر کھاتی رہی۔
کھانے سے فارغ ہو کر وہ پھر باتیں کرنے لگے۔ ادھر ادھر کی باتیں۔ ضروری اور غیر ضروری باتیں۔ بے سر و پیر کی
نے والی باتیں۔ دونوں کے چہرے مسرت سے چمک رہے تھے۔ چشتانیہ کی روشن آنکھوں اور فطری حیا پر
قربان ہوا جا رہا تھا۔
اسی وقت باہر سے کچھ کھٹ پٹ کی آواز آئی۔ شہزادے کے خیمے پر دو محافظ پہرہ دے رہے تھے۔ اس نے
آواز دے کر اندر بلایا۔
محافظ اندر آیا اور جھک کر آداب پیش کیا۔
"یہ شور کیسا ہے؟" شہزادے نے ناگوار لہجے میں پوچھا۔
"سامنے دوسرا خیمہ نصب کیا جا رہا ہے۔" محافظ نے ادب سے جواب دیا۔
"دوسرا خیمہ کس کے لیے؟" شہزادے نے حیرت سے دریافت کیا۔
"ہمارے خیمے کے پاس دوسرا خیمہ کیوں لگایا جا رہا ہے؟"
"وہ خیمہ آپ ہی کے لیے نصب ہو رہا ہے شہزادے بہادر۔"
"مگر ہم نے تو ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔"
"شہزادے بہادر۔ یہ حکم لشکر کے مولانا نے دیا ہے۔"
"مگر کیوں؟" شہزادہ جھلا کے کھڑا ہو گیا۔
"شہزادے بہادر۔ اس کا تو مجھے علم نہیں۔" محافظ ادب سے بولا۔
"مولانا نے حکم دیا ہے شہزادے کے لیے دوسرا خیمہ لگایا جائے اور ان سے درخواست کی جائے کہ دوسرے
تشریف لے جائیں۔"
"نہیں نہیں۔" شہزادہ ترشی سے بولا۔
"دوسرے خیمے کی ضرورت نہیں۔ جا کر کہہ دو کہ ہم اسی خیمے میں رہیں گے۔"

محافظ سر جھکا کر واپس ہونے لگا۔ دو قدم چلا تھا کہ چشتانیہ کی آواز آئی:

"ٹھہرو محافظ"

چشتانیہ بھی کھڑی ہو گئی:

"خیمہ لگنے دو اور مولانا کو اطلاع کر دو کہ شہزادے دوسرے خیمے میں ہی رات گزاریں گے۔ یہ بات تم اپنی طرف سے مولانا سے بڑے ادب سے کہنا"

محافظ قدم بڑھا کر باہر نکل گیا۔

"چشتانیہ" محافظ کے جانے کے بعد شہزادے نے کہا:

"یہ تم نے کیوں کہا۔ میں اسی خیمے میں رہوں گا۔ آخر اس میں حرج کیا ہے؟"

"اگر حرج نہ ہوتا تو مولانا کیوں حکم دیتے؟"

اور چشتانیہ نے شرما کر نظریں نیچی کر لیں۔

"ہاں ہاں"

شہزادہ بوکھلا گیا:

"لیکن حکم دینے سے پہلے انہیں مجھ سے پوچھنا چاہیے تھا"

"اللہ اور رسول کے حکم کے سامنے بادشاہوں کی مرضی بھی نہیں چلا کرتی" چشتانیہ سنجیدگی سے بولی:

"میں اور آپ اس وقت تک ایک دوسرے کے لیے غیر ہیں۔ ہمیں الگ الگ خیموں میں سونا چاہیے"

"لیکن ہم ایک ہی خیمے میں رہیں گے۔ اسی خیمے میں....." شہزادے نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

چشتانیہ نے گھبرا کر شہزادے کو دیکھا:

"شہزادے۔ آپ..... آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟"

پھر شہزادے کو غصے سے گھورتی ہوئی بولی:

"یہ ٹھیک ہے کہ میں اپنی مرضی سے آپ کے ساتھ آئی ہوں مجھے آپ سے بے انتہا محبت ہے لیکن میں مجبور نہیں"

یہ کہتے ہوئے چشتانیہ نے کپڑوں میں چھپا ہوا خنجر کھینچ کے نکالا اور اسے شمع کی روشنی میں چمکا کر شہزادے سے بولی:

"اگر آپ نے اس خیمے میں رہنے کی کوشش کی تو میں قسم کھاتی ہوں کہ اس خنجر کو خون سے آلودہ کر دوں گی۔ خواہ وہ خون میرے ہی دل کا کیوں نہ ہو"

شہزادہ ایک لمحہ حیرت بھری نظروں سے چشتانیہ کو دیکھنے کے بعد مسکرایا:

"شاباش چشتانیہ۔ مغل عورتوں کو اسی طرح اپنی حفاظت کرنی چاہیے۔ اطمینان رکھو۔ خدا اور رسولؐ کے حکم کی تعمیل پابندی کروں گا۔ مولانا کو بھی میں ناراض نہ ہونے دوں گا لیکن رات اس خیمے ہی میں بسر کروں گا۔ تنہا نہیں..... تم بھی میرے ساتھ یہیں رہو گی"۔

چشتانیہ کی تیوریاں چڑھ گئیں:

"شہزادے!" وہ تند لہجے میں چیخ کر بولی:

"آپ نے یہ غلطی کی تو یقین کیجیے کہ میں اس خنجر کو اپنے دل میں اتار دوں گی"۔

"اس کی ضرورت پیش نہ آئے گی چشتانیہ"۔

شہزادہ اب مسکرا رہا تھا اور چشتانیہ کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

شہزادے نے ایک بار پھر محافظ کو آواز دی۔ چشتانیہ نے فوراً خنجر چھپا لیا۔ شہزادے نے محافظ سے کہا:

"چشتانیہ کا حکم منسوخ کیا جاتا ہے۔ دوسرا خیمہ ہرگز نہ لگایا جائے"۔

یہ کہتے ہوئے اس نے چشتانیہ کو شرارت بھری نظروں سے دیکھا۔ چشتانیہ کی آنکھوں کی چنگاریاں، شعلوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔

شہزادے نے بڑی لاپروائی سے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور بولا:

"ایک حکم اور ہے"

محافظ واپس ہونے کے لیے مڑ چکا تھا۔ اس کے قدم رک گئے۔ وہ گھوم کر کھڑا ہو گیا:

"وہ حکم یہ ہے"

شہزادے نے کنکھیوں سے چشتانیہ کو دیکھا:

"حکم یہ ہے کہ مولانا سے درخواست کی جائے کہ وہ چند سرداروں کو اپنے ساتھ لے کر اس خیمے میں تشریف لائیں۔ ہمارا اور چشتانیہ کا نکاح اسی وقت ہو گا اور ہم دونوں اسی خیمے میں رات بسر کریں گے"۔

چشتانیہ اور محافظ کے منہ حیرت سے ایک ساتھ کھل گئے۔

محافظ چلا گیا تو شہزادے پدرس نے پلٹ کر چشتانیہ کو دیکھا۔ مسکرا کر بولا:

"کیوں چشتانیہ۔ اب تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں۔ خنجر کو کسی اہم وقت کے لیے سنبھال کر رکھو"

"شہزادے!"

چشتانیہ کی آواز شدتِ جذبات سے رندھ گئی۔ اس نے خنجر کپڑوں میں چھپا لیا۔

"شہزادے نہیں۔ اب میں تمہارا پارس ہوں"۔

شہزادے نے اسے چھیڑا:

"تمہارا حکم ہو تو اپنے لیے دوسرا خیمہ نصب کروا لوں؟"

چشتانیہ نے لاجواب ہو کر سر جھکا لیا۔

⊙

چنگیز خان کے خاندان کی وہ شاخ جو سب سے پہلے مسلمان ہوئی، وہ سنہری غول کہلاتی تھی۔ اس غول کا پہلا باد
یا خاقان جوجی تھا جو چنگیز خان کا بیٹا تھا لیکن چنگیز خان کے دوسرے بیٹے اسے اپنا بھائی تسلیم نہ کرتے تھے۔ چنگیز خان نے
فتحِ مشرق کے لیے جوجی خان کو اپنے عروج کے زمانہ میں مغربی ایشیا کا صحرائی علاقہ دے کر اپنی دوسری اولاد سے ہمیشہ کے لیے الگ
کر دیا تھا۔ جوجی کی اولاد نے اس ویران صحرا میں اپنی ایک الگ حکومت قائم کر لی جو شمال میں ٹنڈرا اور جنوب میں بحیرۂ کیسپ
اور بحیرۂ اسود کے شمال تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس طرح وسطی ایشیا کے مشرق و مغرب میں مغلوں کی دو زبردست حکومتیں قا
ہو گئی تھیں۔ دونوں کے الگ الگ بادشاہ (خاقان) ہوتے۔ مشرقی حکومت کا خاقان قراقرم میں رہتا تھا اور مغر
خاقان نے اپنا صدر مقام دریائے وانگا کے مشرقی کنارے پر بنایا تھا۔ چونکہ اسے جوجی کے بیٹے باتو خان نے آباد کیا تھا
اس لیے اس کا نام سرائے باتو مشہور ہو گیا۔

سرائے باتو کوئی شہر نہ تھا بلکہ ایک خیمہ بستی تھی جس کے گرد ایک کچا احاطہ بنا دیا گیا تھا۔ یہ لوگ مکان بنانے کا
قائل نہ تھے اور خانہ بدوش زندگی گزارتے تھے۔ خاقان باتو خان کے خیمے کے اوپر شناخت کے لیے سنہری پر لگائے گئے
تھے اسی لیے مغلوں کی یہ شاخ یا قبیلہ سنہری غول کہلاتا تھا۔ جب باتو خان کا چھوٹا بھائی برقائی خان اپنے ایک لاکھ کے لشکر کے
ساتھ مسلمان ہوا تو مغلوں میں بڑی تیزی سے اسلام پھیلا۔

اُرس خان اور توقتمش اسی سنہری غول سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا موجودہ خاقانِ اعظم ممائی چچا تھا جو سرائے باتو
میں رہتا تھا۔ ارس خان تمام شمالی علاقوں کا حاکم تھا اور اس نے بہت طاقت حاصل کر لی تھی۔ خاقان ممائی خان نے خوش
ہو کر ارس خان کو خاقانِ شرق و غرب کا خطاب دیا تھا۔ شہزادہ توقتمش، ممائی خان کا بہت قریبی عزیز تھا۔ اس کے پاس
کریمیا کی حکومت تھی مگر وہ ارس خان کے علاقے کا بھی دعوے دار تھا کیونکہ ارس خان کے علاقے میں توقتمش کے
قبیلے کی کثیر تعداد رہتی تھی۔ ارس خان اور توقتمش کی سرحدیں بھی ملی ہوئی تھیں اس لیے یہ جھگڑا اور بڑھ گیا تھا اور کم و

...دار جھڑپ بھی ہو جاتی تھی۔

توقتمش پچاس سواروں کے ساتھ بڑے جوش و خروش سے شہزادے پارس کے تعاقب میں بڑھ رہا تھا۔ دوپہر
...سے قبل ہی وہ کریمیا کی حد سے نکل کر ارس خان کے علاقے میں داخل ہو گیا تھا۔ اس کا نائب اس کے گھوڑے
...گھوڑا ملا کر چل رہا تھا۔ اس نے توقتمش کو بتایا کہ وہ دشمن کے علاقے میں آ گیا ہے اس لیے رفتار کم کر کے
...لشکر کے پہنچنے کا انتظار کرے لیکن توقتمش کو شہزادے پر سخت غصہ تھا اور جلد از جلد وہ اس کے پاس پہنچنا چاہتا
...لیے نہ اس نے گھوڑا روکا اور نہ رفتار کم کی۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ اندھیرا پھیلنے پر اسے مجبوراً رکنا پڑا۔ پھر بھی
...نے اس خیال سے کہ شہزادے پارس نے بھی رات ہو جانے کی وجہ سے ضرور کہیں قیام کیا ہو گا، اپنے دو سوار
...بھیج دیے تاکہ وہ یہ معلوم کریں کہ پارس خان اس سے کتنے فاصلے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔

اس تدبیر سے توقتمش کو یہ فائدہ ہوا کہ اس کے جاسوس سوار شہزادے کے پڑاؤ تک نصف شب کے
...تک پہنچ گئے۔ کیونکہ توقتمش کی تیز رفتاری کی وجہ سے دونوں پڑاؤ میں نصف منزل سے بھی کم فاصلہ رہ گیا تھا۔ اس
...کے سوار اچھی طرح دیکھ بھال کر کے اپنے پڑاؤ کی طرف واپس ہوئے اور صبح تک توقتمش کے پاس پہنچ گئے۔

توقتمش کا باقی لشکر بھی رات کو اس سے آ ملا تھا۔ خوش قسمتی سے توقتمش کے لشکر میں ایک ہزار سواروں کا اور
...اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب توقتمش دو ہزار سوار لے کر شہزادے پارس کو روکنے کے لیے کریمیا کی
...سے چلا تھا تو احتیاط کے طور پر یہ حکم دے گیا تھا کہ ایک ہزار سوار اس کی کمک کے لیے روانہ کر دیے جائیں۔
...اگر پارس سے جنگ ہو جائے تو وہ اسے آسانی سے شکست دے سکے۔ یہ ایک ہزار سوار کریمیا کی سرحد پر اس وقت
...پہنچے جب توقتمش کا لشکر روانہ ہونے والا تھا۔ پس یہ سوار بھی ساتھ ہو لیے۔ اس طرح توقتمش کے پاس پہنچنے
...کے لشکر کی تعداد تین ہزار ہو گئی۔

صبح کے وقت جب اس کے جاسوس سوار واپس آ کر اطلاع دی کہ شہزادہ پارس یہاں سے صرف نصف
...منزل کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ اس وقت ارس خان کی سرحد کے
...اندر تھا لیکن تین ہزار کے لشکر نے اسے تمام خطرات سے بے پروا کر دیا۔ اس نے فوراً روانگی کا حکم دے دیا۔ تجربہ کار
...نائب نے اسے روکنے کی کوشش کی اور اسے سمجھایا کہ دشمن کے علاقے میں اتنا گھس کر حملہ کرنا عقلمندی نہیں۔
...کا لشکر گھیرے میں بھی آ سکتا ہے اور اگر خدانخواستہ پسپائی اختیار کرنی پڑی تو کریمیا کی سرحد تک پہنچتے پہنچتے
...لشکر بکھر جائے گا مگر توقتمش نے کسی کی ایک نہ سنی اور لشکر لے کر روانہ ہو گیا۔

⊙

پشہزادے پارس کے پڑاؤ میں بالکل سکون تھا۔ لوگ رات کو اطمینان سے سوتے تھے اور صبح آرام سے اٹھتے تھے۔

شہزادے پارس نے رات کو چشمانیہ سے عقد کر لیا تھا۔ اسی خیمے میں نکاح ہوا تھا اور وہی خیمہ حجلۂ عروسی گیا تھا۔ شہزادے نے نکاح کے بعد ایک مختصر سی ضیافت بھی کر دی تھی۔ پھر لوگ اپنے اپنے خیموں میں جا کر سو گئے صبح کو شہزادے کو ایک نہایت پُر مسرت خبر سنائی گئی۔

وہ ابھی سو کے اٹھا تھا کہ ایک تیز رفتار قاصد شمال سے اس کے پڑاؤ پہ پہنچا اور فوراً شہزادے سے ملنے کی درخواست کی۔ شہزادے نے اس سے فوراً ملاقات کی۔ کیونکہ شمال سے خبر لانے والا صرف اس کے باپ ہو سکتا تھا۔

اس کا خیال صحیح نکلا۔ قاصد نے یہ مژدہ جانفزا سنایا کہ خاقانِ شرق و غرب ارس خان معہ ایک لشکر کے اپنی بہو یعنی چشمانیہ کے استقبال کو آرہا ہے اور وہ آج شام تک یہاں پہنچ جائے گا۔

اس خبر سے شہزادہ بے حد خوش ہوا۔ اس نے قاصد کو انعام دے کر رخصت کیا اور چشمانیہ کے پاس جا کر یہ خوشخبری سنائی۔ چشمانیہ کی خوشی کی بھی انتہا نہ رہی۔ اس کی اس سے بڑھ کر کیا خوش قسمتی ہو سکتی خاقانِ شرق و غرب اس کے استقبال کو آرہا تھا۔

پڑاؤ میں بھی اس خبر سے مسرت کی لہر دوڑ گئی اور سب لوگ اپنے خاقان کو خوش آمدید کہنے کی تیاری کرنے لگے۔

دوپہر کے وقت چشمانیہ اور پارس خیمے میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور ہنس ہنس کر باتیں ہو رہی باہر سے گھوڑا دوڑانے کی آواز آئی۔ پارس گھبرا گیا۔ وہ کھانا چھوڑ کر باہر نکلا۔ سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا ادھر تھا۔ وہ خیمے کے پاس آکر رکا۔ گھوڑے سے کودا اور پھولی ہوئی سانس کے دوران بولا:

"شہزادے بہادر۔ جنوب۔ . . . جنوب سے بہت سے سوار ادھر آرہے ہیں۔"

"سوار؟"

شہزادے کا ماتھا ٹھنکا اور چیخ کر بولا:

"سب کو تیار ہونے کا حکم دو۔"

اتنا کہہ کر شہزادہ تیزی سے اندر گیا اور جسم پر ہتھیار لگانے لگا:

"وہ لوگ آگئے چشمانیہ۔"

اس نے چشمانیہ کو خطرے سے آگاہ کیا:

میں جا رہا ہوں۔ تم بھی تیار ہو کر آجاؤ۔"

شہزادہ یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

چشمانیہ سمجھ گئی کہ جس مصیبت سے نکل کر وہ بھاگی تھی وہ مصیبت پھر نازل ہو گئی۔ اس نے شہزادے سے صبح کہا تھا ہمیں فوراً خاقان کی طرف کوچ کرنا چاہیے لیکن شہزادے نے اسی جگہ ٹھہر کر خاقان کو خوش آمدید کہنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"کاش۔ ہم صبح کو آگے بڑھ گئے ہوتے۔" اس نے سوچا اور جلدی جلدی تیار ہونے لگی۔

اس نے سر کے بالوں کو ایک رومال سے کس کر باندھ لیا۔ ایک سینہ بند خیمے میں پڑا تھا اسے بھی پہن لیا۔ خنجر تو کمر میں ہر وقت رہا کرتا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ میں تلوار پکڑی اور دوسرے میں نیزہ سنبھالتی ہوئی باہر نکلی۔ باہر گھوڑا کھڑا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوئی۔ تلوار کمر میں لگائی اور نیزہ تانے آگے بڑھی۔

حاکمِ کریمیا توقتمش اپنے تین ہزار سواروں کے ساتھ آ پہنچا تھا۔ وہ لشکر کے آگے آگے تھا۔ شہزادے نے پھرتی سے اپنے پانچ سو سواروں کی صفیں ترتیب دے لی تھیں۔ توقتمش اور اس کے لشکر نے دور ہی سے تیر چلانا شروع کر دیے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔ شہزادے نے بھی تیروں کا جواب تیروں سے دیا مگر آگے بڑھنے سے گریز کیا۔

توقتمش کا لشکر بڑھتا ہوا پڑاؤ میں داخل ہو گیا۔ تیر کمان بیکار ہو گئے۔ نیزے اور تلواریں نکل آئیں۔ تلوار تلوار سے ٹکرائی اور نیزہ، نیزے سے بھڑ گیا۔ دست بدست لڑائی شروع ہو گئی۔ ہر طرف نفسا نفسی کا عالم تھا۔ نعرے بلند ہو رہے تھے اور شور و غل سے کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ چشمانیہ بڑی ہوش مندی سے شہزادے پارس کے برابر دشمن مقابلے میں مصروف تھی۔

ایک طرف تین ہزار کا لشکر اور دوسری طرف صرف پانچ سو سوار۔ ایک اور چھ کا مقابلہ تھا لیکن شہزادے کے سوار پہاڑ کی طرح اپنی اپنی جگہ پر کھڑے تھے۔ شہزادے پارس کو انہوں نے اپنے حلقے میں لے لیا تھا۔ چشمانیہ اب شہزادے کی پشت کی طرف آگئی تھی تاکہ پشت پہ ہونے والے حملے کو روکے۔

جب لڑائی طول کھینچنے لگی اور توقتمش نے دیکھا کہ پارس کے سواروں کے قدم نہیں اکھڑے تو اس نے دو ہزار سواروں کو ادھر چھوڑا اور ایک ہزار سواروں کے ساتھ پیچھے ہٹا۔ پیچھے آکر اس نے ایک لمبا چکر کاٹا اور پھر شہزادے پارس کی پچھلی سمت نمودار ہوا۔ ادھر چشمانیہ موجود تھی۔ اس نے جو توقتمش کو لشکر سمیت پیچھے سے آتے دیکھا تو چاہا کہ شہزادے کو اس خطرے سے آگاہ کرے لیکن شہزادہ سامنے کی طرف الجھا ہوا تھا۔ اسے پلٹ کر دیکھنے کی فرصت نہ تھی۔

چشمانیہ گھوڑا بڑھا کر شہزادے کے نائب کے پاس پہنچی۔ وہ کچھ دور ایک سو سواروں کا جتھا لیے تم کو روکے کھڑا تھا۔

چشمانیہ نے اسے بتایا کہ پشت کی طرف سے حملہ ہو رہا ہے اس کا انتظام کرو۔ نائب اپنے سواروں کو لے کر پلٹا۔ اور آگے بڑھ کر حملے کو روکنے کی کوشش کی لیکن اس کے سوار کچھ نہ کر سکے اور پسپا ہو کر شہزادے کے قریب پہنچ گئے۔ اب شہزادہ تقریباً چاروں طرف سے گھر چکا تھا۔ شہزادے کے نائب نے اسے میدان سے نکل جانے کا مشورہ دیا۔ پتہ نہیں شہزادے نے میدان چھوڑنے سے انکار کر دیا، یا اسے اتنا موقع ہی نہ مل سکا اور وہ دشمنوں میں گھرتا چلا گیا۔ توقتمش بار بار شہزادے پر یلغار کر رہا تھا مگر شہزادے کے جاں نثار اسے بھگا رہے تھے۔

چشمانیہ اپنی اور شہزادے دونوں کی حفاظت کر رہی تھی پھر کسی طرف سے ایک نیزہ آیا اور وہ چشمانیہ کے گھوڑے کی ران میں آویزاں ہو گیا۔ گھوڑا بڑے وحشیانہ انداز میں اچھلا۔ چشمانیہ اچھی شہسوار نہ ہوتی تو گر جاتی۔ وہ مضبوطی سے گھوڑے پر بیٹھی رہی۔ گھوڑا ایک دو بار اچھلنے کے بعد تیزی سے ایک طرف بھاگا اور دشمنوں کو توڑتا ہوا بجلی کی طرح نکل گیا۔ وہ بے تحاشہ بھاگ رہا تھا۔ نیزہ اب تک اس کی ران میں اٹکا ہوا تھا۔ چشمانیہ نے راسیں ڈھیلی کر دی تھیں کیونکہ اس وقت گھوڑے کو روکنا اسے اور غصہ دلانا تھا اور وہ غصے میں آ کر چشمانیہ کو گرا سکتا تھا۔

زخمی گھوڑا چشمانیہ کو لیے ہوئے پڑاؤ کے قریب جو اب میدانِ جنگ بنا ہوا تھا، ایک پہاڑی پر چڑھ گیا۔ اس کی رفتار اب سست ہو گئی تھی۔ شاید وہ تھک گیا تھا یا پھر نیزے کی تکلیف نے اسے مجبور کر دیا تھا۔ ایک جگہ رک گیا۔ چشمانیہ گھوڑے سے کود کر الگ کھڑی ہو گئی۔

اس پہاڑی کے نیچے جنگ ہو رہی تھی اور میدانِ جنگ بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ چشمانیہ نے ایک ابھری ہوئی چٹان پر کھڑے ہو کر میدان پر نظر ڈالی۔ اس طرف دیکھتے ہی چشمانیہ کا سر چکرانے لگا۔ آنکھیں بند ہونے لگیں اگر وہ چٹان کو پکڑ نہ لیتی تو نیچے گر کر ختم ہو جاتی۔

چشمانیہ نے چند لمحوں بعد آنکھیں کھولیں۔ خود کو سنبھالا اور پھر جھک کر نیچے نظر دوڑائی۔ اس کا خون رگوں میں جمنے لگا۔

دشمن کا ایک سوار اس کے محبوب شوہر شہزادے پارس کا سر نیزے پر اٹھائے ایک دائرے میں چکر لگا رہا تھا۔ دشمن کے تمام سوار اس کے گرد اکٹھا تھے اور فتح کے نعرے لگا رہے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ وہیں سے کود کر جان دے دے لیکن اس نے بڑے ضبط سے کام لیا۔ اس کے جان دینے سے شہزادہ زندہ تو نہ ہو سکتا تھا پھر اس طرح جان دینا سراسر خودکشی تھی اور مغل خودکشی سے سخت نفرت کرتے تھے۔ اس نے ارادہ کیا کہ تلوار کھینچ کر دشمن پر جا پڑے مگر یہ بھی ایک طرح کی خودکشی تھی۔

چشمانیہ کی آنکھیں خشک تھیں اور طرح طرح کے خیالات نے اسے گھیر رکھا تھا۔ وہ اپنے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر پا رہی تھی۔ اسی وقت جیسے کسی نے سرگوشی کی:

"انتقام۔۔۔۔ انتقام۔۔۔۔ جان دینے سے کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ اپنے محبوب کی روح کو سکون پہنچانا ہے تو زندہ رہ اور خود کو توقتمش سے انتقام لینے کے لیے تیار کر۔۔۔۔"

چشمانیہ کے دل کو سکون سا آ گیا۔ اس کے دل میں زندہ رہنے کی خواہش پیدا ہو گئی:

"میں زندہ رہوں گی۔۔۔۔ شہزادے پارس کی روح کو سکون پہنچانے کے لیے۔۔۔۔ توقتمش سے انتقام لینے کے لیے۔۔۔۔"

نیچے فتح کے نعروں سے پورا میدان گونج رہا تھا۔ چشمانیہ کی نظریں میدان کی طرف تھیں لیکن وہ کچھ نہ دیکھ رہی تھی اور نہ کوئی آواز اس کے کان تک پہنچ رہی تھی۔ وہ گم صم کھڑی تھی۔ وہ اپنے بارے میں ایک فیصلہ کر رہی تھی۔ زندگی گزارنے کا طریقہ سوچ رہی تھی۔ انتقام کی تدبیروں پر غور کر رہی تھی۔

پھر فتح کے اس شور میں ایک نیا شور بلند ہوا۔

چشمانیہ نے چونک کے دیکھا۔ شمال کی طرف سے ہزاروں سوار گھوڑے دوڑاتے اور نعرے لگاتے بھاگے چلے آ رہے تھے۔ آگے آگے نیلے اور سفید پرچم بردار تھے۔

"نیلے اور سفید پرچم۔ کہیں یہ نیلے اور سفید غول کا خاقان تو نہیں؟" چشمانیہ نے خود سے سوال کیا۔

اسی وقت اسے ایک سوار نظر آیا۔ اس کے سر پر نیلے اور سفید نمدے کا بنا ہوا ٹوپی نما ایک تاج تھا جس میں موتیوں اور جواہرات کی لڑیاں لٹکی ہوئی تھیں۔

چشمانیہ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا۔

جس وقت توقتمش نے شہزادے پر حملہ کیا تو شہزادے کا ایک سوار فوراً لڑتا ہوا شمال کی طرف چل دیا۔ یہ وہی سوار تھا جس نے شہزادے کو خاقان کے آنے کی اطلاع دی تھی۔

خاقان ارس خان کو بیٹے اور بہو سے ملنے کا اس قدر اشتیاق تھا کہ وہ بغیر منزل کیے بڑھتا آ رہا تھا اور آج شام تک شہزادے کے پڑاؤ تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ پھر جب میدانِ جنگ سے گئے ہوئے سوار نے اس کے پاس پہنچ کر بتایا کہ زیبا کے حاکم نے شہزادے کے پڑاؤ پر حملہ کر دیا ہے تو اس نے اور اس کے لشکر نے راستے کی منزلیں اور گھوڑوں کو اڑاتے ہوئے شام سے پہلے ہی شہزادے کے پڑاؤ پر پہنچ گئے مگر شہزادہ پارس جاں نثار خاقان کے آنے میں صرف چند ساعتوں کی دیر ہوئی تھی۔

خاقانِ مشرق و مغرب نے شہزادے کا سر نیزے پر چڑھا دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ توقتمش کے
سوائے مقابلے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اب مقابلہ برابر کا تھا۔ دونوں کے پاس تقریباً برابر برابر لشکر تھا۔ توقتمش نے
بھی صفیں درست کرنا شروع کر دیں لیکن ارس خان نے آتے ہی حملہ کر دیا۔ چشمانیہ اوپر سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔
اس کا بیٹھتا دل ٹھہر گیا۔

ارس خان نے پہلے ہی حملے میں توقتمش کے لشکر کو پیچھے دھکیل دیا۔ توقتمش نے لشکر کے قدم جمانے کی
بہت کوشش کی مگر ارس خان کی یلغار ایسی تھی کہ توقتمش کا لشکر پیچھے، اور پیچھے ہی ہٹتا رہا۔ ارس خان سر کا بدلہ
سے لینا چاہتا تھا اور بڑھ بڑھ کر حملہ کر رہا تھا۔

توقتمش مدافعتی جنگ پر مجبور ہو گیا۔ وہ برابر پسپا ہو رہا تھا۔ دونوں لشکر لڑتے ہوئے اس پڑاؤ سے جنوب
سمت دور نکل گئے۔ اور چشمانیہ کی نظروں سے بھی اوجھل ہو گئے۔

چشمانیہ کا دل بے چین ہو گیا۔ وہ تیزی سے پہاڑی کے نیچے آئی اور میدان میں اس جگہ آئی جہاں توقتمش
سوار شہزادے کا سر نیزے پر چڑھائے کھڑا تھا۔ ارس خان اور توقتمش کی جنگ کے دوران شہزادے کا سر زمین
گر گیا تھا۔ ابھی میدان میں روشنی تھی۔ چشمانیہ کو اپنے پیارے کا سر تلاش کرنے پر مل گیا۔ اس نے سر کو آنکھوں سے
لگایا۔ بار بار چوما۔ آہیں بھریں۔ آنسو بہائے۔ شہزادے کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ان میں انتظار جھلک رہا تھا۔

چشمانیہ نے پارس کا دھڑ بھی ڈھونڈ لیا۔ چشمانیہ اس دھڑ کو پشت پر لاد کر جھاڑیوں کے پاس لے گئی۔
اس نے سر کو دھڑ سے ملا کر رکھ دیا پھر چاروں طرف پتھر رکھے اور اوپر جھاڑیاں ڈال دیں۔

یہ تھی ایک شہزادے کی قبر۔

جس کا باپ مشرق و مغرب کا خاقان تھا۔ پتھروں اور جھاڑیوں کی قبر۔ نہ پھول نہ خوشبو۔ مغلوں کے
بہادر شہزادے کو کفن بھی نصیب نہ ہوا۔ سوائے چشمانیہ کے کوئی اور آنسو بہانے والا بھی نہ تھا۔

چشمانیہ نے شہزادے کی قبر کے سرہانے بیٹھ کر قسم کھائی:

"شہزادے۔ میرے محبوب! تیرا باپ انتقام لینے آ گیا ہے۔ وہ توقتمش سے جنگ کر رہا ہے۔ اگر وہ توقتمش
کا سر لے کر واپس آیا تو میں خودکشی کا گناہ کر کے تیرے برابر لیٹ جاؤں گی اور اگر وہ خالی ہاتھ پلٹا تو میں زندہ رہوں
گی اور اس وقت تک زندہ رہوں گی جب تک خود اسے اپنے ہاتھ سے قتل نہیں کر دیتی۔"

ارس خان کا لشکر واپس آنا شروع ہوا۔ توقتمش شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اسے پکڑنے کی بہت کوشش
کی لیکن وہ ہاتھ نہ آیا۔

خاقان ارس خان واپس آیا۔ اس کا سر غم سے جھکا جا رہا تھا۔ پورا لشکر اداس اور خاموش خاموش تھا۔ چشمانیہ قبر
کے گرد ایک جھاڑی میں چھپ گئی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ارس خان صرف شکست دے سکا، وہ توقتمش
کو موت کے گھاٹ نہیں اتار سکا۔

میدان میں پہنچتے ہی ارس خان نے شہزادے کے سر اور دھڑ کی تلاش شروع کرائی۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں
پڑی تھیں مگر شہزادے کا سر اور دھڑ میدان میں کہیں نہ ملا۔ پھر اچانک ایک سپاہی کی نظر پتھر اور جھاڑیوں کے
ڈھیر پر پڑی۔ اس نے جھاڑیاں ہٹائیں تو وہیں سے چیخ ماری۔ ارس خان اور دوسرے سردار بھاگ کے پہنچے۔ انہوں نے
شہزادے کے دھڑ کے ساتھ سر ملا رکھا دیکھا تو بہت متعجب ہوئے۔ . . . . ارس خان غم سے نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ زمین
پر بیٹھ گیا اور جھک کر بیٹے کی پیشانی کو چوما۔

"ہم شہزادے کی لاش اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گے۔" خاقان نے غمگین آواز میں کہا۔

اس کے سرداروں کی سمجھ میں نہ آیا کہ خاقان نے اپنا ارادہ کیوں بدل دیا۔ کیونکہ طے یہ ہوا تھا کہ اگر شہزادے کی
لاش دستیاب ہو گئی تو ساتھ لے جا کر شمال کے خاندانی قبرستان میں دفن کریں گے۔

خاقان زمین سے اٹھا اور کہا:

"شہزادہ معصوم اور بے گناہ تھا۔ اس کی قبر فرشتوں نے بنائی ہے۔ ہم اسے اس قبر سے کیسے نکال سکتے ہیں۔"

پھر وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور لشکر کو لے کر شمال کی طرف چلا۔ گھوڑے کو ایڑ دینے سے پہلے اس نے قبر کی
طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"اے خاقانِ مشرق و مغرب کے بہادر بیٹے! توقتمش اس وقت بچ کر نکل گیا ہے لیکن ہم کریمیا پہ پوری قوت سے
حملہ کریں گے اور تیرا قاتل دنیا کے جس گوشے میں بھی جائے گا ہم اس کا پیچھا کریں گے۔"

خاقان ارس خان چلا گیا۔ میدانِ جنگ پر خاموشی طاری تھی۔

چشمانیہ جھاڑیوں سے نکل کر قبر کے پاس آ گئی۔ توقتمش کے مارے نہ جانے سے وہ کچھ مضمحل ہو گئی تھی لیکن جب
وہ شہزادے کی قبر پر پہنچی تو اس کی آنکھیں ایک نئے عزم سے چمک اٹھیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اب نہ تو باپ کے
پاس واپس جائے گی اور نہ خاقانِ مشرق و مغرب کا سہارا ڈھونڈے گی بلکہ کریمیا جا کر توقتمش سے بدلہ لے گی۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ میدان میں سواروں کے مارے جانے کے بعد کتنے ہی گھوڑے آزاد پھر رہے
تھے۔ چشمانیہ نے ایک گھوڑے کو پکڑا۔ شہزادے پارس کی قبر کو آخری بار دیکھا اور گھوڑے پر سوار ہو کر کریمیا کی

طرف چل پڑی۔

چغتانیہ کو ڈر تھا کہ کہیں وہ راستے میں توقتمش کے آدمیوں کے ہاتھ نہ پڑ جائے۔ اس لیے اس نے گزر جانے والی شاہراہ سے ہٹ کر سفر اختیار کیا۔ وہ رات بھر اپنے خیال میں سڑک کے ساتھ ساتھ چلتی رہی تھی لیکن جب سویرا ہوا تو سڑک کہیں نظر نہ آئی۔ وہ وسط ایشیا کے ویرانوں میں راہ بھول چکی تھی۔ قدم قدم پر بھٹکنے کا خطرہ تھا۔ اسے اپنی جان کی قطعی پروا نہ تھی لیکن وہ زندہ رہنا چاہتی تھی تاکہ شہزادے پارس کے خون کا بدلہ لے سکے۔ اس لیے وہ احتیاط سے سفر کر رہی تھی۔

اس احتیاط کے تحت وہ عام طور پر دن کے وقت کسی محفوظ جگہ چھپ جاتی اور رات ہوتے ہی چل پڑتی۔ کھانے پینے کی بھی اسے کچھ زیادہ پروا نہ تھی۔ میدان سے چلتے وقت اس نے خشک پھل وغیرہ خورجی میں بھر لیے تھے۔ راستے میں جہاں کہیں تازہ پھل مل جاتے ان سے ہی گزارہ کر لیتی۔

چغتانیہ کو اس احتیاط سے راتوں کو سفر کرتے ہوئے ایک ہفتے سے بھی زیادہ ہو گیا لیکن وہ نہ تو کریمیا پہنچی اور نہ اسے راستے میں کوئی قبیلہ ہی ملا۔ وہ اپنے خیال میں تو ہر رات جنوب کی طرف روانہ ہوتی لیکن قسمت نہ جانے اسے کہاں لیے جا رہی تھی۔ پھر اس نے یہ سوچنا ہی چھوڑ دیا کہ وہ کدھر جا رہی ہے۔ وہ گھوڑے کو آزاد کر دیتی اور گھوڑے کا رخ جدھر ہو جاتا وہ ادھر ہی چل پڑتی۔

○

پندرہ راتوں کے سفر کے بعد ایک صبح وہ ایسی جگہ پہنچی جہاں کچے پکے مکانات کی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ چغتانیہ کے لیے مٹی اور پتھر کے یہ مکانات تعجب خیز تھے۔ اس نے قصے کہانیوں میں سن رکھا تھا کہ دنیا کے بعض حصوں میں لوگ پتھر کے مکانات بنا کے رہتے ہیں اور ایک ہی جگہ رہتے رہتے عمر گزار دیتے ہیں۔ قصے کہانیوں کی یہ باتیں آج ایک حقیقت بن کر اس کے سامنے آ گئی تھیں۔

چغتانیہ بے دھڑک بستی میں پہنچ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ بستی کے مکانات مختلف ہیں تو لوگ بھی مختلف شکل کے ہوں گے لیکن ان کی صورتیں بھی اس کے قبیلے والوں جیسی تھیں۔ ان کی بولی بھی چغتانیہ کی بولی سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔

چغتانیہ نے عورتوں سے اس بستی کے بارے میں پوچھا۔ عورتیں اسے اپنے ایک بزرگ کے پاس لے گئیں۔ بزرگ کو جب معلوم ہوا کہ وہ راستہ بھٹک کر یہاں آ گئی ہے تو اس نے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا۔

چغتانیہ نے کریمیا کے بارے میں دریافت کیا تو بزرگ نے بتایا کہ کریمیا کا علاقہ یہاں سے شمال مغرب میں ہے۔ وہ راستہ بھول کر اورگنج کے قریب آ گئی ہے جو خوارزم کا صدر مقام ہے اور امیر تیمور کی عملداری میں شامل ہے۔

امیر تیمور کے نام پر چغتانیہ چونک پڑی۔ تیمور کی بہادری اور فتوحات کی کہانیاں شمالی ویرانوں تک پہنچ چکی تھیں۔

پھر چغتانیہ نے فوراً ہی ایک عجیب فیصلہ کیا۔ اس نے بزرگ سے کہا کہ وہ دراصل مغلوں کے خاقان شرق و غرب کی بہن اور شہزادہ پارس کی بیوہ ہے اور شکار کھیلتے ہوئے ادھر آ گئی ہے۔

بستی والے اس انکشاف پر پریشان ہو گئے۔ وہ ہاتھوں ہاتھ چغتانیہ کو اپنے سردار کے پاس لے گئے۔ چغتانیہ نے اس سے کہا کہ وہ امیر تیمور سے ملاقات کرنا چاہتی ہے۔

سردار نے اسے اورگنج پہنچوایا اور حاکم اورگنج نے بڑی عزت و احترام سے اسے سمرقند بھیجنے کا انتظام کیا۔ دو دن بعد چغتانیہ سمرقند پہنچ گئی۔

○

اصفہان کا قتل عام

"اے ملکِ تاتار کے سب سے بڑے بادشاہ! میں خاقان ارس خان کی بہو ہوں۔"

چشمانیہ اپنی درد بھری کہانی امیر تیمور کو سنا رہی تھی۔ تیمور کے برابر بڑی بیگم سرائے خانم بیٹھی تھی۔ سرائے
کو جب معلوم ہوا کہ چشمانیہ کا شوہر پادس خان جنگ میں مارا گیا ہے اور یہ بھٹکتی ہوئی ملکِ تاتار آ گئی ہے تو وہ
پر بہت مہربان ہو گئی اور اسے اپنے محل میں کسی شاہی مہمان کی طرح رکھا۔

چشمانیہ سے ایک ہفتے تک تیمور یا سرائے خانم نے سوائے رسمی گفتگو کے اور کوئی بات نہیں کی۔ وہ اسے
سے زیادہ سکون دینا چاہتے تھے تاکہ اس کا غم کچھ ہلکا ہو جائے۔

"اے مہربان بادشاہ!"

چشمانیہ نے پھر سے کہنا شروع کیا:

"میرے ملک میں آپ کا نام کوئی نہیں جانتا۔ وہاں تو لوگ آپ کو لنگڑے بادشاہ کے نام سے جانتے ہیں۔"

چشمانیہ ایک دم رک گئی۔ اسے احساس ہوا کہ تیمور کو لنگڑا کہہ کر اس نے اس کی توہین کی ہے۔ تیمور اور سرائے
دونوں کے چہروں پر اس لفظ سے بے چینی اور ناگواری کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ چشمانیہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر
سنبھل کر بولی:

"اے بادشاہ! میرے ملک والے آپ کو حقارت سے نہیں بلکہ انتہائی عزت سے یاد کرتے ہیں۔ ہم لوگ جب رات کو
آگ پیدا کر کے الاؤ سلگاتے ہیں تو بڑے بوڑھے آپ کے کارنامے قصے کہانیوں کی طرح بیان کرتے ہیں۔ جب میں چھوٹی
سی تھی اور آپ کی جنگوں کا حال سنتی تھی تو میرے دل میں خواہش پیدا ہوتی تھی کہ اس بہادر بادشاہ کو دیکھوں جس

نے شکست دے کر انہیں ریت کے تودوں اور ریگولوں کی سرزمین تک بھگا دیا۔"

چشمانیہ جاہلِ مطلق تھی لیکن اس نے تاتاریوں کی کچھ اس انداز سے تعریف کی کہ سرائے خانم اور تیمور کی بے حد خوش ہوئی۔

تیمور نے دلچسپی سے پوچھا:

"تمہارا خاقان ہمارے بارے میں کیا خیالات رکھتا ہے؟"

"اے بادشاہ! ہم مغلوں کے دو گروہ ہیں اور ان کے دو خاقان ہیں۔"

چشمانیہ نے تفصیل سے بتانا شروع کیا:

"ہمارے سب سے بڑے خاقان کا نام مانی خان ہے جو جنوب میں کسی دریا کے کنارے ایک بہت بڑے قلعے میں رہتا ہے۔ اس کا گروہ سنہری غول کہلاتا ہے اور وہ تمام مغلوں کا حاکم ہے۔ اس نے اپنی طرف سے شمالی علاقوں میں ایک خاقان مقرر کیا ہے جو خاقانِ شرق و غرب کہلاتا ہے۔ اس کا نام ارس خان ہے۔ میں اسی کی بہو ہوں۔ میں ایک معمولی خانہ بدوش قبیلے کی عورت ہوں اس لیے یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ دونوں خاقان آپ کو کس طرح اور کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ جب مغلوں کا کوئی بڑا سردار ہمارے قبیلے کا مہمان ہوتا ہے، رات کو الاؤ کے گرد بیٹھ کر ہمارے بزرگ اس سے ملکِ تاتار اور وہاں کے بادشاہ کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو وہ بڑی حقارت سے زمین پر تھوک کر کہتا ہے کہ 'ہم بادشاہ یا اور تاتاری ہماری رعایا ہے۔ ان کا ایک سردار ہے جس کا نام تیمور ہے اور وہ ..... وہ ماوراء النہر کا ایک معمولی سوار ہے۔'

..... لیکن ہمارے بزرگ اس کی باتوں کا اعتبار نہیں کرتے اور سر جھکا لیتے ہیں کیونکہ وہ سوداگر جو آپ کے ملک سے گزر کر ہمارے ملک میں پہنچتے ہیں، وہ آپ اور مغلوں کی جنگوں کا حال بڑی تفصیل سے سناتے ہیں تو حقائق کا پتہ چل جاتا ہے۔"

تیمور سمجھ گیا کہ چشمانیہ سچ کہہ رہی ہے۔ کیونکہ وہ جس صاف گوئی سے باتیں کر رہی ہے اس پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ تیمور خوش ہوتے ہوئے بولا:

"اس کا مطلب ہے عام مغل ہمارے خلاف نہیں ہیں؟"

"انہیں تو آپ سے اور آپ کے کارناموں سے محبت ہے۔" چشمانیہ نے فوراً ادب سے جواب دیا:

"اور میں کہہ رہی تھی کہ میرے قبیلے میں لڑکیوں کی خرید و فروخت کا عام رواج ہے۔ پکڑے ہوئے غلام بازاروں میں بکتے ہیں اور لڑکیوں کی فروخت گھر پر ہوتی ہے۔ باپ لڑکی کے جوان ہوتے ہی اعلان کرتا ہے اور سب سے زیادہ قیمت دینے والے کے حوالے کر دیتا ہے۔

میں اپنے علاقے کی سب سے مشہور اور باکمال رقاصہ تھی اس لیے میرے باپ نے خود میری قیمت مقرر کی۔

اس قیمت پر خاقانِ شرق و غرب کے بیٹے پارس خان نے مجھے خرید لیا۔ ابھی ہمارا نکاح اور رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ کربیا کا حاکم شہزادہ توقتمش بیچ میں آ کودا اور میرے باپ کو لالچ اور رعب دے کر مجھے دگنی قیمت پر خریدنے کا اعلان کر دیا۔ چونکہ میں نے شہزادے پارس کو دیکھ لیا تھا اور اسے پسند بھی کر لیا تھا اس لیے میں نے شہزادے پارس سے رابطہ قائم کیا اور اس کے پاس پہنچ کر اس سے نکاح کر لیا۔

حاکمِ کربیا کو یہ بات ناگوار گزری۔ اس نے اپنے لشکر کے ساتھ شہزادے پارس پر حملہ کر دیا اور اس جنگ میں میرا شوہر شہزادہ پارس . . . . . " چشتانیہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"صبر کرو چشتانیہ۔" سرائے خانم نے تسلی دی:

"جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب یہ بتاؤ کہ ہم سے کیا چاہتی ہو؟ ہمارے ساتھ رہنا چاہو تو تمہیں ہر طرح کا آرام پہنچائیں گے۔ خدا نے تمہیں اچھی صورت دی ہے۔ پھر تم ایک ماہر رقاصہ ہو جسے ہر مرد پسند کرے گا۔ اگر تم شادی کی خواہش مند ہو تو تم جس تاتاری سردار کو پسند کر دو اس سے تمہارا رشتہ کیا جا سکتا ہے۔"

"مہربان ملکہ . . . . . " چشتانیہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی:

"اس وقت تو مجھے سوائے اس کے اور کوئی خواہش نہیں کہ کربیا کے حاکم توقتمش سے انتقام لوں۔ میں عرض کر رہی تھی کہ ایک رات کی بات ہی تھی کہ اس ظالم نے تین ہزار سواروں کے ساتھ میرے شوہر پر حملہ کر دیا۔ ہمارے پاس صرف پانچ سو سوار تھے۔ وہ سب شہزادے پارس پر نثار ہو گئے اور شہزادے نے اپنی آن اور اپنے باپ کی شان کی خاطر گرفتار ہونے کے بجائے موت کو ہنسی خوشی گلے لگا لیا۔"

"دیکھو لڑکی . . . . " تیمور نے محبت سے سمجھایا:

"کیا شہزادے کے باپ ارس خان کو جسے تم خاقانِ شرق و غرب کہتی ہو اپنے بیٹے کی موت کی خبر نہیں پہنچی ہو گی۔ کیا توقتمش سے انتقام لینے کے لیے وہ تم سے زیادہ بے چین نہیں ہو گا؟"

"اے مہربان بادشاہ!" چشتانیہ نے سنبھل کر کہا:

"اس غم اور پریشانی نے میرے ہوش و حواس درست نہیں رہنے دیے۔ شہزادے کا باپ ارس خان مجھ سے زیادہ انتقام لینے کے لیے بے چین تھا اور اس نے انتقام لے بھی لیا۔"

"یعنی توقتمش مارا جا چکا ہے؟" تیمور چونک پڑا۔

"اے شاہِ تاتار! توقتمش مارا نہیں جا سکا۔" چشتانیہ افسردگی سے بولی:

"ارس خان اپنے لشکر کے ساتھ میرا ڈولا لینے ہماری خیمہ گاہ کی طرف آ رہا تھا۔ اسی دوران توقتمش نے ہم پر حملہ کیا۔ مگر ارس خان کو آنے میں دیر ہو گئی۔ جب وہ میدان میں آیا تو اسے ایک نیزے پر اپنے بیٹے کا چڑھا ہوا سر دکھائی دیا۔ اس نے شدت سے حملہ کیا اور دور تک تعاقب بھی کیا لیکن وہ ارس خان کے ہاتھ نہ آ سکا۔ پھر ارس خان نے بیٹے کی لاش پر کھڑے ہو کر قسم کھائی کہ وہ توقتمش سے انتقام لے گا اور اس کا سر کاٹ کر اسی طرح نیزے پر چڑھائے گا۔"

"ارس خان بغیر انتقام لیے واپس چلا گیا؟" تیمور نے تعجب کا اظہار کیا۔

"جی ہاں۔ وہ اپنی لشکر گاہ کو لوٹ گیا تاکہ مزید لشکر جمع کر کے کربیا پر حملہ کر سکے۔" چشتانیہ نے درد بھری آواز میں جواب دیا:

"انتقام لینا میں اپنا فرض سمجھتی ہوں اے شاہِ تاتار اور ملکۂ تاتار اس سلسلے میں میری رہنمائی کر سکیں تو میں تا زندگی احسان مند رہوں گی۔"

"تم اپنے سسر ارس خان کے پاس بھی تو جا سکتی ہو۔" ملکہ سرائے خانم نے کہا:

"ہم تمہیں وہاں بھیجنے کا انتظام کر سکتے ہیں۔"

"ملکۂ تاتار کا شکریہ۔ لیکن میں ارس خان کے پاس نہیں جا سکتی۔"

"مگر کیوں؟" سرائے خانم نے حیرت سے پوچھا:

"تم ارس خان کے بیٹے کی جائز بیوی ہو۔ اسے تمہاری قدر کرنی چاہیے۔"

"نہیں ملکۂ تاتار۔" چشتانیہ نے غمگین لہجے میں کہا:

"میں ارس خان کی بہو ضرور ہوں لیکن شہزادہ پارس کے قتل کی اصل وجہ بھی تو میں ہی ہوں۔ جھگڑا میری وجہ سے ہوا تھا۔ خطرہ ہے کہ ارس خان مجھے دیکھتے ہی قتل کرا دے گا۔ مجھے اپنی جان کی پروا نہیں لیکن میں اس وقت تک مرنا نہیں چاہتی جب تک میرا انتقام پورا نہ ہو جائے۔"

امیر تیمور جو کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا، اس نے سر اٹھا کر کہا:

"دیکھو لڑکی یہ ایک دوسرے ملک کا معاملہ ہے۔ ہم محض تمہارے لیے مغلوں کے معاملات میں دخل نہیں دے سکتے۔ پھر یہ دو امیروں کا ذاتی جھگڑا تھا۔ ارس خان ہمارے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن تم اسے خاقان تسلیم کرتی ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ اس نے اب تک توقتمش سے اپنے بیٹے کا حساب برابر کر لیا ہو گا کیونکہ ہم تاتاریوں اور مغلوں کی روایت ہے کہ مرد وہ ہے جو اپنے ہم قوم کے قاتل کے ساتھ آسمان تلے نہ سوئے۔"

چشتانیہ دل شکستہ ہو گئی۔ تیمور نے اسے صاف جواب دے دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو چھلک آئے۔ سرائے خانم کو بھی تیمور کی یہ صاف گوئی کچھ زیادہ پسند نہ آئی:

"اے امیر! کیا آپ شاہِ تاتار ہوتے ہوئے اس مظلوم کی جھولی میں ہمدردی کے دو بول بھی نہیں ڈال سکتے؟" . . .

برائے خانم نے کچھ اس لہجے میں کہا کہ تیمور متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"لڑکی! کاش ہم تمہارے آنسو پونچھ سکتے۔ ہم وعدہ تو نہیں کرتے لیکن تم یہ امید رکھو کہ جب بھی کوئی موقع آیا ہم تمہاری پوری پوری مدد کریں گے۔"

"خدا آپ کو اور آپ کی مہربان ملکہ کو ہمیشہ سلامت رکھے۔" چیشتانیہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی:

"میرے لیے یہ امید ہی کافی ہے۔ میں اس امید پر اپنی پوری زندگی گزار دوں گی۔"

امیر تیمور کے جاسوس شمال سے جنوب تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ سفید اور سنہرے غول کے قصوں سے آشنا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس نے چنگیز خان کے منجھلے بیٹے چغتائی خان کے خانوادے کی طاقت کا خاتمہ کر دیا ہے لیکن پھر بھی سنہرے غول کا خاقان دریائے والگا کے کنارے اپنے قلعے میں موجود ہے اور وہ اتنا طاقتور ہے کہ پورا مشرقی یورپ اسے خراج دیتا ہے۔

امیر تیمور نے اس معاملے میں کبھی اتنی سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا جتنا سنجیدہ وہ چیشتانیہ کی روداد سننے کے بعد ہوا تھا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ سنہری غول کسی بھی وقت اس کے لیے مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔

O

امیر تیمور کی تسلی و تشفی اور ملکہ سرائے خانم کے محبت بھرے سلوک نے چیشتانیہ کا غم بہت کم کر دیا۔ سرائے خانم نے چیشتانیہ کو سمرقند اور دوسرے مقامات کی سیر کرائی۔ چیشتانیہ کے لیے وہاں کی ہر چیز نئی اور عجوبہ تھی۔ سرائے خانم کی صحبت میں رہ کر اس کی طبیعت سنبھل گئی اور اس نے زندگی کی دلچسپیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔

امیر تیمور نے چیشتانیہ کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ اپنی داستان کسی اور کو نہ سنائے۔ محل والوں کو صرف یہ علم تھا کہ چیشتانیہ ایک عالی مرتبت مغل شہزادی ہے اور اپنے خسر ارس خان سے خفا ہو کر یہاں پناہ گزین ہوئی ہے۔

چیشتانیہ کو سمرقند میں رہتے ہوئے دو ماہ سے زیادہ گزر گئے۔ ایک دن امیر تیمور اپنے سرداروں سے مل کر محل میں داخل ہوا ہی تھا کہ ایک غلام نے حاضر ہو کر اطلاع دی کہ خوارزم کے حاکم کا قاصد ایک خاص پیغام لایا ہے۔

خوارزم سرحدی علاقہ تھا اور اس کی سرحدیں منگولوں کے سنہرے غول سے ملتی تھیں۔ تیمور نے فوراً قاصد کو بلا لیا۔ خوارزم کے قاصد نے ایک لفافہ پیش کیا۔

امیر خط پڑھ کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"کوئی زبانی پیغام بھی دیا ہے حاکم نے؟" کچھ دیر بعد تیمور نے فکرمند لہجے میں پوچھا۔

قاصد نے بڑے ادب سے کہا:

"مجھے حکم ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے اس خط کا جواب لے کر خوارزم پہنچایا جائے۔"

تیمور نے ایک لمبی سانس لی:

"تمہیں معلوم ہے اس خط میں کیا لکھا ہے؟"

"نہیں امیر......"

قاصد گھبرا گیا: "مجھے تو صرف خط پہنچانے اور جواب لانے کا حکم ہے۔"

"تمہیں یہ تو ضرور معلوم ہوگا کہ حاکم خوارزم کے پاس کوئی اہم آدمی ٹھہرا ہوا ہے؟" امیر تیمور نے مزید تحقیق کی۔

قاصد کچھ سوچتے ہوئے بولا:

"جی ہاں امیر...... ایک ترکستانی سردار ان کے پاس آیا ہے۔ شاید ان کا دوست ہے۔ انہوں نے اسے اپنے محل میں ٹھہرایا ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔"

تیمور نے اسے رخصت کرتے ہوئے کہا:

"کل تک مہمان خانے میں ٹھہرو۔ تمہیں خط کا جواب مل جائے گا۔"

قاصد سلام کر کے رخصت ہو گیا تو امیر تیمور نے خط کو دوبارہ پڑھا۔ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس کے ماتھے کی شکنیں آہستہ آہستہ صاف ہو گئیں۔ وہ مسکراتا ہوا اٹھا اور سرائے خانم کی طرف چل دیا۔

سرائے خانم اپنے کمرے میں موجود تھی۔ اس نے دروازے کے باہر تیمور کو خوش آمدید کہا اور تیمور کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ تیمور فطرتاً سنجیدہ تھا۔ جب سے اس کی پہلی بیوی الجائی خاتون کا انتقال ہوا تھا وہ کچھ زیادہ ہی سنجیدہ رہنے لگا تھا پھر جب اس کے بڑے بیٹے جہانگیر نے عین جوانی میں دنیا سے منہ موڑ لیا تو اس کی رہی سہی شگفتگی بھی ختم ہو گئی تھی۔ اس وقت تیمور برابر مسکرائے جا رہا تھا:

"ہم تمہیں اس وقت ایک ایسی خبر سنائیں گے کہ تم پھڑک اٹھو گی۔"

"ضرور ارشاد فرمائیے امیر!" سرائے خانم بھی مسکرائی: "میرے کان خبر سننے کے لیے بے چین ہیں۔"

"وہ لڑکی......" امیر نے باہر کی طرف نظر دوڑاتے ہوئے پوچھا: "ارس خان کی بہو کہاں ہے؟"

"اپنے کمرے میں ہوگی۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اس کی طبیعت سمرقند میں لگ گئی ہے۔"

"سرائے خانم! کیا یہ قدرت کی ستم ظریفی نہیں کہ دو دشمن ایک جگہ جمع ہو جائیں؟"

تیمور کا چہرہ خوشی سے کھلا جا رہا تھا۔

"جسے ہم کل تک ظالم سمجھتے تھے وہ آج مظلوم بن کر ہمارے پاس آیا ہے۔"

"میں امیر کو مسکراتے دیکھ کر خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی ہوں" سرائے خانم نے دانشمندی سے تیمور کی بات ہوتے بھی سلسلۂ کلام جاری رکھنے کی کوشش کی۔

"ہم تمہاری محبت کی قدر کرتے ہیں سرائے خانم۔" تیمور خوش ہو کر بولا۔

"تم ایک مزاج داں اور سمجھدار عورت ہو۔ تمہیں موقع محل کے مطابق بات کرنے کا سلیقہ بھی آتا ہے، بہرحال کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ ہم نے جتہ مغلوں کی طاقت کو ختم کر دیا ہے۔ ہم پر حکومت کرنے والے مستقر یعنی حصار المالیق چھوڑ کر منگولیا کے ریگستانوں سے بھی دور بھاگ چکے ہیں لیکن چنگیز خان کی ایک مضبوط شاخ سفید اغول کہا جاتا ہے، اب تک ہماری سرحدوں پر ایک مستقل خطرہ بنی کھڑی ہے۔ ہم اپنی سرحدوں کو مضبوط کیے بغیر فتوحات کا سلسلہ کسی اور طرف نہیں بڑھا سکتے۔"

"امیر درست فرما رہے ہیں۔" سرائے خانم نے تیمور کی بات نہ سمجھتے ہوئے بھی اس کی تائید کی۔

"سرائے خانم! تقدیر کبھی کبھی عجیب طرح کے گل کھلاتی ہے!"

تیمور کے دل میں امڈتے ہوئے جذبات اسے آج بہت کچھ اگلنے پر مجبور کر رہے تھے۔ وہ رازداری کا پابند تھا لیکن اس وقت راز کی باتیں بھی اس کی زبان سے نکلی پڑ رہی تھیں۔ وہ بولا:

"ارس خان کی بہو کے سمرقند آنے سے کم از کم ہمیں یہ احساس ضرور ہوا تھا کہ ایک عظیم طاقت ہم سے بہت نزدیک موجود ہے۔ اس احساس نے ہمیں ایک نامعلوم پریشانی میں الجھا دیا تھا۔ ہم اس خطرے کو دور کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے اور اب یہ خطرہ خود بخود دور ہوتا محسوس ہو رہا ہے۔ تمہاری جان مغل لڑکی کے شوہر کا قاتل ارس خان کے ہاتھوں شکست کھا کر ہماری حدود میں آ گیا ہے اور اس نے پناہ کی درخواست کی ہے۔"

"امیر کا مطلب ہے...... " سرائے خانم یاد کرتے ہوئے بولی:

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے چغتائیہ نے اس کا نام توقتمش بتایا تھا۔ کیا وہی شخص آپ کے پاس آیا ہے؟"

"ہاں سرائے خانم!" تیمور نے سنجیدگی سے کہا:

"اس کا نام توقتمش ہی ہے۔ خوارزم کے قلعدار نے ایک خفیہ خط کے ذریعے ہمیں اطلاع دی ہے کہ گرمیوں میں حاکم شہزادہ توقتمش اور مغلوں کے شمالی خاقان ارس خان کے درمیان زبردست جنگ ہوئی۔ توقتمش کو اس جنگ میں زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ جان بچا کر خوارزم پہنچا ہے۔ ارس خان نے توقتمش کا ہماری سرحد تک پیچھا کیا ہے۔ اب

ہمارے قلعدار کے ذریعے ہم سے پناہ طلب کر رہا ہے۔ اگر ہم نے پناہ نہ دی تو وہ کسی اور طرف چلا جائے گا۔"

سرائے خانم بڑی صاحبِ تدبیر عورت تھی۔ وہ غور سے تیمور کی باتیں سن رہی تھی۔ تیمور کے خاموش ہوتے ہی بولی:

"توقتمش کا شکست کھا کر پناہ کی درخواست کرنا امیرِ تاتار کی کامیابی کا پیش خیمہ بن سکتا ہے بشرطیکہ امیر کی عقل انہیں اس مسئلے پر غور کرنے کی دعوت دے۔"

"بہت خوب سرائے خانم!" تیمور مسکرایا۔

"اب تم ہمیں مشورے بھی دینے لگیں۔"

"ہرگز نہیں امیر...... " سرائے خانم نے فوراً بات پلٹ دی:

"میری کیا مجال۔ میں نے تو صرف ایک اندازہ لگایا تھا۔ اسے امیر میری بے عقلی کہہ سکتے ہیں۔" سرائے خانم گھبرا گئی کہ کہیں تیمور بگڑ نہ جائے۔ اس کے تمام سردار اس معاملے میں بہت محتاط رہتے تھے اور جب تک امیر تیمور خود ان سے مشورہ طلب نہ کرتا وہ اپنی زبانیں بند رکھتے تھے۔

تیمور نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہا:

"ہمیں تمہارا مشورہ ناگوار نہیں گزرا کیونکہ ہم نے خود بھی ان خطوط پر غور کیا ہے۔ تمہیں تو ہم اطلاع دینے اس لیے آئے کہ چغتائیہ، توقتمش کی سخت دشمن ہے۔ تم اسے اچھی طرح سمجھا دینا کہ توقتمش جب تک ہماری پناہ میں رہے اسے الجھنے یا اسے نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے بلکہ فی الحال تو تم توقتمش کے آنے کی اسے اطلاع بھی نہ دو۔"

"آپ اطمینان رکھیں۔ ایسا ہی ہوگا امیر!" سرائے خانم نے کہا:

"الجو چغتائیہ کو اس کی خبر ہی نہیں ہو پائے گی۔ اگر اسے معلوم ہو بھی گیا تو میں اس پہ یہ واضح کر دوں گی کہ جس طرح امیر تیمور کی پناہ میں ہے اسی طرح توقتمش بھی امیر کی پناہ میں آ گیا ہے اور امیر اپنی پناہ میں آنے والوں کی جان کا نگہبان ہوتا ہے۔"

امیر تیمور نے خوارزم کے قلعدار کو جواب بھیجا تو قاصد کے ساتھ اپنا ایک سردار بھی بھیج دیا تاکہ وہ توقتمش کو عزت و احترام کے ساتھ سمرقند لے آئے۔ امیر نے توقتمش کو یقین دلایا کہ وہ پناہ دینے کے ساتھ ساتھ اس کی حتی الامکان مدد کرے گا۔

توقتمش کے لیے اس کی سرزمین تنگ ہو گئی۔ وہ بھٹکتا ہوا خوارزم آ گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تیمور اسے
نہ دے گا کیونکہ مغل، تاتاریوں کو حقیر اور اپنے سے کمتر سمجھتے تھے اور امیر تیمور کو "لنگڑا تاتاری" کہتے تھے لیکن جب تیمور
بھیجے ہوئے سردار نے اسے ادب سے سلام کر کے کہا:

"امیر تیمور آپ سے ملاقات کے مشتاق ہیں اور آپ سمرقند کو اپنا گھر سمجھ کر فوراً چلیے۔"

تو توقتمش بہت خوش ہوا۔ خوارزم کے قلعہ دار نے سواروں کا ایک دستہ بھی اس کے ساتھ کر دیا۔ اس طرح توقتمش
شان سے سمرقند پہنچا۔

امیر تیمور نے توقتمش کو سمرقند سے باہر ٹھہرانے کا انتظام کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ توقتمش کی آمد سے
لوگ واقف ہوں۔ اس کے علاوہ توقتمش سے گفتگو کر کے وہ یہ اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ مغلوں کا یہ شہزادہ کس
تک اس کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔

توقتمش کو جب قلعے سے باہر ایک حویلی میں اتارا گیا تو اسے کچھ خطرہ محسوس ہوا لیکن چند ہی گھنٹوں کے
امیر تیمور کا پیغام پہنچا کہ وہ بہ نفسِ نفیس کل کسی وقت اس سے ملاقات کے لیے آئیں گے۔

دوسرے روز دوپہر کے بعد امیر تیمور تنہا اس سے ملنے آیا۔ مغل شہزادے نے امیر تیمور کو دیکھا۔ اس تیمور
جس نے بلادِ شمال کے مغلوں کو دور صحراؤں اور ریگستانوں میں مار بھگایا تھا۔ توقتمش پر اس خیال ہی سے کہ
ایک فاتح بادشاہ ہے، رعب پڑ گیا اور وہ تیمور سے اس قدر ادب سے ملا جیسے تیمور اس کا خاقانِ اعظم مائی خان ہو
بھی شفقت سے ملا اور اسے بیٹا اور چھوٹا بھائی کہہ کر مخاطب کیا۔

دونوں میں گفتگو شروع ہوئی۔ امیر تیمور اس کے بارے میں چشمانیہ سے بہت کچھ سن چکا تھا لیکن اب
توقتمش کا بیان بھی سننا چاہتا تھا تاکہ چشمانیہ کی بتائی ہوئی باتوں کی تصدیق یا تردید ہو سکے اور وہ توقتمش کے مزاج سے
بھی واقف ہو جائے۔

امیر تیمور بلا کا قیافہ شناس تھا۔ اس نے توقتمش کے چہرے سے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ شخص متلون مزاج
ہے اور ایسے شخص پر مشکل ہی سے اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ توقتمش نے پہلے ہی قدم پر تیمور کو فریب دینے کی کوشش کی
اس نے اپنی داستان کا آغاز اس طرح کیا:

"اے شاہِ تاتار۔ میری اور ارس خان کی پرانی دشمنی ہے کیونکہ جس علاقے کا ارس خان حاکم ہے وہاں میرے
قبیلے کے زیادہ لوگ آباد ہیں لہٰذا اس پر میرا حق ہے۔ چونکہ خاقانِ اعظم مائی خان ایک کمزور خاقان ہے اور وہ ارس خان
سے خوف کھاتا ہے اس لیے اس نے شمالِ مشرق کا ایک بڑا علاقہ دے کر اسے خاقانِ مشرق و مغرب کا خطاب بھی
کر دیا ہے۔ خاقان مائی خان نے میری حق تلفی کی۔ میں پھر بھی خاموش رہا لیکن ابھی کچھ عرصہ پہلے ارس خان کا بیٹا

...ن کے بغیر میرے علاقے میں لشکر لے کر آ گیا۔ ارس خان کے لشکر کی تعداد زیادہ تھی۔ مجھے اپنے علاقے سے
...ل نہ پہنچ سکی اس لیے مجھے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ارس خان اس قدر ظالم ہے کہ اس نے مجھے شکست
...ی اکتفا نہیں کی بلکہ میرے پورے ملک کو روند کر رکھ دیا۔ میں شکست پر شکست کھاتا اور پسپا ہوتا رہا۔
...م امیدیں ٹوٹ گئیں تو میں نے آپ کے دامن میں پناہ حاصل کرنے کا ارادہ کیا اور خوارزم پہنچ گیا۔"

امیر تیمور تحمل سے اس کی روداد سنتا رہا۔ جب وہ خاموش ہوا تو تیمور نے کہا:

"مغل شہزادے۔ ہم تمہیں پناہ دے چکے ہیں اور پناہ میں آئے ہوئے آدمی کی عزت کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔
...اس بات کا افسوس ضرور ہے کہ تم نے ارس خان اور اپنی جنگ کے بارے میں یہ باتیں قصداً ہم سے
...رکھی ہیں۔"

توقتمش گھبرا کے تیمور کا منہ دیکھنے لگا۔ پھر ڈرتے ڈرتے بولا:

"شاہِ تاتار! میں آپ کے قبضے میں ہوں۔ آپ جو چاہیں میرے ساتھ سلوک کر سکتے ہیں لیکن میں یہی کہوں گا کہ
...آپ سے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔"

"شہزادے۔ تم بھول رہے ہو۔" امیر نے سنجیدگی سے کہا:

"تم ہمارے قبضے میں نہیں پناہ میں ہو اور پناہ میں آئے ہوئے آدمی سے ہم کسی قسم کی سختی نہیں کر سکتے۔ تمہاری
...اس وقت تک خطرہ نہیں جب تک تمہاری طرف سے کسی قسم کی غداری کا اظہار نہیں ہوتا۔ ہم تو صرف یہ پوچھنا چاہتے
...ارس خان کے بیٹے پر کیا گزری جو تمہاری حدود میں داخل ہو گیا تھا؟"

"شاہِ محترم!" توقتمش نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا:

"...میں نے اپنی روداد مختصر طور پر بیان کی تھی۔ اس لیے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ ارس خان کے بیٹے سے میری جنگ
...میرے ہاتھوں مارا گیا۔ اسی دوران اس کا باپ آ گیا اور مجھے شکست کھا کر آپ کے پاس پناہ گزین

"شہزادے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہارے اور ارس خان کے بیٹے کے درمیان ایک عورت پر جھگڑا ہوا تھا۔"
...کہتے ہوئے توقتمش کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

توقتمش کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ اطلاع تیمور تک کیسے پہنچی۔ اس نے خود کو سنبھالا

"...کی اطلاع درست ہے۔ شہزادہ پارس میرے علاقے سے ایک عورت کو لے گیا تھا۔ مجھے یہ بات ناگوار

"توقتمش..." تیمور کا لہجہ سخت ہو گیا:
"شہزادے پارس نے لڑکی کے باپ کو اس کی قیمت ادا کر دی تھی۔ پھر تمہیں لڑکی واپس لینے کا کیا حق؟"
توقتمش کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔
تیمور نے نرمی سے کہا:
"توقتمش۔ یاد رکھو کہ وہ بادشاہ یا امیر اپنی سلطنت کو اسی وقت تک قابو میں رکھ سکتا ہے، جو وہ اپنی سرحدوں کے باہر کے حالات سے پوری طرح واقف رہتا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم سمرقند میں بے خبر بیٹھے ہیں اور ہمیں اپنی سرحدوں پر رونما ہونے والے واقعات کا علم نہیں۔ ہمیں تمہاری اور ارس خان کی کے تمام حالات معلوم ہیں۔ ہم نے تمہیں آنکھیں بند کر کے پناہ نہیں دی۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ سنہرا غول سمرقند میں موجودگی برداشت نہیں کرے گا اور اس کا جو کچھ نتیجہ ہو گا، وہ بھی تم جانتے ہو۔"
"شاہِ تاتار۔ آپ واقعی ایک عظیم حکمران ہیں"۔ توقتمش کو اعتراف کرنا پڑا:
"ہم مغلوں نے آپ کی طاقت اور بیدار مغزی کا غلط اندازہ لگایا تھا۔"
"بہرحال تم ہمیں بعض خامیوں کے باوجود عزیز ہو۔"
تیمور نے اسے تسلی دی:
"ہم نے تمہیں مدد دینے کا وعدہ کیا ہے اور وہ پورا کیا جائے گا۔"
"میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں"۔ توقتمش نے عاجزی سے کہا:
"میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا اور مجھے آپ کی غلامی پر ہمیشہ فخر رہے گا۔"
امیر تیمور اپنے مہمان کو تسلی دے کر واپس آ گیا مگر اس کی بے چینیاں بڑھ گئیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ سنہرے غول سے خوفزدہ تھا بلکہ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ توقتمش سے کس طرح کام لے کیونکہ وہ سنہرے غول کے خلاف پہل کرنا نہیں چاہتا تھا۔

O

امیر تیمور نے بلادِ شمال کے خانِ اعظم کو شکست دے کر ان کی طاقت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا تھا۔ اس کوشش میں شمالی پہاڑوں کی مضبوط دیوار پار کر کے آگے بڑھ گیا اور اس کے قبضے میں ایشیا کی وہ ...

... کے ذریعے ایشیا اور یورپ کے درمیان ایک زمانے سے تجارت ہوتی چلی آ رہی تھی۔ تیمور نے شمال کے ... شکست دے کر وہ راستہ بند کر دیا تھا جس کے ذریعے ترک، ہن اور چنگیز خان کی اولاد آئے دن وسطی ایشیا پر حملے کیا کرتی تھی۔
مغلوں کی طاقت اگرچہ ٹوٹ چکی تھی لیکن سنہرے غول کی بے پناہ طاقت اب بھی تیمور کے لیے ایک خطرہ بنی ہوئی تھی۔ ... کا یہ علاقہ تیمور کی سلطنت کے شمال اور مغرب کی جانب واقع تھا۔ سنہرے غول اور خاص کر خاقان ارس خان کے خانہ بدوش مغل ٹنڈرا کے برف پوش میدانوں میں گھومتے رہتے تھے۔ ان میں اکثریت مسلمانوں کی تھی اور حاکم بھی مسلمان تھے۔ جب یہ لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے تو یوں معلوم ہوتا کہ ایک پورا شہر حرکت میں آ گیا ... امیروں کے پاس دو دو سو گاڑیاں ہوتیں۔ یہ گاڑیاں اتنی بڑی ہوتی تھیں جن میں ایک پورا گھر آرام سے ... اور کھانا بھی انہی گاڑیوں میں پکایا جاتا۔ سفر کے دوران ان گاڑیوں کو ایک دوسری سے باندھ دیا جاتا تھا۔ ... ایک گاڑی بان پچاس پچاس گاڑیوں کو چلاتا تھا۔
ان حکمران مغل خاندانوں کے علاوہ سنہرے غول میں شمالی علاقے کے مختلف مذاہب کے لوگ بھی شامل تھے۔ اس کے ... دنیا کے جہاں گرد (جپسی) اور جیوٹی کی بھی کافی تعداد موجود تھی۔ جہاں ایک طرف مسلمانوں کی چوبی مسجدیں ... نظر آتیں وہاں لاماؤں کے ساتھ بت پرستوں کے شامان بھی گھر میں بت لٹکائے نظر آتے۔ ان میں بیویوں ... کا رواج تھا اور بیواؤں کی شادی کا رواج نہیں تھا۔
سنہرے غول کے یہ مغل، تاتاریوں کے ہم چہرے بھائی تھے۔ وہی ترچھی آنکھیں، چھدری داڑھیاں اور طبع ... یہ مغل ان روسیوں سے زیادہ سنگدل تھے جن سے یہ خراج وصول کرتے تھے۔ یہ لوگ سکے بھی ڈھالتے ... کے محکوم روسی خراج ادا کر سکیں۔ مغل کاغذ بھی بناتے تھے اور روسیوں سے اس پر معاہدے لکھے جاتے ... یورپ کا سیاسی توازن ان کے ہاتھ میں تھا۔
سنہرے غول نے روسیوں سے صرف ایک بار شکست کھائی تھی لیکن پھر انہوں نے اس قدر زبردست انتقام لیا تھا کہ ... غول سے بغاوت کرنے سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی۔ امیر تیمور کو اسی سنہرے غول سے سابقہ پڑنے والا ... بربریت میں چنگیز ... سے کسی طرح کم نہیں تھا۔
... توقتمش سے ملاقات کے بعد جنگی تیاریاں شروع کر دی تھیں اور کسی اہم موقع کا متلاشی تھا۔ توقتمش ... کی خبر کو پہلے تو پوشیدہ رکھا گیا لیکن جب یکایک تیموری لشکر میں جنگی تیاریاں شروع ہوئیں تو ... کے تجسس میں اضافہ ہوتا گیا۔
... راز داری ختم کر دی اور توقتمش کو سمرقند کے قلعے میں آنے اور گھومنے پھرنے کی اجازت دے دی تاکہ

سمرقندیوں اور تیموری لشکر کے لیے توقتمش کی ذات اجنبی نہ رہے۔

امیر تیمور کو وہ موقع یا قدرت کا اشارہ جلد ہی مل گیا جس کا وہ بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ تیمور ابھی تیاریوں میں مصروف تھا کہ خاقان ارس خان کا قاصد سمرقند پہنچ گیا۔

تیمور نے صحیح اندازہ لگایا تھا کہ ارس خان، شہزادہ توقتمش کا سمرقند میں قیام برداشت نہیں کرے گا اور اس کی واپسی کا مطالبہ کرے گا۔

تیمور نے ارس خان کے قاصد سے فوراً ملاقات نہیں کی بلکہ اسے مہمان خانے میں ٹھہرایا۔ دراصل تیمور چاہتا تھا کہ قاصد شہزادہ توقتمش کی وہ شان و شوکت دیکھ لے جو اسے تیمور نے عطا کی تھی۔ امیر تیمور کے حکم سے شہزادہ توقتمش کو تاتاری امیروں کا بیش قیمت لباس دیا گیا اور اس سے کہا گیا کہ وہ پوری شان و شوکت کے ساتھ سمرقند کے بازار کی سیر کو آئے۔

تیمور نے درپردہ ایک سردار کو اس بات پر مامور کیا کہ وہ ارس خان کے قاصد کو سمرقند کی سیر کے بہانے لے جائے اور اسے کسی ایسی جگہ کھڑا کر دے جہاں سے وہ توقتمش کی شاہانہ سواری کا نظارہ کر سکے۔ ان کے ساتھ ہی اس بات کا اہتمام بھی کیا کہ توقتمش کی سیر کے دوران بازاروں میں لوگوں کا زیادہ ہجوم ہو اور وہ شہزادے کو زور شور سے خوش آمدید کہیں اور اس کے حق میں نعرے لگائیں۔

دوسرے دن بازاروں میں لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ پورا سمرقند توقتمش کے استقبال کو امڈ آیا۔ اس وقت تک چشتانیہ کو توقتمش کے سمرقند پہنچنے کی کوئی خبر نہ تھی۔ جب محلات میں یہ خبر اڑی کہ آج کسی اجنبی کا شہزادہ سمرقند کی سیر کو آنے والا ہے تو کنیزوں اور غلاموں نے بھی شہزادے کو دیکھنے کی اجازت چاہی۔ ملکہ سرائے خانم کی کنیزوں نے ملکہ کو مجبور کیا کہ وہ بھی آج سمرقند کی سیر کو چلے تاکہ کنیزیں بھی مغل شہزادے کو دیکھ سکیں۔ ملکہ آمادہ ہو گئی۔

چشتانیہ نے جب سے مغل شہزادے کی آمد کے بارے میں سنا تھا وہ ایک الجھن میں گرفتار تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مغلوں کا کون سا شہزادہ سمرقند آ سکتا ہے جبکہ مغلوں کے تمام سردار تیمور کو تیمور لنگ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس نے بھی سرائے خانم کے ساتھ جانے کی درخواست کی۔ سرائے خانم نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد مسکرا کر ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ اس وقت سرائے خانم کی مسکراہٹ بڑی پُراسرار تھی جسے چشتانیہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

"ہٹو بچو۔ مغل شہزادے کی سواری آتی ہے۔"

دو نقیب پرچم اٹھائے، آوازیں لگاتے سمرقند کی شاہراہ پر نمودار ہوئے۔ نقیبوں کے پیچھے تاتاری پیدل سپاہی

پیدل، نقارے سجی ہوئی گاڑیوں پر رکھے تھے۔ نقاروں پر چوٹ پڑ رہی تھی اور طبل کی آواز سے فضا گونج رہی تھی۔ پھر دو سو گھڑ سواروں کا دستہ نمودار ہوا۔ تاتاری بانکے سوار بنک سک سے درست، چار چار کی قطار میں گھوڑے دوڑاتے آتے دکھائی دیے۔ آخر میں مغل شہزادے کی سواری تھی۔ خلعتِ فاخرہ میں ملبوس، سر پر زرنگار چھتر لیے ہوئے، دائیں بائیں محافظ سوار، پشت پر کنیزیں اور غلام، پھولوں کی بارش کرتے آ رہے تھے۔ شہزادے کی سواری نصف شاہراہ طے کر چکی تو نقیبوں نے ایک ایسا نعرہ بلند کیا جس پر کچھ لوگ چونک پڑے۔ ایک نقیب نے پرچم سر سے بلند کر کے نعرہ لگایا:

"خوش آمدید مغل خاقانِ شرق و غرب توقتمش خان۔"

یہ نعرہ بلند ہوتے ہی چشتانیہ نے گھبرا کر گردن گاڑی سے باہر کی طرف نکال دی۔ وہ ملکہ سرائے خانم کے ساتھ گاڑی میں سوار ایک بلند مقام سے اس سواری کو بڑی بے چینی سے دیکھ رہی تھی۔ توقتمش کا نام سن کر ایک لمحے کے لیے تو اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ پھر وہ گھبرا کر باہر دیکھنے لگی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کے شوہر کا قاتل جس سے انتقام لینے کی اس نے قسم کھائی تھی، وہ اس کے اتنے قریب اور اس شان سے نمودار ہو گا۔ اس کی نظریں توقتمش پر جمی ہوئی تھیں جس کی سواری اس سے صرف دس قدم دور سے گزر رہی تھی۔ توقتمش غرور سے سر اٹھائے گھوڑے پر بیٹھا تھا۔

چشتانیہ کے ہاتھ پیروں میں سنسناہٹ پیدا ہوئی اور دل ڈوبنے لگا۔ اس نے سر گھما کر ملکہ کو دیکھا۔ ملکہ سرائے خانم بڑی دلچسپی سے توقتمش کی سواری کا جلوس دیکھ رہی تھی لیکن اس نے چشتانیہ کی بے چینی اور گھبراہٹ بھی محسوس نہ کی۔ ملکہ اس طرح بیٹھی تھی جیسے اسے کسی بات یا کسی ردعمل کا علم نہ ہو۔

چشتانیہ سے ضبط نہ ہو سکا تو اس نے ڈوبتی آواز میں کہا:

"ملکہ! تاتار....!" اس کا گلا خشک ہو گیا۔

"ہاں چشتانیہ..... کہو!" ملکہ نے بغیر چشتانیہ کی طرف دیکھے کہا۔

"ملکہ! تاتار.....!"

چشتانیہ نے پوری طاقت ہونٹوں پر جمع کر کے کہا مگر وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کا سر چکرانے لگا اور وہ گاڑی کی پشت سے سر لگا کر بے ہوش ہو گئی۔

سرائے خانم کو چشتانیہ سے اسی قسم کے ردعمل کی توقع تھی اس لیے فوراً واپسی کا حکم دیا اور چشتانیہ کو لے کر محل میں آ گئی۔

دوسری طرف توقتمش کے اس شاہانہ جلوس کا ارس خان کے قاصد پر تقریباً اتنا ہی شدید ردعمل ہوا۔ قاصد کو تیمور کا

ایک سردار قصداً یہ جلوس دکھانے لایا تھا۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ تیمور سے توقتمش کا شاندار جلوس کر اُرس خان کو شریفانہ جواب دیا تھا۔ توقتمش کی ایسی آؤ بھگت کے بعد یہ کس طرح ممکن تھا کہ تیمور اسے ارس کے حوالے کر دے۔ اسے تیمور پر غصہ بھی آ رہا تھا کیونکہ اس نے توقتمش کے لیے "خاقانِ مشرق و مغرب" کا نعرہ لگایا۔ ارس خان کی سراسر توہین تھی۔

قاصد جلوس گزرنے کے دوران دانت کٹکٹاتا رہا اور دل ہی دل میں تاؤ کھاتا رہا۔ اسے پیغام دیئے ہی تیمور کا جواب مل گیا تھا لیکن وہ پیغام دیئے بغیر واپس نہیں جا سکتا تھا۔

○

چشتانیہ کو محل پہنچتے پہنچتے ہوش آ گیا تھا۔ وہ چپ چاپ سی گاڑی سے اتری اور اپنے کمرے میں چلی گئی بھی اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا اور کوئی بات نہ کی۔

جب چشتانیہ کے حواس بجا ہوئے تو ملکہ سرائے خانم کے پاس آئی۔ اس کے دل میں طرح طرح کے ہو رہے تھے اور مختلف قسم کے وسوسوں نے اسے گھیر لیا تھا۔

چشتانیہ، ملکہ کے پاس جا کر خاموشی سے بیٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ گفتگو کا آغاز کس ملکہ کو اس کے دلی جذبات کا اندازہ تھا لیکن وہ چاہتی تھی کہ چشتانیہ خود بات کرے۔

"آپ کیسی طبیعت ہے؟" ملکہ نے خاموشی سے اکتا کر پوچھ ہی لیا۔

"شکر ہے۔"

چشتانیہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی:

"خدا اپنے بندے کو جس حال میں رکھے، بندے کو اس کا شکر ہی ادا کرنا چاہیے۔"

"چشتانیہ!" ملکہ نرمی سے بولی:

"تمہیں ہم سے شکایت پیدا ہوئی ہے لیکن تم حالات کا تجزیہ کرو گی تو تمہاری یہ شکایت خود ہی ہو جائے گی۔"

"ملکۂ تاتار!" چشتانیہ نے سسکی بھر کر کہا:

"میں آپ سے کیا شکایت کر سکتی ہوں۔ تقدیر میں جو ہو گا وہ تو دیکھنا ہی پڑے گا۔ کاش میں

جلوس دیکھنے نہ جاتی۔"

سرائے خانم نے محبت سے کہا:

"جو ہو چکا اس پر پچھتانا بیکار ہے۔ قدرت کس سے کیا کام لینا چاہتی ہے اس کا کسی کو علم نہیں۔ آج ش کے اس عروج پر تمہارا دل کڑھتا ہو گا لیکن کل کیا ہو گا اس کا کسی کو پتہ نہیں۔"

"ملکۂ تاتار..... کیا آپ کو علم تھا کہ توقتمش یہاں آیا ہوا ہے؟" چشتانیہ کو جیسے بھولا ہوا سوال یاد آ گیا۔

"ہاں چشتانیہ....." ملکہ سرائے خانم نے نرم لہجے میں کہا:

"امیر نے ہمیں منع کر دیا تھا۔ وہ تمہاری دل آزاری نہیں چاہتے تھے..... مگر جب تم نے جلوس دیکھنے کی ضد ہم انکار نہ کر سکے۔"

"شاہ تاتار کی باتیں میری سمجھ سے بہت بلند ہیں۔" چشتانیہ نے الجھتے ہوئے کہا:

"اگر امیر میرے دشمن کی یوں عزت افزائی کرنا چاہتے تھے تو پھر مجھ غریب کو اپنی پناہ میں کیوں لیا۔ ظالم ش کو دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا تھا اور دل چاہتا تھا کہ اس کے سینے میں اپنا خنجر اتار دوں۔"

"نادان لڑکی....." سرائے خانم نے ذرا سختی سے کہا:

"تمہارے لیے یہ سوچنا بھی جرم ہے۔ توقتمش بھی امیر تیمور کی پناہ میں ہے اور امیر اپنی پناہ میں آنے والے ان کی کی ٹیڑھی نظر بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ یاد رکھو اگر تم نے ایسی غلطی کرنے کی کوشش کی تو امیر کے ے ہاتھ دو گی!"

"ملکۂ تاتار۔" چشتانیہ رونے لگی اور بڑی دکھی آواز میں بولی:

"خدا کے لیے مجھے یہ تو سمجھائیے کہ یہ کون سا دستور ہے کہ ظالم اور مظلوم دونوں کو ایک ہی دامن میں پناہ ملے۔ دشمن ایک ہی درخت کے سائے تلے کیسے گزارا کر سکتے ہیں۔"

"ایسا ممکن ہے اور اس کی مثال تم اور توقتمش ہو۔"

ملکہ نے اسے سمجھایا:

"اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ امیر نے تمہیں پناہ دی تھی تو اس کی وجہ صرف انسانی ہمدردی تھی اور توقتمش بکہ امیر کی سیاسی مصلحت اور ملکی ضرورت ہے۔ حکومت کی اپنی الگ مصلحتیں ہوتی ہیں۔ کبھی میدان میں دشمن کے پر تلوار اتاری جاتی ہے تو کبھی اسی دشمن کو سینے سے لگایا جاتا ہے۔ امیر کو تمہارے کرب کا احساس ہے لیکن اور توقتمش کو بھی پناہ دینے پر مجبور تھے۔ تاہم تمہیں فکرمند نہیں ہونا چاہیے۔"

"کیا توقتمش کو معلوم ہے کہ میں آپ کے قدموں میں موجود ہوں؟" چشتانیہ کو ایک اور سوال یاد آ گیا۔

"ہر گز نہیں"۔ ملکہ نے اسے تسلی دی:

"اگر اسے علم ہو جائے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ بات تو تیمتش بھی جانتا ہے کہ امیر تیمور کی کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جا سکتا"۔

ملکہ سرائے خانم کا جواب اس قدر واضح تھا کہ چشتانیہ کو مزید کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس نے خود کو کے حوالے کر دیا..... اور تقدیر پہ شاکر ہو کے بیٹھ گئی۔

O

دوسرے دن امیر تیمور نے ارس خان کے قاصد کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ دربار میں تاتاریوں بڑے تمام سردار موجود تھے۔ تیمور بعض اہم فیصلوں کے وقت دربار میں صوفیائے کرام اور علمائے دین کو بھی اس وقت وہاں کئی صوفی اور عالم بھی دکھائی دے رہے تھے۔

تیمور روایتی نمدے کی مسند پر بڑی تمکنت سے بیٹھا تھا۔ مغل شہزادے توقتمش کو اس نے پہنا کر اپنی پشت پر کھڑا کیا تھا تاکہ قاصد پر یہ واضح ہو جائے کہ امیر تیمور کے دل میں اب تک مغلوں کی عزت وہ مغلوں کو بادشاہ تو سمجھتا ہے لیکن اب ان کی جگہ شاہی مسند نہیں بلکہ امیر تیمور کی پشت پر کھڑے ہو کر اس کے لیے دعا کرنا اور دربار یہ تیمور کی شان بڑھانا ہے۔

خاقان ارس خان کے قاصد کو دربار میں سرداروں کے درمیان کھڑے ہونے کی اجازت دی گئی میں سناٹا تھا۔

امیر تیمور نے قاصد کو مخاطب کیا:

"اے مغل حاکم ارس خان کے قاصد..... ہم تجھے تیموری دربار میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ آگے قدم وہ پیغام پیش کر، جو مغل حاکم نے ہمیں بھیجا ہے"۔

قاصد نے تیمور کی نظروں سے نظریں ملائیں لیکن مرعوب ہو گیا اور نظر نیچی کرتے ہوئے بولا:

"خاقان کا پیغام زبانی ہے۔ بیان کرنے کی اجازت دی جائے"۔

"اجازت ہے۔ پیغام سب حاضرینِ دربار کے سامنے سنایا جائے"۔ تیمور مسند پہ پہلو بدل کر بیٹھ گیا۔

قاصد نے دربار پر طائرانہ نظر ڈالی۔ پھر پوری آواز سے گرج کر کہا:

"اے تیمور لنگ.....!"

قاصد کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہی تھے کہ دربار میں ایک ساتھ کئی تلواریں نیام سے نکل آئیں۔ تاتاری سرداروں کے چہرے غصے سے سرخ ہو گئے۔ پتلیاں چڑھ گئیں اور سرگوشیوں کی سرسراہٹ یوں بلند ہوئی جیسے کسی نے شہد کی مکھیوں کو چھیڑ دیا ہو۔ اور وہ بھنبھناتی ہوئی کسی تنگ جگہ گھس آئی ہوں مگر تیمور کے چہرے پہ ایک شکن تک نہیں تھی۔ وہ اس تحقیر آمیز خطاب پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

قاصد نے کہنے کو تو جوشِ خطابت میں تیمور کو "تیمور لنگ" کہہ دیا لیکن تاتاری سرداروں کے بگڑے تیور اور نیام سے جھانکتی ہوئی تلواریں دیکھ کر اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ وہ بجائے آگے کچھ کہنے کے، چپ ہو کر کھڑا ہو گیا۔

ایک مغل سردار آگے بڑھ کر بولا:

"اے امیرِ تاتار! مجھے اجازت دی جائے کہ اس گستاخ کا سر قلم کر دوں"۔

تیمور نے سردار کو جواب دینے کے بجائے سر گھما کر صوفیائے کرام اور علماء دین کی طرف دیکھا اور متانت سے کہا:

"اے دینِ اسلام کے نقیبو! اگر کسی ملک کا قاصد گستاخی پر آمادہ ہو، جو کہ ہمارے خیال میں گستاخی نہیں ہے تو اس کے بارے میں شرع کیا کہتی ہے؟"

"اے امیرِ تاتار!" ایک عالم نے جواب دیا:

"قاصد کسی ملک اور کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ اسلامی روایات کے تحت وہ صرف قاصد ہے۔ اس کی کسی بات، کلام یا اندازِ گفتگو پر نہ تو گرفت کی جا سکتی ہے اور نہ سزا دی جا سکتی ہے"۔

اسی وقت تیمور دربار میں موجود مغل سردار بیان آگے بڑھا۔ یہ نوجوان بڑا جوشیلا تھا اور جتہ مغلوں کے بڑی خاقان کے سپہ سالار بیک جک کا بیٹا تھا جس وقت مغلوں کو شکست ہوئی تھی تو بیک جک گرفتار ہو کر تیمور کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ تیمور نے اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے دشمن کے سپہ سالار کی جان بخشی کی تھی۔ بیک جک اس سلوک سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ مغل لشکر میں جانے کی بجائے وہ تیمور کا ملازم ہو گیا تھا۔ بیان نے یہ سب کچھ دیکھا تھا دربار کے بعد اب خود بھی تیموری لشکر میں ایک اعلیٰ سردار کی حیثیت سے ملازم تھا۔ اس نے سر جھکا کر بھاری آواز میں کہا:

"اے شاہِ تاتار اور امیرِ عالم! میں نہیں جانتا کہ تاتاریوں میں گستاخ قاصدوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے لیکن میں مغل ہوں اور مغل اپنے بادشاہ کی توہین کسی کی زبان سے بھی نہیں سن سکتے۔ اگر تاتاری سرداروں کو اس گستاخ قاصد کا سر قلم کرنے میں ہچکچاہٹ ہے تو مجھے اجازت دی جائے۔ میں اپنے خنجر سے اس کی زبان تراشوں گا تاکہ امیر کی شان میں آئندہ کوئی گستاخی نہ کر سکے"۔

تیمور نے اسے اشارے سے روک دیا اور قاصد سے بولا:

"ارس خان کا قاصد اپنا بیان جاری رکھے اور ہماری ناراضگی کی قطعی پروا نہ کرتے ہوئے پیغام کے وہ الفاظ دہرائے جو ارس خان کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔"

قاصد نے سنبھل کر کہنا شروع کیا:

"میرے خاقان نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ کو ان الفاظ میں پیغام دوں..... اے تیمور لنگ! ارس خان جو حاکمِ شرق و غرب اور سبز غول، نیلے غول اور سفید غول کا خاقان ہے، توقتمش نے اس کے بیٹے کو قتل کر دیا اور تمہارے پاس پناہ لی ہے۔ اسے میرے حوالے کر دو، ورنہ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"اے علمائے کرام!" تیمور نے علماء کو مخاطب کیا۔

"پناہ میں آئے ہوئے شخص کے لیے کیا حکم ہے؟"

"پناہ میں آیا ہوا شخص پناہ دینے والے کے لیے اس کی جان سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔" ایک عالمِ دین نے فوراً جواب دیا۔

"شرافت، دوستی اور مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا کہ پناہ میں آئے ہوئے شخص کو کسی خوف یا لالچ کی وجہ سے اس کے دشمن کے حوالے کر دیا جائے۔"

تیمور ایک لمحے تک خاموش رہا۔ اس نے سر جھکا کر کچھ سوچا۔ شاید وہ جواب کے لیے الفاظ تلاش کر رہا تھا۔ اس نے بڑے وقار سے پہلے اپنے سرداروں کو مخاطب کیا:

"اے سلطنتِ تیموریہ کے وفادارو! تمہیں یہ بات ناگوار گزری کہ ارس خان نے تمہارے امیر کو تیمور لنگ کے الفاظ سے مخاطب کیا۔ تمہارا غم و غصہ اپنی جگہ۔ لیکن یقین کرو کہ میں اس طرح کے خطاب سے خوش ہوتا ہوں۔ اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ مجھے یہ علم ہو جاتا ہے کہ ابھی میری مملکت کے اردگرد ایسے خودسر لوگ موجود ہیں جو میری توہین اور تحقیر برسرِعام کرنے کی جرأت بھی رکھتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب مجھے کوئی تیمور لنگ کہتا ہے تو مجھے اپنے آباؤاجداد کا یہ قول یاد آ جاتا ہے کہ بہادروں کی اصل جگہ محلاتِ شاہی نہیں بلکہ گھوڑے کی پیٹھ اور میدانِ جنگ ہے اور بہادروں کی مردانگی زخم کھا کر مسکرانا اور زخم پہنچا کر خوش ہونا ہے۔"

تیمور ذرا دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے قاصد کی طرف دیکھ کر کہا:

"اے ارس خان کے سفیر! تم نے دیکھ لیا کہ شہزادہ توقتمش ہمارے ساتھ ہے اور اس دربار میں موجود ہے اور ہم اس مغل شہزادے کا کس قدر احترام کرتے ہیں۔ شہزادے کو ہم نے اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔ جاؤ اور ارس خان سے کہہ دو کہ ہم نے اس کا پیغام سن لیا ہے اور پورا تاتاری لشکر مغل شہزادے کی حفاظت کرے گا۔ ہم اسے تمہارے ظلم سے بچائیں گے۔ ارس خان سے یہ بھی کہنا کہ اس نے تاتاریوں کو جنگ کے لیے للکارا ہے تو تاتاری بھی اسے

...دعوت دیتے ہیں۔"

تیمور کے اعلان سے دربار میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سرداروں نے نعرے بلند کرنا شروع کر دیے اور قاصد کے جاتے ہی جنگی تیاریوں میں اضافہ کر دیا گیا۔

جنگ ناگزیر ہو چکی تھی۔ تیمور کو سفید غول سے جلد یا بدیر جنگ تو کرنا ہی تھی۔ توقتمش کی آمد نے اس جنگ کو قریب کر دیا تھا۔ تیمور نے توقتمش کو سرحد کے دو قلعے دیے۔ یہ قلعے اس نے حال ہی میں مغلوں سے چھینے تھے۔ توقتمش کی ضرورت کے مطابق تاتاری سپاہی اور افسر دیے گئے..... بے شمار زر و جواہر کے علاوہ اس کے لیے ہتھیاروں، اونٹوں، خیموں حتیٰ کہ نقارہ، طبل اور علم کا بھی انتظام کر دیا گیا۔

جب شہزادے توقتمش کا لشکر کیل کانٹے سے درست ہو گیا تو تیمور نے اسے شمال کی طرف بڑھنے اور قسمت آزمائی کی اجازت دے دی۔ تمام بڑے بڑے تاتاری سردار شہزادے کو الوداع کہنے کے لیے موجود تھے۔ توقتمش بے حد خوش تھا۔ وہ بڑی شان سے گھوڑے پر سوار ہوا مگر گھوڑے پر بیٹھتے ہی کچھ ایسا مغرور ہوا کہ اس نے تیمور کو الوداعی سلام بھی نہیں کیا اور لشکر لے کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

تیمور نے اس کی اس کوتاہی کو بدحواسی پر محمول کیا اور خاموش رہا۔

○

خاقان ارس خان کو تیمور کا جواب پہنچ چکا تھا اور وہ تیار ہو کر تاتاری سرحدوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ توقتمش کی ارس خان کے لشکر سے جلد ہی مڈبھیڑ ہو گئی۔ ارس خان کے لشکر کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ وہ پہلے بھی توقتمش کو شکست دے چکے تھے۔

توقتمش کو ارس خان سے اس قدر جلد جنگ ہونے کا خیال ہی نہ تھا۔ وہ ارس خان کو اپنے سر پر دیکھ کر گھبرا گیا۔ تاتاری لشکر نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن توقتمش کو اپنی پہلی شکست کا خیال آ گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ گرفتار ہو کر ارس خان کے ہاتھوں مارا جائے اس لیے دباؤ پڑتے ہی اس نے پسپائی اختیار کی۔ توقتمش کے باوجود تاتاری سرداروں نے مشورہ دیا کہ اگر ہم اسی طرح پسپا ہوتے رہے تو ہماری شکست یقینی ہے، اس لیے ہمیں ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے لیکن توقتمش دشمنوں سے اس قدر مرعوب ہو گیا تھا کہ وہ قدم نہ جما سکا۔ وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے بلند پہاڑ تک آ گیا۔ یہاں کچھ دیر تاتاریوں اور مغلوں میں زبردست مقابلہ ہوا لیکن توقتمش کی غلط حکمتِ عملی کی وجہ

سے تاتاری لشکر کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔

توقتمش شکست کھا کر سمرقند آیا تو امیر تیمور نے اس سے باز پرس کرنے کے بجائے اس کی دلجوئی کی۔ تاتاری سرداروں نے امیر تیمور سے شکایت کی کہ توقتمش تاتاری لشکر کی سرداری کے لیے موزوں نہیں ہے۔ اس کے بجائے کسی تاتاری کو سپہ سالار بنا کر بھیجا جائے لیکن امیر تیمور کو توقتمش کی شکست و فتح کی کچھ زیادہ پروا نہ تھی۔ اس نے تو مغلوں کے خلاف ایک طرح کی آزمائشی جنگ کا آغاز کیا تھا۔ اس جنگ کے ذریعے وہ ارس خان کی طاقت کا اندازہ کرنا چاہتا تھا تاکہ جب خود میدان میں اترے تو پوری طرح تیار ہو اور ارس خان کی طاقت کا پہلے ہی وار میں خاتمہ کر دے۔

امیر تیمور نے شہزادہ توقتمش کو ایک اور موقع دیا۔ اس کے لیے پہلے سے زیادہ لشکر کا انتظام کیا گیا۔ تیمور کے دل میں کچھ ہی ہو لیکن وہ توقتمش پر بے حد مہربان نظر آتا تھا۔ دراصل وہ سانپ کو دشمن کی لاٹھی سے مارنا چاہتا تھا۔ اس کا مقصد مغلوں کو مغلوں سے لڑانا تھا اور وہ اس میں کسی حد تک کامیاب بھی رہا تھا

توقتمش خان اور ارس خان کی پہلی جنگ کے دوران کئی مغل قبائل توقتمش سے آملے تھے اور وہ توقتمش کی طرف سے ارس خان سے لڑے تھے۔ پھر جب وہ شکست کھا کر واپس آیا تو بہت سے مغل سوار اس کے ساتھ تھے۔ تیمور نے توقتمش کے لشکر کے لیے سرحد پر خیمے لگوا دیے تاکہ توقتمش کا ساتھ دینے والے مغل وہاں تک پہنچ کر اس کے لشکر میں شامل ہو جائیں۔ چنانچہ جب توقتمش نے دوسری بار دریائے سیر کو عبور کیا تو اس کے ساتھ کئی ہزار مغل سوار بھی ہو گئے۔

امیر تیمور نے شکست خوردہ توقتمش کو اس دفعہ بھی پہلے جیسی شان و شوکت اور اہتمام سے رخصت کیا اور اسے یہاں تک اعزاز بخشا کہ اپنا خاص گھوڑا توقتمش کو سواری کے لیے دیدیا۔

توقتمش نے جب دریا عبور کیا تو اس کا خیال تھا کہ ارس خان کا لشکر دوسری جانب موجود ہوگا لیکن وہاں ارس خان کے لشکر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ارس خان نے گو کہ توقتمش کو شکست دے دی تھی لیکن اس مختصر جنگ سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ تاتاری، روسیوں اور مغربی یورپ کے سواروں سے کہیں زیادہ چست چالاک اور بہادر ہیں۔ پھر اسے یہ بھی خیال تھا کہ ممکن ہے توقتمش کے عقب میں تیمور کسی بڑے لشکر کے ساتھ موجود ہو۔ اس لیے وہ اپنی کامیابی کے بعد پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس نے دریائے سیر سے کئی منزل دور اپنی خیمہ گاہ قائم کی تھی اور وہاں ٹھہر کر مزید لشکر جمع کر رہا تھا۔

توقتمش ڈر ڈر کر شمال کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ اس کی اس بڑھی ہوئی احتیاط پر، جسے تاتاری بزدلی سے تعبیر کرتے تھے، تاتاری سردار دل ہی دل میں ہنستے تھے مگر کوئی اعتراض نہ کر سکتے تھے کیونکہ تیمور نے توقتمش کو سپہ سالار مقرر کیا تھا اور تاتاری سرداروں کو اس کی اطاعت کا حکم دیا تھا۔

توقتمش چوروں کی طرح دبے قدموں آگے بڑھتا رہا۔ . . . پھر ایک دن جاسوسوں نے اسے اطلاع دی کہ ارس خان لشکر کے ساتھ آندھی اور طوفان کی طرح بڑھتا چلا آرہا ہے۔ توقتمش نے فوراً پیش قدمی روک دی اور مورچہ بندی شروع کر دی . . . . حالانکہ اگر وہ چاہتا تو تلاش کر کے کوئی اچھا میدان منتخب کر سکتا

توقتمش سے دوسری غلطی یہ ہوئی کہ جب ارس خان کا لشکر اس کے سامنے پہنچا تو دوپہر ڈھل رہی تھی۔ تاتاری سرداروں نے ارس خان کے تھکے ہوئے لشکر پر فوراً حملہ کرنے کی درخواست کی لیکن توقتمش شاید مدافعتی جنگ کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے لشکر کو مورچوں سے نکلنے کی اجازت نہ دی۔ دشمن کو آرام کرنے کا موقع مل گیا۔ رات کو سرداروں نے شب خون مارنے کا مشورہ دیا لیکن وہ اس پر بھی رضامند نہ ہوا۔

. . . . پھر جب صبح ہوئی تو توقتمش، دشمن کی صف بندی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ارس خان اس دفعہ پہلے سے زیادہ طاقت کے ساتھ مقابل ہوا تھا۔ توقتمش کی ساری مورچہ بندی دھری کی دھری رہ گئی . . . . ارس خان کا ٹڈی دل لشکر بڑھتا ہوا تاتاریوں پر آپڑا۔ تاتاریوں نے اس آندھی کو روکنے کی بہت کوشش کی۔ توقتمش نے بھی اس دفعہ جرات کا ثبوت دیا اور بڑی بہادری سے لڑا۔ اس کے جسم پر کئی زخم آئے مگر اس نے میدان نہ چھوڑا۔

ارس خان کے خاص دستوں نے توقتمش کو زندہ گرفتار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ہر بار ان کا گھیرا توڑ کر نکل گیا۔ ارس خان نے اعلان کیا تھا کہ توقتمش کو زندہ پکڑا جائے تاکہ وہ اپنے بیٹے کے قاتل کو مقتول شہزادے کی قبر کے پاس لے جا کر سولی پر چڑھائے لیکن ارس خان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔

جب توقتمش لڑتے لڑتے زخموں سے چور ہو گیا اور اسے گھوڑے پر بیٹھنا مشکل ہو گیا تو اس نے تیمور کے جنگی گھوڑے کی گردن پر سر رکھ دیا اور اس کی رامیں چھوڑ کر ایال سے چمٹ گیا۔ سمجھدار گھوڑے نے اپنے سوار کی حالت کا اندازہ لگا لیا اور ان مغلوں پر جا پڑا، جو توقتمش کو گھیرے ہوئے تھے۔ مغل سوار گھبرا کر ایک لمحے کے لیے ادھر اُدھر ہوئے اور گھوڑا سنسناتے ہوئے تیر کی طرح اُن کے درمیان سے نکل گیا۔ مغل سوار ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

توقتمش کو ارس خان کے ہاتھوں دوبارہ شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کے میدان سے نکلتے ہی تاتاری لشکر نے بھی میدان چھوڑ دیا . . . . ارس خان نے اب بھی احتیاط کا دامن نہ چھوڑا۔ اس نے اپنے لشکر کو تعاقب سے روک دیا اور خود لڑتا ہوا اسی جگہ واپس چلا گیا جہاں سے چل کر وہ توقتمش کے مقابلے پر آیا تھا۔

زخمی توقتمش جس وقت میدان سے نکلا تو سہ پہر تھی۔ گھوڑا اپنے سوار کو لیے شام تک بھاگتا رہا۔ جنگی گھوڑے راستہ بھی پہچانتے ہیں۔ انہیں اس بات کا بھی ادراک ہوتا ہے کہ شکست کی صورت میں انہیں کدھر اور کہاں واپس جانا ہے۔ گھوڑا دریائے سیر پار کر کے شمال کی طرف بڑھتا تھا . . . . اندھیرا ہو جانے کے باوجود وہ کہیں نہ رکا۔

اور صبح کے قریب بھوکا پیاسا دریائے سیر کے کنارے پہنچ گیا۔

پھر جب گھوڑا رکا اور توقتمش کی نظر دریائے سیر پر پڑی تو وہ گھوڑے کی سمجھداری پر حیران رہ گیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں سے دریا پار کرکے وہ جنوب کی طرف روانہ ہوا تھا۔

توقتمش گھوڑے سے اترا۔ اس نے گھوڑے کے سر اور پیٹھ پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔ گھوڑے نے ہنہنا کر ... کا اظہار کیا۔ توقتمش نے اسے چرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ ۔ ۔ ۔ اور خود اپنے زخموں کی مرہم پٹی کرنے لگا۔ جتنی دیر میں وہ ابھی مرہم پٹی سے فارغ ہوا گھوڑا بھی گھاس چر کر اور پانی پی کر تازہ دم ہو گیا تھا۔ توقتمش کو اب اپنے پکڑے جانے کا خدشہ تھا اس لیے وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور دریا پار کرکے تاتاری علاقے میں پہنچ گیا۔

وہاں پہنچ کر ایک نئے خیال نے اسے پریشان کرنا شروع کر دیا۔

توقتمش کی پہلی شکست کے سلسلے میں تیمور نے اس سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی تھی حالانکہ تاتاری سرداروں نے اس کی غلط حکمت عملی کی شکایت کی تھی۔ توقتمش کو خطرہ پیدا ہوا کہ اس دوسری شکست پر تیمور اس سے ضرور باز پرس کرے اور پتہ نہیں، اس کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ پہلے اس نے دریا پار کرکے سمرقند جانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اسے تیمور کے سامنے جاتے ہوئے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ ہر چند کہ اس نے ارس خان کے مقابلے میں بڑی شجاعت کا مظاہرہ کیا تھا آخری وقت تک میدان نہ چھوڑا تھا لیکن بعض تاتاری سردار اس سے ناراض تھے اور وہ تیمور کے سامنے اس کی شجاعت کو گھٹا کر اور اس کی غلطیوں کو بڑھا کر پیش کر سکتے تھے۔ ان حالات اور خیالات نے اس کے قدم روک دیے اور وہ سمرقند کا سفر ملتوی کرکے گھوڑے سے اتر پڑا۔

توقتمش کے زخموں کی تکلیف تو کچھ کم ہو گئی تھی لیکن راستے کی تھکن سے جسم چور چور تھا۔ اس نے کچھ جنگلی غذا اور تازہ پھل کھا کر پیٹ بھر لیا تھا لیکن اس کا دماغ سخت پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اور کدھر جائے؟

آخر اس نے گھوڑے کو چرنے کے لیے چھوڑ دیا اور خود ایک سایہ دار درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ تھکن اور نیند کے غلبے نے اس پر ایسا حملہ کیا کہ وہ اسی حالت میں سو گیا اور ایسی گہری نیند سویا کہ دوپہر ڈھلے تک ہوش نہ آیا۔

یہ وہ وقت تھا کہ تاتاری لشکر کے شکست خوردہ دو دو چار چار کرکے دریائے سیر کے کنارے پہنچ رہے تھے۔ ان سواروں کو شکست سے زیادہ توقتمش کے غائب ہونے کی فکر تھی۔ میدان جنگ میں جو سوار توقتمش کے قریب لڑ رہے تھے ان میں ایک سوار ان لوگوں میں موجود تھا۔ اس کا بیان تھا کہ اس نے توقتمش کو زخم کھا کر گھوڑے کی پیٹھ پر جھکتے دیکھا تھا۔ ۔ ۔ ۔ پھر گھوڑا اسے لے کر میدان سے نکل گیا تھا۔ اس سے سواروں کو یہ تو اندازہ ہو گیا کہ توقتمش

زندہ ہے کیونکہ جب گھوڑا اسے لے کر میدان سے نکل گیا تو پھر اس کے پکڑے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

"وہ ہمارے امیر کا گھوڑا ہے" ایک سوار نے کہا۔

"ہمارے امیر پر خدا کی رحمت ہے اس لیے ان کا گھوڑا بھی سب سے زیادہ تیز رفتار ہے۔

پھر کیا عجب کہ وہ اس دریا پر ہم سے پہلے پہنچ گیا ہو" ایک بوڑھے برلاس سردار نے خیال ظاہر کیا۔

"ٹھیک ہے" دوسرے نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا:

"مجھے یقین ہے کہ وہ دریا پار کرکے سمرقند کی طرف گیا ہے اس لیے ہمیں بھی سمرقند چلنا چاہیے۔"

پھر سب سوار بوڑھے برلاس کے پیچھے پیچھے دریا پار کرنے لگے۔ بوڑھا برلاس سب سے آگے تھا۔ اچانک اس کی نظر ایک طرف اٹھی اور وہ خوشی سے چلایا:

"امیر کا اقبال بلند ہو۔ اس کا گھوڑا ادھر چر رہا ہے۔"

گھوڑا دریا سے کچھ دور بڑے اطمینان سے ہری ہری گھاس چرنے میں مصروف تھا۔ وہ سب گھوڑے کے نزدیک آ کر اور اس کے گرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ گھوڑا چند لمحوں تک ان کی طرف دیکھتا رہا پھر ہنہناتا ہوا ایک طرف کو چل پڑا۔ آنے والے سب سوار اس کے پیچھے ہو لیے۔

گھوڑا میدان پار کرکے جنگل میں داخل ہوا اور اس درخت کے نیچے پہنچ گیا جہاں توقتمش گہری نیند میں پڑا تھا۔

"شہزادہ توقتمش۔ ۔ ۔ ۔ سپہ سالار!" برلاس سردار نے اسے بڑے ادب سے آواز دی۔

توقتمش ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا:

"اوہ۔ ۔ ۔ ۔ تم۔ ۔ ۔ ۔" یہ کہتے ہوئے اس نے خجالت سے سر جھکا لیا۔

"شہزادے! دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں۔"

بوڑھے برلاس نے اسے تسلی دی:

"ہم نے امیر کی ضرور کوئی نافرمانی کی ہے جبھی ہمیں دوسری بار شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔"

توقتمش کے زخموں میں ابھی تکلیف تھی لیکن وہ خود کو سنبھال کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا:

"امیر کی نافرمانی نہیں بلکہ ہماری اپنی غلطی ہے۔ بہرحال، اب بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ میں تمہارا ہر مشورہ مانوں گا بالکل ٹھیک ہے تو بھی میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"نہیں شہزادے!" برلاس سردار سر ہلاتے ہوئے بولا:

"ہم نے شکست کھائی ہے۔ ہم امیر کے سامنے اس کا اعتراف کریں گے۔ آپ ہمارے ساتھ سمرقند واپس چلیے۔"

"میں کس منہ سے امیر کا سامنا کروں گا؟" توقتمش بڑے کرب سے بولا،
"اس سے تو بہتر تھا کہ میں میدان ہی میں قتل کر دیا گیا ہوتا!"
"آپ نے دشمن کو پیٹھ نہیں دکھائی شہزادے"۔ بوڑھا سردار نے متانت سے کہا:
"ہم دربار میں اس کی شہادت دیں گے۔ امیر کبھی کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتے۔ وہ آپ کو معاف کر دیں گے۔ وہ صرف بزدلوں اور میدان سے بھاگنے والوں کو معاف نہیں کرتے..... اور انہیں سزا دیے بغیر نہیں چھوڑتے"۔

شہزادہ توقتمش نے سمرقند پہنچ کر بھی تین روز تک امیر تیمور کا سامنا نہیں کیا۔ تیمور کو معلوم تھا کہ شکست نے توقتمش کے حوصلے پست کر دیے ہیں۔ اس نے بھی توقتمش کو نہیں بلوایا۔ اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ جب ایک ہفتے کے بعد توقتمش کی شرمندگی ذرا کم ہوئی اور اس کے زخم بھی بھر گئے تو وہ دربار میں گیا۔

تیمور نے اسے سابقہ مرتبے پر رکھا اور شکست کے بارے میں بھی اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ تیمور کو اس کے سرداروں سے شہزادے کی بہادری اور شجاعت کا حال معلوم ہو چکا تھا۔ اس کے دل میں توقتمش کے لیے اب بھی ویسی ہی محبت اور مروت موجود تھی۔

توقتمش کے لیے کریمیا کی سرزمین دیارِ غیر ہو گئی اور اس کی بازیابی سے ناامید ہو گیا۔ اس نے یہی غنیمت سمجھا کہ سمرقند میں رہ کر زندگی کے باقی ایام تاتاریوں کی پناہ میں گزار دے۔ اس دوران اس کا جیشتانیہ سے کئی بار آمنا سامنا ہوا۔ وہ جیشتانیہ کو نہیں پہچانتا تھا لیکن جیشتانیہ اپنے محبوب شوہر کے قاتل کو کس طرح بھول سکتی تھی۔ وہ جب توقتمش کو دیکھتی تو جوشِ انتقام سے سلگ اٹھتی..... مگر جلد ہی وہ اپنے جذبات پر قابو پا لیتی۔ اسے سرائے خانم کی تنبیہ اور تاکید یاد آ جاتی..... وہ جذبات کی رو میں بہہ کر کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتی تھی جس کی وجہ سے وہ اس پناہ گاہ سے بھی محروم ہو جائے۔

پھر جلد ہی مغلوں کے سنہرے غول میں ایک انقلاب برپا ہوا۔ توقتمش کی قسمت نے یکایک پلٹا کھایا۔ اس کا طاقتور دشمن خاقانِ شرق و غرب ارس خان کا انتقال ہو گیا۔

اس اطلاع نے توقتمش کو قسمت آزمائی کا ایک سنہرا موقع دیا۔ اس نے تیمور سے کریمیا جانے کی اجازت چاہی۔ [تیمور] نے اسے غیر مشروط طور پر اجازت دے دی۔

[تو]قتمش جلد از جلد کریمیا پہنچنا چاہتا تھا۔ تیمور نے احتیاط کے طور پر اس کے ساتھ دس تاتاری سوار کر دیے [کہ اگر تو]قتمش کو اقتدار حاصل ہو جائے تو یہ سوار اسے، امیر تیمور اور اس کے احسانات کی یاد دلاتے رہیں۔

[سن]ہرے غول میں ارس خان کے مرنے سے ایک خلا پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا بیٹا پہلے ہی توقتمش کے ہاتھوں [مارا جا چکا] تھا۔ اب اس کے سوا کوئی دوسری اولاد نہیں تھی۔ خاقانِ شرق و غرب کی جانشینی کا مسئلہ پیدا ہوا تو اس علاقے [کے] دعویدار اکٹھے ہو گئے۔ فیصلہ سنہرے غول کے خاقانِ اعظم مانی خان کو کرنا تھا۔ اس فیصلے میں اسے یہ دشواری [پیش آ رہی] تھی کہ ارس خان کے علاقے میں شہزادہ توقتمش کے قبیلے کے لوگ زیادہ آباد تھے اور وہ توقتمش کے علاوہ کسی اور [کو ت]سلیم کرنے پر رضامند نہ تھے۔

[ما]نی خان اگرچہ توقتمش کا قریبی عزیز تھا لیکن توقتمش نے ارس خان کے بیٹے کو بلاوجہ قتل کر کے جو فتنہ اٹھایا تھا [اس]سے وہ توقتمش کے خلاف ہو گیا تھا..... پھر وہ دوبارہ ارس خان کے مقابلے پر تاتاری لشکر لے کر [آیا تھا۔ اس]ی نے مانی خان کو توقتمش سے اور زیادہ برگشتہ کر دیا تھا۔

[م]انی خان ابھی اپنے مرکز سرائے باتو میں بیٹھا اس جانشینی کے مسئلے پر اپنے سرداروں سے مشورہ کر رہا تھا کہ شہزادہ [توقتمش ب]ڑی خاموشی سے کریمیا میں داخل ہوا۔

[و]ہ ایک اندھیری رات تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دیتا تھا۔ توقتمش بے دھڑک کریمیا کی سرحدی چوکی میں داخل [ہوا۔ چند] خیموں پر مشتمل یہ چوکی ارس خان نے قائم کی تھی۔ چوکی کے مغل محافظ آگ کے گرد بیٹھے باتیں کر رہے [تھے۔ گھوڑ]وں کی ٹاپیں سن کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"[کون] ہے؟" ایک محافظ نے تلوار کھینچ کر آواز لگائی۔

[تو]قتمش کا گھوڑا سب سے آگے تھا۔ اس نے بغیر رکے جواب دیا:

"[و]الیِ کریمیا، شہزادہ توقتمش"۔

[شہ]زادے کا نام سن کر محافظوں کے ہاتھوں میں تلواریں کانپنے لگیں۔ توقتمش آگ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ تمام [محافظ] اسے دیکھ رہے تھے۔ توقتمش تلوار بلند کیے بڑی شان سے گھوڑے پر بیٹھا تھا۔ پھر اس کی بارعب [آواز گونجی:]

"[دو]ست یا دشمن؟..... جنگ یا امن؟..... جواب دو"۔

"[آق]ا! ہم آپ کے سامنے ہتھیار کیسے اٹھا سکتے ہیں؟" ایک محافظ نے سر جھکا کر کہا اور تلوار زمین پر پھینک

دوسرے محافظوں نے بھی تلواریں پھینک دیں۔ توقتمش نے تلوار نیام میں ڈالی اور مسکراتا ہوا گھوڑے سے اترا۔ تاتاری سوار بھی آگ کے قریب پہنچ چکے تھے اور مغل محافظ انہیں تیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"ان سے خطرہ نہیں۔ یہ دوست ہیں"۔ توقتمش نے مغل محافظوں کی نظریں پڑھتے ہوئے کہا:

"انہیں ایک خیمے میں ٹھہراؤ"۔

تاتاری سواروں کے لیے ایک خیمہ خالی کر دیا گیا۔ انہوں نے گھوڑے قریب ہی باندھ دیے اور خیمے میں چلے گئے۔

توقتمش کے آنے کی خبر پوری چوکی میں پھیل گئی۔ خیموں میں سونے والے محافظ بھی جاگ پڑے اور شہزادے کو خوش آمدید کہنے کے لیے اس کے گرد جمع ہو گئے۔

ارس خان نے کریمیا پر قبضہ کرنے کے بعد وہیں کے ایک سردار کو کریمیا کا عارضی حاکم بنا دیا تھا۔ اس لیے ابھی کریمیا کے فوجی، محافظوں کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ پرانے آقا کو اپنے درمیان دیکھ کر وہ بہت خوش ہو رہے تھے۔ وہ شہزادے کو ایک بڑے خیمے میں لے گئے اور پھر وہاں باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

توقتمش کے ساتھ آنے والے تاتاری سوار خیمے میں بیٹھے بری طرح پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ ان کا خیمہ شہزادے کے بڑے خیمے سے کچھ فاصلے پر تھا۔۔۔۔ پھر بھی شہزادے کے خیمے سے بلند ہونے والے قہقہوں کی آوازیں وہاں تک پہنچ رہی تھیں، جنہیں سن کر انہیں زیادہ تاؤ آ رہا تھا۔ رات کا کھانا انہوں نے الگ کھایا تھا۔ حالانکہ ان کے پاس سفری خشک غذا موجود تھی لیکن توقتمش نے انہیں روک دیا تھا اور کہا تھا کہ چوکی پر پہنچ کر شاندار کھانا کھائیں گے اور اب شہزادہ اپنوں میں پہنچ کر تاتاری سواروں کو بالکل فراموش کر بیٹھا تھا۔ آدھی رات گزر جانے کے باوجود انہیں اب تک کھانا نہیں بھیجا گیا تھا۔۔۔۔ پھر انہوں نے مجبور ہو کر توقتمش کے کھانے پر لعنت بھیجی اور ایک ساتھی کو باہر بھیجا کہ وہ خورجیوں میں کھانے کو جو کچھ موجود ہو لے آئے۔

ایک تاتاری خیمے سے باہر نکلا۔ انہوں نے گھوڑے ابھی نہیں کھولے تھے۔ سب سامان ان پر لدا تھا۔ تاتاری گھوڑے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ توقتمش کے خیمے سے ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ اس قہقہے میں بہت سے لوگوں کی آوازیں شامل تھیں۔

تاتاری کو توقتمش کی اس بے مروتی اور لاپروائی پر سخت غصہ آیا۔ وہ خورجیوں سے کھانا نکالنے کے بجائے توقتمش کے خیمے کی طرف بڑھا۔

مغل محافظوں کے تمام خیمے اسے خالی معلوم ہوئے۔ وہ سمجھ گیا کہ تمام محافظ، شہزادے کے خیمے میں جمع خوشیاں منا رہے ہیں۔

تاتاری احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا توقتمش کے خیمے کے پاس پہنچ گیا۔ خیمے کا پردہ اٹھا ہوا تھا اور خیمہ درجنوں مشعلوں کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ محافظ، شہزادے کو گھیرے بیٹھے تھے۔ پھر یہ دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی کہ یہ لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ کوئی بکرے کی ٹانگ بھنبھوڑ رہا تھا۔۔۔۔ اور کوئی گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے نگل رہا تھا۔

تاتاری خیمے کی پشت پر پہنچ گیا۔ خیمے میں خاموشی تھی۔۔۔۔ سب کھانے میں مصروف تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک محافظ کی آواز سنائی دی۔ وہ توقتمش سے کہہ رہا تھا:

"آقا! تاتاریوں نے آپ کا کتنا ہی ساتھ دیا ہو لیکن مغل، ان کا سایہ تک برداشت نہیں کر سکتے"۔

"ایسا ہی ہونا چاہیے"۔ توقتمش نے اطمینان سے جواب دیا:

"میں خود تاتاریوں سے نفرت ہے لیکن ہمارا ارادہ ہے کہ جب تک ہم پوری طرح طاقت حاصل نہ کر لیں۔ تب تک تاتاریوں سے دوستی رکھیں"۔

"میں آقا کا ہر حکم ماننے کو تیار ہوں"۔ محافظ نے کہا:

"لیکن کریمیا اور منگول علاقوں پر آپ اسی وقت قابو پا سکتے ہیں جب مغل قبائل آپ سے تعاون کریں"۔

"آخر تعاون نہ کرنے کی کیا وجہ ہے؟" توقتمش سخت لہجے میں بولا:

"کیا ہم کریمیا کے حاکم نہیں۔ کیا ہماری رگوں میں مغل خون موجود نہیں؟"

"یہ درست ہے آقا!" محافظ نے جواب دیا:

"لیکن میری درخواست ہے کہ آپ کوئی نیا تجربہ نہ کریں۔ مغل، تاتاریوں کے خلاف ہیں۔ آپ ان تاتاری سواروں کو لے کر آگے بڑھیں گے تو کریمیا کے مغل بھڑک اٹھیں گے۔ سمرقند میں پناہ حاصل کرنے سے آپ کے خلاف بدگمانی ہو گئی ہے"۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر توقتمش بولا:

"پھر تمہارا کیا مشورہ ہے؟ ہمیں مغلوں کا تعاون تو ہر صورت میں حاصل کرنا ہے"۔

"آقا! میں آپ کو کیا مشورہ دے سکتا ہوں؟" محافظ نے انکسار سے کہا:

"میرے خیال میں اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ ہم تاتاریوں کو ساتھ لے جانے کی بجائے صرف ان کے سر نیزوں پر بلند کر کے آگے بڑھیں۔ تاتاریوں کے سر دیکھ کر مغل بہت خوش ہوں گے اور آپ کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جائیں گے"۔

تاتاری سوار کو، جو خیمے کے پیچھے کھڑا یہ باتیں سن رہا تھا، اپنے پیروں تلے سے زمین نکلتی محسوس ہوئی۔ اس نے

توقتمش کا جواب بھی سنا اور ذرا پیچھے ہٹ کر اپنے خیمے کی طرف بھاگا۔ . . . . وہ ہلمپتا کانپتا پہنچا تو
اس کے ساتھی گھبرا گئے۔

"بھاگو بھاگو . . . . جلدی بھاگو" اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔

"کیوں . . . کیا ہوا، خیر تو ہے؟" اس کے ساتھیوں نے ہر طرف سے اس پر سوالوں کی بوچھاڑ

"وہ . . . . مغل ہمیں قتل کرنے کے لیے آرہے ہیں۔ وہ سب کو مار دیں گے" تاتاری نے
سنبھالتے ہوئے کہا . . . . اور پھر تیزی سے اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا۔

دوسرے ہی لمحے تمام تاتاری اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر کریمیا سے جلد از جلد نکل جانے
گھوڑے بھگائے چلے جا رہے تھے۔ تاتاری جس راستے سے کریمیا میں داخل ہوئے تھے، وہ اس سے
تھے مگر رات کا وقت، پھر گرفتاری کا دھڑکا . . . . پتہ نہیں وہ کدھر کے کدھر نکل گئے۔ اس پر ستم
ہی دیر بعد انہیں اپنے پیچھے گھوڑے بھاگتے ہوئے محسوس ہوئے . . . . انہیں یقین ہو گیا کہ مغل ان کا
رہے ہیں۔ اس سے ان پر اور بدحواسی طاری ہو گئی۔ اور وہ زیادہ اندھا دھند بھاگنے لگے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ٹکڑیوں میں بٹ گئے اور ایک کو دوسرے کی خبر نہ رہی . . . . پھر
اور انہیں اپنی سرحد قریب دکھائی دی تو ان کی جان میں جان آئی مگر سرحد پر پہنچنے والوں کی تعداد گھٹ
گئی تھی . . . . باقی پانچ کا پتہ نہ تھا کہ کہاں گئے اور ان پر کیا بیتی۔ دن چڑھے تک انہوں نے ان
کا انتظار کیا۔ پھر مایوس ہو کر سمرقند کی طرف روانہ ہو گئے۔

○

تیمور کو توقتمش کی بڑی فکر تھی کیونکہ وہ مغل شہزادہ، جنگی بساط کا ایک اہم مہرہ تھا۔ اس نے اسے
کو آگے بڑھا کر ارس خان کو شہ دی تھی مگر یہ چال الٹی ہو گئی۔

کریمیا سے واپس آنے والے پانچوں سواروں نے جب کریمیا کی پہلی چوکی پر رونما ہونے والے
حالات بتایا تو . . . . تیمور سناٹے میں آگیا۔ اسے یقین نہیں آیا کہ توقتمش اس سے بے وفائی کر
تیمور نے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے ایک سوار سے پوچھا:
"تم میں سے کون توقتمش کے خیمے پر گیا تھا اور اس نے وہاں کیا سنا۔ کیا توقتمش نے

حکم اپنی زبان سے دیا تھا؟"

سواروں کے پاس تیمور کے سوالوں کا کوئی اطمینان بخش جواب نہ تھا۔ پہلے انہوں نے ایک دوسرے کا منہ
دیکھا پھر ان میں سے ایک جرأت کر کے بولا:

"اے امیر۔ ہم آپ کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتے۔ وہ سوار، جس نے توقتمش کے خیمے پر پہنچ کر، اس کی
باتیں سنی تھیں، اس وقت ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ ہمارے پانچ سوار جو کریمیا سے واپس نہیں آسکے، ان میں وہ
بھی تھا۔"

"بے وقوفو" تیمور چڑ کر بولا:
"تم نے کم از کم اس کی پوری بات تو سنی ہوتی۔ ممکن ہے اسے دھوکا ہوا ہو اور اس نے غلط مطلب نکالا ہو۔"

"امیر۔ ہم سے یہ غلطی ہو گئی" ایک نے مسکین صورت بنا کر کہا:
"وہ گھبرایا ہوا آیا اور بولا کہ جلدی بھاگو۔ توقتمش نے ہمارے بارے میں قتل کا حکم دے دیا ہے۔"

"اور تم لوگ بغیر تصدیق کیے بھاگ کھڑے ہوئے۔ احمق!"
تیمور کو غصہ آگیا: "جاؤ اور باقی سواروں کا انتظار کرو۔ جب وہ واپس آجائیں تو ہمیں اطلاع دینا۔"
تاتاری سوار خاموشی سے واپس چلے گئے۔

. . . . ہفتہ، پندرہ دن، مہینہ گزر گیا مگر باقی پانچ سوار واپس نہیں آئے . . . . وہ واپس آتے بھی کیسے؟
انہیں تو مغلوں نے پکڑ کر ختم کر دیا تھا۔ تیمور نے اس واقعے کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی۔ یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ تاتاری
سواروں کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ توقتمش کی طرف سے بے فکر ہو کر بحیرۂ خزر کی طرف چلا گیا۔ وہاں کچھ قبائل نے شورش
برپا کر رکھی تھی۔ انہیں سزا دینے کے لیے خود تیمور لشکر لے کر گیا تھا۔ راستے میں اسے اطلاع ملی کہ توقتمش نے ارس خان
کے سارے علاقے پر قبضہ کر کے خاقانِ شرق و غرب کا لقب اختیار کر لیا ہے۔

پھر جب وہ بحیرۂ خزر کی شورش ختم کرنے میں مصروف تھا تو اسے بتایا گیا کہ توقتمش نے مغلوں کے خاقانِ اعظم
کو شکست دے کر اسے سرائے باتو سے نکال دیا ہے اور تمام مغلوں اور سنہرے غول کا خاقانِ اعظم بن بیٹھا ہے۔
اس خبر سے اطمینان ہوا . . . . اس نے سوچا کہ توقتمش کے خاقان ہو جانے کے بعد، سنہرے غول سے کسی فوری
خطرے کا امکان نہیں رہا۔ وہ خوارزم کے صدر مقام اور گنج میں دو مہینے اطمینان سے مقیم رہا۔ وہ اس فتنے کو ہمیشہ کے لیے
ختم کر دینا چاہتا تھا۔

○

امیر تیمور کی یہ محض خوش فہمی تھی۔ توقتمش نے کریمیا واپس جاتے ہی احسان، مروت اور دوستی کے تار توڑ دیے تھے۔ اس نے کریمیا کے مغلوں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے تیموری سواروں کے قتل کا حکم دیا تھا۔ ان میں سے پانچ اپنی جانیں بچا کر سمرقند پہنچ گئے تھے لیکن وہ تیمور کو توقتمش کا اصل چہرہ دکھانے پر رہے تھے۔

توقتمش جب سمرقند میں مقیم تھا تو اسے تاتاریوں کے عالی شان محلات اور خوبصورت خیمے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس نے سمرقند میں زر و جواہر کے دریا بہتے دیکھے تھے۔ اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر اسے اقتدار ملا گیا تو سمرقند کی دولت اپنے ویرانوں میں سمیٹ لے جائے گا۔ پھر سنہرے غول کا خاقان ہوتے ہی اس نے اپنے اس فیصلے کو حقیقت میں بدلنے کی کوشش شروع کر دی۔

اس نے اعلان کیا:

"تاتاری سلطنت، سنہرے غول کے لیے پشت کا ناسور ہے۔ میں اس کا خاتمہ کر دوں گا۔"

"خاقان! آپ مغلوں کے آقا ہیں۔" اس کا ایک سردار دبی زبان سے بولا:

"لیکن تیمور نے بُرے وقت میں آپ کو پناہ دی تھی۔ تاتاری لشکر آپ کی کمان میں دے دیا تھا۔ اس کے بڑے احسانات ہیں۔"

توقتمش نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا:

"تم نادان ہو۔ تیمور نے میری مدد نہیں کی۔ اس نے مجھے اروس خان کے مقابلے پر بھیج کر جوا کھیلا تھا۔ وہ اس ذریعے مغل علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اچھا ہوا کہ میں اس کے لشکر کے ذریعے اروس خان کو شکست نہ دے سکا۔ میں نے سنہرے غول کی بادشاہت اپنے آدمیوں کے تعاون سے حاصل کی ہے۔ اس کا مجھ پر کوئی احسان نہیں۔"

"پھر بھی میرے آقا!" مغل سردار نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی لیکن توقتمش نے اسے ڈانٹ دیا:

"تم نہیں جانتے۔ مغل حکومت کے لیے تاتاریوں کا خاتمہ ضروری ہے۔ ایک نیام میں دو تلواریں اور ایک ملک میں دو بادشاہ کیسے رہ سکتے ہیں؟"

توقتمش، مغلوں کا ایک بڑا لشکر لے کر دریائے سیر پار کر آیا۔ اب وہ تاتاریوں کے علاقے میں تھا اور اس نے قتل و غارت کا طوفان برپا کر دیا تھا۔ تاتاریوں کے سرحدی قلعہ داروں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ تیمور کا بیٹا عمر شیخ اس علاقے میں موجود تھا۔ وہ لشکر لے کر بڑھا۔ توقتمش سے ایک سخت معرکہ ہوا لیکن عمر شیخ بھی اس طوفان کو نہ روک سکا۔ وہ بڑی بے جگری سے لڑا لیکن زخمی ہو کر پسپا ہو گیا۔ توقتمش بخارا کے مضافات تک پہنچ گیا۔ اس نے آبادیاں تہس نہس کر دیں اور بڑے محل کو آگ لگا دی۔

تیمور اس وقت خوارزم کے مرکز اُورگاؤں میں مقیم تھا۔ ایک شام ایک شخص اس کے پاس لایا گیا جو بے حد کمزور اور نڈھال تھا۔

اس نے نحیف آواز میں کہا:

"اے امیر! احسان فراموش توقتمش تاتاری علاقوں میں قیامت برپا کر رہا ہے۔ آبادیاں ویران ہو گئی ہیں اور بخارا کے محلات میں آگ بھڑک رہی ہے۔"

"یہ کب کا واقعہ ہے؟" تیمور نے پوچھا۔

"میں دس روز پہلے سمرقند سے چلا تھا۔" سوار نے اٹک اٹک کر بتایا۔

"دس روز . . . !" تیمور نے حیرت سے پوچھا کیونکہ وہاں سے سمرقند کا فاصلہ نو سو میل تھا۔

"جی ہاں۔ اگر میں زخمی نہ ہوتا اور میرے پانچ گھوڑے راستے میں نہ مر گئے ہوتے تو میں کل ہی یہاں پہنچ جاتا۔" اس شخص نے سہارے سے بیٹھتے ہوئے کہا:

"امیر! جلد کوئی قدم اٹھائیں۔ وہ نمک حرام، سمرقند سے صرف چند منزلیں دور ہے۔"

"ہمیں احساس ہے بہادر جوان۔"

تیمور نے گھوڑا لانے کا اشارہ کیا۔ اس کا غلام بھاگ کر گھوڑا لایا۔ تیمور گھوڑے پر سوار ہوا اور مشرق کی طرف رُخ کر کے بولا:

"اے بخارا اور سمرقند کی بستیو! تیمور قسم کھاتا ہے کہ جب تک مغل لشکر کو وہ تاتاری علاقوں سے مار کر بھگا نہیں دے گا، گھوڑے کی رکاب سے پیر نہیں نکالے گا۔"

. . . . اور تیمور نے یہ قسم پوری کی۔

توقتمش تاتاری علاقوں کو پامال کرتا ہوا بڑی تیزی سے سمرقند کی طرف بڑھا لیکن تیمور کی تیز رفتاری نے اسے بے بس کر دیا۔ توقتمش ابھی سمرقند سے دو منزلیں دور تھا کہ تیمور اپنے چند جانثاروں کے ساتھ سمرقند پہنچ گیا۔ اس کا لشکر دوسرے دن پہنچا۔

تیمور کے سمرقند پہنچنے کی خبر نے توقتمش کے قدم روک دیے اور وہ جس تیزی سے حملہ آور ہوا تھا، اسی تیزی سے دریائے سیر عبور کر کے شمالی علاقوں میں غائب ہو گیا۔ بظاہر سمرقند بچ گیا۔ مغل واپس جا چکے تھے لیکن مغلوں کے اس حملے نے تیمور کے دشمنوں کے لیے راہیں کھول دیں۔

بلادِ شمال کے جتہ مغل، جنہیں تیمور حصار المالیق سے آگے تک بھگا آیا تھا، مشرقی دروں میں پھر نمودار ہوئے اور ساتھ ہی اس کی بہو خانزادہ کے صوفی رشتہ داروں نے بھی بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ تیمور کو چو مکھی لڑائی کا سامنا تھا۔

وہ اس سے بھی خراب حالات سے دوچار ہو چکا تھا اس لیے ذرا بھی ہراساں نہ ہوا۔ اس نے لشکر کا ایک حصہ کو شمالی دروں سے نکالنے کے لیے بھیجا اور دوسرا حصہ خوارزم کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ صوفیوں کی بغاوت کا خاتمہ کر دے۔

تیمور ابھی ان انتظامات سے فارغ ہوا تھا کہ توقتمش ایک بار پھر ایک بڑے لشکر کے ساتھ دریائے سیر کے میں داخل ہوا۔ اس وقت شدید سردی پڑ رہی تھی اور تیمور کے پاس فوج کا صرف تیسرا حصہ تھا۔ سمرقند سے شمال کو جانا دعوت دینا تھا۔ تیمور کو کرنا تو اپنی مرضی تھی لیکن وہ سرداروں سے مشورہ ضرور کرتا تھا:

"ہمارے نواحی علاقوں میں توقتمش کا لشکر گھس آیا ہے۔ تمہارے خیال میں ہمیں کیا قدم اٹھانا چاہیے" نے اپنے سرداروں کی رائے معلوم کرنے کے لیے کہا۔

"اے امیر۔ حالات کا تقاضہ یہی ہے کہ ہم وقتی طور پر جنوب کی جانب پسپائی اختیار کریں اور موسم بدلتے ہی مغلوں پر جا پڑیں"۔ یہ ایک تاتاری سردار کا بڑا معقول مشورہ تھا۔

تیمور نے اس مشورے پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس نے دوسرے سرداروں کی طرف دیکھا جیسے رائے طلب کر رہا ہو۔ اس نے تیمور کو اپنی طرف مخاطب دیکھ کر کہا:

"اے امیر۔ اس سخت سردی میں اگر امیر پسند فرمائیں تو سمرقند میں قلعہ بند ہو کر دفاعی جنگ کر سکتے ہیں۔ موسم ٹھیک ہوتے ہی ہم مغلوں کو مار بھگائیں گے۔ ہمارے پاس فوج کا تیسرا حصہ ہے۔ مغلوں سے مقابلے کے لیے پورے لشکر کی ضرورت ہے۔ ہمیں باقی فوج کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیے"۔

یہ رائے بھی کچھ ایسی غیر معقول نہ تھی لیکن تیمور پر اس کا شدید ردعمل ہوا:

"انتظار . . . . ." تیمور شیر کی طرح گرجا:

"کس بات کا انتظار . . . . ہماری آبادیاں پامال ہو رہی ہیں۔ محلات میں آگ لگائی جا رہی ہے اور تم کہتے ہو انتظار کرو . . . . نہ ہم جنوب کی طرف پسپا ہوں گے اور نہ ہی چوڑیاں پہن کر قلعے میں بیٹھیں گے۔ ہم انتظار نہیں کر سکتے۔ ہم اپنی نواحی بستیوں کو دشمن کے رحم و کرم پر کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟"

تیمور کے عزم کے سامنے اس کے سرداروں نے سر خم کر دیے۔ وہ اس تہائی لشکر کو ساتھ لے کر سیر کی طرف چلا۔ اس وقت برفباری ہو رہی تھی اور سرد ہوائیں چل رہی تھیں مگر تیمور نے موسم کی سختی کی پروا نہ کی۔ راستے میں اتنی دلدل تھی کہ بعض جگہ گھوڑے پیٹ تک دھنس جاتے تھے۔

تیمور اس عالم میں پرچم بلند کیے توقتمش کی اگلی چوکیوں تک پہنچ گیا اور زوردار حملہ کر کے مغلوں کے قلب لشکر تک پہنچ گیا۔ توقتمش گھبرا گیا۔ اسے خیال ہوا کہ کہیں وہ گھیرے میں نہ آ جائے اس لیے اس نے فوراً پسپائی شروع کر دی۔

تیمور نے اپنے چند دستے مغلوں کے تعاقب میں لگا دیے اور باقی فوج کے ساتھ وہ خوارزم کی طرف چل پڑا۔ خوارزم کے صوفیوں کی یہ تیسری بغاوت تھی۔ وہاں پہلے سے جنگ ہو رہی تھی۔ تیمور نے پہنچتے ہی ایک بڑا حملہ کر کے صوفیوں کے قدم اکھاڑ دیے اور اور گنج کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

وہاں سے فارغ ہو کر اس نے جتہ مغلوں کی خبر لی جو شمالی دروں میں اودھم مچائے ہوئے تھے۔ تیمور نے سمرقند آ کر اعلان کیا کہ وہ سنہری غول کے علاقوں میں داخل ہو کر توقتمش سے فیصلہ کن جنگ کرے گا۔

۵

تیمور نے اس جنگ کے لیے زبردست تیاریاں شروع کر دیں۔ چشمانیہ کو جب سے توقتمش کی احسان فراموشی اور تاتاری علاقوں پر یورش کی خبر ملی تھی وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اگر وہ توقتمش سے انتقام نہ لے سکی تو تیمور اس کی یہ آرزو ضرور پوری کرے گا۔ کیونکہ سرائے خانم نے اسے بتایا تھا کہ امیر تیمور احسان فراموش امیروں اور سرداروں کو کبھی معاف نہیں کرتا اور جب تک ان کا سر قلم نہیں کرتا چین سے نہیں بیٹھتا۔ اس لیے موت تو توقتمش کا مقدر بن گئی ہے۔

چشمانیہ نے سرائے خانم سے بڑی امیدوں سے پوچھا:

"کیا اس جنگ کے دوران ملکہ تاتار بھی امیر تیمور کے ساتھ ہوں گی؟"

دراصل چشمانیہ کو وطن کی یاد بہت ستا رہی تھی۔ اسے سمرقند میں ہر آرام اور آسائش مہیا تھی۔ وہ ملکہ سرائے خانم کی سہیلی بن گئی تھی لیکن سمرقند کے عالی شان محلات میں اسے گھٹن سی محسوس ہوتی تھی۔ وہ آزاد اور کھلی فضاؤں کی عادی رہ چکی تھی۔

ملکہ کو چشمانیہ کے دلی جذبات کا اندازہ ہو گیا۔ اس نے ہنس کر کہا:

"اس بارے میں کچھ یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا لیکن امیر کا یہ طریقہ ہے کہ جب وہ کسی طویل جنگ پر جاتے ہیں تو عام طور پر خواتین ان کے ساتھ ہوتی ہیں۔ ابھی تک امیر نے اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے"۔

"ملکہ عالم . . . . اگر آپ . . . . " چشمانیہ کی زبان پر حرفِ مدعا آیا لیکن وہ اس خیال سے چپ ہو گئی کہ کہیں ملکہ کو اس کی بات ناگوار نہ گزرے۔

"تم فکر نہ کرو چشمانیہ . . . . " ملکہ نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا:

"اگر امیر کے ساتھ حرم تنہا ہی گیا تو تم بھی جاسکو گی۔ تمہیں یقیناً اپنے ملک کی یاد ستا رہی ہو گی، ہم
تمہارے لیے اجازت حاصل کر لیں گے۔"

اور جیشمانیہ ..... "ملکۂ عالم" کہہ کر اس کے قدموں میں جھک گئی۔

لشکر تیار ہو گیا تو امیر تیمور نے سرائے خانم کو اطلاع بھجوائی کہ وہ اپنی تیاری کر لے۔ ملکہ نے جیشمانیہ
بغیر اسے اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت حاصل کر لی اور جب لشکر روانہ ہوا تو جیشمانیہ بھی اس کے ساتھ تھ

○

سنہری غول کا علاقہ اپنی جغرافیائی اور تاریخی حیثیت سے آج بھی اسی اہمیت کا حامل ہے جیسا تیمو
زمانے میں تھا۔ وسطی روس، ٹنڈرا اور سائبیریا کے علاقے تو ہمیشہ سے ناقابلِ تسخیر رہے ہیں۔ تیمور کے بعد
بعد مشہور فاتح اور جنرل نپولین بوناپارٹ نے اس علاقے میں قدم رکھا سو وہ ماسکو تک پہنچ گیا تھا لیکن و
برف باری نے اس کے لشکرِ عظیم کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ پھر ۱۷۱۶ء میں پیٹرِ اعظم کے حکم سے خیوہ اور بخا
زیر و زبر کرنے کے لیے روسی لشکر بھیجا گیا۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ لشکر کا سالار شہزادہ بیکو وچ صحرا میں تڑپ
مر گیا۔ لشکر کا بیشتر حصہ بھوک و پیاس کی وجہ سے موت کا لقمہ بن گیا۔ اس کے سو سال بعد کاؤنٹ پیروو کو
لے کر قزل قم (سرخ ریگستان) اور غیر آباد پہاڑوں میں داخل ہوا۔ گو کہ اس فوج کے لیے پانی کا کافی ذخیر
کیا گیا تھا مگر اس مہم کے دس ہزار اونٹ، دس ہزار بار برداری کی گاڑیاں اور لشکر کا زیادہ حصہ ان صحرا
دفن ہو گیا۔ یہی علاقے سنہری غول کی تگ و تاز کے میدان تھے جن پر وہ صدیوں سے بلا شرکتِ غیرے
کر رہا تھا اور تیمور بڑی جرأت و زردی سے انہیں آبا و اجداد کے اس مسکن سے بے دخل کرنے جا رہا تھا۔

دریائے سیر تک کا علاقہ تیمور اور اس کے لشکر کا دیکھا بھالا تھا۔ تیمور بڑے اطمینان سے کوہ قراتا
پہنچ گیا اور سلسلۂ کوہ کے تمام مغل علاقوں پر قبضہ کر لیا۔

توقتمش کو اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ تیمور ایک لشکرِ جرار کے ساتھ اس کے
قلعوں کو تہ و بالا کر رہا ہے تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ اس قدر خوف زدہ ہو گیا کہ بجائے جنگ کو
اس نے مکاری کا راستہ اختیار کیا۔

اس نے تیمور کے پاس سفارت صلح کے لیے بھیجی اور بیش قیمت تحائف کا نذرانہ روانہ کیا، ان تحا

اعلیٰ نسل کے گھوڑے اور ایک شکرا قابلِ ذکر ہے۔ اس شکرے کی آنکھوں پر جو پٹی بندھی تھی اس پر بیش قیمت
نگینے لگے ہوئے تھے۔

توقتمش کے ایلچی نے تحائف پیش کرنے کے بعد ہاتھ باندھ کر کہا:

"اے ملکِ تاتار کے عظیم المرتبت بادشاہ! ہمارے خاقان توقتمش نے آپ کے حضور پیغام بھیجا ہے کہ وہ اپنی
غلطیوں پر نادم اور شرمندہ ہیں اور آپ کے ساتھ صلح کے خواہش مند ہیں۔"

تیمور سمجھ گیا کہ یہ توقتمش کی نئی چال ہے مگر اس خیال سے وہ دل میں خوش ہوا کہ توقتمش پر اس کا رعب پڑ
گیا ہے اور اس نے تیمور کی برتری تسلیم کر لی ہے۔ تیمور کے تھکے ماندے لشکر پر بھی اس کا اچھا اثر ہوا اور اس میں
پہلے سے زیادہ جوش پیدا ہو گیا۔

تیمور ایک لمحہ سوچتا رہا پھر شیر کی طرح گرجا:

"توقتمش مکار، دغا باز اور احسان فراموش ہے۔ وہ ارس خان سے شکست کھا کر بھاگا تو ہم نے اسے پناہ
دی، اپنا بیٹا بنایا۔ تاتاری سوار وں نے اس کے لیے اپنا خون بہایا لیکن طاقت حاصل ہوتے ہی اس نے آنکھیں
پھیر لیں۔ ملک سے میری عدم موجودگی میں اس نے میرے علاقوں کو تاراج کیا۔ اب وہ جنگ سے کیوں کترا رہا ہے!
جاؤ اور اس سے کہہ دو کہ تیمور کے قدم آگے بڑھ کر کبھی پیچھے نہیں ہٹا کرتے۔ ہم فیصلہ کن جنگ کریں گے۔ ہاں،
اگر وہ دل سے اپنی غلطیوں پر نادم ہے اور واقعی صلح چاہتا ہے تو اس سے کہو کہ ہم سے گفتگو کے لیے اپنے وزیرِ اعظم
علی کو ہمارے پاس بھیجے۔"

توقتمش کا قاصد واپس چلا گیا۔ تیمور نے لشکر کو ایک ہفتے کے پڑاؤ کا حکم دیا۔ اس طرح وہ مغل وزیرِ اعظم کے
آنے کے بہانے اپنے لشکر کو آرام دینا چاہتا تھا۔

ایک شام تیمور خیمے کے سامنے اپنے سرداروں کے پاس بیٹھا تھا کہ اس کے جاسوس مغلوں کے ایک خانہ بدوش
خاندان کو مع ان کے ٹوٹے پھوٹے ساز و سامان کے، جانوروں کی طرح ہانکتے ہوئے تیمور کے پاس لے آئے۔ تیمور نے
جاسوسوں کو حکم دے رکھا تھا کہ جو مغل دکھائی دے اسے پکڑ کر پیش کیا جائے تاکہ وہ اس سے توقتمش کے بارے
میں معلومات حاصل کر سکے۔

امیر تیمور ابھی ان خانہ بدوشوں سے بات بھی نہ کر پایا تھا کہ اس کی پشت پر ملکہ سرائے خانم کا خیمے کا پردہ
اٹھا اور جیشمانیہ چیختی ہوئی باہر نکلی۔ وہ "بابا۔ بابا" کہتی ہوئی خانہ بدوشوں کے پاس پہنچ گئی۔

جیشمانیہ کو دیکھ کر ایک بوڑھا اس کی طرف بڑھا اور جیشمانیہ دوڑ کر اس کے سینے سے چمٹ گئی۔ یہ جیشمانیہ کا
وہی باپ تھا جس نے دو گنی قیمت پر اسے توقتمش کے ہاتھ فروخت کرنے کا اعلان کیا تھا۔ جیشمانیہ کو اپنے باپ سے

صدہا ننکا یتیں تھیں لیکن جب ملکہ کے خیمے کے اندر سے اس کی نظر اپنے قبیلے والوں اور باپ پر پڑی تو وہ
محبت کے فطری جذبے کو دبا نہ سکی اور بے تاب ہو کر باپ کے پاس آ گئی۔

چشمانیہ دیر تک باپ سے لپٹی روتی رہی۔ تیمور کو باپ بیٹی کے اس اتفاقیہ ملاپ نے بڑا متاثر
امیر تیمور نے بڑی نرمی سے چشمانیہ کو خیمے میں واپس جانے کا حکم دیا۔ چشمانیہ کے جانے کے بعد تیمور نے
اس کے باپ سے پوچھا:

"ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ تم چشمانیہ کے باپ ہو اور یہ اسی کا قبیلہ ہے۔ تم اطمینان رکھو ہم تمہیں
نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ توقتمش اس وقت کہاں ہے؟ یہ وہی شخص ہے جس نے
بیٹی کا گھر اجاڑا ہے..... شہزادہ پارس کو توقتمش نے قتل کیا تھا....."

"مجھے معلوم ہے اے شہنشاہِ تاتار....." بوڑھے نے گھٹی آواز میں کہا:

"اس نے چشمانیہ کا گھر ہی نہیں اجاڑا بلکہ وہ میرے پورے قبیلے کا دشمن ہے۔ اس نے حکم دے رکھا
ہم لوگوں کو جہاں دیکھا جائے فوراً قتل کر دیا جائے۔ ہم لوگ اس کے خوف سے جنگلوں اور صحراؤں میں چھپے پھرتے
توقتمش دو ہفتے پہلے یہاں سے دو منزل پر لشکر لیے پڑا تھا لیکن اب وہ شمال میں چلا گیا ہے۔ شاید صحرائے ایسا
بر فیلے میدانوں میں۔"

امیر تیمور کو یقین ہو گیا کہ اب اسے توقتمش تک پہنچنے کے لیے ایک طویل اور خطرناک سفر اختیار کرنا پڑے گا۔
اس نے سرائے خانم اور دیگر خواتین کو واپس جانے کا حکم دیا۔ چشمانیہ نے ملکہ کے توسط سے اپنے قبیلے میں جانے کی
اجازت مانگی جسے تیمور نے منظور کر لیا۔ چشمانیہ رخصت ہوتے وقت سرائے خانم کے گلے لگ کر خوب روئی اور
کے احسانات کا شکریہ ادا کیا۔

"چشمانیہ....." ملکہ نے اسے بزرگانہ نصیحت کی:

"اب تم اپنے قبیلے میں جا کر کسی معقول آدمی سے شادی کر لو۔ تمہارے غموں کا یہی علاج ہے۔ پوری زندگی
اس موہوم امید پر تو نہیں گزاری جا سکتی۔"

"میں ملکہ کے حکم کی تعمیل کروں گی۔" چشمانیہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا:

"لیکن یہ اس وقت ہو گا جب میں توقتمش سے انتقام لے لوں گی۔"

"اس کے لیے تو تمہیں تاتاری لشکر کے ساتھ رہنا چاہیے۔" سرائے خانم نے اسے سمجھایا:

"امیر ایک نہ ایک دن اسے گرفتار کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔"

"ایسا ہی ہو گا ملکۂ عالیہ۔" چشمانیہ نے بڑے استقلال سے کہا:

"میں اپنے قبیلے کے ساتھ تاتاری لشکر کے قریب ہی رہوں گی اور امیر توقتمش کے بارے میں خبریں
پہنچاتی رہوں گی۔"

"خدا تمہیں اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔" ملکہ نے اپنی دعاؤں کے ساتھ چشمانیہ کو رخصت کر دیا۔

تیمور کے حکم پر چشمانیہ کے قبیلے والوں کو کئی خیمے دے دیے گئے تھے۔ چشمانیہ قبیلے میں پہنچی تو اس کی نظر سب سے
پہلے اپنی عزیز سہیلی یاسو پر پڑی۔ دونوں سہیلیاں دوڑ کر ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ قبیلے والوں نے اسے
گھیر لیا اور دیر تک امیر تیمور اور سمرقند کے بارے میں پوچھتے رہے۔

یاسو اور چشمانیہ رات بھر باتیں کرتی رہیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے حالات سے آگاہ کیا اور اس
اتفاقیہ ملاقات پر اللہ کا شکر ادا کیا۔

اٹھارہ ہفتے کے جان لیوا سفر کے بعد امیر تیمور نے توقتمش کو جا لیا۔ اس سفر کے دوران تیمور کے لشکر کو
کئی بار دشمنوں کا بھی سامنا کرنا پڑا لیکن اس نے پھر بھی ہمت نہ ہاری۔ مغل اور تاتاری لشکر اس طرح لڑے، جیسے بھیڑیے
آپس میں لڑتے ہیں۔ آخر تیمور کامیاب ہوا۔ اور توقتمش کئی ہزار لاشیں میدان میں چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ تیمور کو اس
کے زندہ بچ جانے کا افسوس ہوا لیکن اس نے بجائے تعاقب کرنے کے، مغلوں کے جنوبی علاقوں کو تاراج کرنا
شروع کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے توقتمش کی طاقت کا خاتمہ کر دیا ہے اور وہ اب سر اٹھانے کی کوشش
نہیں کرے گا لیکن اس کا یہ خیال غلط نکلا۔ توقتمش جلد ہی نیا لشکر لے کر ایک بار پھر سامنے آ گیا۔ اس بار بھی
شدید جنگ ہوئی۔ تیمور نے اعلان کر دیا کہ جو توقتمش کا سر اتار کر لائے گا اسے تیمور کی طرف سے منہ مانگا
انعام دیا جائے گا۔

دن بھر سخت جنگ کے بعد مغلوں کے قدم میدان میں نہ جم سکے اور انہوں نے میدان سے بھاگنا شروع
کر دیا۔

تاتاریوں کے لشکر میں مغل جوان بیان، ایک جک کا بیٹا تھا۔ وہ گھوڑا اچکاتا ہوا توقتمش کی طرف چلا۔
توقتمش کے گرد مغلوں نے حلقہ باندھ رکھا تھا۔ بیان خود بھی مغل تھا۔ اس نے حلقے کے قریب پہنچ کر جھکائی
دی تو توقتمش کے چند محافظ سوار اس کی طرف لپکے۔ بیان تیزی سے پلٹا اور اس جگہ سے اس حلقے میں داخل

ہو گیا، جہاں سے سوار اس کی طرف بڑھے تھے۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔

بیان نے توقتمش کے سر پر پہنچ کر بھرپور وار کیا۔ توقتمش نے گھبرا کر بیان کا وار اپنی تلوار پر روکا، رک تو گیا لیکن توقتمش کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی۔ توقتمش کے ہوش اڑ گئے اور وہ گھوڑا گھما کر بھاگا مگر بیان اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اور دونوں میدان سے دور نکل آئے۔

بیان جب توقتمش کے قریب پہنچا تو اسے محسوس ہوا کہ کوئی اور سوار بھی اس کے پیچھے آ رہا ہے لیکن وقت نہیں تھا کہ وہ پلٹ کر دیکھتا۔ اگر وہ ایک لمحہ بھی ضائع کرتا تو توقتمش اس کے ہاتھ سے نکل جاتا۔ بیان نے توقتمش کے برابر پہنچ کر اس کے سر پر تلوار کا وار کیا لیکن توقتمش سر بچا گیا اور تلوار گھوڑے کی پشت پر لگی، زخم کھا کر اس زور سے اچھلا کہ توقتمش توازن برقرار نہ رکھ سکا اور وہ گھوڑے سے گر پڑا۔ بیان گھوڑے سے کودا اور فوراً تلوار توقتمش کی پشت میں داخل کر دی۔ توقتمش کے جسم نے ایک ہلکا سا جھٹکا کھایا اور ڈھیلا پڑ گیا۔

بیان اس کے جسم سے تلوار نکال رہا تھا کہ پشت سے آنے والا سوار اس کے پاس پہنچ گیا۔ بیان نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک خوبصورت لڑکی تیزی کے ساتھ گھوڑے سے اتری اور خنجر نکال کر توقتمش کی لاش کی طرف بڑھی۔

"لاش پر خنجر چلانا بزدلی ہے لڑکی!" بیان نے بڑے پیار سے کہا۔

لڑکی کے قدم رک گئے۔ اس نے بڑی حیرت سے بیان کو دیکھا:

"کیا یہ مر چکا ہے؟"

"ہاں۔"

بیان نے اثبات میں سر ہلایا:

"مگر تم کون ہو۔ اس سے تمہارا کیا تعلق تھا؟"

"یہ...... یہ...... میری مانگ اجاڑنے والا...... میرے شوہر کا قاتل تھا۔"

اور اس خوبصورت لڑکی یعنی غمزدہ چیتانیہ کے ہاتھ سے خنجر گر گیا۔

"کاش! میں چند لمحے پہلے آئی ہوتی۔ میں نے اسے قتل کرنے کی قسم کھائی تھی۔"

۵

تیمور کے سامنے سنہری غول کے سفاک ترین خاقان توقتمش کی لاش پیش کی گئی۔ تیمور کے چہرے

پر مسکراہٹ آئی:

"تم اپنا انعام مانگو۔" تیمور نے آہستہ سے کہا۔

تیمور کے الفاظ ختم ہوئے تو بیان نے مجمع پر نظر ڈالی۔ تاتاری سواروں نے توقتمش کی لاش کو گھیر لیا تھا۔ اس کی نظریں ایک جگہ رکیں۔ اس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"یہ، اے امیر تاتار! یہ لڑکی مجھے انعام میں عطا کی جائے۔"

"کون چیتانیہ......؟" تیمور نے حیران نظروں سے اُدھر دیکھا:

"ہم نے چیتانیہ تمہیں بخشی بشرطیکہ وہ راضی ہو۔"

اور...... چیتانیہ نے حیا سے اپنا سر جھکا لیا۔

اصفہان کا قتلِ عام

اور پھر تیمور کا دوسرا بیٹا عمر شیخ، تیمور کے جنگی جنون کی بھینٹ چڑھ گیا۔

چنگیز خان کے بیٹے جوجی کے سنہری غول نے جو مضبوط حکومت قائم کی تھی، تیمور نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ تیمور نے سنہری غول کے صدر مقام سرائے باتو پر حملہ کر کے خیموں اور لکڑی کے مکانوں کے اس شہر میں آگ لگوا دی اور شہری کھلے میدان میں سردی سے اکڑ اکڑ کر مر گئے۔

اس نے مغلوں کے جنوبی شہر استراخان کو بھی تاراج کیا۔ کہتے ہیں کہ اس شہر کی اونچی فصیل برف کی اونچی دیوار تھی۔ اہلِ شہر اس پر پانی ڈالتے رہتے اور پانی برف میں تبدیل ہو کر فصیل کی بلندی بڑھاتا رہتا لیکن تیمور کے سامنے برف کی یہ بلند و بالا فصیل پانی بن کر بہ گئی۔

پھر تیمور نے روس کے دارالسلطنت ماسکو کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ ماسکو میں کہرام مچ گیا۔ روس کے عیسائی شہنشاہ کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ گرجوں کے گھنٹے بجنے لگے اور خداوند یسوع مسیح سے دعائیں مانگی جانے لگیں۔ حضرت مریم کا ایک مجسمہ اس وقت شمال کے برفانی شہر ولیشائی گورود میں موجود تھا۔ شہنشاہ نے فوراً برفانی گاڑیاں حضرت مریم کے مجسمہ کو لانے کے لیے ولیشائی گورود میں بھیج دیں۔

مجسمے کے آنے کی اطلاع ملی تو لوگوں نے سرحد پر پہنچ کر اس کا استقبال کیا اور جلوس کی شکل میں مجسمے کو ماسکو پہنچایا گیا۔ تمام عیسائی مع شہنشاہِ روس حضرت مریم کے مجسمے کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔

"اے مادرِ خداوند۔ روس کو بچا لے"۔

ہر ایک زبان پر یہی دعا تھی۔

تیمور اپنا لشکر لے کر دریائے ڈان کے کنارے کنارے آگے تو بڑھا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ ماسکو صرف چند ہزار باشندوں کا ایک معمولی قصبہ ہے تو اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ بعض کا خیال ہے کہ تیمور نے ماسکو کا رخ کیا تھا لیکن روسی یہی کہتے ہیں کہ ماسکو حضرت مریم کے مجسمے کی وجہ سے محفوظ رہا۔

بلادِ شمال کو تاخت و تاراج کرنے کے بعد جب تیمور نے وطن واپسی کا ارادہ کیا تو اس نے بجائے سیدھا راستہ اختیار کرنے کے بحرِ خزر کے مغرب کی طرف سے چکر کاٹ کر جانے کا فیصلہ کیا۔ اس راستے میں کوہستانِ قفقاز کے اونچے اونچے پہاڑی سلسلے تھے اور جنگلات اس قدر گھنے تھے کہ ان جنگلات کو کاٹ کر ایک سڑک نکالنا، یہ بات ناممکن معلوم ہوتی تھی لیکن تیمور کے آہنی ارادوں کے سامنے ہر بات ممکن تھی۔

یہاں تیمور کو جارجیا اور قفقاز کے وحشی قبیلوں سے کئی بار جنگ کرنی پڑی۔ اس نے کلات اور تکریت کے ناقابلِ تسخیر قلعوں کو بھی مسمار کر کے رکھ دیا۔ دریائے دجلہ کے کنارے تکریت کا وہی مشہور قلعہ تھا جس میں دو سو سال پہلے مسلمانوں کے عظیم فاتح سلطان صلاح الدین ایوبی کی پیدائش ہوئی تھی۔ تکریت کا قلعہ فتح کرنے میں تیمور کو سترہ دن لگ گئے تھے۔

اب تیمور کی مملکت میں بلادِ شمال، خوارزم، بحیرۂ خزر اور کوہستانِ قفقاز شامل ہو گئے تھے۔ خراسان کی بڑی شاہراہ دو ہزار دو سو میل تک اس کی مملکت سے گزرتی تھی لیکن تیمور کو یہ فتوحات بڑی مہنگی پڑیں۔ تیمور کی خاص فوج کے بہادروں کی تعداد بہت کم ہو چکی تھی۔ خطائی بہادر دریائے سیر کی جنگ میں مارا جا چکا تھا۔ شیخ علی بہادر بھی سنہری غول کے ایک جاسوس کے خنجر کا نشانہ بن گیا تھا۔ تیمور کا امیر الامراء سیف الدین اور اس کا تیسرا بیٹا میران شاہ مرتے مرتے بچے تھے اور کوہِ قفقاز سے گزرتے ہوئے تیمور کے منجھلے بیٹے عمر شیخ کو ایک ایسا تیر لگا جس نے اس کی جان لے کر ہی چھوڑی۔ عمر شیخ کے جسم سے تیر نکال لیا گیا لیکن زخم اس قدر کاری تھا کہ عمر شیخ جانبر نہ ہو سکا۔

عمر شیخ کا انتقال راستے میں ایک پڑاؤ پر ہوا۔ ایک امیر نے ڈرتے ڈرتے تیمور کو اطلاع دی:

"بڑے شہزادے۔ جہانگیر نے منجھلے بھائی عمر شیخ کو جنت سے بلا بھیجا اور عمر شیخ اس کے پاس چلا گیا"۔

تیمور کو ایک لمحے کے لیے سکتہ سا ہو گیا لیکن فوراً سنبھلا اور اونچی آواز میں بولا:

"خدا ہی نے دیا تھا۔ اس نے واپس لے لیا تو پھر غم کیا؟"

تیمور نے بڑے ضبط سے کام لیا۔ ولی عہدِ سلطنت شہزادہ جہانگیر پہلے ہی مر چکا تھا۔ عمر شیخ تیمور کو بہت عزیز تھا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ [illegible] اپنے بعد اسی کو حکومت دے گا لیکن عمر شیخ بھی اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔

تیمور کچھ ایسا دلبرداشتہ ہوا کہ اسی وقت کوچ کا حکم دے دیا۔ کچھ دن آق سنجر میں آرام کرنے کے بعد [illegible] شہر سبز پہنچا اور قصرِ سفید میں قیام کیا۔ تیمور نے یہاں کوئی دربار نہیں لگایا صرف مولانا زین الدین سے ملاقات

کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ مسجد میں اعلان کر دیں کہ شہزادہ عمر شیخ کی تعزیت کے لیے لوگ اس کے پاس نہ آئیں۔
تیمور کا یہ رویہ اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ اسے عمر شیخ کے مرنے کا بہت صدمہ ہوا تھا۔

اسی دن شام کو اس نے اپنے تیسرے بیٹے میران شاہ کو طلب کیا۔ میران شاہ بڑا خود سر شہزادہ تھا۔ اس کا زیادہ رجحان عیش و عشرت کی طرف تھا لیکن میدانِ جنگ میں خصوصاً اس وقت جب تیمور لشکر کے ساتھ ہوتا وہ شجاعت دکھاتا تھا۔ توقتمش کے خلاف جنگ میں اس نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا تھا اور بری طرح زخمی ہوا تھا۔ تیمور کو میران شاہ کی عشرت پسندی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایک وقت وہ آئے گا جب خود ہی میران شاہ کو اپنا ولی عہد بنانا پڑے گا۔

تاتاریوں کے خود ساختہ قانون کے مطابق تاتاری امیر کے پہلے چار بیٹے ہی اس کے ولی عہد یا وارث ہو سکتے۔ جہانگیر اور عمر شیخ کے بعد میران شاہ کا نمبر تھا۔ چوتھا بیٹا شاہ رخ بیگم سرائے خانم کے بطن سے پیدا ہونے والا شاہ رخ تھا لیکن وہ ابھی چھوٹا تھا۔ اگر شاہ رخ جوان ہوتا تو تیمور یقیناً اسے میران شاہ پر ترجیح دیتا۔

میران شاہ آیا اور سلام کر کے خاموشی سے باپ کے سامنے بیٹھ گیا۔ تیمور ذرا دیر اس کے چہرے کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا:

"میران شاہ! اگر تم یہ سوچ کر کہ تم اس امیر کے بیٹے ہو جس سے بڑا فاتح اور امیر اس وقت روئے زمین پر نہیں تو تم حق بجانب ہو گے۔ بحیثیت ایک شہزادے کے عیش و عشرت کے تمام لوازمات تمہارے قدموں میں ہیں مگر ہر بات میں اعتدال لازم ہے۔ زیادہ آرام انسان کو کاہل بنا دیتا ہے۔ اس طرح شان و شوکت کا بے جا اظہار فضول خرچی اور خود سری کا اظہار ہوتا ہے۔"

"امیر بابا!" میران شاہ ادب سے بولا:

"مجھے معاف کر کے اصلاح کا موقع دیا جائے۔ میں نے ضرور ایسی غلطیاں کی ہوں گی جو امیر کے مزاج کی ناگواری کا باعث ہوئیں۔ میں آئندہ ان میں احتیاط برتوں گا۔"

"عزیز بیٹے! ہم تمہارے جواب سے خوش ہوئے۔" تیمور نے اسے محبت سے دیکھا:

"ہم نے تمہیں تنبیہ کے لیے نہیں بلایا تھا اور نہ ہمارا روئے سخن کسی خاص واقعے کی طرف تھا۔ ہم نے صرف نصیحت کے طور پر دو باتیں کی تھیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ تم نے ہماری باتیں غور سے سنیں اور گرہ میں باندھ لیں۔"

"امیر بابا اگر مجھے اس طرح نصیحت فرماتے رہے تو میرے تمام عیب دور ہو جائیں گے۔" میران شاہ نے فوراً کہا:

"دراصل امیر بابا کی بڑھتی ہوئی شفقت ہی نے مجھ میں خود سری پیدا کر دی ہے۔"

"میران شاہ!" تیمور رعب سے بولا:

"تم یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ جہانگیر اور عمر شیخ کی وفات کے بعد ہم سلطنتِ تاتار کی ولی عہدی تمہیں تحفے کے طور پر دیں گے۔ تاتاری رواج کے مطابق تم حقدار ضرور ہو لیکن تاتاریوں میں ایک مثل مشہور ہے کہ صرف وہی ہاتھ زمامِ حکومت پکڑ سکتے ہیں جو تلوار پکڑنا جانتے ہوں۔ حقدار ہونے کے باوجود تمہیں خود کو ولی عہدی کا اہل ثابت کرنا ہو گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ تمہارا حق مار کر ہم کسی اور کے حوالے نہیں کرنا چاہتے۔ تم نے بھری غول کے مقابلے میں جس بہادری کا مظاہرہ کیا ہے اس کے صلے میں ہم تمہارا مرتبہ بڑھاتے ہیں۔ اب تم بارہ ہزار سواروں کے علاوہ ایک اور ولایت کی آمدنی کے مالک ہو گے۔"

"امیر بابا!"

میران شاہ نے حیرت سے تیمور کو دیکھا۔ اسے اب تک یہی خیال تھا کہ تیمور اس سے ناراض ہے اور اس کا عہدہ گھٹا دے گا لیکن جب تیمور نے اس کا عہدہ گھٹانے کے بجائے اس میں اضافہ کر دیا تو میران شاہ حیران رہ گیا۔ اس نے حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا:

"امیر بابا کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ قائم رہے۔ میں امیر بابا کی نوازشوں کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہوں۔"

"دیکھو میران شاہ۔"

تیمور نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں:

"عمر شیخ کی لاش ہم اپنے ساتھ لائے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے جگر کے اس ٹکڑے کو بھی جہانگیر کے پہلو میں دفن کیا جائے۔ یہ کام تمہارے سپرد کیا جاتا ہے۔"

"بہتر ہے امیر بابا۔" میران شاہ اٹھتے ہوئے بولا:

"میں شہزادے بھائی کے مقبرے پر جانے ہی والا تھا۔"

تیمور نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بہت مختصر گفتگو کرتا تھا۔ اگر وہ حکم دیتا تو یہی چاہتا کہ اس پر فوراً عمل شروع ہو جائے۔ شہزادہ میران شاہ تیمور کی فطرت سے واقف تھا۔ اس نے تیمور کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور فوراً واپس آ گیا۔

تیمور نے اپنے بیٹوں کے مراتب کا تعین کر دیا تھا۔ اس کا بڑا بیٹا جہانگیر جب تک زندہ رہا اسے بارہ ہزار سواروں کا علوفہ اور خوارزم کی سلطنت کی آمدنی ملتی رہی۔ علوفہ کے معنی خوراک کے ہوتے ہیں لیکن اس سے مراد تنخواہ بھی ہے۔ جہانگیر کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا گیا تھا اس لیے اسے اپنا دربار لگانے کی بھی اجازت تھی۔ اس کے علاوہ تیمور نے اسے طبل و نقارہ کی بھی اجازت دی اور علم بھی بخشا تھا لیکن جب اسے جہانگیر کے مرنے

کی اطلاع ملی تو اس نے جہانگیر کا طبل و نقارہ منگوا کر اسے ٹکڑے ٹکڑے کرا دیا تاکہ اس کا طبل و نقارہ کوئی شہزادہ استعمال نہ کر سکے۔

تیمور نے دوسرے بیٹے عمر شیخ کو دس ہزار کا علوفہ اور ایک ولایت دی تھی۔ میران شاہ کو نو ہزار اور ایک ولایت کی آمدنی ملتی تھی لیکن ان دونوں شہزادوں کو طبل و نقارہ یا علم استعمال کرنے کی اجازت تیمور نے میران شاہ کو ولی عہد بنانے کا اعلان تو نہ کیا لیکن بارہ ہزار کا علوفہ بخش کر در پردہ میران شاہ کو جتلانے کی کوشش کی کہ اگر اس نے اپنے عادات و اطوار درست کر لیے تو اسے ولی عہد بنا دیا جائے گا۔

شہزادہ میران شاہ قصرِ سفید کے بجائے اپنے احباب کے ساتھ شہرِ سبز کی ایک خوبصورت حویلی میں ٹھہرا تھا۔ اس نے قصداً سفید محل میں تیمور کے ساتھ قیام کرنے سے گریز کیا کیونکہ باپ کی موجودگی میں اس کی سوئی سوئی رہتی تھی اس لیے وہ دوسری جگہ ٹھہرا تاکہ دوستوں کے ساتھ اطمینان اور آرام سے وقت گزارے اسے مشکل سے نیند آئی۔ وہ چاہتا تھا کہ تیمور کے حکم کی جلد از جلد تعمیل کر کے سرخروئی حاصل کرے۔

صبح ہوتے ہی اس نے چار سواروں کو ساتھ لیا۔ یہ چاروں اس کے رازدار یار تھے۔ تیمور نے جہانگیر کا مقبرہ شہرِ سبز میں بنوایا تھا۔ اس پر ایک گنبد تعمیر کیا گیا تھا۔ میران شاہ نے شہرِ سبز میں موجود تعمیر کے ماہرین کو حکم دیا تھا کہ وہ جہانگیر کے مقبرے پر پہنچ جائیں۔

میران شاہ دوستوں کے ساتھ خوش فعلیاں کرتا ہوا مقبرے پر پہنچا تو مقبرے کی چہار دیواری کے دروازے پر اسے بتایا گیا کہ جہانگیر کی بیوہ خانزادہ شوہر کے مزار پر فاتحہ کے لیے آئی ہوئی ہیں۔ خانزادہ کا نام سن کر وہ چونک پڑا۔ خوارزم کی اس خوبصورت شہزادی کو اس نے صرف دو تین بار ہی دیکھا تھا اور جب بھی دیکھا تھا دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ اسے اپنے بھائی کی قسمت پر بڑا رشک آیا تھا۔

مقبرے کے باہر پہرہ لگا ہوا تھا۔ اندر شہزادی کی درجنوں کنیزیں اور سہیلیاں گھومتی دکھائی دے رہی تھیں۔ میران شاہ چند لمحے کچھ سوچتا رہا۔ پھر گھوڑے سے اترا۔ اپنے دوستوں اور ماہرینِ تعمیرات کو وہیں انتظار کا حکم دے کر چہار دیواری کے اندر داخل ہو گیا۔

شہزادی خانزادہ نے حکم دے رکھا تھا کہ جب تک وہ مقبرے میں ہے، کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے لیکن پہریدار میران شاہ کو نہ روک سکے۔ میران شاہ شہزادہ ہی نہ تھا بلکہ عمر شیخ کے مرنے کے بعد اس کے ولی عہد ہونے کا یقین تھا۔ پہریدار سلام کر کے ایک طرف ہو گئے۔

ایک پہریدار نے شاید شہزادے کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے زور سے آواز لگائی:

"باادب شہزادہ میران شاہ، ولی عہد بہادر سلطنتِ تاتار قدم رنجہ فرما رہے ہیں۔"

شہزادہ میران شاہ اپنے اس نئے خطاب پر مسکرایا۔ مقبرے کے صحن میں چہل قدمی کرتی کنیزیں ٹھٹک کر رک گئیں۔ شہزادہ شاہانہ قدم اٹھاتا ہوا مقبرے کی طرف بڑھا۔

مقبرے کے باہر چاروں طرف سنگِ مرمر کا چوڑا چبوترہ بنا تھا اور سنگِ مرمر ہی کی چار سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں۔ میران شاہ نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تھا کہ ایک جھماکا سا ہوا۔ ایک کوندا لپکا اور میران شاہ کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔

خوارزم کی شہزادی مقبرے سے برآمد ہوئی اور شہزادے کو دیکھ کر اس کے بڑھتے ہوئے قدم ایک دم رک گئے۔ خانزادہ سیاہ لباس میں تھی اور اس کا حسین چہرہ ان کپڑوں میں یوں دمک رہا تھا جیسے بدلی سے ایک دم چاند نکل آیا ہو۔

دونوں کی حیران نظریں ایک دوسرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ حیرت کا یہ عالم چند لمحے طاری رہا۔ پھر شہزادی کو ہوش آیا۔ اس نے سر سے ڈھلکا ہوا پلو فوراً سر پر ڈال لیا۔

"ولی عہد بہادر کی خدمت میں خانزادہ تسلیم پیش کرتی ہے۔" خان زادہ نے سر کو ذرا خم کر کے بڑے ادب سے میران شاہ کو سلام کیا۔

"شہزادی!" میران شاہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولا:

"آپ کو کیسے علم ہوا کہ ہم ولی عہد ہیں؟" اور وہ سیڑھیاں چڑھ کر چبوترے پر پہنچ گیا۔

"شہزادے بہادر۔ مشک کی خوشبو ہر طرف خود ہی پھیل جاتی ہے۔" خان زادہ نے دزدیدہ نظروں سے میران شاہ کو دیکھا:

"آپ بغیر اجازت اور ہماری تاکید کے باوجود اندر تشریف لے آئے۔ ہم جانتے ہیں کہ سلطنتِ تیموریہ میں امیر تیمور کے بعد اگر کوئی ہمارے معاملات میں دخل دے یا ہمارے احکامات کی پروا نہ کرے تو وہ ولی عہد اور صرف ولی عہد ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا کسی کو خانزادہ کے مزاج کے خلاف قدم اٹھانے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔"

"عقلمند شہزادی!" شہزادہ مسکرایا:

"ہم ابھی میران شاہ ہیں سلطنت کے صرف ایک شہزادے۔ امیر بابا نے ہمارا مرتبہ مزید بڑھا دیا ہے۔ اب تک ہم نو ہزار کا علوفہ اور ایک ولایت کے حقدار تھے لیکن آج بارہ ہزار کا علوفہ عطا کر دیا گیا۔"

"شہزادے نے خود ہی ہماری بات کی تصدیق کر دی۔" خانزادہ میران شاہ کو اسی طرح چور نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی:

"آپ جانتے ہیں بارہ ہزار کا علوفہ صرف ولی عہد سلطنت کے لیے مقرر ہے۔ شہزادے عمر کے بعد آپ

ہی اس مرتبے کے اہل تھے۔ ہمیں اجازت دی جائے کہ ہم آپ کی خدمت میں ولی عہدی کی مبارک باد پیش کریں۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ شہر سبز کے رہنے والوں نے شہزادے کی وفات کی خبر سنتے ہی آپ کو دل سے ولی عہد تسلیم کر لیا تھا۔"

شہزادے کو اس خبر سے واقعی خوشی ہوئی۔ اس نے ذرا شوخی سے کہا:

"شہزادی۔ ان باتوں کو چھوڑیے۔ ہم اپنا مرتبہ آپ سے بلند نہیں سمجھتے اور چاہتے ہیں کہ آپ برابر ہو کر بات کریں۔ آپ خوارزم کی عالی وقار شہزادی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی قدرت نے آپ کو حسن کی شہزادی بھی بنایا ہے۔"

"شہزادے۔ آپ ہماری بیوگی کا مذاق اڑا رہے ہیں۔" خانزادہ نے بھاری پلکیں اٹھا کر میراں شاہ کو دیکھا تو اس کی دنیا زیر و زبر ہو گئی۔

خانزادہ دو بچوں کی ماں تھی۔ شہزادہ پیر محمد اور شہزادہ سلطان۔ اسے دو خوبصورت بچے خدا نے بخشے تھے جیسے تھے۔ پھر وہ صرف اٹھارہ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی۔ میراں شاہ کی نظر سے ایسا حسن پہلے کبھی نہ گزرا تھا۔

خانزادہ کو جیسے ایک نئے خیال نے گھیر رکھا تھا۔ آخر وہ جیسے خیال میں بولی:

"شہزادے۔ اگر ہمیں آپ خانزادہ کہہ کر مخاطب کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس بات سے مسرت ہوگی۔" خانزادہ نے میراں شاہ کی حوصلہ افزائی کی۔

میراں شاہ نے خانزادہ کو غور سے دیکھا۔ شاید وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ خانزادہ کے الفاظ میں کس قدر خلوص اور صداقت ہے۔

"شہزادی۔ دراصل ہمیں بے جا تکلفات پسند نہیں۔ خانزادہ کہنے میں ہمیں کچھ اپنائیت سی محسوس ہوتی ہے اور ہمیں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہم ایک سوگوار بیوہ سے نہیں بلکہ ایک ایسی ہستی سے مخاطب ہیں جو حسن کی رعنائیوں سے آراستہ ہے اور جسے آنسو بہانے کے بجائے دلوں پر حکومت کرنے کا حق ملنا چاہیے۔"

"شہزادے۔" خانزادہ نے ٹھنڈی سانس لی:

"خوبصورت الفاظ سے ویرانیاں بہار میں نہیں بدلا کرتیں اور نہ دل کے تاریک گوشے امید موہوم کے چراغ کی روشنی سے تابناک ہو سکتے ہیں۔" پھر وہ تیزی سے شہزادے کے پاس سے گزر کر سیڑھیاں اترنے لگی۔

"خانزادہ۔" شہزادے کی بھرائی اور جذبات میں ڈوبی آواز ابھری اور وہ بھی سیڑھیاں اتر گیا۔

"جی!" خانزادہ نے قدم روک کر گلو گیر آواز میں جواب دیا۔

"ہم دوسری ملاقات کے امیدوار ہیں۔" شہزادے نے دلی تمنا کو الفاظ کا جامہ پہنا دیا۔

"بیکار ہے شہزادے۔" خانزادہ نے استقلال سے کہا:

"ریگزاروں میں چشمے نہیں، سراب ہوتے ہیں۔ بگولوں کو پکڑنا کوئی عقلمندی نہیں۔"

"خانزادہ۔ ایسا مت کہو۔" میراں شاہ بڑی تمکنت سے بولا:

"ریت کے سمندر میں نخلستان بھی لہلہاتے ہیں اور سانسوں کو مقید بھی کیا جا سکتا ہے۔"

"شہزادے۔" خانزادہ نے بڑی بے بسی سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔

"شہزادے نہیں۔ ہمیں میراں کہو خانزادہ۔" میراں شاہ نے دل کھول کر رکھ دیا۔

"ہم ولی عہد کے حضور میں ایسی گستاخی نہیں کر سکتے۔" خانزادہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی:

"ہاں اگر میراں کے بجائے صرف شاہ کہنے کی اجازت دی جائے تو۔۔۔"

"ہمیں تمہاری خاطر منظور ہے خانزادہ۔" میراں شاہ نے جواب دیا:

"تم جس نام سے چاہو ہمیں پکار سکتی ہو۔ اب تم جاؤ۔ ہم سے کب ملو گی؟"

"شاہ۔ یہ باتیں بہت قبل از وقت ہیں۔" خانزادہ نے خدشے کا اظہار کیا:

"ہمیں امیر کے عتاب سے ہر وقت ڈرنا چاہیے۔"

"اس کی بھی کوئی صورت نکال لی جائے گی۔" شہزادہ لاپروائی سے بولا:

"تم کہاں ٹھہری ہوئی ہو؟"

"خدا کے لیے ایسا غضب نہ کیجیے گا شاہ۔" خانزادہ گھبرا گئی:

"ہم نے بیوگی کی زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کوئی نیا خواب دیکھنے سے پہلے ہمیں اپنا ذہن بدلنے کے لیے [illegible] درکار ہوگا۔"

"ہم آج بہت مصروف ہیں۔" شہزادے نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی:

"امیر بابا نے حکم دیا ہے کہ شہزادے جہانگیر کی قبر چوڑی کرائی جائے۔ عمر شیخ کی لاش اس کے پہلو میں [illegible] گی۔ یہ کام ایک دو روز میں ختم ہو جائے گا۔"

"مگر قبر کو کھولنا تو بڑی بے حرمتی کی بات ہے۔" خانزادہ کو اس خبر سے بڑا صدمہ ہوا۔

"خانزادہ یہ امیر کا حکم ہے اور اس کی تعمیل ہونا ہے۔"

"بہتر۔" خانزادہ سر جھکا کر بولی:

"ہمیں بلانے آپ سے ملاقات ہونا تھی۔ یہ بھی کتنا عجیب اتفاق ہے کہ ادھر ہم سمرقند سے شہر سبز پہنچے۔ ادھر [illegible] واپس آ گئے۔ پھر ہماری پہلی ملاقات بھی کتنے عجیب ماحول میں ہوئی۔ اچھا خدا حافظ۔ شاہ!"

میراں شاہ نے بھی خدا حافظ کہا۔ اسے محسوس ہوا کہ خانزادہ کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم ہے۔

"خانزادہ چلنے لگی تو میران شاہ بولا:

"ہم پھر ملیں گے خانزادہ"۔

"بشرطیکہ حالات نے اجازت دی"۔

خانزادہ احاطہ کا میدان پار کر کے دروازے پر پہنچی۔ اسے آتا دیکھ کر پہریداروں نے تمام لوگوں کو پرے کرا دیا۔ خانزادہ کی کنیزیں اور سہیلیاں بھی اس کے ساتھ باہر آ گئیں۔ انہیں لے جانے کے لیے سواریاں تھیں۔ خانزادہ اپنی گاڑی میں بیٹھی اور تمام گاڑیاں آگے پیچھے چلنے لگیں۔

شہزادہ میران شاہ اس ملاقات پر بڑا مسرور تھا۔ اس نے ماہرین کو اندر بلا کر امیر کے حکم سے آگاہ کیا۔ سب نے مل کر جہانگیر کی قبر کا معائنہ کیا اور قبر کو وسیع کرنے کا کام تھوڑی دیر بعد ہی شروع ہو گیا۔ میران شاہ نے مقبرے کے میدان میں اپنے لیے ایک خیمہ نصب کرا لیا تاکہ وہ کام کی نگرانی کر سکے اور امیر تیمور کو اپنی رپورٹ دے سکے۔

O

جہانگیر کی قبر کو وسیع کر کے عمر شیخ کی میت کو اس کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ وہ منظر بڑا رقت آمیز تھا۔ امیر تیمور دونوں بیٹوں کی قبروں کی پائنتی کھڑا فاتحہ پڑھ رہا تھا۔ بڑے حوصلے اور دل گردے کا مالک ہونے کے باوجود اس وقت ضبط کرنے پر بھی اس کی آنکھیں اشک آلود ہو گئی تھیں۔ دائیں بائیں اس کے تمام بڑے سردار ہاتھ اٹھائے فاتحہ میں شریک تھے۔ فضا میں افسردگی گھلی ہوئی تھی۔

ہر طرف خاموشی تھی لیکن یہ خاموشی اس وقت ٹوٹ جاتی جب کسی سردار کے منہ سے کوئی درد بھری آہ نکل جاتی۔

فاتحہ کے بعد مولانا زین الدین نے تیمور کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے تھپ تھپایا۔ مولانا اس کے ساتھ فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ تیمور ایک ہلکی سی ٹھنڈی سانس لے کر گنبد سے باہر آ گیا۔ پھر یہ ماتمی جلوس آہستہ آہستہ منتشر ہو کر اپنے ٹھکانوں پر چلا گیا اور تیمور قصرِ سفید واپس آ گیا۔

اسی شام خانزادہ قدم بوسی کے لیے حاضر ہوئی۔

تیمور کو معلوم ہو گیا تھا کہ خانزادہ سمرقند آئی ہوئی ہے۔ خانزادہ نے دو بار پہلے بھی باریابی کی درخواست کی تھی لیکن تیمور نے اسے روک دیا تھا۔ آج تیمور بہت زیادہ مضمحل تھا لیکن خانزادہ کی درخواست رد نہ کر سکا۔

خانزادہ سیاہ کپڑوں میں ملبوس دبے دبے قدم رکھتی تیمور کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے جھک کر تعظیم پیش کی لیکن تیمور کی نظریں چھت پر لگی تھیں اور وہ خیالات میں گم تھا۔ اسے خانزادہ کی آمد کی خبر نہ ہوئی۔ خانزادہ دیر تک اس کے سامنے خاموش کھڑی رہی پھر خود ہی تیمور کے خیالات کا سلسلہ کسی وجہ سے ٹوٹ گیا۔ اس کی نظر خانزادہ پر پڑی تو چونک اٹھا اور نرمی سے بولا:

"تم آ گئیں خانزادہ۔ کیوں کھڑی ہو؟ بیٹھ جاؤ"۔

خانزادہ دو زانو ہو کر اس کے سامنے قالین کے فرش پر بیٹھ گئی۔

"خانزادہ ہم نے تمہاری درخواست دو بار رد کی ہے"۔

تیمور کی بھاری آواز کرب میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایک جملہ کہنے کے بعد تیمور رک کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر بولا:

"ہم نہیں چاہتے تھے کہ تمہیں دیکھ کر اپنے ساتھ ساتھ تمہارے غموں میں بھی اضافہ کریں"۔

"اے شاہِ تاتار!" خانزادہ پُروقار لہجے میں بولی:

"غم برداشت کرنے کے لیے پتھر کا کلیجہ چاہیے۔ کنیز جانتی تھی کہ امیر کو جس طرح تاتاری لشکر، امرا و وزرا اور مفتوحہ علاقوں کو پوری طرح قابو میں رکھنے کی طاقت ہے۔ اس طرح شاہِ تاتار غموں کے پہاڑ کو بھی برداشت کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ کنیز تو صرف اس وجہ سے حاضری دینا چاہتی تھی کہ امیر کو علم ہو جائے کہ افسردگی اور اندوہ کے اس طوفان میں وہ اکیلے نہیں بلکہ ایک یہ بھی ان کے قدموں میں موجود ہے"۔

"ایسا نہ کہو خانزادہ۔ تم ہمیں بہت عزیز ہو"۔

تیمور نے مسند پر اس طرح پہلو بدلا جیسے کسی بوجھ تلے دبا جا رہا ہو:

"ہمیں تمہارے غم کا پورا احساس ہے۔ کاش ہم اس کا مداوا کر سکتے۔ ہم لوگوں کی نظر میں بااختیار ہیں لیکن حقیقت میں کس قدر بے اختیار اور عاجز ہیں۔ یاد رکھو خانزادہ۔ انسان جہاں پر بے اختیار اور بے بس ہوتا ہے، وہاں سے خدائی کی حدود شروع ہوتی ہیں۔ ہماری عاجزی ہی تو ہمیں خدا کے وجود کا یقین دلاتی ہے۔ اس کا علاج صبر اور صرف صبر ہے اور ایسے موقعوں پر صبر کرنے والا ہی عظمتِ انسانی کا علم بردار کہا جاتا ہے"۔

خانزادہ کو تیمور کی زبان سے بے اختیاری اور صبر کے فلسفے کی تشریح سن کر بڑا تعجب ہوا۔ وہ جابر اور قہار بادشاہ جس کی نظروں میں ہزاروں لاشوں کا تڑپنا کوئی معنی نہ رکھتا تھا، اس کا دل اپنے دو بیٹوں کی موت پر کتنا رنگ گداز ہو گیا تھا۔

"شاہِ تاتار درست فرماتے ہیں"۔ خانزادہ کو اس کے سوا کوئی جواب سمجھ ہی نہ آیا۔

"ہم سمرقند جا رہے ہیں۔ چاہو تو تم ہمارے ساتھ چل سکتی ہو"۔ تیمور نے رسماً پوچھا:
"اگر شہر سبز میں رہنا چاہو تو ہمارے بعد یہاں منتقل ہو جانا۔ تمہیں یہاں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی"۔
"امیرِ محترم! کنیز سمرقند میں رہتے رہتے گھبرا گئی تھی۔ اس لیے کچھ دنوں کے واسطے یہاں آ گئی تھی"۔ خانزادہ نے تیمور کا لہجہ نرم دیکھ کر کہا:
"سمرقند اور شہر سبز دونوں مقامات اب مجھے اجنبی اجنبی سے لگتے ہیں کیونکہ امیر عام طور سے باہر رہتے ہیں"۔
"ٹھیک کہہ رہی ہو خانزادہ"۔ تیمور بولا:
"ملکی ضروریات اور مصلحتیں ہمیں سمرقند میں زیادہ دن ٹھہرنے نہیں دیتیں۔ ہم جانتے ہیں کہ دارالسلطنت میں ہماری غیر حاضری ہمارے لواحقین کو شاق گزرتی ہے لیکن ہم مجبور ہیں"۔
"امیرِ محترم۔ اگر اجازت دی جائے تو کنیز کچھ دنوں کے لیے اُرگاؤں چلی جائے"۔ خان زادہ نے موقع غنیمت جان کر فوراً کہا:
"اُرگاؤں میں اگرچہ اب کنیز کا کوئی قریبی عزیز موجود نہیں۔ پھر بھی وہاں سے کنیز کی بچپن کی یادیں وابستہ ہیں۔ اگر امیر مناسب سمجھیں تو"۔
خانزادہ نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا تاکہ تیمور اس کی بات کو ضد نہ سمجھ بیٹھے۔ تیمور کا خیال فوراً اپنی دوسری بیوی سرائے خانم کی طرف گیا۔ اسے معلوم تھا کہ خانزادہ اور سرائے خانم میں اَن بن رہتی ہے اور ہر ایک اپنے کو دوسرے سے برتر سمجھتی ہے۔ یہ بات بالکل صحیح تھی۔ تیمور نے خانزادہ کو بہت کافی اختیارات دے رکھے تھے۔ یہاں تک کہ اسے محل میں دربار لگانے کی بھی اجازت تھی۔ خانزادہ کے اخراجات پر بھی کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ جس قدر چاہتی خرچ کر سکتی تھی۔ خانزادہ کو یہ مراعات اس وجہ سے دی گئی تھیں کہ وہ تیمور کے سب سے بڑے اور چہیتے بیٹے کی بیوہ تھی۔
دوسری طرف سرائے خانم تھی۔ تیمور کی پہلی بیوی الجائی خاتون کے مرنے کے بعد سرائے خانم تیمور کی سونی زندگی میں بہار بن کر آئی تھی۔ وہ ملکۂ عالم تھی اور اسے تمام بیگمات اور شاہی خاندان کی خواتین پر فوقیت حاصل تھی۔ سرائے خانم کی اہمیت اس وجہ سے اور بڑھ گئی تھی کہ اس نے تیمور کے سب سے چھوٹے بیٹے شہزادہ شاہ رُخ کو جنم دیا تھا۔ شاہ رخ تیمور کا لڑکا تھا اور دستور کے مطابق وہ سلطنت کا وارث تھا کیونکہ بادشاہ کے پہلے چار بیٹوں کو وارث سمجھا جاتا تھا۔ سرائے خانم اور خانزادہ میں کئی بار جھگڑا ہو چکا تھا لیکن تیمور کے رعب کی وجہ سے اس نے کوئی خطرناک صورت اختیار نہ کی تھی۔ خانزادہ با اختیار ہونے کے باوجود احساسِ کمتری کا شکار رہتی۔ سرائے خانم کی شان و شوکت اور آن بان دیکھ کر خانزادہ دل ہی دل میں کڑھتی رہتی۔ سرائے خانم جب شام کے وقت گل گشت کو نکلتی تو ایک درجن حبشی عورتیں اس کی قبا کا دامن اٹھا کے چلتیں اور خوبصورت کنیزیں اس کی زرنگار کلاہ کے مرصع پروں کو سنبھالے رہتیں۔ تیمور کو نیلا رنگ بہت پسند تھا اس لیے

سرائے خانم قصرِ شاہی میں نیلی اینٹوں کے نئے نئے فرش بنواتی اور ان پر گردن بلند کر کے چہل قدمی کرتی تو خانزادہ کے سینے پر چھریاں سی چلنے لگتیں۔
ان باتوں سے تنگ آ کر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ سمرقند کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے۔ اس لیے کہ اس کے دونوں بیٹے جوان ہو رہے تھے اور اسے خطرہ تھا کہ تیمور کی آنکھ بند ہوتے ہی وراثت کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوگا اور اسے اپنے لڑکوں کی حفاظت کرنا مشکل ہو جائے گی۔ خوارزم میں اب بھی لوگ پرانے رشتوں کی بنا پر اس سے محبت کرتے تھے اور وہ خود کو وہاں سمرقند سے زیادہ محفوظ سمجھتی تھی۔
تیمور بھی ان باتوں سے بے خبر نہ تھا۔ خان زادہ کی درخواست پر اسے کچھ زیادہ حیرت نہ ہوئی۔ وہ ذرا دیر سوچنے کے بعد بولا:
"خانزادہ۔ تمہاری درخواست قبول کی جاتی ہے لیکن تمہیں ایک قربانی دینا ہوگی۔ بظاہر یہ قربانی ہوگی لیکن مستقبل میں تمہیں اس سے فائدہ پہنچے گا"۔
"امیر، کنیز کی جان و مال کے مالک ہیں"۔ خانزادہ نے بے جھجک کہا:
"کنیز کو کسی بھی قربانی میں عذر نہ ہوگا بلکہ امیر کے حکم کی تعمیل کرنا کنیز کے لیے باعثِ فخر ہوگا"۔
"تم ہمارے بہادر بیٹے کی بیوہ ہو خانزادہ"۔ تیمور نے اسے دیکھا:
"ہمیں جہانگیر سے جس قدر محبت تھی کم و بیش اتنی ہی محبت ہمیں تم سے اور تمہاری اولاد شہزادہ پیر محمد اور خلیل سلطان محمد سے ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ باپ کی موت انہیں احساسِ محرومی میں مبتلا کر دے اور وہ اپنا مستقبل نہ بنا سکیں۔ انہیں بہترین تربیت کی ضرورت ہے۔ تم عقلمند ہو ہمارا اشارہ سمجھ گئی ہوگی"۔
"کیوں نہیں امیرِ عالی مقام"۔ خانزادہ نے بغیر سوچے سمجھے جواب دیا:
"کنیز کے بیٹے امیر کی محبت اور شفقت کی ضرور قدر کریں گے اور جوان ہونے کے بعد امیر کے احکامات پر اپنی جان کی بازی لگا دیں گے"۔
"ہم یہ چاہتے ہیں خانزادہ"۔ تیمور نے مزید وضاحت کے لیے کہا:
"کہ تمہارے ساتھ رہ کر شہزادے وہ مقام حاصل نہ کر سکیں گے جس کی ہمیں آرزو ہے۔ تم خود تو اپنا مستقبل بنانے کی ذمہ داری اٹھا سکتی ہو ہم اس میں دخل دینا نہیں چاہتے لیکن شہزادوں کی نگہداشت اور تربیت تم ہم پر چھوڑ دو"۔
"امیرِ عزیز۔ کنیز کو ان کی تربیت کے لیے کیا قدم اٹھانا ہوگا"۔ خانزادہ نے سنجیدگی سے کہا:
"کنیز شہزادوں کی بھلائی کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہے"۔

"تمہیں اس سلسلے میں فکر کی ضرورت نہیں خانزادہ۔" تیمور نے کمالِ شفقت کا اظہار کیا:

"ہم چاہتے ہیں کہ دونوں شہزادے ہماری نگرانی میں فوجی اور غیر فوجی تربیت حاصل کریں۔ اگر تم نے خوشی سے شہزادوں کو ہمارے پاس چھوڑ دیا تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہماری نظروں میں شاہ رخ مرزا اور تمہارے بیٹوں کا ایک ہی مقام ہوگا۔ انہیں یکساں طور پر فنونِ جنگ کی تربیت دی جائے گی۔ اب یہ ان کی کوشش اور صلاحیت ہوگی کہ کون کس پر سبقت لے جاتا ہے۔"

خانزادہ کے لیے اس سے بڑھ کر مسرت اور اطمینان کا اور کیا مقام ہو سکتا تھا کہ تیمور اس کی اولاد کو اپنے بیٹے شاہ رخ مرزا کے برابر درجہ دے رہا تھا۔ خان زادہ نے اپنی مسرت چھپاتے ہوئے کہا:

"امیر کو خدا نے دنیا بھر میں سب سے زیادہ عقل اور فراست عطا کی ہے۔ امیر جو سوچتے ہیں وہ بالکل ہوتا ہے۔ کنیز کو فخر ہے کہ امیر اپنے مرحوم بیٹے کی اولاد کو اس قدر رغبت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کنیز دونوں شہزادوں کو ہمیشہ کے لیے امیر کے حوالے کرتی ہے اور ان کی واپسی کا کبھی مطالبہ نہ کرے گی۔"

"شاباش خانزادہ۔" تیمور خوش ہو کر بولا:

"آج سے پیر محمد اور سلطان محمد ہمارے پاس مثل اپنی اولاد کے رہیں گے۔ ہم کچھ دنوں بعد کہیں جا رہے ہیں۔ ہمارے واپس آنے پر تم جہاں جانا چاہو جا سکتی ہو۔ تمہارے اختیارات میں کوئی کمی نہ ہوگی۔"

تیمور کی بات ختم ہوئی تھی کہ ایک کنیز نے میراں شاہ کے آنے کی اطلاع دی۔ میراں شاہ کے نام پر خانزادہ چونکی۔ امیر نے ایک لمحہ توقف کے بعد کہا:

"شہزادے کو آنے کی اجازت ہے۔"

خانزادہ نے فوراً اپنا رخ ذرا سا دوسری طرف موڑ لیا۔

شہزادہ میراں شاہ نے داخل ہو کر تیمور کو سلام کیا پھر ہاتھ باندھ کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔

"کیا بات ہے شہزادے۔ کوئی اہم مسئلہ ہے؟" تیمور نے ذرا ترشی سے پوچھا۔

"کوئی مسئلہ نہیں امیر بابا۔۔۔۔" میراں شاہ، تیمور کے تیور دیکھ کر گھبرا گیا:

"میں تو صرف سلام کو حاضر ہوا تھا۔"

"سلام قبول ہوا۔ اب تم جا سکتے ہو۔" تیمور نے بڑے روکھے پن سے کہا۔

میراں شاہ اور زیادہ گھبرا گیا۔ اور الٹے پیر واپس ہونے لگا۔ یہ میراں شاہ کی اپنی غلطی تھی۔ اسے بتا دیا گیا تھا کہ امیر اور بڑی بہو شہزادی خانزادہ گفتگو کر رہے ہیں لیکن اس اطلاع کے باوجود اس نے قدم بوسی کی اجازت طلب کی تھی۔ ممکن ہے کہ وہ خانزادہ کا دیدار کرنا چاہتا ہو جس کی محبت اس کے دل میں رہتی۔

میراں شاہ باہر نکلنے والا تھا کہ تیمور نے آواز دی:

"شہزادے! اب تم آ ہی گئے ہو تو ان سے ملو۔ جانتے ہو یہ کون ہیں؟"

"جی۔ جی۔" میراں شاہ کی زبان سے اک دم نکل گیا۔ حالانکہ اسے خانزادہ کا پورا چہرہ نظر نہ آ رہا تھا:

"شاید یہ شہزادے جہانگیر بھائی کی بیوہ۔۔۔۔"

"شاید نہیں بلکہ یہ یقیناً وہی ہے۔" تیمور نے زور دے کر کہا:

"خان زادہ تمہاری بھابی ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ جب بھی ان سے سامنا ہو تو سلام کرنے میں پہل کرو اور احترام بالکل اسی طرح کیا کرو جیسے شہزادے کی عزت کرتے تھے۔"

"ایسا ہی ہوگا امیر بابا۔"

میراں شاہ نے جھک کر خانزادہ کو سلام کیا۔ ذرا دیر بعد اس نے واپس جانے کی اجازت مانگی۔ امیر تیمور کسی خیال میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میراں شاہ کو ٹھہرنے کا بہانہ مل گیا اور وہ چور نظروں سے بار بار خانزادہ کو دیکھنے لگا۔ خانزادہ کو اس کی یہ چھچھوری حرکت بہت ناگوار گزری۔ اگر شاہی دربار نہ ہوتا تو شاید وہ میراں شاہ کو دھتکار دیتی۔

"ہم سمرقند جا رہے ہیں۔" تیمور نے جیسے خود کلامی کی۔ وہ کسی سے بھی مخاطب نہ تھا۔ میراں شاہ اور خانزادہ خاموش رہے۔

"تم نے سنا شہزادے۔" تیمور نے کہا:

"ہم سمرقند جا رہے ہیں اور تم بحیرۂ خزر (کیسپین) کی طرف کوچ کرو گے۔۔۔۔ خوارزم کی ولایت تمہیں عطا کی ہے۔"

"مجھے کب جانا ہوگا امیر بابا؟" شہزادے کا سر غرور سے بلند ہو گیا۔

"کل شام تم یہاں نہیں ہو گے۔" تیمور نے اسے اعزاز بخش کر رخصت کر دیا۔

○

میراں شاہ باپ سے مل کر واپس آیا تو اس کے قدم زمین پر نہ ٹک رہے تھے۔ خوارزم کی ولایت بحیرۂ خزر

کے مشرق تک واقع تھی۔ یہ علاقہ اس دور میں انتہائی خوشحال اور دولت سے مالا مال سمجھا جاتا تھا۔

خوارزم کی حکومت پہلے خانزادہ کے چچا حسین صوفی کے پاس تھی۔ تیمور نے اسے شکست دے کر اس پر قبضہ کیا اور اس ولایت کو اپنے بڑے بیٹے اور ولی عہد جہانگیر کے سپرد کر دیا۔ جب جہانگیر کا انتقال ہوا تو تیمور نے یہ علاقہ عمر شیخ کے حوالے کر دی تھی لیکن وہ بھی مارا جا چکا تھا۔

اس مالدار ولایت پر میران شاہ جس قدر بھی غرور کرتا وہ کم تھا۔ اس نے واپس جاتے ہی روانگی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ تیمور نے اگرچہ اس سے دوسرے دن شام تک روانہ ہونے کے لیے کہا تھا لیکن میران شاہ جانتا تھا کہ یہ تیمور کا حکم ہے اور تیمور اپنی حکم عدولی کسی صورت میں برداشت نہ کرتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ صبح ہوتے ہی اپنی ولایت پر روانہ ہو جائے گا۔

پھر کسی چور دروازے سے خانزادہ کا خیال اس کے دل کے نہاں خانے میں اتر آیا۔ اس کی دوسری ملاقات تیمور کے دربار میں ہوئی تھی مگر اسے ملاقات کا نام مشکل ہی سے دیا جا سکتا تھا۔ وہ خانزادہ کی صرف ایک جھلک دیکھ سکا تھا۔ اس وقت اس کے دل میں کچھ ایسی بے چینی پیدا ہوئی کہ وہ خانزادہ سے ملنے چل پڑا۔ خانزادہ جس حویلی میں ٹھہری ہوئی تھی اس کا پتہ میران شاہ کو معلوم ہو گیا تھا۔ شام کو دربار جاتے وقت وہ اس حویلی کے سامنے سے گزرا تھا۔ اگر اسے دربار جانے کی جلدی نہ ہوتی تو اسی وقت خانزادہ سے ملاقات کرتا۔

خانزادہ تھوڑی دیر پہلے ہی تیمور سے مل کر واپس آئی تھی۔ وہ اپنی سہیلیوں کو خوشی خوشی اس مفید ملاقات کی تفصیل بتا رہی تھی۔۔۔۔ آج تو اس نے میران شاہ کو اپنے حسن جہاں تاب کی جھلک دکھا کر اس کے دل میں آگ سی لگا دی تھی۔ اسے میران شاہ پسند نہ تھا لیکن مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ میران شاہ کو اپنے دام میں گرفتار رکھے اور ضرورت کے وقت اس سے کوئی اہم کام لے۔

اپنے دونوں بیٹوں کی طرف سے اسے جو فکر تھی اسے تیمور نے حل کر دیا تھا۔ شہزادہ پیر محمد اور شہزادہ سلطان محمد کو تیمور نے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا تھا۔ جب پہلا شہزادہ پیر محمد پیدا ہوا تھا تو اس نے جہانگیر سے ہنس کر کہا تھا:

"اب بادشاہت میرے گھر میں رہے گی۔"

لیکن جہانگیر عین جوانی میں انتقال کر گیا اور خانزادہ کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ اسے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا تھا۔ شہزادوں کے تیمور کے زیرِ سایہ پرورش پانے سے اسے یہ امید ہو گئی تھی کہ اس کے بیٹے تیمور کی زندگی میں کم از کم ایسا مرتبہ پا لیں گے کہ تیمور کی وفات کے بعد خواہ کوئی بھی بادشاہ بنے، شہزادے اپنی اور خانزادہ کی حفاظت کر سکیں گے۔

خانزادہ سہیلیوں کو رخصت کر کے سونے کی تیاری کر رہی تھی کہ کنیز نے اسے میران شاہ کے آنے کی اطلاع دی۔ خانزادہ اس اطلاع سے بہت متوحش ہوئی۔ اسے خوف بھی محسوس ہوا۔ اور میران شاہ پر غصہ بھی آیا۔ تیمور ابھی شہر میں موجود تھا اگر اسے میران شاہ کے اس کے پاس اتنی رات گئے آنے کی خبر ہو گئی تو پتہ نہیں کیا قیامت برپا ہو۔ لیکن اس میں خود اس کی غلطی تھی۔ اگر اس نے میران شاہ کو پہلی ملاقات میں اس قدر بے تکلف ہونے کا موقع نہ دیا ہوتا تو شاید وہ ایسی جرأت نہ کر سکتا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟

میران شاہ سے ملاقات نہ کرنے کا مطلب تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے اس کے ہاتھ سے نکل جاتا لیکن ملاقات میں خوف سدِ راہ تھا۔

بہت کچھ غور و فکر کے بعد آخر اسے ملاقات کا خطرہ مول لینا پڑا۔ اس نے کنیز کو حکم دیا:

"شہزادے کو مہمان خانے میں بٹھایا جائے۔"

کنیز کو ادھر بھیج کر اس نے دوسرا لباس پہنا۔ چہرے پر غازے کی تہ جمائی اور نئی نویلی دلہن کی طرح سج بن کر میران شاہ کے پاس گئی۔

میران شاہ نے تو اسے ماتمی لباس میں ہی پسند کر لیا تھا۔ اب جو وہ سولہ سنگھار کیے اور شعلہ جوالہ بنی اس کے سامنے پہنچی تو وہ اسے دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ خانزادہ کو دیکھ کر یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ اس کے دو بیٹے جوانی میں قدم رکھ رہے ہیں۔

میران شاہ اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھے جا رہا تھا اور خانزادہ سامنے کھڑی تبسم کی بجلیاں گرا رہی تھی۔ میران شاہ بدحواس ہو گیا۔ اس نے خود ہی خانزادہ کو تعظیم پیش کی۔

"خانزادہ شہزادے کو خوش آمدید کہتی ہے۔" خانزادہ مسکرا کر ذرا سا خم ہوئی پھر سیدھے ہوتے ہوئے بولی:

"خانزادہ جانتی ہے کہ ولی عہد بہادر جان پر کھیل کر ملاقات کے لیے آئے ہیں ورنہ امیر تیمور کی موجودگی میں اس بلا کسی غیر عورت کے گھر اس طرح جانے کے انجام سے کون واقف نہیں۔ یہی سوچتے ہوئے خانزادہ نے بھی سر گردن رکھ دی اور شہزادے کو خوش آمدید کہا۔"

"خانزادہ، تم حسنِ صورت کے ساتھ حسنِ کلام سے بھی آراستہ ہو!" میران شاہ نے سرمستی کے عالم میں کہا: "تم جیسی ہستی کے لیے اگر ہمیں سر بھی گنوانے پڑیں تو ہم دریغ نہیں کریں گے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے اس وقت تکلیف دی۔۔۔۔ مگر ہم کیا کرتے۔ صبح ہوتے ہی ہم اپنی ولایت کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ ہم نے سوچا کہ جانے سے پہلے ہم بارگاہِ حسن میں ایک بار حاضری دے لیں اور تجدید عہد بھی کرتے چلیں۔ خانزادہ! ہم یقینی

دلاتے ہیں کہ میران شاہ کے دل کے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ ہم تمہارا انتظار کریں گے اور ہماری ولایت کی سرزمین تمہاری قدم بوسی کے لیے بے چین رہے گی۔"

خانزادہ جواب دینے والی تھی کہ ایک کنیز نے اس کے کان میں کچھ کہا۔ خانزادہ کچھ پریشان ہو گئی۔ اس نے میران شاہ سے کہا:

"ولی عہد شہزادے! جس خطرے کا امکان تھا وہ سر پر آ گیا۔ شہر سبز کے کوتوال نے شہزادے کو ہماری حویلی کے دروازے پر دیکھ لیا ہے اور شاید وہ آپ کی واپسی کا انتظار کر رہا ہے۔"

"سر سے کفن باندھنے والے ڈرا نہیں کرتے خانزادہ۔" میران شاہ یہ کہتے ہوئے اٹھا:

"بہرحال ہم نہیں چاہتے کہ تم کسی عذاب میں مبتلا ہو۔ اس موہوم خطرے کا تدارک کر کے ہم ابھی واپس آتے ہیں۔"

میران شاہ حویلی کے دروازے پر پہنچا۔ شہر سبز کا کوتوال واقعی گھوڑے پر سوار وہاں کھڑا تھا۔ میران شاہ کو دیکھ کر وہ فوراً گھوڑے سے اترا اور جھک کر آداب بجا لایا۔

"شاید تمہیں علم نہیں کہ صبح کو ہم اپنی ولایت کی طرف کوچ کر رہے ہیں۔" میران شاہ نے پُر رعب لہجے میں کوتوال کو مخاطب کیا:

"شہزادیِ خوارزم سے ہمارا جو رشتہ ہے اس سے تم واقف ہو۔ جانے سے پہلے ان سے ملاقات ضروری تھی۔ تمہیں فکر کی ضرورت نہیں۔"

"مجھے اجازت ہے؟" کوتوال نے پھر آداب پیش کیا۔

"ہاں۔ تم جا سکتے ہو۔" میران شاہ لاپروائی سے بولا۔

کوتوال نے باگ سنبھال کر رکاب میں پیر رکھا ہی تھا کہ میران شاہ نے کہا:

"ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے یہاں آنے کی اطلاع امیر بابا کو نہ دی جائے۔"

"بہتر ہے شہزادے بہادر۔" کوتوال گھوڑے پر سوار ہوا:

"میری کیا مجال ہے کہ ولی عہدِ سلطنتِ تاتار کے حکم سے سرتابی کروں۔ میں ولی عہد شہزادے کے احسان پر ہمیشہ فخر کروں گا۔"

کوتوال چلا گیا۔ میران شاہ نے واپس آ کر کہا:

"بلا آئی مگر بخیر و خوبی ٹل گئی۔ اب ہم اطمینان سے گفتگو کر سکتے ہیں۔"

"نہیں شہزادے!" خانزادہ نے ملتجی نظروں سے اسے دیکھا:

"اس ملاقات کو یہیں ختم کر دیجیے۔ زندگی ہے تو ہم کسی نہ کسی موڑ پر پھر ملیں گے۔"

میران شاہ نے محسوس کیا کہ خانزادہ خوفزدہ ہو گئی ہے۔ ایسے ماحول میں کسی پُرلطف گفتگو کی امید بھی نہ تھی۔ اس نے کہا:

"ہم تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتے لیکن ہم تمہارا انتظار کریں گے۔"

"خانزادہ بھی شہزادے کو یقین دلاتی ہے کہ وہ ایک دن اور گنج ضرور پہنچے گی۔" خانزادہ نے پورے وثوق سے جواب دیا:

"لیکن اس دن کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ وہ دن سات روز بعد بھی آ سکتا ہے اور سات سال بعد بھی۔"

"اچھا خدا حافظ۔" شہزادہ واپس ہوا۔

"شب بخیر۔" خانزادہ نے شہزادے کو دروازے تک پہنچایا۔

○

میران شاہ نے اور گنج پہنچ کر اپنی رنگین محفل جمائی۔ دولت کی افراط نے میران شاہ کی دل بستگی کے ایسے ایسے سامان پیدا کیے کہ خانزادہ کا خیال اس کے ذہن سے ہوا کے ایک جھونکے کی طرح نکل گیا۔

شہر سبز سے چلتے وقت وہ خانزادہ کی محبت سے سرشار تھا۔ اس نے ارادہ کیا تھا کہ اور گنج پہنچتے ہی وہ خانزادہ کو اپنی ولایت میں لانے کے انتظامات کرے گا۔ میران شاہ کو اگر دولت نہ بھی حاصل ہوتی تو بھی اس کے آرام و آسائش میں کوئی فرق نہ پڑتا کیونکہ تاتاری اپنے امیر سے اس قدر مرعوب تھے کہ تیمور کے علاوہ وہ اس کی اولاد کو بھی اپنا آقا اور ولی نعمت سمجھتے تھے اور اس کے حکم کی بے چون و چرا تعمیل کرتے تھے۔ بادشاہ کا مذہب، رعایا کے مذہب کے مصداق لوگوں نے میران شاہ کی رنگین مزاجی دیکھی تو خود بھی اس رنگ میں رنگے گئے۔

اس دوران خانزادہ ایک بار پوشیدہ طور پر اور گنج گئی اور اس نے کسی کے ذریعے میران شاہ کو اپنی اور گنج میں موجودگی کی اطلاع دی تھی اور کئی دن تک میران شاہ کے جواب کا انتظار کیا لیکن پتہ نہیں یہ اطلاع میران شاہ کے کانوں تک پہنچی نہیں یا پھر وہ اپنی رنگ رلیوں میں کچھ اس طرح گھر گیا تھا کہ اسے اب خانزادہ جیسی خوبصورت بیوہ کی پروا نہ رہی تھی۔

خانزادہ کو میران شاہ کی غفلت یا اس کی طرف سے بے التفاتی سخت ناگوار گزری اور وہ بھی میران شاہ کو

اس طرح بھول گئی جیسے اس سے ملاقات ہی نہ ہوئی تھی۔

ملکہ سرائے خانم اپنی جگہ خوش تھی۔ اس کا بیٹا شاہرخ مرزا جوان ہو رہا تھا۔ یہ شہزادہ تیمور کے تمام بیٹوں اور پوتوں سے زیادہ نفیس الطبع اور رحمدل تھا۔ امورِ سلطنت سے زیادہ اس کا رجحان علم و ادب کی طرف تھا۔ خالی اوقات میں وہ کتابیں پڑھا کرتا۔ سرائے خانم کو بیٹے سے یہی شکایت تھی۔ یہ نہیں کہ شاہرخ مرزا میں بہادری کے جوہر نہ تھے۔ وہ شہزادے پیر محمد اور سلطان محمد سے شجاعت میں کسی طرح کم نہ تھا لیکن یہ تینوں ہم عمر تھے اس لیے ان میں میل، محبت اور دوستی بھی تھی۔ میدانِ جنگ میں ان کی راہیں بے شک بدل جاتیں اور وہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے اور تیمور انہیں لڑتے دیکھ کر مسکرایا کرتا تھا۔

تیمور کو اب نہ سرائے خانم کی فکر تھی اور نہ خانزادہ کی پروا۔ اس نے اپنے عیاش بیٹے میراں شاہ کی طرف بھی توجہ دینا چھوڑ دی تھی۔ پہلے اس کا یہی خیال تھا کہ اگر میراں شاہ نے اپنی حالت درست کر لی تو وہ اسے ولی عہد بنا دے گا۔ لیکن جب اس کے بیٹے شاہرخ مرزا اور پوتوں پیر محمد اور سلطان محمد نے اس کے ساتھ جنگ میں حصہ لینا شروع کر دیا تو اسے میراں شاہ کی مطلق پروا نہ رہی۔ اس کے سامنے ولی عہدی کے تین نئے امیدوار آ گئے تھے جن میں سے ہر ایک اس مرتبے کا اہل تھا اور ہر جنگ میں ان کی اہلیت پر مہریں لگتی چلی جا رہی تھیں۔

تیمور نے بلادِ شمال کے جتنہ خانِ اعظم اور سنہری غول کے خاقان کی سرزمین کو پامال کر کے رکھ دیا تھا۔ اب ان کا ٹھکانا ان کا آبائی وطن صحرائے گوبی یا ٹنڈرا کے برفیلے میدانوں کے سوا اور کہیں نہ رہ گیا تھا۔

تیمور کے حوصلے بلند تھے۔ اس کا لشکر ایک لاکھ سے زیادہ سواروں پر مشتمل تھا جسے معروف اور فعال رکھنے کے لیے تیمور کو نئے جنگی میدانوں کی ضرورت تھی۔ اس نے جنوب اور جنوب مغرب کی طرف اب تک توجہ نہ کی تھی۔ اس کی جنوبی سرحدیں ہندوستان اور ایران سے ملتی تھیں۔ افغانستان کا علاقہ اس کے قبضے میں تھا۔ اس کے بعد ہندوکش کا پہاڑی سلسلہ تھا جس کے دوسری طرف ہندوستان واقع تھا۔ لیکن تیمور کو ہندوستان سے سوائے تجارت کے اور کوئی سروکار نہ تھا۔ ایران کی طرف ضرور اس کی نظریں اٹھتی تھیں لیکن اس کی مملکت اور ایران کے درمیان ایک ہزار میل کا شور صحراؤں کا وسیع سلسلہ حائل تھا جس کو عبور کرنے کے لیے اسے کافی تیاری کی ضرورت تھی۔

ایران کبھی شوکت و سطوت کا مرکز رہا تھا۔ نوشیرواں، کیکاؤس اور خسرو پرویز کا تعلق اسی سرزمین سے تھا۔ زرتشت، مانی اور مزدک نے یہیں نئے نئے مذاہب کی تبلیغ کی تھی اور اوائلِ اسلام میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے گھوڑے اس کے میدانوں میں دوڑتے رہے تھے لیکن اب یہ ایک تباہ حال ملک تھا۔ ہلاکو خان کا ایلخانی خاندان بھی ایران پر ڈیڑھ سو سال تک حکومت کر کے اپنے آپ کو شرابِ ناب میں ڈبو کر ختم ہو چکا تھا۔ عظیم مسلم فرمانرواؤں کے تخت و تاج کے مالک ان کی نالائق اولاد تھی جو ملکی امور پر توجہ دینے کے بجائے اپنا سارا وقت لہو و لعب اور شراب

ب میں گنواتے تھے۔ ایران کی عظیم سلطنت ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی جن میں آئے دن لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔
تیمور کے دور میں ایران پر خاندانِ مظفریہ کا قبضہ تھا اور وہاں کا بادشاہ جلال الدین شاہ شجاع تھا۔ اس کا اگرچہ صرف کرمان، نیرو، اصفہان اور شیراز تک محدود تھا لیکن وہ خود کو شہنشاہ کہلواتا تھا۔ تیمور کی فتوحات کا ہوا تو شاہ شجاع نے فوراً دوستی کا ہاتھ تیمور کی طرف بڑھایا اور اسے ایک طویل خط لکھا۔
اس خط میں شاہِ ایران نے لکھا:

"جنہوں نے اس دنیا کو غور سے دیکھا وہ جانتے ہیں کہ یہ کتنی ناپائدار ہے۔ عقلمند نہ اس کی فانی اشیاء کی طرف مائل ہوتے ہیں اور نہ اس کے حسن اور لذتوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ میرے اور آپ کے درمیان ایک عہدنامہ ہوا تھا (اس عہدنامے کی تفصیل کسی تاریخ میں نہیں ملتی)۔ اس کے سلسلے میں یہ کہنا کافی ہوگا کہ میں آپ کی دوستی حاصل کر لینے کو ایک بہت بڑی کامیابی سمجھتا ہوں اور میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ قیامت کے دن یہ عہدنامہ میرے ہاتھ میں ہو تاکہ آپ مجھے عہد شکنی کا ذمے دار قرار نہ دیں۔ ترپن سال کی اس زندگی میں جو میں نے اس دنیائے آب و گل میں بسر کی، کونسا عیش ایسا تھا جس کی لذت میں نے نہیں چکھی، لیکن ایسا کوئی کام نہیں کیا جس پر میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہو۔ بارگاہِ خداوندی میں میری دعا ہے کہ خدا اس بادشاہ (تیمور) کو سلامت رکھے جو سلیمان جیسا دانا اور سکندر جتنا عظیم ہے۔

میں جانتا ہوں کہ آپ سے اپنے جگر گوشے زین العابدین کی سفارش کرنا ضروری نہیں۔ خدا اسے آپ کے سایہ میں خوش و خرم رکھے۔ میں اسے خدا کے اور آپ کے سپرد کرتا ہوں اور اس بدگمانی کی گستاخی ہرگز نہیں کر سکتا کہ آپ اپنے عہد پر قائم نہ رہیں گے!"

تیمور ایران پر فوج کشی کا منصوبہ بنا چکا تھا اور اس نے بڑے رازدارانہ طریقے سے اس کی تیاریاں بھی مکمل کیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شاہ شجاع کے اس خط نے اس پر بہت اثر کیا اور اس نے فوری حملے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

پھر جب ۱۳۸۶ء میں شاہ شجاع کا انتقال ہو گیا اور ایران میں خانہ جنگی شروع ہو گئی تو ایران فتح کرنے کی

تمنا پھر تیمور کے دل میں پیدا ہوئی۔ شاہ شجاع نے اپنے بیٹے زین العابدین کو اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین نامزد کیا
تھا لیکن اس کے مرتے ہی اس کے دس بیٹے سلطنت کے دعویدار بن گئے۔ اصفہان پر زین العابدین کے ایک بھائی
سلطان ابویزید نے قبضہ کر لیا۔ دوسرا بھائی احمد بن شجاع کرمان پر قابض ہو گیا۔ تیسرے نے فارس دبا لیا۔ غرض
ہر ایک نے اپنی حکومت بنالی اور سکے بھی ڈھال لیے۔ یہ سب بھائی آلِ مظفر تھے لیکن ہر ایک دوسرے کے
خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔

تیمور نے پھر بھی تحمل سے کام لیا۔ اس نے ہر شہزادے کے پاس الگ الگ اپنا سفیر بھیجا اور انہیں اطاعت
کا حکم دیا۔ تیمور کی فتوحات اور لاؤ لشکر کا شہرہ پورے ایران میں پھیلا ہوا تھا۔ تمام شہزادے بھی اس سے خائف تھے
لیکن ہر ایک نے تیموری سفیر کو روک لیا اور یہ انتظار کرنے لگا کہ پہلے دوسرا بھائی اطاعت قبول کرے تاکہ
بدنامی کا پہلا داغ اس پر نہ لگ سکے۔ اس انتظار میں تیموری سفیر ایک طویل عرصے تک ایران کی مختلف ریاستوں میں
ٹھہرے رہے۔

سفیر جب عرصہ تک جواب لے کر واپس نہ پہنچے تو تیمور کا پارہ چڑھ گیا اور اس نے لشکر کو کوچ کا حکم دیا
میں تیمور نے ستر ہزار کے عظیم لشکر کے ساتھ جنوب کا رخ کیا۔ یہ لشکر ہزار ہزار کے ستر چھوٹے لشکروں پر مشتمل تھا۔
باربرداری سے متعلق لوگ اس کے علاوہ تھے۔ تیمور نے ہزار میل کا ریت اور شور کا صحرا بڑے سکون سے طے کیا اور اصفہان کے
مضافات میں پہنچ کر خیمہ زن ہوا۔

ایرانیوں کی بے خبری کا یہ عالم تھا کہ انہیں جیسے تیمور کے آنے کی خبر نہ ہوئی تھی یا وہ تاتاری لشکر کو بارات سمجھ رہے
تھے۔ ان کے معمولات میں تیمور کے آنے سے کوئی فرق نہ پڑا۔ تیمور کو جگہ جگہ نیم برہنہ زائرین دھوپ تاپتے نظر آئے۔
تیمور کے ان نیم قبائلی سرداروں کو بڑی دلچسپی سے دیکھا جو دنیا و مافیہا سے بے خبر خچروں پر سوار ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔
ان سرداروں کے سروں پر ان کے غلام چھتر کا سایہ کیے ہوئے تھے۔

اصفہان چند میل کے فاصلے پر تھا۔ تیمور کی جنگی تیاریاں بھی مکمل تھیں لیکن وہ جنگ کرنے پر آمادہ نظر نہ آتا تھا۔
شاہ شجاع کا خط یاد تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اگر شہزادے اس کی اطاعت قبول کر لیں تو وہ انہیں سرزنش کر کے واپس چلا جائے
گا۔

اصفہان کے مضافات نے تو تیمور کی آمد کی کوئی پروا نہ کی لیکن جب یہ خبر اصفہان پہنچی تو لوگوں کے حواس
گم ہو گئے۔ اصفہان میں شاہ زین العابدین کا خالو سید مظفر شمسی موجود تھا۔ اہلِ شہر اس کے پاس گئے اور اس بلا
سے نجات دلانے کی درخواست کی۔ مظفر شمسی جانتا تھا کہ جو لشکر ایک ہزار میل کا ریتلا راستہ طے کر کے آیا ہے
خالی ہاتھ واپس نہیں جا سکتا اور شہر کو بچانے کی صرف یہی صورت ہے کہ تیمور کے سامنے اظہارِ اطاعت کے ساتھ اس کی خواہشات کو پورا کیا جائے۔ مظفر شمسی گھوڑے پر سوار ہوا اور اصفہان کے چند امیروں کو ساتھ لے کر تیمور کی لشکر گاہ
جا پہنچا۔

تیمور اس وقت اپنے خیمے کے سامنے قالین کے فرش پر ایک مسند کے سہارے بیٹھا تھا اور اپنے سرداروں
سے اصفہان ہی کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا۔ اسے زین العابدین کے خالو کے آنے کی خبر ملی تو اس نے اسے مع دیگر
امراء کے اسی وقت اپنے حضور میں طلب کر لیا۔ مظفر شمسی کو خیال تھا کہ اس پر تیمور ناراض ہوگا اور ممکن ہے کہ اس کی گرفتاری
کا حکم دے دے لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تیمور خلافِ امید اس سے بڑی خوش دلی اور محبت سے ملا۔ اس نے مظفر شمسی
کو اپنے قریب ہی قالین پر بٹھا لیا۔ اور سوچنے لگا کہ بات کس طرح شروع کرے۔

تیمور نے اس کی پریشانی شاید بھانپ لی۔ اس نے بغیر کسی تمہید کے بڑی بے تکلفی سے گفتگو کا آغاز کیا اس
نے متانت سے کہا،
"شاہ شجاع ہمارا بھائی تھا اور زین العابدین کو ہم اپنا بیٹا سمجھتے ہیں لیکن جب بیٹا نافرمانی کرے تو اس کی
سرزنش ضروری ہو جاتی ہے۔"
"شاہِ تاتار درست فرماتے ہیں۔" مظفر شمسی نے بڑے سلیقے سے کہنا شروع کیا،
"اگر اولاد کی غلطیوں پر گرفت نہ کی جائے تو بُرے راستے پر چل پڑتی ہے۔ ہم اہلِ شہر شاہِ تاتار کی خدمت
میں اسی لیے حاضر ہوئے ہیں کہ اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے معافی مانگیں۔"
"ہمیں تم سے کوئی شکایت نہیں۔" تیمور صاف دلی سے بولا،
"مگر ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے سفیروں کو کیوں روکا گیا اور ہمیں اب تک اطاعت کی اطلاع کیوں
نہیں دی گئی ہے۔"
"اے شاہِ تاتار!" مظفر شمسی نے بات بنانے کی کوشش کی،
"سمرقند کے تمام سفیروں کو شاہی مہمان خانوں میں ٹھہرایا گیا ہے۔ ان کی خاطر و مدارات میں بھی کسی قسم کی کمی
نہیں کی گئی۔ ان کی واپسی میں دراصل تاخیر اس لیے ہوئی کہ تمام شاہزادے یہ چاہتے تھے کہ شاہِ تاتار کو ایک متفقہ
اور متحدہ سفارت بھیجی جائے جو دربارِ سمرقند میں تحائف پیش کرے اور ہر شہزادے کی نمائندگی کرتے ہوئے اظہارِ
اطاعت کرے۔ اس نمائندہ سفارت کی تشکیل کے لیے تمام شہزادوں کو اطلاع دی جا چکی ہے۔ اس تاخیر کے لیے ہم بے حد
معذرت خواہ ہیں اور معافی کی امید رکھتے ہیں۔"
"تم کیمو مظفر؟" تیمور نے اسے گھور کر دیکھا،
"ہمیں تمہارا یہی نام بتایا گیا ہے۔ ہاں مظفر! ہمیں اصفہان سے کوئی پرخاش نہیں۔ گنبدوں کے اس خوبصورت

شہر کو ہم تباہ نہیں کرنا چاہتے۔ ہم اہلِ شہر کو امان دیتے ہیں لیکن تمہاری غلطی کے ازالہ کے لیے ہمیں یہ سفر اختیار کرنا پڑا۔ اس لیے خراج ادا کرنا پڑے گا۔ خراج لیے بغیر لشکر واپس نہیں جائے گا۔"

سید مظفر شمسی نے اپنے ساتھیوں پر ایک حاکمانہ نظر ڈالی۔ انہوں نے مظفر کو تیمور سے معاملہ طے کرنے کا اختیار پہلے ہی دے دیا تھا۔ اس موقع پر بھی انہوں نے اشاروں کنایوں سے اس کی تصدیق کر دی۔

"اے شاہِ تاتار! ہم مطلوبہ خراج ادا کر دیں گے۔ اہلِ شہر کو امان دی جائے۔" سید مظفر نے تیمور کا مطالبہ تسلیم کر لیا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہ تھا۔

امیر تیمور نے اپنے ایک امیر کو اشارہ سے قریب بلایا۔

"مظفر سے خراج کی رقم طے کی جائے اور اس کی وصولی کا انتظام کیا جائے۔"

مظفر اور تیمور کے امیر کے درمیان خراج کا فوری تعین ہو گیا۔ اس نے جو رقم کہی مظفر نے اسے تسلیم کر لیا۔ پھر سید شمسی نے تیمور سے درخواست کی،

"اے شاہِ تاتار۔ خراج کی رقم وصول کرنے کے لیے تاتاری لشکر کے سردار میرے ساتھ شہر میں بھیجے جائیں۔ اس طرح خراج کی وصولی میں آسانی بھی ہو گی اور کام بھی جلد نمٹ جائے گا۔"

تیمور نے یہ درخواست منظور کر لی۔ اس نے اپنے متعدد لشکروں میں سے ایک ایک کے سردار کو منتخب کیا اور حکم دیا کہ وہ ایک ایک محلے سے خراج کی وصولی کی نگرانی کریں۔

منتخب سردار سید شمسی کے ساتھ اصفہان میں داخل ہوئے۔ اصفہان کے گرد ایک مضبوط فصیل تھی جس پر چاروں طرف بڑے بڑے دروازے لگے تھے۔ تیمور کے سرداروں کو خراج کی رقم وصول کرنے میں کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ اس خانہ جنگی کے زمانے میں لوگوں کے پاس دولت کی کمی نہ تھی۔ خراج کی یہ رقم اصفہانیوں کے لیے اس بھیک سے بھی کم تھی جو وہ دوشالوں میں بیٹھے ہوئے بھکاریوں کو دے دیا کرتے تھے۔ انہیں اگر افسوس تھا تو صرف اس بات کا کہ وہ بے دینوں کو بھیک دے رہے تھے۔ ایرانیوں کو تاتاریوں سے سخت نفرت تھی اور وہ تاتاریوں کو بے دین سمجھتے تھے۔

دوسرے دن تیمور اصفہان کی سیر کو روانہ ہوا۔

پانچ ہزار مسلح سواروں کے جلو میں تیمور کا جلوس شہر میں داخل ہوا۔ سیر کا تو محض بہانہ تھا۔ تیمور اصل میں شہر کے تمام دروازوں پر قبضہ کرنا چاہتا تھا تا کہ اہلِ شہر قابو میں رہیں اور کوئی گڑبڑ نہ کر سکیں۔ اس نے شہر کے ہر دروازے پر اپنے ہزار ہزار سواروں کا پہرہ لگا دیا اور گھوم پھر کر اپنی لشکر گاہ میں واپس آ گیا۔

خراج وصول کرنے والے سرداروں نے شہر سے واپس آ کر اس کی خوبصورتی کا کچھ اس طرح ذکر کیا کہ لشکر کا ہر سپاہی اصفہان دیکھنے اور وہاں کی رنگینیوں سے لطف اٹھانے کے لیے بے چین ہو گیا۔ جو سوار کسی ضرورت سے شہر بھیجے جاتے

وہاں پہنچ کر لہو و لعب میں مشغول ہو جاتے اور کام ختم کرنے کے بعد بھی وہاں دیر تک ٹھہرے رہتے۔ بعض لشکریوں نے شہر جانے کے بہانے تراشنا شروع کر دیے۔ غرض یہ کہ اس رات شہر میں کئی ہزار تاتاری بازاروں میں گھوم رہے تھے یا قہوہ خانوں میں اطمینان سے بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔

شام تک شہر میں بالکل امن و سکون تھا لیکن کچھ رات گزرتے ہی اصفہان پر جو بیتی اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دہلی میں نادر شاہ درانی کے حکم سے جو قتلِ عام ہوا تھا کچھ اسی قسم کا واقعہ اصفہان میں بھی پیش آیا۔

کہتے ہیں اصفہان کے ایک قہوہ خانے کے سامنے علی کچہ پابیان نامی ایک نوجوان نمودار ہوا۔ یہ ذات کا لوہار تھا لیکن بڑا اندڑ اور جوشیلا تھا۔ وہ ایک اونچی جگہ کھڑا ہو گیا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا:

"مسلمانو! اٹھو!! اور بے دین تاتاریوں کو ختم کر دو۔ تمہارا مذہب خطرے میں ہے۔ تمہارا دین تباہ ہو رہا ہے۔ تاتاریوں نے دروازوں پر پہرہ لگا دیا ہے۔ تیمور تمہیں چاروں طرف سے گھیر کر ختم کر دے گا۔ تلوار بلند کرو اور قبل اس کے کہ تم قتل ہو جاؤ، تم اپنے قتل کرنے والوں کا خاتمہ کر دو۔ تاتاریوں کی تعداد قلعہ کے اندر بہت کم ہے۔ تم ان پر آسانی کے ساتھ قابو پا سکتے ہو۔"

علی کچہ پابیان کے گرد لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ ایرانیوں کو تاتاریوں سے پہلے ہی نفرت تھی۔ علی کچہ کی تقریر نے جلتی پر تیل کا کام کیا، ان میں آگ لگا دی اور محلے محلے شور مچ گیا۔ ہر ایک کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا:

"اٹھو مسلمانو! تمہارا دین خطرے میں ہے۔"

مسلمان خواہ کوئی ہو، کسی ذات، برادری یا گروہ سے تعلق رکھتا ہو، چاہے اس نے دینی فرائض کی کبھی پروا نہ کی ہو لیکن "دین و مذہب" کے نام پر وہ کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر انجام سے بے خبر ہو کر آگ و خون کی ہولی کھیلنے سے دریغ نہیں کرتا۔

وہ ایرانی جو ذرا دیر پہلے ساغر بکف غل غپاڑہ مچاتے پھر رہے تھے، لمحوں میں مجاہد بن گئے۔ چنگ و رباب کی آوازیں بند ہو گئیں اور شمشیر و سناں کی جھنکار بلند ہوئی۔ ایران والوں نے بغیر سوچے سمجھے تاتاریوں پر حملہ کر دیا۔ تاتاریوں کے تصور میں بھی نہ تھا کہ عشرت پسند ایرانی ان پر حملہ کر سکتے ہیں۔ ان میں گھبراہٹ پیدا ہو گئی۔ ان کی دو دو چار چار کی ٹولیاں شہر میں گھوم رہی تھیں۔ ایرانی گروہ در گروہ ان پر ٹوٹ پڑے۔ تاتاریوں نے بھی تلواریں نکالیں مگر کہاں تک مقابلہ کرتے۔ وہ ایک ایک کر کے قتل ہونا شروع ہو گئے۔

شہر کے سنجیدہ لوگوں کو علم ہوا تو وہ اصفہان کے انجام سے کانپ اٹھے۔ جلالِ تیموری کا انہیں علم تھا۔ وہ جانتے تھے

کہ یہ نادان اپنی موت کو دعوت دے رہے ہیں اور تاتاری لشکر کو اطلاع ہوتے ہی شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔ عقلمند لوگ گھروں سے نکلے اور بپھرے ہوئے نوجوانوں کو سمجھانا شروع کیا لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ کسی نے ان کی باتوں پر کان نہ دھرے۔ ان سے مایوس ہو کر بعض اصفہانیوں نے تاتاریوں کو اپنے گھر میں پناہ دی اور جب ان کا گھر گھیر لیا گیا تو وہ بلوائیوں کے سامنے سینہ سپر ہوئے لیکن خونریزی ایک بار شروع ہو جائے تو پھر اس کا روکنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

تاتاریوں نے بھاگ کر جان بچانے کی کوشش کی۔ اصفہانیوں کو اس کا پہلے سے خیال تھا۔ انہوں نے بلوہ شروع ہوتے ہی ان تاتاریوں پر حملہ کر دیا جنہیں تیمور نے شہر کے دروازوں پر متعین کیا تھا۔ وہاں تمام رات دست بدست لڑائی ہوتی رہی۔ شہر کے اندر والے تقریباً تمام تاتاری تہ تیغ کر دیے گئے۔

اصفہانیوں نے دروازوں کے تاتاریوں کو بھی قتل کر کے شہر کے دروازے بند کر لیے۔ اس طرح اصفہان میں تقریباً تین ہزار بے گناہ تاتاری محض ایک بے وقوف لوہار کی آواز پر قتل کر دیے گئے۔ صرف وہ چند تاتاری بچے جنہیں شہر کے شرفاء نے اپنے گھروں میں پناہ دی تھی۔

تیمور کی لشکر گاہ اصفہان کے مضافات میں تھی۔ اس بلوہ کی خبر رات میں تیمور تک نہ پہنچ سکی۔ کچھ تاتاری شہر سے بچ کر لشکر گاہ میں پہنچ گئے تھے لیکن یہ وہ لشکری تھے جو بغیر اجازت اصفہان کی سیر کو گئے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر انہوں نے تیمور کو اصل حالات سے آگاہ کیا تو پہلے ان سے ہی باز پرس ہو گی۔ اس لیے انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ یہ بات چھپنے والی کب تھی۔ صبح ہوتے ہی تیمور کو اس کی خبر مل گئی۔

تیمور کو جس قدر جلال آیا ہو گا اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ایک طرف تین ہزار تاتاریوں کا قتل عام ہی تیمور کو مشتعل کرنے کے لیے کافی تھا کہ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کا ایک جوان عمر امیر اور "بہادر" محمد بھی مارا گیا ہے۔ محمد مشہور تاتاری سردار حطائی بہادر کا بیٹا تھا۔

تیمور کو اس قدر طیش آیا کہ اس نے اصفہان پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا اور سوائے عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے تمام لوگوں کے قتل عام کی اجازت دے دی۔

سید مظفر شمسی چند امراء کے ساتھ اس رات تیمور کی خیمہ گاہ پر موجود تھا۔ اسے اصفہانیوں کی حماقت کا علم ہوا تو اس نے سر پیٹ لیا۔ اور اصفہان کی بھیانک تباہی کا نقشہ اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔ وہ اپنے امیروں کو لے کر تیمور کے پاس پہنچا۔ یہ سب لوگ سر کھولے اور گریبان چاک کیے اس کے سامنے گئے تھے۔ یہ فریادی کی صورت تھی۔ انہیں امید تھی کہ تیمور ان کو اس حال میں دیکھ کر شاید قتل عام کے حکم میں کچھ نرمی کر دے۔ مظفر اور اس کے ساتھی تیمور کے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

تیمور کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ وہ زخمی شیر کی طرح ٹہل رہا تھا۔ وہ لنگڑا کر چلتا تھا لیکن اس وقت وہ اتنی تیزی سے خیمے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جاتا تھا کہ دیکھنے والوں کو اس کا لنگڑانا نظر نہ آتا تھا۔

تیمور نے مظفر شمسی کو دیکھ کر منہ دوسری طرف کر لیا۔ مظفر شمسی نے بولنے کی کوشش کی لیکن آواز اس کے حلق سے نہ نکل سکی۔ کچھ دیر بعد تیمور نے پلٹ کر شمسی اور اس کے ساتھیوں کو دیکھا۔ پھر غرایا:

"مظفر ہم جانتے ہیں کہ اس میں تمہارا قصور نہیں لیکن ہمارے تین ہزار تاتاری"۔ تیمور نے غصے سے مٹھیاں بند کر لیں اور ہونٹ بھینچ لیے۔

"رحم اے شاہِ تاتار۔ بے گناہ شہریوں پر رحم کیجیے"۔ مظفر شمسی نے پوری طاقت جمع کر کے کہا۔

"رحم۔ بے گناہ!"

تیمور نے زہرخند کیا:

"تمہارے آدمیوں نے تاتاریوں کو قتل کرتے ہوئے ذرا بھی رحم نہ کیا۔ وہ بھی تو بے گناہ تھے۔ ان کا کیا گناہ تھا۔ ایک باغی کو بھی زندہ نہ چھوڑا جائے گا۔ جب تک بلوائیوں کا خون اصفہان کے دروازوں سے باہر نکل کر نہ بہتا۔ قتل عام جاری رہے گا"۔

"رحم شاہِ تاتار"۔ مظفر شمسی نے پھر ہمت کی:

"بلوائیوں اور باغیوں کو ضرور قتل کیا جائے۔ یہی ان کی سزا ہے لیکن شہریوں پر رحم کیا جائے۔ پرامن شہریوں کو معاف کیا جائے"۔

"نہیں مظفر"۔ تیمور بگڑ کر بولا:

"ہمارے تاتاری بھی پرامن تھے۔ جاؤ ہماری نظروں سے دور ہو جاؤ"۔

سید مظفر شمسی اپنے آدمیوں کے ساتھ بے نیل و مرام واپس آ گیا۔

تیموری لشکر نے اصفہان کے دروازوں پر حملہ کر دیا۔ احمقوں نے تھوڑی دیر تو آگ کا کھیل کھیلا، شہر میں دو تاتاریوں کو قتل کر دیا۔ فصیل کے دروازے بھی بند کر لیے لیکن تیموری طوفان کو کون روک سکتا تھا۔ تیموری لشکر نے مغلوں کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ بحرِ خزر اور کوہ قاف کی وحشی قوموں کا غرور توڑ کے رکھ دیا تھا۔ اس سیلاب کو ان کی معمولی فصیلیں کس طرح روک سکتی تھیں۔ ستر ہزار کے لشکر نے چاروں طرف سے یلغار کی تو اصفہان کی فصیل خس و خاشاک کی طرح اڑ گئی۔ فصیل ٹوٹ گئی۔ دروازے اکھاڑ پھینکے گئے اور خونخوار تاتاریوں کا ریلا ہر طرف سے شہر میں داخل ہو گیا۔

اُدھر تو شہر کی فصیلیں ٹوٹ رہی تھیں اور ادھر مظفر شمسی ایک بار پھر تیمور کے سامنے کھڑا گڑگڑا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ شہر کے جتنے آدمی بھی بچ سکیں وہ غنیمت ہے۔ آخر تیمور پر سید شمسی کی مسلسل التجا اور درخواست کا اثر ہوا۔ اس نے قتلِ عام کے حکم میں ذرا لچک پیدا کی اور نیا فرمان جاری کیا۔ اس فرمان کی رو سے شہر کے شرفا، معززین اور ان محلوں کے لوگوں کو امان دی گئی جہاں کوئی تاتاری قتل نہ ہوا تھا لیکن ساتھ ہی ایک سفاکانہ اضافہ بھی کر دیا۔ اس نے حکم دیا کہ ہر تاتاری سپاہی ایک اصفہانی کا سر کاٹ کر حاضر کرے۔

تاتاری لشکر بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑا۔ قتلِ عام شروع ہو گیا۔ انہیں اپنے تین ہزار تاتاریوں کا انتقام لینا تھا۔ پھر تازہ حکم یہ تھا کہ ہر تاتاری ایک اصفہانی کا سر پیش کرے۔ اس لیے تیموری لشکر کو لوٹ مار سے زیادہ سر کاٹنے کی فکر پڑ گئی۔

اصفہان میں قصوروار تو ہزار دو ہزار سے زیادہ نہ تھے۔ وہ مقابلے پر نکلے تھے اور پہلے ہی ہلے میں ختم ہو گئے تھے۔ تیموری سرداروں نے حسب الحکم شرفا اور امن پسند لوگوں کو بچانے کی کوشش ضرور کی ہو گی اور ان میں بہتوں کو بچا بھی لیا گیا ہو گا لیکن لشکر کو سروں کی تعداد پوری کرنی تھی چنانچہ تمام مصیبت نہتے اور بے گناہ شہریوں پر آ گئی۔ وہ روتے، گڑگڑاتے، خوشامد کرتے لیکن کوئی سننے والا نہ تھا، نہ داد نہ فریاد۔ تاتاری قتلِ عام کرتے کرتے تھک گئے۔ ممکن ہے کہ بعض کے دلوں میں انسانیت اور رحم کا جذبہ پیدا ہو گیا ہو۔ اس لیے سروں کی خرید و فروخت شروع ہو گئی۔ جن کو سر حاصل نہ ہو سکا انہوں نے دوسروں سے سر خریدنا شروع کر دیے۔ یہ نہیں کہ شہر کی آبادی کم تھی، اس وجہ سے قتل کرنے کے لیے آدمی دستیاب نہ ہوتے تھے بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ لوگ جان بچانے کے لیے شہر سے بھاگ نکلے اور جنگلوں، پہاڑوں میں جا کر چھپ گئے تھے۔

ایک متعصب انگریز مورخ کا بیان ہے کہ شروع میں ایک سر کی قیمت بیس ہزار دینار تھی جو گھٹتے گھٹتے نصف دینار تک پہنچ گئی۔

اس بیان میں سراسر مبالغہ ہے۔ دینار سونے کا سکہ تھا اور تیمور کے لشکری اس قدر امیر کسی طرح نہیں ہو سکتے کہ وہ ایک سر کی قیمت بیس ہزار دینار ادا کر سکیں۔

تیمور نے اگرچہ قتلِ عام کا حکم جذبۂ انتقام کے تحت دیا تھا لیکن یہ انتقام نہایت سنگین، ظالمانہ اور سفاکانہ تھا۔ دوسرے دن جب سروں کا شمار کیا گیا تو ان کی تعداد ستر ہزار سے تجاوز کر گئی۔ تیمور کے لشکر کی تعداد بھی اتنی ہی تھی۔ تین ہزار کا انتقام ستر ہزار کو قتل کر کے پورا کرنا کسی طرح جائز نہیں کہا جا سکتا۔ شاید تیمور کو اسی وجہ سے لرزندۂ جہاں اور سفاک کہا جاتا ہے۔

تیمور مسلمان تھا اور ایک مسلمان کو اس قدر سنگین بدلہ لینے کی مذہباً اجازت نہیں۔ حالانکہ اس دور میں

دوسرے مذاہب کے فاتح اس سے کہیں زیادہ سفاکی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ بلیک پرنس نے لموگ کی تاراجی کے وقت لوگوں کو جس بے دردی سے قتل کیا، اس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ڈنانٹ کے مقام پر رگنڈی چارلز انسانوں کا یوں شکار کرتا دکھائی دیتا ہے جیسے بھیڑیا بکریوں کا شکار کرتا ہے۔ ہمارے انگریز آقاؤں نے تمام فرانسیسی قیدیوں کو محض اس وجہ سے قتل کرا دیا تھا کہ وہ آخری معرکے سے پہلے ان سے فارغ ہونا چاہتے تھے۔ اسی طرح صلیبی جنگ کے انگریز، جرمن اور فرانسیسی سورماؤں نے سریانی اور ترک امیرانِ جنگ کا نکوپس کی جنگ سے پہلے قتلِ عام کرایا تھا۔

تیمور سے پہلے بھی سروں کے مینار بنائے جاتے تھے۔ تیمور نے بھی ان بے گناہ مقتولین کے سروں کو پہلے مکانوں کی دیواروں پر نمائش کے لیے سجوایا۔ پھر شاہراہوں پر ان کے مینار بنوائے اور اس طرح اپنے غصے اور جوشِ انتقام کو ٹھنڈا کیا۔

بلاشبہ تیمور دنیا کا عظیم ترین فاتح تھا لیکن اس کے دامن پر سفاکی کے جو سیاہ داغ ہیں ان داغوں میں اصفہان کا قتلِ عام بہت واضح نظر آتا ہے۔

اصفہان کے قتلِ عام کی خبر ایران میں پھیلی تو آلِ مظفر کانپ اٹھے۔ زین العابدین شاہِ ایران دہشت زدہ ہو کر بھاگ نکلا اور اپنے چچا زاد بھائی منصور بن مظفر کے پاس پناہ حاصل کرنے کے لیے شوستر پہنچا۔ منصور نے اسے پناہ دینے کے بجائے گرفتار کر لیا۔ اس نے زین العابدین پر الزام لگایا کہ اس نے تیموری لشکر کے سامنے بزدلی کا مظاہرہ کیا ہے۔

زین العابدین کے دوسرے تمام بھائیوں نے فوراً اطاعت کا اعلان کر دیا۔ تیمور کو بتایا گیا کہ مظفری شہزادوں نے لوگوں پر بھاری محصول عاید کیے ہیں۔ اس نے رعایا کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے محصول گھٹا دیے۔ اس طرح عوام میں تیمور کے لیے پہلے جیسی نفرت باقی نہ رہی اور وہ اسے اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگے۔

تیمور نے اصفہان سے شیراز کا رخ کیا۔

شیراز میں اس نے ایک بڑا دربار لگایا۔ تمام مظفری شہزادے اس دربار میں حاضر ہوئے اور تیمور کی اطاعت اور وفاداری کا حلف اٹھایا۔ تیمور نے ان کی ریاستوں کو ختم کر دیا اور ہر ریاست کو سلطنتِ تاتار کا صوبہ بنا دیا۔ جو مظفری شہزادہ جس علاقے پر قابض تھا اسے وہاں کا صوبے دار مقرر کیا گیا جن کا حاکمِ اعلیٰ امیر تیمور تھا۔ اس سلسلے میں تیمور نے ہر شہزادے کو صوبیداری کا سرکاری پروانہ عطا کیا۔ اس پروانے پر تیمور کی مہر ثبت کی گئی۔ تیمور کی شاہی مہر سرخ رنگ سے لگائی جاتی تھی۔ مہر میں فارسی کے دو لفظ "راستی رستی" کندہ تھے جن کے معنی صداقت [illegible] کے ہیں۔ ان الفاظ سے تیمور کے مزاج کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اسے اپنی طاقت پر اعتماد تھا اور طاقت ہی کو

سب سے بڑی صداقت سمجھتا تھا۔

شیراز بڑا تاریخی شہر ہے۔ علم و ادب کے لحاظ سے بھی اسے ایک اہم مقام حاصل ہے۔ سعدی اور حافظ نے اس سرزمین میں علم و دانش کے چراغ جلائے تھے۔

جس وقت تیمور شیراز پہنچا، حافظ شیرازی شہر میں موجود تھے۔ ان کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور ان کے اشعار زبان زدِ عام تھے۔ تیمور کو شعر و شاعری سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی لیکن اس نے حافظ کا کلام لوگوں سے سنا تھا اور ان کے بہت سے اشعار تیمور کو زبانی یاد تھے۔

شیراز میں قیام کے دوران کسی نے تیمور کو بتایا کہ فارسی زبان کا عظیم شاعر شیراز میں موجود ہے۔ تیمور حافظ کے نام پر چونک اٹھا اور فوراً حافظ کو دربار میں طلب کر لیا۔ حکمِ حاکم کے مصداق حافظ کو تیمور کے دربار میں جانا پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ حافظ بہت خوش پوش تھے اور اچھے سے اچھا لباس پہنتے تھے لیکن جب وہ دربارِ تیمور میں پہنچے تو ان کے جسم پر معمولی کپڑے تھے اور بظاہر وہ ایک غریب آدمی نظر آتے تھے۔

تیمور کو حافظ کی شاعری کس حد تک پسند تھی اس کا تو علم نہیں لیکن اسے حافظ کے ایک شعر پر سخت اعتراض تھا۔ پس جب حافظ سلام کے بعد تیمور کے سامنے مؤدب ہو کر کھڑے ہوئے تو تیمور نے تیوریوں پر بل ڈال کر پوچھا:

کیا یہ شعر تمہارا ہے؟

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ مارا
بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

ترجمہ: اگر میرا محبوب میری دلداری پر آمادہ ہو جائے تو میں اس کے رخسار پہ چمکنے والے سیاہ تل پہ سمرقند و بخارا کو نچھاور کر دوں۔

حافظ شیرازی کو تیمور لرزندہ جہاں کی زبان سے اپنا شعر سن کر سخت حیرانی ہوئی۔ انہوں نے بڑی حیرت سے تیمور کو دیکھا۔ پھر سر جھکا کر ادب سے بولے:

"جی ہاں شہنشاہ! یہ شعر میرا ہی ہے"۔

تیمور بڑی تلخی سے بولا:

"سمرقند کو ہم نے سینکڑوں قیمتی جانیں گنوا کر بزورِ شمشیر حاصل کیا ہے اور اب دوسرے شہروں سے نوادرات لے جا کر اس کی خوبصورتی میں روز بروز چاند لگا رہے ہیں لیکن تم کہاں کے ایسے رئیس ہو کہ اس عظیم شہر کو شیراز کی کسی دو کوڑی کی چھوکری کو بخشے دے رہے ہو؟"

حافظ نے تیمور کے چہرے پر نظر ڈالی تو انہیں خفگی کے آثار نظر آئے۔ وہ بہت گھبرائے اور سمجھ گئے کہ آج ان کی جان بچنا مشکل ہے پھر بھی انہوں نے ہمت سے کام لیا اور ذرا توقف سے بولے:

"اے امیرِ نامدار و شاہِ شاہاں! میری ان شاہ خرچیوں اور غلط بخشیوں ہی کا تو نتیجہ ہے کہ آج امیر کے دربار میں آنے کے لیے میرے پاس ڈھنگ کا کوئی لباس بھی باقی نہیں رہا اور ایک مفلس اور فقیر کی طرح حاضرِ دربار ہوا ہوں"۔

حافظ شیرازی کی ذہانت نے ان کی جان بچا لی۔ ان کے اس برجستہ اور برمحل جواب سے تیمور بہت خوش ہوا اور غصہ کافور ہو گیا اور اس نے حافظ کو دربار سے انعام و اکرام دے کر بڑی عزت سے رخصت کیا حالانکہ تمام درباری حافظ شیرازی کی سلامتی کی دعا مانگ رہے تھے۔

تیمور کی شکل و صورت اور کردار بڑا متنازعہ ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ تیمور دراز قامت تھا۔ اس کی پیشانی بلند اور سر بڑا تھا۔ وہ جتنا بہادر تھا، طاقت کے لحاظ سے بھی اتنا ہی زور آور تھا۔ اس کی رنگت نکھری اور جلد گوری تھی۔ شانے چوڑے اعضا مضبوط اور انگلیاں قوی تھیں۔ داڑھی لمبی تھی اور ہتھیلیاں خشک رہتی تھیں۔ آواز میں گونج اور گرج تھی۔ پچاس سال کی عمر کے بعد بھی وہ جوان نظر آتا تھا۔ جھوٹ سے اسے سخت نفرت تھی۔ سچائی اسے پسند تھی اور سچی بات ناگوار بھی ہو تو اسے برداشت کرتا تھا۔ مصیبت میں نہ گھبراتا تھا اور خوشی کے موقعے پر جامے سے باہر نہ ہوتا تھا۔ بعض لوگ اس کا رنگ گندمی بتلاتے ہیں۔ حالانکہ ابنِ عرب شاہ نے اس کا رنگ گورا بتایا ہے۔ ابنِ عرب شاہ اس کا سخت دشمن تھا اور تیمور اسے دمشق سے قید کر کے سمرقند لے گیا تھا۔

تیمور کی سفاکی اور تشدد کے واقعات کے پہلو بہ پہلو اس کی رحمدلی اور مروت کے بھی چرچے ہوتے تھے۔ وہ ہر حملے سے پہلے لشکر کو تاکید کرتا تھا کہ خواتین کا احترام کیا جائے اور ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ کی جائے۔ انعام و اکرام میں اس کا ہاتھ بہت کھلا ہوا تھا۔ حافظ شیرازی کے ساتھ اس کا سلوک اس کا کھلا ثبوت ہے۔ انہیں عزت و اکرام سے رخصت کیا گیا۔ حالانکہ درباریوں کا خیال تھا کہ بلبلِ شیراز کی زندگی چند لمحوں سے زیادہ نہیں۔

○

تیمور ایرانی شہزادوں کے جھگڑے نمٹا کر سمرقند واپس آ گیا لیکن تین سال بعد اسے پھر ایران پر فوج کشی کرنا پڑی۔ ایرانی شہزادوں کو وہ صوبائی گورنر بنا کر چھوڑ آیا تھا انہوں نے پھر لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا۔ اس حملے کی سب سے بڑی وجہ شاہ منصور بن مظفر حاکم شوستر کا وہ سلوک تھا جو اس نے اپنے چچا زاد بھائی زین العابدین کے ساتھ کیا تھا۔

زین العابدین، تیمور کے خوف سے بھاگ کر منصور بن مظفر کے پاس چلا گیا تھا۔ تیمور نے شوستر کا رخ کیا تو منصور قلعہ چھوڑ کر پہاڑوں میں چھپ گیا۔ تیمور اسے اس کے حال پر چھوڑ کر واپس آ گیا تھا۔ لیکن تیمور کے واپس آتے ہی منصور بن مظفر نے پھر علمِ بغاوت بلند کیا اور ایک بڑے علاقے پر قبضہ کر کے شاہِ ایران ہونے کا اعلان کر دیا۔ منصور بڑا ظالم اور درندہ صفت انسان تھا۔ اس نے شاہ زین العابدین کی آنکھوں میں سلائی پھروا کر اسے ہمیشہ کے لیے اندھا کر دیا تاکہ وہ کبھی تخت و تاج کی خواہش نہ کر سکے۔ ہر چند کہ تیمور بھی سفاک مشہور تھا لیکن اسے اپنے دوست شاہ شجاع شاہِ ایران کے خط کا اب بھی پاس تھا۔ شاہ شجاع نے اپنے بیٹے زین العابدین کو تیمور کی حفاظت میں دینے کا اعلان کیا تھا۔ زین العابدین پر وہ یہ ظلم برداشت نہ کر سکا اور فوراً لشکر لے کر ایران کی طرف چل پڑا۔

ایران کے راستے میں تیمور کے لشکر کو حشیشین کے خونخوار فدائین کا سامنا کرنا پڑا۔ اس فرقے کی تاریخ عباسی دور سے شروع ہوتی ہے اور اس کے بارے میں بہت ہی عجیب و غریب قصے بیان کیے جاتے ہیں۔ اس کی بنیاد حسن بن صباح نامی ایک شخص نے رکھی تھی۔ ایران کے شمالی علاقے میں ان کے قبضے میں اٹھارہ مضبوط قلعے مشرق سے مغرب تک ایک پہاڑی سلسلے سے منسلک تھے۔ ان کا صدر مقام قلعہ الموت تھا اور ان کا امام یا پیشوا ہمیشہ اس قلعہ میں رہتا اور شیخ الجبل کے نام سے مشہور تھا۔

قلعہ کے اندر جنت کے نقشے کے مطابق نقلی ہیرے جواہرات کے محل تعمیر کرائے گئے تھے۔ دودھ اور شہد کی نہریں بہتی تھیں اور حور و غلمان ساغر سنبھالے مہمان نوازی کرتے تھے۔ لوگوں کو حشیش (بھنگ) پلا کر اس جنت کی سیر کرائی جاتی تھی اور پھر ان سے مسلمانوں کے بڑے بڑے بادشاہوں اور علما کو قتل کرایا جاتا تھا۔ ان کی ہیبت کا یہ عالم تھا کہ قرب و جوار کے تمام امیر اور بعض بادشاہ اسے خراج ادا کرتے تھے۔

تیمور سے ڈیڑھ سو سال پہلے مغل سردار ہلاکو خان نے اس قلعہ پر حملہ کر کے اسے نیست و نابود کر دیا تھا اور شیخ الجبل خور شاہ قتل کر دیا گیا تھا لیکن حشیشین نے پھر کچھ طاقت پکڑ لی تھی اور اب وہ قتل و غارت گری اور راہزنی کرتے تھے۔ انہیں تیمور کی طاقت کا اندازہ نہ تھا اس لیے حسبِ عادت انہوں نے تیمور کے چار جاسوس سواروں کو قتل کر دیا اور جب تیمور کا ہراول دستہ ان کی تلاش میں پہاڑوں میں داخل ہوا تو حشیشیوں نے ان پر بھی حملہ کر دیا۔

تیمور بھلا اس قسم کی شورش کس طرح برداشت کر سکتا تھا۔ اس کی فوجی حکمت عملی یہ تھی کہ آگے بڑھنے سے پہلے وہ اپنی پشت کو مضبوط کرتا۔ اس نے فوراً ان راہزنوں کے مکمل خاتمے کا حکم دیا۔ تیمور کے پورے لشکر نے پہاڑ کو گھیر لیا اور پھر حملے کا آغاز کیا۔

حشیشین بھی مقابلے پر آئے مگر شکست کھا کر پسپا ہوئے۔ انہیں یہ علم ہی نہ تھا کہ انہیں چاروں طرف سے گھیرا جا چکا ہے۔ وہ جدھر بھی بھاگ کر جاتے تیموری سوار انہیں نظر آتے۔

تیمور کے ساتھ اس کے دس دس ہزار کے صرف تین لشکر تھے۔ تیمور کا بیٹا شاہ رخ اور دونوں پوتے پیر محمد اور سلطان محمد اس کے ساتھ تھے۔ یہ تینوں ہم عمر شہزادے اب جوان ہو چکے تھے۔ تیمور نے لشکر کی کمانیں انہیں کے سپرد کی تھیں۔ شہزادوں کا یہ پہلا امتحان تھا اور ہر شہزادہ دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کوشش میں شہزادوں نے ناقابلِ یقین و بیان دلاوری اور شجاعت کے جوہر دکھائے اور حشیشین کو چن چن کر تہِ تیغ کیا۔

تیمور الگ کھڑا اس جنگ کا معائنہ کر رہا تھا۔ شہزادوں کی بہادری سے وہ بہت خوش ہوا۔ خاص کر پیر محمد جو شہزادہ کا بڑا بیٹا تھا، اس نے کچھ ایسی بے جگری کا ثبوت دیا کہ تیمور بے ساختہ واہ واہ کہہ اٹھا۔ اسے پیر محمد کے پیکر میں اپنا ولی عہد نظر آیا۔ اور اسے یقین ہو گیا کہ اگر یہ شہزادے اسی طرح بہادری کے جوہر دکھاتے رہے اور ان میں یونہی اتفاق و اتحاد رہا تو اس کی سلطنت پر کوئی آنچ نہ آئے گی۔

اس جنگ میں تیمور نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کسی مناسب وقت پہ پیر محمد کو اپنا ولی عہد بنانے کا اعلان کر دے گا۔

حشیشین کا مکمل خاتمہ کرنے کے بعد جب تیموری لشکر ایرانی سرحد کے قریب پہنچا تو وہاں ایک اور دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ تیموری لشکر میں آق بوغا نامی ایک سوار تھا۔ اس کے ماتحت صرف دس سپاہی تھے۔ آق بوغا بڑا قوی ہیکل اور دیو پیکر تھا اور جسامت کے لحاظ سے بڑی کثرت سے شراب پیتا تھا۔ مشہور ہے کہ وہ مینڈھے کے سینگ میں دو دو سیر شراب بھر کر ایک ہی سانس میں چڑھا جاتا اور اس بری عادت کے باوجود تیمور اس کی بہادری کی قدر کرتا تھا۔ تیمور کے لشکر میں ہر نسل و قوم اور مختلف عادات و اطوار کے لوگ تھے۔ زاہد و پرہیزگار بھی اور شرابی اور کبابی بھی۔ شراب پینے کی عام اجازت نہ تھی۔ لوگ خیموں کے اندر بیٹھ کر شراب پیتے تھے۔ اگر کوئی شراب پی کر غل غپاڑہ مچاتا تو اسے سخت سزا دی جاتی تھی۔

تیمور نے پڑاؤ ڈالا تو آق بوغا کو شراب کی خواہش ہوئی۔ وہ شراب کی تلاش میں اٹھا اور گھوڑا لے کر دور نکل گیا۔ اسے ایک بستی نظر آئی۔ بستی پہنچا تو وہاں ایک شراب خانہ دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

شراب خانے کا مالک اس دیو کو دیکھ کر پہلے تو گھبرایا لیکن جب آق بوغا نے شراب طلب کی تو وہ مطمئن ہو گیا۔ اس نے آق بوغا کے نقش و نگار سے اندازہ لگا لیا کہ وہ تاتاری سوار ہے۔ آق بوغا کو بھی یہ احساس ہو گیا تھا کہ یہ گاؤں تو ایران کے اندر ہے یا اس کی سرحد کے بالکل قریب ہے اس لیے اس نے گھوڑے پر زین کسی رکھی اور کمر کھول کر جام پر جام چڑھانے شروع کر دیے۔

آق بوغا کو یہاں آئے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ بستی کا نمبردار گھبرایا ہوا شراب خانے میں داخل ہوا۔ شراب خانے

کا مالک اسے پریشان دیکھ کر خود بھی پریشان ہو گیا۔ اس نے نمبردار سے گھبراہٹ کا سبب پوچھا تو نمبردار نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بتانا شروع کیا:

"بستی کے باہر تالاب کے کنارے پچاس کے قریب ایرانی سوار گھوڑوں سے اتر رہے ہیں۔ وہ بستی کو لوٹیں گے۔"

"پھر اب کیا کیا جائے؟" مالک کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اسے اپنے شراب خانے کی فکر پڑ گئی۔

"تم فوراً شراب خانہ بند کر دو اور کہیں جا کر چھپ جاؤ۔" نمبردار نے اسے اپنے خیال میں بڑا نیک مشورہ دیا۔

نمبردار اور شراب خانے کے مالک کے درمیان یہ گفتگو آق بوغا کے قریب ہی ہو رہی تھی۔ اس کے کانوں میں کچھ باتیں پڑی تھیں۔ شراب خانہ بند کرنے کی بات پر وہ چونک پڑا اور تلخ لہجے میں پوچھا:

"کیا قیامت آ گئی ہے۔ شراب خانہ بند نہیں ہو گا!"

ان دونوں نے حیران نظروں سے آق بوغا کو دیکھا۔ نمبردار اس کے ذرا اور قریب آ گیا اور بڑی راز داری کے ساتھ بولا:

"تاتاری جوان! آپ نے سنا نہیں کہ پچاس ایرانی سوار تالاب پر اپنے گھوڑوں کو پانی پلا رہے ہیں۔ دم میں وہ بستی پر حملہ کر دیں گے۔ آپ اجنبی ہیں۔ بہتر ہے کہ آپ بھی چپکے سے کسی طرف نکل جائیے۔"

"واہ واہ۔ تم لوگ بھی عجیب آدمی ہو۔" آق بوغا ہنستے ہوئے بولا:

"تم گاؤں کے مسلح آدمیوں کو لے کر آؤ۔ ہم سب مل کر ان سے لڑیں گے۔"

نمبردار کو اور زیادہ حیرت ہوئی۔ شراب خانے کے مالک نے کہا:

"تاتاری جوان! تم ہمارے مہمان ہو۔ نمبردار نے بالکل صحیح مشورہ دیا ہے۔ گاؤں میں دس پانچ سے زیادہ مسلح سوار نہیں ہیں۔ پچاس سواروں سے لڑنا کوئی عقلمندی کی بات نہیں۔ تم چپ چاپ یہاں سے نکل جاؤ۔"

"نہیں۔ تم اپنے آدمی لاؤ۔ ہم لڑیں گے۔" آق بوغا نے اس قدر گرجدار اور دہشت ناک آواز میں کہا کہ نمبردار اور شراب خانے کا مالک گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ ایرانیوں سے تو وہ پہلے ہی خوفزدہ تھے اب یہ دیو بھی ان کے لیے مصیبت بن گیا تھا۔ انہیں خطرہ ہوا کہ اگر اس دیو کا کہنا نہ مانا گیا تو کہیں کوئی اور فتنہ نہ کھڑا ہو جائے۔ وہ خاموشی سے شراب خانے سے نکلے اور دم کے دم میں دس مسلح سواروں کو ساتھ لے کر واپس آق بوغا کے پاس آ گئے۔

"تم نے اچھا کیا۔" آق بوغا آخری جام حلق میں انڈیلتے ہوئے بولا:

"تم لوگ میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ جس وقت میں نعرہ لگاؤں، تم لوگ فوراً گھوڑے دوڑا کر ایرانیوں پر ٹوٹ پڑنا۔"

گاؤں کے سواروں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

آق بوغا نے کمر کا پٹکا کسا۔ داڑھی چمڑے کی پٹی سے باندھی۔ ڈھال بازو پہ چڑھائی اور سر پر خود رکھتے ہوئے ان سے کہا:

"خبردار۔ اپنے گھوڑے مت روکنا خواہ آندھی اور طوفان آ جائے۔ ایک بار گھوڑا بڑھ جائے تو اسے روکنا بڑی بزدلی ہے۔"

آق بوغا سواروں کو ساتھ لے کر تالاب کی طرف چلا۔ ایرانی اپنے گھوڑوں کو پانی پلا کر کسی بات پر بحث کر رہے تھے۔ شاید وہ کچھ دیر تالاب کے کنارے آرام کرنے کی فکر میں تھے۔

آق بوغا نے ذرا اور قریب پہنچ کر گھوڑا روکا۔ سواروں کو اشاروں سے سمجھایا۔ پھر تاتاریوں کا مخصوص نعرہ لگا کر ایڑ لگائی۔ گاؤں والے تو پچاس سواروں کو دیکھ کر ہی حواس باختہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے آق بوغا کو بڑھتے دیکھا تو اپنے گھوڑوں کا رخ گاؤں کی طرف کر کے بھاگنا شروع کر دیا۔

ایرانیوں نے صرف ایک تاتاری کو اپنی طرف آتے دیکھا تو وہ سمجھے کہ اس کے پیچھے اس کا دستہ ہو گا۔ ایرانی پہلے ہی تاتاریوں سے مرعوب ہو گئے تھے۔ وہ جلدی جلدی گھوڑوں پر سوار ہوئے اور بے تحاشا بھاگ کھڑے ہوئے۔ آق بوغا بھی ان کے تعاقب میں بھاگنے لگا۔ وہ بار بار نعرے لگاتا اور آواز دے کر کہتا:

"اے ایرانی سردارو! ذرا ٹھہر کر دو دو ہاتھ تو کرتے جاؤ۔"

لیکن انہوں نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ ان کے گھوڑے زیادہ تیز رفتار تھے۔ ایک بھی آق بوغا کے ہاتھ نہ آ سکا۔ آق بوغا بڑے فاتحانہ انداز سے گاؤں واپس آیا۔ گاؤں والے اس کی بہادری پر عش عش کر رہے تھے مگر اسے ایرانیوں کے بھاگ جانے کا افسوس تھا۔ اس نے بڑی ترشی سے کہا:

"ایرانی تو ایک ہی آواز پہ گیدڑوں کی طرح دم دبا کر بھاگ گئے لیکن تم لوگ بھی خرگوش سے زیادہ بزدل ہو۔"

آق بوغا نے جب واپس جا کر تیمور کو یہ بات بتائی تو وہ خوب ہنسا۔ حالانکہ تیمور مسکرانا بھی کبھی کبھی تھا۔

منصور بن مظفر بھی اپنی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس کے جاسوس دور دور تک پھیلے ہوئے تھے اور تیمور کی پیش قدمی کی دم دم خبریں پہنچا رہے تھے۔ منصور نے اپنا آدھا لشکر اپنے نائب کی زیر کمان قلعہ سفید میں بھیج دیا تھا۔ اس قلعہ کا پرانا نام دروازہ پارس یا دروازہ شوش تھا اور یہ ہزاروں سال سے ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ قلعہ چاروں طرف سے پہاڑوں میں گھرا ہوا تھا اور ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا۔ اس کی دیواریں پہاڑ کاٹ کر بنائی گئی تھیں جن میں دراڑیں ڈالنا تقریباً ناممکن تھا۔

پہاڑ پر ایک وسیع و عریض میدان تھا جہاں پھل دار درختوں کے علاوہ کاشت بھی ہوتی تھی اس لیے قلعہ والوں کو غذا کی کوئی قلت نہ ہوتی تھی۔ سکندر اعظم بھی اس قلعہ کے سامنے بے بس ہو گیا تھا اور اگر ایک چرواہا اس کی رہنمائی نہ کرتا تو وہ قلعے پر قابض نہ ہو سکتا تھا لیکن تیمور تو سکندر اعظم سے بھی بڑا فاتح تھا۔ اس نے قلعہ کے سامنے پہنچ کر چرواہے کی مدد کا بھی انتظار نہ کیا اور فوراً حملے کا حکم دے دیا۔

پہاڑ پر نہ تو گھوڑے چڑھائے جا سکتے تھے اور نہ قلعہ شکن آلات پہنچائے جا سکتے تھے۔ تیمور نے اپنی قیام گاہ پہاڑ کی ترائی میں ایک چٹان پر قائم کی اور اس کے سوار گھوڑوں سے اتر کر چیونٹیوں کی طرح پھیل گئے۔ یہاں سے عمودی چٹانیں شروع ہوتی تھیں جن پر جگہ جگہ برج بنے تھے جن میں ایرانی فوج بیٹھی تھی۔

تاتاریوں نے پہلے موڑ کے برجوں پر حملہ شروع کر دیا۔ اوپر سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی اور بہادر سپاہی سروں پر خود چڑھائے آتے ہوئے تیروں کی سمت عمودی چٹانوں پر چڑھ رہے تھے۔ تیمور دور کھڑا اپنے سپاہیوں کی جرأت دیکھ رہا تھا اور جوش دلانے کے لیے نقارے بجوا رہا تھا۔ سپاہی چٹانوں سے چمٹے ہوئے بڑی احتیاط سے بڑھ رہے تھے لیکن اکثر کے ہاتھ چٹان سے چھوٹ جاتے اور وہ ترائی میں گر کر ختم ہو جاتے تھے۔ اوپر سے تیر باری کے علاوہ بڑے بڑے پتھر بھی لڑھکائے جا رہے تھے جو سپاہیوں پر ٹوٹتے اور تاتاریوں کا خاتمہ کر دیتے۔

قلعہ سفید پر شام تک حملہ جاری رہا لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ نہ کوئی برج سر ہوا اور نہ اوپر جانے کا کوئی متبادل راستہ ہی دریافت ہو سکا۔

شام کو جب زخمیوں اور مرنے والوں کی لاشوں کو نیچے وادی میں پہنچایا گیا تو یہ تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ تیمور کے چہرے پر اداسی دوڑ گئی۔ کئی بڑے سردار اور بہادر بھی اس ناکام حملے میں جاں بحق ہو گئے۔ ممکن ہے کہ تیمور افسردہ ہوا ہو مگر اس نے چہرے سے ظاہر نہ ہونے دیا۔

رات ہونے پر جو سپاہی جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا۔ کچھ نے چٹانوں کے نیچے رات گزاری اور بعض نے [illegible] کے لگڑوں سے چمٹے چمٹے سویرا کر دیا۔

صبح کو پھر حملہ شروع ہوا۔ وہی نقاروں کی گھن گرج اور وہی نعروں کا شور۔ تاتاری سپاہی مر مر کر گر رہے تھے، تیروں کا نشانہ بن رہے تھے۔ اوپر سے لڑھکائے جانے والے پتھروں میں دب دب کر ختم ہو رہے تھے لیکن [illegible]ے قدم آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ عمودی چٹانیں ان کے بڑھتے قدم روکنے سے قاصر تھیں۔ دیو پیکر [illegible]انے اس جنگ میں بھی دلاوری کا مظاہرہ کیا۔ اسے ایک عمودی چٹان میں شگاف نظر آیا۔ شاید کسی اور نے [illegible]ان میں داخل ہونے کی ضرورت محسوس نہ کی یا پھر اسے موت کا دہانہ سمجھ کر اس سے کترا کر نکل گئے۔

آق بوغا اس شگاف میں داخل ہو گیا اور پھر اس میں اس طرح غائب ہوا جیسے اسے شگاف نے نگل لیا ہو۔ [illegible]ے نے واقعی بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا لیکن وہ عمودی شگاف اس کی کامیابی اور تیموری فتح کا زینہ بن گیا۔ وہ اپنی [illegible]ر ڈھال سنبھالے بہت جلد چوٹی پر پہنچ گیا۔

اوپر پہنچ کر آق بوغا نے ڈھال کو آڑ بنا کر ایرانیوں پر تیر برسانا شروع کر دیے۔ مگر وہ خود تیروں سے [illegible] رہا۔ بہت سے ایرانی زخمی ہو کر پیچھے ہٹ گئے۔

اسی دوران کچھ لوگ برج کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اس وقت انہوں نے دور اوپر سے آتی ایک آواز سنی۔ [illegible] نے نظریں اٹھائیں تو دیکھا کہ آق بوغا پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا زور زور سے اعلان کر رہا تھا:

"شاہ تاتار فتح مند ہوا۔ ایرانیوں کو شکست ہو گئی۔"

[illegible]لکے اس اعلان کو سن کر سپاہیوں میں اور جوش پیدا ہو گیا۔ ایرانیوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ [illegible]رائے خانم کے بیٹے شاہ رخ مرزا نے فوراً اپنے دستوں کو یلغار کا حکم دیا اور برجوں سے آگے نکل گیا۔ [illegible]ین بیٹھے ایرانی دستے بیکار ہو کر رہ گئے۔ کچھ سپاہی آق بوغا کی مدد کو پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ شاہ رخ برجوں [illegible]ے علم لہراتا ہوا چوٹی پر پہنچا تو اس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ آق بوغا تلوار سونتے ایرانیوں کے پیچھے بھاگ رہا [illegible]یرانی سر پر پیر رکھ کر بھاگ رہے تھے۔

نیچے وادی میں نقاروں پر چوٹ پڑ رہی تھی اور تیمور خیمے کے باہر کھڑا مسکرا رہا تھا۔

تیمور میدان جنگ میں بھاگنے والوں کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتا۔ عام طور پر ایسے لوگوں کا منہ کالا کیا جاتا، گلے میں گھوڑے کے چارے کا توبڑا لٹکایا جاتا۔ پھر اسے خچر پر الٹا بٹھا کر بازاروں میں پھرایا جاتا مگر بہادروں کی قدر کرتا اور ان کی حوصلہ افزائی کے لیے انعام و اکرام سے مالا مال کرتا تھا۔

قلعہ سفید پر قبضہ ہوتے ہی تیمور نے آق بوغا کو بلوایا۔ آق بوغا اب تک پہاڑ کی چوٹی پر بھاگنے والوں کا پیچھا کر [illegible] لوگوں نے اسے تیمور کا حکم سنایا اور جلوس کی شکل میں اسے تیمور کے سامنے پیش کیا۔

آق بوغا دس سواروں کا رسالدار تھا لیکن اس کے پاس سوائے ایک گھوڑے کے اور کچھ نہ تھا۔ تیمور نے اسے

اپنے پاس بلایا اور شفقت سے پوچھا:

"آق بوغا۔ تمہارے پاس کتنے گھوڑے ہیں؟"

"میں اکیلا ہوں امیرِ تاتار۔ گھوڑا بھی ایک ہی ہے"۔ آق بوغا نے معصومیت سے جواب دیا۔

امیر نے حکم دیا:

"پچاس گھوڑے لائے جائیں"۔

گھوڑے حاضر کیے گئے۔ امیر نے کہا:

"یہ سب گھوڑے تمہارے لیے ہیں۔ تم ان کے مالک ہو"۔

"اتنے گھوڑے؟" آق بوغا نے حیرت سے کہا:

"میں کیا کروں گا امیر؟"

امیر نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا:

"تمہارے پاس اونٹ کتنے ہیں؟"

"ایک بھی نہیں امیر"۔

"پچاس اونٹ حاضر کیے جائیں"۔

امیر نے اونٹ منگوا کر آق بوغا کے حوالے کر دیے۔

"کنیزیں کتنی ہیں؟"

"ایک بھی نہیں"۔

تیمور کے حکم سے دس حسین و جمیل کنیزیں آق بوغا کو عطا ہوئیں۔ اس کے علاوہ درہم و دینار، ریشمی زربفت کے تھان، درجنوں خیمے اور ایک سو خچر آق بوغا کو انعام میں دیے گئے۔ یہ تمام سامان لا کر اس کے ڈھیر کر دیا گیا۔

آق بوغا اتنا سامان دیکھ کر بوکھلا گیا۔ اس نے کہا:

"اے امیرِ تاتار۔ میں اتنا سامان لے کر کیا کروں گا۔ ان گھوڑوں، خچروں اور اونٹوں کو میں کس طرح سنبھالوں گا؟"

"یہ سب تمہاری ملکیت ہے آق بوغا"۔ امیر بولا:

"تم نے قلعہ سفید کی فتح کو آسان بنایا ہے۔ یہ تمہارا حق ہے اور ہم جوانمردوں کا حق نہیں مارا کرتے کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بیان کرو"۔

"آق بوغا کو تو صرف امیر کی نظرِ عنایت چاہیے"۔ آق بوغا نے بھولپن سے کہا:

"امیر خوش ہوں تو فتح حاصل ہوتی ہے اور ان کی ناراضگی ہم لوگوں کو فنا کر دیتی ہے"۔

تیمور نے آق بوغا کا عہدہ بڑھا دیا۔ بیس غلام اور اتنے ہی سائیس جانوروں کی دیکھ بھال کے لیے عطا کیے گئے

بوغا جب یہ انعامات غلاموں پہ لدوا کر واپس ہوا تو اس کا ایک ساتھی بولا:

"مبارک ہو آق بوغا! امیر نے تمہاری شجاعت کا حق ادا کر دیا۔ تم نے تو اتنے سامان کا کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا"۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو دوست"۔ آق بوغا جیسے خواب میں بولا:

"کچھ دیر پہلے میرے پاس صرف ایک گھوڑا تھا۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ اب میں اتنے ساز و سامان کا بن گیا ہوں"۔

آق بوغا اب گھوڑے پر سوار ہو کر بڑی شان سے نکلتا۔ اسے شہزادہ محمد سلطان کے ایک دستے کا کمانڈر مقرر یا گیا تھا۔

آق بوغا جب تیمور کے ساتھ ہوتا تو اس بات کا خیال رکھتا کہ تیمور کی طرف اس کی پشت نہ ہونے پائے۔ وہ امیر کے خیمے کی طرف پیر کر کے سویا اور تاکید کی کہ جب اسے دفن کیا جائے تو اس کے پیر امیر کے محل کی ان خیمے یا محل کی طرف پیر کرنے کا مقصد سمجھ میں نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ بعض قبائل میں امیر یا سردار کے خیمے کی پیر کرنے سے اس کا احترام مقصود ہو۔

شاہ منصور کے یہ وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ قلعہ سفید پر تیمور کا قبضہ ہو جائے گا۔ اس نے تو قلعہ دار کو حکم دے رہا جب تیمور قلعہ کی فتح سے بے بس ہو کر واپس ہو تو اس پر پشت سے حملہ کیا جائے۔ سامنے سے منصور نے دم بنایا تھا مگر قلعۂ سفید تیموری عزم و ارادے کے سامنے چوبیس گھنٹے سے زیادہ نہ ٹھہر سکا اور اس کے ناقابلِ سنے کا عقیدہ ریزہ ریزہ ہو گیا۔

شاہ منصور کو کھلے میدان میں مقابلے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ اپنا لشکر لے کر شیراز کی طرف نکل گیا تاکہ چھاپہ مار الجھا کر تیمور کو واپس جانے پر مجبور کر دے۔ تیمور بھی اس کے تعاقب میں روانہ ہوا۔

قلعۂ سفید کے حملے میں مراثے خانم کے بیٹے شاہ رخ مرزا نے نمایاں کردار ادا کیا تھا خانزادہ کے دونوں بیٹوں پیر محمد اور سلطان محمد کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع نہ ملا تھا۔ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ تیمور نے جو شاید یہ بات محسوس کر لی تھی۔ اس نے میمنہ و میسرہ پر پیر محمد اور سلطان محمد کو کمانڈر مقرر کیا اور خود باقی لشکر لے کر شیراز کی طرف بڑھا جہاں شاہ منصور کے پہنچنے کی اسے اطلاع ملی تھی۔

یہ خبر درست تھی۔ شاہ منصور چار ہزار سواروں کے ساتھ شیراز کے مضافات میں پہنچ چکا تھا۔ تیمور کے بڑھنے کی خبر سن کر اس نے وہاں سے بھاگنا چاہا لیکن ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ وہ بھاگنے کے بجائے تیمور سے فیصلہ کن جنگ کرنے پر مجبور ہو گیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جن دنوں شاہ منصور اپنے سواروں کے ساتھ شیراز کے قریب ہی چھپا ہوا تھا اس نے بھیس بدل کر گاؤں والوں سے باتیں کیں۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اگر وہ شیراز میں داخل ہو جائے تو شیراز والے اس سے کس حد تک تعاون کریں گے؟

شاہ منصور نے ایک دیہاتی سے پوچھا:

"شیراز کے باشندے شاہ منصور کے بارے میں کس طرح کے خیالات رکھتے ہیں؟ کیا اسے شیراز کے قلعہ میں پناہ مل جائے گی؟"

دیہاتی نے اس کی بات سن کر تمسخر کے انداز میں کہا:

"اجنبی دوست۔ شیراز والے تو کہتے ہیں کہ شاہ منصور کے سوار جو بھاری ڈھالیں اٹھائے پھرتے ہیں اور جن کے پاس لانبی کمانیں اور وزنی تیر ہیں وہ اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر اس طرح بھاگے ہیں جیسے بھیڑ بکریوں کے غول بھیڑیوں کو آتا دیکھ کر بھاگتے ہیں"۔

شاہ منصور کو دیہاتی کے اس جواب پر بڑی شرم محسوس ہوئی۔ اس نے بھاگنے کا ارادہ ترک کر دیا اور لشکر کو شیراز کے راستے پر واپس لے آیا۔ تیمور نے مظفری لشکر کو راستہ روکے دیکھا تو اسے شاہ منصور کی جرأت پر بڑا تعجب ہوا۔ منصور نے فوراً حملہ کر دیا۔

یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ تیموری لشکر نے بڑی مشکل سے قدم جمائے۔ منصور کے ساتھ اس کے سواروں نے بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ منصور کے دو ہزار سوار یا تو مارے گئے یا منتشر ہو گئے لیکن وہ باقی دو ہزار کے ساتھ چھلاوے کی طرح تیموری لشکر پر حملے کرتا رہا۔ تیمور کا باقی لشکر بھی آ پہنچا۔ پیر محمد اور سلطان محمد کو ایسے وقت کا انتظار ہی تھا۔ دونوں بھائی تلواریں سونت کر منصور پر ٹوٹ پڑے مگر وہ اس پر قابو نہ پا سکے۔ ایک بار تو ایسا ہوا کہ منصور لڑتا بھڑتا تیمور کے سر پر پہنچ گیا۔ منصور کے ساتھیوں نے تیمور کے محافظوں کو قتل کر دیا۔ شاہ رخ مرزا نے

برابر کھڑا تھا اس نے تیمور پر سامنے سے ہونے والے کئی وار خود پر لے لیکن تیمور کی پشت بھی غیر محفوظ تھی۔ اس کے ڈھال اور تلوار برداریا مارے جا چکے تھے۔ تیمور کے پاس سوائے ایک خنجر کے اور کوئی ہتھیار نہ تھا۔

پیر محمد اور سلطان محمد نے تیمور کو دشمن کے نرغے میں دیکھا تو مظفری حملہ آوروں کو مارتے کاٹتے اور دھکیلتے ہوئے دادا کی پشت پر پہنچ گئے۔ تیمور نے انہیں بڑی تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔ منصور کے حملے کا زور ٹوٹ گیا اور اسے قتل کر دیا گیا۔

شاہ منصور کے خاتمے سے ایران میں مظفری دور حکومت بھی ختم ہو گیا اور وہ تمام علاقے جو اس خاندان کے قبضے میں تھے براہ راست تیموری سلطنت میں شامل کر لیے گئے۔

تیمور نے بیٹے شاہ رخ اور پوتوں پیر محمد اور سلطان محمد کو انعام و اکرام سے نوازا لیکن اس دفعہ اس کی نظر کرم پیر محمد کی طرف رہی جو اپنی جان خطرے میں ڈال کر تیمور کی مدد کو پہنچا تھا۔

تیمور تو پیر محمد اور سلطان محمد پر نوازشوں کی بارش کر رہا تھا لیکن ان کی ماں خانزادہ کچھ اور ہی گل کھلا رہی تھی۔

خبطی شہزادہ

خانزادہ نے قصرِ سلطنت سے ایک سوار کو نکلتے دیکھ کر اپنا گھوڑا روک لیا۔

سوار کا لباس نہایت قیمتی تھا۔ سر پر طرّے دار پگڑی جسے ایک زر نگار پٹی سے پیشانی پر کس دیا گیا تھا سونے کے کام والا انگرکھا نما جبہ، جڑاؤ دستے والی زین سے لٹکی تلوار۔ گھوڑے کا ساز چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔

خانزادہ اس عظیم الشان محل کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ اس طرحدار سوار کا اس پر اور زیادہ رعب پڑا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ یہ کوئی بڑا امیر یا وزیر ہے۔ سوار کا رخ خانزادہ کی طرف تھا۔ شاید وہ اسے دیکھ کر ہی صدر دروازے سے باہر آیا تھا۔ خانزادہ اپنے گھوڑے پر سنبھل کر بیٹھ گئی۔ سوار اس کے قریب آیا۔

"السلام علیکم خاتونِ محترم"۔ سوار نے ادب سے کہا:

"میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ تبریز میں اجنبی ہیں۔ براہِ کرم میرے خیال کی تصدیق فرمائیے"۔

"آپ نے صحیح فرمایا"۔ خانزادہ نے تائید کی:

"تبریز میرے لیے اجنبی ہے۔ میں اور گنج کی رہنے والی ہوں"۔

"سبحان اللہ۔ اور گنج بھی کیا عجب شہر ہے"۔ سوار متانت سے بولا:

"اور گنج کو صرف سلطنتِ خوارزم کا دارالسلطنت ہونے کا فخر حاصل نہیں بلکہ اس مبارک شہر سے تو خوارزم کے صوفی خاندان کے ترکمانوں کی درخشندہ تاریخ بھی وابستہ ہے"۔

خانزادہ کا تعلق صوفی خاندان سے ہی تھا۔ اپنے خاندان اور شہر کی تعریف سن کر وہ خوش ہو گئی۔ اس نے پوچھا:

"معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو تاریخ سے بہت دلچسپی ہے"۔

سوار نے انکسار سے جواب دیا:

"تاریخ تو ایک ضمنی علم ہے۔ دراصل میرا میدان شعر و ادب اور رقص و موسیقی ہے"۔

خانزادہ کی دلچسپی بڑھی:

"آپ شاعری کرتے ہیں؟"

"بشرطِ فرصت اپنے شاعر ہونے کا ثبوت پیش کر سکتا ہوں"۔

"اور موسیقی؟"

"ہر طرح کے ساز بجا کے داد حاصل کر چکا ہوں"۔

"اور رقص سے کس حد تک لگاؤ ہے"۔

"دورِ خسروی کے رقص میں مہارت رکھتا ہوں"۔

"چہ خوب۔ آپ تو ہمہ صفت شخصیت ہیں"۔

"ذرہ نوازی۔ شکریہ"۔ سوار نے سر کو ذرا سا جھکا کر جواب دیا:

"لیکن خاتون! میں آپ سے شرمندہ ہوں کہ فصیلِ شہر کے ناظم نے آپ کی صحیح رہنمائی نہیں کی"۔

"کس کا ذکر کر رہے ہیں آپ؟" خانزادہ نے حیرت کا اظہار کیا:

"میری کسی ناظم سے ملاقات نہیں ہوئی۔ سیدھی ادھر ہی آ گئی ہوں"۔

"تو پھر یہ سرحد کے محافظوں کی کوتاہی ہے"۔ "ان سے باز پرس کی جا سکتی ہے"۔ سوار نے بڑے تاسف سے کہا۔ "یہ شکایت تو کوتوالِ شہر سے ہونی چاہیے"۔

"میں کچھ نہیں سمجھ سکی"۔ خانزادہ الجھتے ہوئے بولی:

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"میں آپ کو سمجھاتا ہوں خاتونِ محترم"۔ سوار نرمی سے بولا:

"اس شہرِ نامدار اور حصارِ نو بہار کا دستور ہے کہ جب کوئی اجنبی سرحد پہ پہنچے تو ناظمِ سرحد کا فرض ہے کہ وہ اسے سرائے تک پہنچائے۔ یہاں کی تمام سرائیں دراصل شاہی مہمان خانے ہیں جن کے اخراجات خزانے سے پورے کیے جاتے ہیں۔ آپ کے سلسلے میں ناظمِ سرحد اور ناظمِ فصیلِ شہر دونوں کی کوتاہی قابلِ تعزیر جرم ہے۔ اس سے

چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ آخر آئینِ جہانبانی اور اصولِ سلطانی۔۔۔۔"

"مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں"۔ خانزادہ چڑ گئی:

"میں تو فریاد لے کر آئی ہوں۔ اور گنج کی ایک فریادی ہوں"۔

"فریادی!" سوار گھبرا کر بولا:

"کیا غضب کرتی ہیں خاتون۔ فریادی اور قصرِ شاہی کے سامنے۔ ابھی قیامت آ جائے گی اور دو چار کی گردنیں قلم ہو جائیں گی"۔

"کیوں، کیا فریاد کرنا جرم ہے؟" خانزادہ کو غصہ آ گیا:

"میں اتنی دور سے فریاد لے کر آئی ہوں اور آپ الٹا میرا ہی سر قلم کرا رہے ہیں۔ یہی دستور ہے اس شہر کا؟"

"خاتونِ محترم! دستور تو اس شہر انتخاب کا یہ ہے"۔ سوار نے فلسفہ بگھارنا شروع کر دی:

"فریادی کو پہلے کوتوالِ شہر کے دربار میں رجوع کرنا چاہیے۔ اگر وہ شکایت رفع نہ کر سکے تو پھر وزیرِ سلطنت کے دربار میں فریاد کرنی چاہیے۔ وزیر کا فرض ہے کہ وہ فریادی کو مطمئن کرے"۔

خانزادہ، سوار کی دلچسپ باتوں پر مسکرا دی۔ دلچسپی سے پوچھا:

"اگر کوتوالِ شہر اور وزیرِ سلطنت فریادی کو مطمئن نہ کر سکیں تو کیا ہوگا؟"

"ایسا کبھی نہیں ہوا خاتونِ محترم"۔ سوار وثوق سے بولا:

"اگر خدانخواستہ ایسا ہو جائے تو کوتوالِ شہر اور وزیرِ عالی مقام کو تختۂ دار پر چڑھا دیا جائے۔ سلطان تو اپنی بزمِ نشاط میں کسی فریادی کو دیکھنا پسند نہیں کرتے"۔

"سلطان!" خانزادہ نے حیرت کا اظہار کیا:

"تبریز کا گورنر تو میراں شاہ ہے"۔

"توبہ توبہ کیجیے خاتون۔ آہستہ بولیے۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں"۔ سوار گھبرا کر بولا:

"سلطان ابنِ سلطان کا نام آپ اس قدر گستاخی سے لے رہی ہیں۔ اگر آپ کی فریاد دو چار ہزار دینار سے رفع ہو سکتی ہے تو وہ میں اپنی جیبِ خاص سے ادا کر سکتا ہوں"۔

"دو چار ہزار دینار"۔ خانزادہ نے سوار کو حیرت سے دیکھا:

"آپ یہاں کس عہدے پر فائز ہیں؟"

"میں قصرِ سلطانی کا صدر دروازہ صبح کو کھولتا اور رات کو بند کرتا ہوں"۔ سوار نے بڑے فخر سے جواب دیا۔

"اوہ۔۔۔۔ تو آپ دربان ہیں۔ آپ کا تعلق نگرانی کے معزز پیشے سے ہے"۔ خانزادہ نے بڑی مشکل سے

ہنسی ضبط کی، پھر اسے گھورتے ہوئے بولی:

"کیا یہاں کے سارے ملازمین تمہاری طرح شاعر اور رقاص ہیں؟"

"بے شک۔ لاریب"۔ سوار کی گردن غرور سے تن گئی:

"قصرِ سلطانی میں ایک سے ایک باکمال موجود ہے۔ شاہی سقہ قصیدہ گوئی میں اپنا جواب نہیں رکھتا اور شاہی باورچی اپنے فن میں بے نظیر ہے۔ جب شاہی خاصے کا خوان سر پر رکھ کر چلتا ہے تو مطبخ سے کھانے کے کمرے تک طبلے کی تھاپ پر ایسا رقص کرتا ہوا جاتا ہے کہ دیکھنے والے۔۔۔۔؟"

"بکواس بند کرو۔ ہم میراں شاہ سے ابھی ملنا چاہتے ہیں"۔ خانزادہ نے گھوڑا صدر دروازے کی طرف بڑھایا۔

سوار جلدی سے کودا اور خانزادہ کی رکاب سے لپٹ گیا۔

"مجھ پر رحم کیجیے۔ میں غریب مارا جاؤں گا۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں"۔ وہ گڑگڑانے لگا۔

"خدا کے لیے اس وقت اندر نہ جائیے"۔ سوار ہاتھ جوڑ کر گھوڑے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"کیوں؟ اس وقت میراں شاہ کیا کر رہا ہے؟"

"خاتون! اس وقت سلطان شعرائے کرام سے قصائد اور غزلیات سماعت فرما رہے ہیں"۔ دربان نے بڑی معصومیت سے بتانا شروع کیا:

"پھر رقص و سرود کی محفل گرم ہوگی جس کا اختتام نصف شب کے بعد ہوگا"۔

"اس کے بعد؟" خانزادہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"اس کے بعد قصہ گو حضرات تشریف لائیں گے اور اعلیٰ حضرت قصے کہانیاں سنتے سنتے نیند کی آغوش میں پہنچ جائیں گے"۔ دربان نے امیر تیمور کے ولی عہد بیٹے کے لیل و نہار کا اوقات نامہ بیان کر دیا۔

خانزادہ کو یہ سن کر حیرت بھی ہوئی اور تشویش بھی۔ اس نے پوچھا:

"اور میراں شاہ دربار کس وقت لگاتے ہیں؟"

"سلطان تو سلطان ہیں خاتون۔ انہیں دربار لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ انتظامِ سلطنت کے لیے ہزاروں کارندے موجود ہیں"۔ دربان نے یوں کہا جیسے یہ کوئی اہم بات نہ ہو۔

خانزادہ کو میراں شاہ کا یہ حال سن کر بہت افسوس ہوا۔ اس نے سوچا کہ جب میراں شاہ کے عیش و عشرت کا یہ عالم ہے تو کہیں اسے پہچاننے سے ہی انکار نہ کر دے۔ یہ تو اس کی بہت بڑی توہین اور شکست ہوگی۔ اسے میراں شاہ کی عیش و عشرت کی تو پروا نہ تھی لیکن اس کی روش سے مطلق العنانی ظاہر ہوتی تھی اور ان حالات میں وہ کوئی غلط قدم بھی اٹھا سکتا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے میراں شاہ سے فوری طور پر ملاقات کا ارادہ ملتوی کر دیا اور دربان کے کہنے

کے مطابق شاہی مہمان خانے میں چلی گئی۔

ایران کی فتح کے بعد امیر تیمور نے میراں شاہ کو ایران کا شمالی علاقہ بھی سپرد کر دیا تھا اور میراں شاہ نے چھوڑ کر تبریز میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

تیمور کو صرف نئی نئی فتوحات سے دلچسپی تھی۔ اس کا لشکر جس طرف بڑھتا فتح و نصرت اس کے قدم چومتی۔ سلطنت روز بروز پھیلتی جا رہی تھی اور اتنی ہی تیزی سے تیمور بھی بڑھاپے کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ خانزادہ کو رہائش ہمیشہ کے لیے ترک کر کے اورگنج منتقل ہو گئی۔ میراں شاہ اس سے پہلے ہی تبریز جا چکا تھا۔ خانزادہ کے ساتھ ساتھ میراں شاہ کو بھولتی جا رہی تھی لیکن جب اسے اپنے دونوں بیٹوں شہزادہ پیر محمد اور شہزادہ کی فتوحات اور جوانمردی کی خبریں ملیں تو ایک بار پھر اس کے دل میں اپنے بیٹوں کے لیے بادشاہت حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ ممکن ہے کہ وہ اورگنج اسی وجہ سے گئی ہو لیکن میراں شاہ کی موجودگی میں اس کے بیٹوں کو حکومت ملنا ناممکن تھا اس لیے اس نے اپنے طور پر منصوبہ بنایا کہ میراں شاہ کو کسی طرح راستے سے ہٹا دیا جائے۔

میراں شاہ سے ٹکر لینا تو کسی طرح ممکن نہ تھا کیونکہ وہ صاحبِ اقتدار تھا اور اس پر تیمور کی مہربانیاں تھیں۔ ہاں میراں شاہ کو بہلا پھسلا کر کسی ایسے جال میں پھانسا جا سکتا تھا جس سے تیمور اس کی طرف سے بدگمان ہو جائے۔ اس کے بعد خانزادہ کے بیٹوں کے لیے میدان صاف تھا۔

خانزادہ جس قدر خوبصورت تھی اس سے کہیں زیادہ عیار اور شاطر تھی۔ اس کی سحر انگیز گفتگو مخاطب کو [illegible] کر دیتی تھی۔ اس کا تجربہ ایک بار وہ شہرِ سبز میں میراں شاہ پر کر چکی تھی۔ میراں شاہ پہلی ہی ملاقات میں خانزادہ کا [illegible] لگا تھا اور اسے اپنی ولایت میں آنے کی دعوت دی تھی۔ خانزادہ اب زیادہ جاذبِ نظر عورت شاید اب بھی پورے خوارزم میں موجود نہیں تھی۔ خانزادہ اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے تبریز پہنچی تھی لیکن شاہی دربان سے میراں شاہ کی لیل و نہار کے مشاغل کی تفصیل سن کر وہ بہت پریشان ہوئی۔ محل سے وہ سیدھی سرائے آئی۔ اس نے اب تک چہرے سے نقاب نہیں اٹھائی تھی لیکن جب سرائے پہنچ کر اس نے نقاب الٹا تو سرائے کے داروغہ کا منہ کھلا رہ گیا۔

حسن و جمال کے ساتھ خانزادہ کے چہرے پر ایک شاہانہ جلال بھی تھا۔ وہ خوارزم کے حکمران حسین صوفی کی بھتیجی تھی۔ حسین صوفی کی شکست کے بعد اس کی شادی امیر تیمور کے بیٹے جہانگیر سے ہوئی تھی۔ اس وقت اگرچہ وہ بیوگی کی زندگی گزار رہی تھی لیکن تیمور کی بہو ہونے کے ناطے اس کی چال ڈھال اور گفتگو سے تیموری رعب داب ظاہر ہوتا تھا۔ داروغہ سرائے تو اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

خانزادہ نے سرائے میں اس لیے قیام کیا تا کہ میراں شاہ سے ملاقات سے پہلے اس کے معمولات اور سلطنت کے تمام بڑے بڑے امیروں کے بارے میں معلومات حاصل کر لے۔ اسے کسی وقت بھی ان کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ میراں شاہ

دربار اور حرم سرا کی جو باتیں اسے بتائی گئیں، وہ حیرت انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد دلچسپ بھی تھیں۔ تیمور، ایران سے اہلِ حرفہ کو اپنے ساتھ سمرقند لایا تھا۔ ان میں معماروں اور انجنیئروں کی تعداد زیادہ تھی لیکن ان کے علاوہ بہت سے مطرب بھی تیمور کے ساتھ سمرقند آ گئے تھے۔

ان ناچنے گانے والوں کو جب معلوم ہوا کہ میراں شاہ تبریز میں دادِ عیش دے رہا ہے اور اس کی فیاضیوں سے ہر ایک فائدہ اٹھا رہا ہے تو یہ سب کے سب تبریز پہنچ گئے۔ میراں شاہ نے ان لوگوں کی پذیرائی کی اور انہیں محفلِ نشاط تک محدود رکھنے کے بجائے فوجی اور انتظامی عہدوں پر فائز کیا۔

حافظ شیرازی کے بقول ایرانی مغنی اور موسیقار تمام دنیا میں لاثانی تھے کیونکہ وہ ایسی دھنیں بجاتے تھے کہ جنہیں سن کر مدہوش اور ہوشمند سب ہی جھومنے اور رقص کرنے لگتے تھے۔ ایسے اہل اور نااہل ندیموں سے میراں شاہ کا دربار بھرا رہتا تھا۔ دربارِ تبریز پر عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے بغداد کے دربار کا شبہ ہوتا تھا۔ مشائخ بھرے دربار میں شاعروں سے مذہبی بحثیں کرتے نظر آتے۔ نقال، مسخرے اور لفظی صنعت گری کے ماہر قصیدہ گو شعراء میراں شاہ کی تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملاتے اور میراں شاہ کے گرد مہ وشوں کا ہجوم رہتا۔ شراب اسلام میں حرام ہے لیکن بعض علماء نے نبیذ (کھجور کی تاڑی) کو جائز قرار دے دیا تھا۔ میراں شاہ اور اس کے درباری تاڑی کے سرور میں مست رہتے تھے۔

خانزادہ کو تعجب تھا کہ امیر تیمور اپنے ولی عہد سے اس قدر غافل کیوں ہے؟ یہ حالات ایسے تھے کہ ان کی خبر تیمور کو ضرور ہونا چاہیے تھی۔ تیمور شہزادوں کی سخت نگرانی کرتا تھا اور ان کی ذرا سی کوتاہی بھی نظر انداز نہ کرتا تھا۔ تبریز میں دولت کی جو ریل پیل تھی اس کا اندازہ خانزادہ کو سرائے کا ساز و سامان دیکھ کر ہوا۔ شہر میں اس طرح کی دو سو سے زیادہ سرائیں تھیں اور ہر سرائے شاہی مہمان خانہ معلوم ہوتی تھی۔ ان کے اخراجات شاہی خزانے سے ادا ہوتے تھے۔ تبریز میں کوئی گداگر نہ تھا۔ پہلے فقیروں کو حکومت کی طرف سے کھانا کپڑا دیا جاتا تھا اور انہیں کام پر لگایا جاتا تھا لیکن جب یہ فقیر کام سے جی چرانے لگے اور انہوں نے بھیک مانگنے کی عادت نہ چھوڑی تو انہیں پکڑ کر قتل کر دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ یہ تیمور کا حکم تھا۔ جو سیاح تیمور کے دور میں اس کی سلطنت سے گزرے تھے انہوں نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ تیموری سلطنت کے طول و عرض میں انہیں کوئی گداگر نظر نہیں آیا۔

تبریز کے دولت مند ہونے کا اصل سبب اس کا محلِ وقوع تھا۔ تبریز جو آجکل ایک اونگھتا ہوا چھوٹا سا شہر ہے۔ اس زمانے میں چین کے دارالسلطنت کو چھوڑ کر دنیا کا سب سے بڑا شہر تھا۔ سمرقند، دمشق اور بغداد کا اس کے سامنے کوئی حقیقت نہ تھی۔ تبریز جیسے قدیم مؤرخوں نے تورین لکھا ہے، عہدِ تیموری میں عالمی تجارت کا ایک عظیم مرکز تھا۔ اس جگہ شاہراہِ خراساں جنوب سے آنے والی اس سڑک سے ملتی تھی جو بغداد، ایران

اور خلیج فارس کو جاتی تھی۔ اس کی عمارتیں روم اور فارس سے زیادہ وسیع اور شاندار تھیں۔ مساجد، دارالعلوم اور شفا خانوں کی سامنے کی دیواروں پر کاشی کی منقش اینٹیں لگائی جاتی تھیں۔ سرایوں اور مہمان خانوں کے علاوہ شہر میں دو لاکھ مکانات تھے۔ آبادی تقریباً بارہ لاکھ تھی۔ ایک سیاح نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ صرف تبریز کی آمدنی حکومتِ فرانس کی آمدنی کے برابر تھی۔

خانزادہ تین روز تک سرائے میں مقیم رہی اور اپنے منصوبے پر غور کرتی رہی۔ پھر اس نے سرائے کے داروغہ کو بلایا۔ داروغہ ایک جہاندیدہ شخص تھا۔ اس نے خانزادہ کو دیکھ کر پہلے ہی دن اندازہ کر لیا تھا کہ وہ کوئی اہم شخصیت ہے اور کسی مصلحت کے تحت سرائے میں مقیم ہے لیکن اس نے کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"تمہیں معلوم ہے کہ میں کون ہوں؟" خانزادہ نے داروغہ سے پوچھا۔

"میرا اندازہ ہے کہ آپ کا تعلق کسی بہت اونچے گھرانے سے ہے۔" داروغہ نے دست بستہ جواب دیا۔

"اپنے بارے میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔" خانزادہ بولی:

"اس وقت مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے"۔

داروغہ نے عاجزی سے کہا:

"مہمانوں کے حکم کی تعمیل میرا فرض ہے"۔

"میں تمہارے سلطان سے ملنا چاہتی ہوں۔" خانزادہ کو دل کی بات زبان پر لانا پڑی۔

داروغہ نے حیرت سے خانزادہ کو دیکھا:

"یہ ناممکن ہے خانم۔" داروغہ نے نفی میں سر ہلایا:

"سلطان عالی مقام اس قدر مصروف رہتے ہیں کہ کسی سے ملنے کا وقت نکال ہی نہیں سکتے۔ باہر کے سیاح سلطان سے ملاقات کی درخواست کرتے ہیں تو انہیں پہلے دو چار ماہ شاہی مہمان رہنا پڑتا ہے"۔

"سنا ہے کہ تمہارے سلطان کا تمام وقت قصیدے سننے یا رقص و سرود کی محفلوں میں گزرتا ہے" خانزادہ جل کر کہا:

"اس کے علاوہ کوئی مصروفیت ہو تو بتاؤ"۔

"خانم۔ آپ کو سب کچھ معلوم ہے۔" داروغہ معصومیت سے بولا:

"بادشاہوں کا وقت تو اسی طرح گزرتا ہے۔ اسی مصروفیت سے انہیں فرصت کہاں ملتی ہے کہ کسی کو ملاقات کی اجازت دیں"۔

"مگر مجھے تو سلطان سے ضرور ملنا ہے"۔

خانزادہ کو غصہ تھا کہ میران شاہ نے محض ایک صوبے کا گورنر یا جاگیردار ہوتے ہوئے سلطان کا لقب کیوں اختیار کیا جبکہ تیمور نے اب تک اپنے نام میں سوائے امیر کے اور کوئی لقب شامل نہیں کیا تھا۔

"یہ میرے اختیار سے باہر ہے خانم۔" داروغہ نے معذوری ظاہر کی:

"میں آپ کو صرف محل کے دروازے تک پہنچا سکتا ہوں لیکن شاہی دربان آپ کو کسی طرح اندر نہ گھسنے دے گا"۔

داروغہ کا کہنا ٹھیک ہی تھا۔ خانزادہ کو محل کے طرحدار دربان سے پہلے ہی سابقہ پڑ چکا تھا۔

"کوئی ترکیب نکالو داروغہ۔ سوچو۔" خانزادہ نے کہا۔

داروغہ سوچ میں ڈوب گیا۔ ذرا توقف کے بعد بولا:

"آپ کو انتظار کرنا پڑے گا خانم۔ سلطان مہینے دو مہینے میں ایک بار شہر کی سیر کرنے نکلتے ہیں۔ جب ان کا جلوس نکلے گا تو میں آپ کو ایک اونچی جگہ کھڑا کر دوں گا۔ وہاں سے آپ سلطان کا دیدار کر سکیں گی"۔

"مجھے دیدار نہیں کرنا۔" خانزادہ جھلا گئی:

"میں ان سے گفتگو کرنا چاہتی ہوں"۔

"یہ میرے فرائض میں شامل نہیں ......" داروغہ نے مجبوری ظاہر کی:

"مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا"۔

خانزادہ نے دوسری ترکیب نکالی۔

"اچھا یوں کرو۔ میں تمہیں ایک خط دیتی ہوں وہ تم اپنے سلطان کو پہنچا دو"۔

داروغہ سوچنے لگا۔ پھر مسکرا کر بولا:

"آپ خط لکھیے۔ میں کوشش کروں گا"۔

خانزادہ نے اسی وقت چار جملوں کا خط لکھا اور لفافے میں بند کر کے داروغہ کے حوالے کر دیا۔

تین دن گزر گئے لیکن داروغہ نے خانزادہ کو کوئی جواب نہ دیا حالانکہ وہ دن میں دو بار اس کی مزاج پرسی کے لیے آتا تھا۔ خانزادہ نے بھی اس سے پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ جانتی تھی کہ جس ملک کا حاکم عیش و عشرت کے ماحول میں دن گزار رہا ہو اس تک خط پہنچانا اور جواب لانا کتنا مشکل ہے۔

پھر جب تین دن گزر گئے تو خانزادہ کو فکر ہوئی۔ اس نے سوچا کہ کم از کم اسے یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ خط میران شاہ تک پہنچا بھی یا نہیں۔

شام کو حسبِ معمول داروغہ آیا اور ادب سے اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

"داروغہ!" خانزادہ نے اسے ملائمت سے مخاطب کیا:

"امید ہے کہ تم نے میرا خط پہنچا دیا ہوگا۔"

"جی ہاں خانم! خط پہنچا دیا گیا ہے۔"

"جواب کی کب تک امید ہے؟"

"جواب میرے اختیار سے باہر ہے لیکن مجھے امید ہے کہ آج۔۔۔"

اسی وقت سرائے کا ایک ملازم آیا اور داروغہ کے کان میں کچھ کہہ کے چلا گیا۔

"مبارک ہو خانم"۔ داروغہ مسرت سے بولا:

"آپ کے خط کا جواب آ گیا ہے"۔

"آ گیا جواب۔ کون لایا؟" خانزادہ نے حیرت سے پوچھا۔

"میں ابھی حاضر ہوتا ہوں"۔ یہ کہتا ہوا داروغہ باہر چلا گیا۔

خانزادہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ معلوم نہیں میران شاہ نے کیا جواب دیا ہے؟ وہ امید و بیم کے درمیان ہچکولے کھانے لگی۔

کچھ دیر بعد داروغہ مسکراتا ہوا واپس آیا اور بولا:

"وزیرِ سلطنت آپ سے ملنا چاہتے ہیں"۔

"مجھ سے، وزیرِ سلطنت، مگر کیوں؟" خانزادہ نے گھبرا کر پوچھا۔

"وہ۔۔۔ آپ نے سلطانِ عالم کو خط لکھا تھا؟" داروغہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

"اچھا۔۔۔ تو وزیرِ سلطنت جواب لائے ہیں"۔ خانزادہ کو کچھ اطمینان ہوا:

"دیکھو داروغہ۔ وہ وزیرِ سلطنت ہیں۔ حکومت کے ایک اعلیٰ افسر۔ ان کا میرے پاس آنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ میں خود ان سے ملنے جاؤں گی"۔

"مگر خانم۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔ وہ"۔

"تم تیموری سلطنت کے اصول نہیں جانتے"۔ خانزادہ نے تیز لہجے میں کہا:

"جاؤ۔ انہیں اطلاع دو کہ میں آ رہی ہوں۔ پھر آ کے مجھے لے جانا"۔

داروغہ اس کا منہ دیکھتا ہوا چلا گیا۔

خانزادہ کو پھر خیالات نے گھیر لیا لیکن اس نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور ملاقات کے لیے پوری طرح تیار ہو لی۔ داروغہ آیا تو خانزادہ چلنے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

"خانم۔ وزیرِ سلطنت باہر کھڑے ہوئے ہیں۔ اندر آنے کی اجازت دیجیے"۔ داروغہ نے سر جھکا کر کہا۔

"اچھا۔ آنے دو"۔

چند لمحوں کے بعد ایک ادھیڑ عمر شخص اندر آیا۔ اس کا جگمگاتا لباس دیکھ کر خانزادہ حیران رہ گئی۔ اتنا عمدہ اور قیمتی لباس تو بادشاہ یا شہزادے ہی پہن سکتے تھے۔

"میں وزیرِ سلطنت کو خوش آمدید کہتی ہوں"۔ خانزادہ نے وزیر کو سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"خانزادہ خانم۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ مصروفیت کی وجہ سے پہلے نہ حاضر ہو سکا"۔ وزیر بڑی بے تکلفی سے بولا اور خانزادہ کا جائزہ لینے لگا۔

خانزادہ اس کے منہ سے اپنا نام سن کر چونک پڑی۔ داروغہ کو تو اس نے اپنا نام اب تک نہیں بتایا تھا پھر بھلا اس نے اپنے اطمینان کے لیے پوچھا:

"وزیرِ سلطنت کے منہ سے اپنا نام سن کر مجھے حیرت ہوئی۔ کیا اس کی وضاحت فرمائی جائیگی"۔

"خانزادہ خانم۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے"۔ وزیر اطمینان سے بولا:

"سلطانِ معظم کے نام آپ نے جو پرچہ بھیجا تھا اس پر آپ کا نام درج تھا۔ پھر یوں بھی شاہی سرائے میں ٹھہرنے والے مہمانوں کی فہرست روز مجھے بھیجی جاتی ہے۔ مہمانوں کی ضروریات کا خیال رکھنا میرے فرائض میں شامل ہے"۔

"میرے خط کا کیا جواب دیا گیا ہے؟" خانزادہ نے گفتگو کو مختصر کرنے کے لیے پوچھا۔

"میں اسی سلسلے میں حاضر ہوا ہوں خانزادہ خانم"۔ وزیرِ سلطنت نے بڑی شائستگی سے کہا:

"کچھ وضاحت کی ضرورت ہے۔ آپ کا خط بے انتہا مختصر ہے"۔

"مجھے جواب چاہیے وزیرِ محترم"۔ خانزادہ کا لہجہ ترش ہو گیا:

"کیا میرا نام کافی نہیں تھا؟"

"میرا مطلب ہے خانزادہ خانم!" وزیر اس کے ترش لہجے سے گھبرا گیا:

"میں ..... میں چاہتا ہوں۔"

"وزیرِ محترم!" خانزادہ نے اس کی بات کاٹ دی:

"مجھے صرف یہ بتایا جائے کہ کیا میراں شاہ نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا ہے اور آپ سے ا

طلب کی ہے؟"

"سلطانِ، سلطان میراں شاہ ابنِ سلطان"۔ وزیرِ سلطنت بوکھلا کر خانزادہ کو دیکھنے لگا۔

"میرا خط پڑھا تھا تمہارے سلطان نے؟" خانزادہ کا لہجہ اور سخت ہو گیا:

"اگر سلطان نے خط پڑھا تھا یا تم سے پڑھوا کر سنا تھا تو پھر اس کے جواب میں وہ الفاظ دہرا دیے

انہوں نے کہے اور ..... اور کچھ نہیں بس!"

"خانزادہ خانم۔ وہ خط ابھی تو میرے پاس ہے۔"

خانزادہ اچھل پڑی:

"کیا؟ کیا آپ نے میرا خط پڑھ لیا؟" خانزادہ نے اپنی مٹھیاں غصے میں کس لیں:

"آپ کو یہ جرأت کیسے ہوئی؟"

"خانزادہ خانم۔ ناراض نہ ہوں۔ میرا فرض ہے کہ ....."

"میں آپ کے فرائض کی تفصیل نہیں سننا چاہتی"۔ خانزادہ غصے سے بولی:

"آپ لوگ باتیں تو بڑی شائستگی سے کرتے ہیں لیکن آپ کو کسی کے ذاتی خط پڑھتے ہوئے شرم

آتی۔ اخلاق کا یہ کون سا اصول اور دستور ہے۔ یہ ایک بہت بڑا اخلاقی جرم ہے وزیرِ محترم۔"

وزیرِ سلطنت نے خانزادہ کی کڑوی باتیں بڑے تحمل سے سنیں اور جواب بھی اسی تحمل سے دیا:

"خانزادہ خانم ..... سلطانِ عالم کا فرمان ہے کہ رعیت کی تمام شکایتیں وزیرِ سلطنت کو پہنچائی جا

وہی ان کی دادرسی کرے۔ اگر کوئی وزیر رعیت کو مطمئن کرنے میں ناکام رہتا ہے تو اسے معزول کر دیا جاتا ہے

آپ میری معزولی یا بربادی سے خوش ہو سکتی ہیں تو میں تیار ہوں۔ میں ایک بال بچے دار غریب انسان ہوں۔ مجھے

کر کے آپ کو کیا ملے گا خانزادہ خانم؟"

"بال بچے دار اور غریب انسان"۔ خانزادہ بڑبڑائی۔

یہی الفاظ اس نے دربان کے منہ سے بھی سنے تھے۔ عجیب لوگ ہیں یہاں کے۔ اتنے امیر اور مال دار ہو

ہوئے بھی ہر ایک خود کو غریب کہتا ہے۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ امیر تیمور کے دورِ حکومت میں اس کے

ایک ایسی حکومت قائم کر رکھی ہے جس کے قوانین دنیا سے نرالے ہیں بلکہ یہاں تو کوئی قانون ہی نہیں معلوم ہوتا۔

سلطنت پر ترس آ گیا۔ نرمی سے پوچھا:

"مجھے آپ سے ہمدردی ہے مگر یہ تو بتائیے کہ اگر کوئی قتل ہو جائے۔ کوئی بڑا ڈاکہ پڑے یا کہیں بغاوت ہو

تو آپ کیا قدم اٹھائیں گے؟"

"خانزادہ خانم۔ میری وزارت کے چار سالہ دور میں صرف ایک قتل ہوا تھا"۔ وزیرِ سلطنت نے بڑی سادگی

بتایا:

"میں نے قاتل کو گرفتار کرایا اور اسی وقت بیچ بازار میں اسے سولی پر چڑھا دیا۔"

"اس کے قتل کا حکم سلطان یا قاضیِ شہر نے دیا ہوگا؟" خانزادہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"خانزادہ خانم۔ آپ ہمارے ملک کے قانون سے ناواقف معلوم ہوتی ہیں"۔ وزیرِ سلطنت نے ذرا رعب

کہا:

"میں وزیرِ سلطنت ہوں۔ یہاں صرف میرا حکم چلتا ہے۔ اس ملک میں کوئی قاضی نہیں۔"

"ٹھیک فرما رہے ہیں آپ"۔ خانزادہ مسکرائی:

"چوری اور ڈاکے کی صورت میں آپ کیا حکم دیتے ہیں؟"

"ابھی تک تو ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا خانزادہ خانم"۔ وزیرِ سلطنت فخر سے بولا:

"تبریز دنیا کی سب سے بڑی منڈی ہے۔ ہر شخص مال دار ہے۔ ضرورت مند کو شاہی خزانے سے رقم دے

جاتا ہے۔ ایسی صورت میں چوری ڈاکے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"بغاوت کی صورت میں تو سلطانِ عالی مقام ضرور کچھ ارشاد فرماتے ہوں گے"۔ خانزادہ نے طنز کیا:

"کیا اس وقت بھی آپ کے سلطان کے کان پر جوں نہیں رینگتی اور فوج کو بغاوت کچلنے کا حکم بھی نہیں

؟"

"خانزادہ خانم"۔ وزیر نے فلسفیانہ انداز اختیار کیا:

"بغاوت ملک میں بے چینی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ جس ملک کے باشندے فارغ البال ہوں اور

عیش میسر ہو تو انہیں بغاوت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ فوج کا ذکر کرتی ہیں اگر عوام کو بھی یہ شبہ

کہ کوئی شخص بغاوت کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ خود ہی مار مار کر اس کا قیمہ بنا دیں۔ میں آپ کو یقین

دلا .....

"بس کیجیے وزیرِ محترم"۔ خانزادہ نے اسے ٹوکا:

"مجھے آپ کے قانون اور اس کی تفصیل سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں سمجھ گئی کہ یہاں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔

شاید اندھیر نگری چوپٹ راجہ ایسے ہی ملکوں کو کہا جاتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ لوگ میری کوئی مدد نہیں کر سکتے مجھے میران شاہ تک پہنچنے کے لیے خود ہی راستہ بنانا پڑے گا"۔

"ایسا نہ کیجیے گا خانزادہ خانم"۔ وزیر گڑگڑانے لگا:

"میری ملازمت ختم ہو جائے گی۔ میں:۔۔۔"

"آپ کوئی فکر نہ کریں وزیرِ سلطنت"۔ خانزادہ کو ہنسی آ گئی:

"مجھے معلوم ہے کہ آپ بہت غریب ہیں اور بال بچے دار آدمی ہیں۔ میں جب آپ کے سلطان سے ملوں گی تو کہہ دوں گی کہ میں سیدھی ان کے پاس آئی ہوں اور میرے آنے کی تبریز میں کسی کو خبر نہیں۔ آپ کا کوئی نقصان بالکل نہ ہو گا۔ میں وعدہ کرتی ہوں"۔

"مجھے آپ سے ایسی ہی امید ہے خانزادہ خانم"۔ وزیرِ سلطنت انکسار سے دُہرا ہوا جا رہا تھا:

"میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں آپ کا شکریہ ادا کر سکوں"۔

پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا: "میں شرمندہ ہوں کہ میں آپ کے آرام میں مخل ہوا۔ اب مجھے جانے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے"۔

"تشریف رکھیے وزیرِ سلطنت"۔ خانزادہ ملائمت سے بولی:

"آپ کی بات تو ختم ہو گئی مگر میرا مسئلہ باقی ہے۔ میں آپ کو زیادہ تکلیف نہیں دینا چاہتی لیکن آپ کو میرے لیے دو باتیں کرنا ہوں گی"۔

"فرمائیے فرمائیے۔ میں تعمیلِ حکم کے لیے حاضر ہوں"۔ وزیرِ سلطنت اٹھتے اٹھتے بیٹھ گیا۔

"ایک تو یہ کہ آپ میرا نام کسی کو نہیں بتائیں گے"۔

خانزادہ نے پہلے ارادہ کیا تھا کہ وہ میران شاہ کے پاس پہنچ کر اسے اپنی پہلی ملاقات کا حوالہ دے گی اور اس کی تجدید کی کوشش کرے گی لیکن یہاں کے حالات دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ میران شاہ کے پاس پہنچ کر اسے رام کرنا آسان کام نہیں۔ اس لیے وہ چاہتی تھی کہ ۔۔۔ ۔۔۔ نہ ہو کیونکہ اس بات کا قوی امکان تھا کہ میران شاہ کے دربار میں کوئی نہ کوئی آدمی اس سے ضرور واقف ہو گا اور ناکامی کی صورت میں شرمندگی کے علاوہ اس کی ذلت اور رسوائی بھی ہو گی۔

"آپ اطمینان رکھیں خانزادہ۔۔۔۔"۔ وزیرِ سلطنت کہتے کہتے رکا پھر سنبھل کر بولا:

"میرا مطلب ہے معزز مہمان خانم! میں اپنے منہ کو سی لوں گا۔ ہونٹوں پر مہر لگا لوں گا"۔

"اور۔۔۔۔"۔ خانزادہ نے داروغہ کی طرف اشارہ کیا:

"اس داروغہ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

داروغہ اس تمام گفتگو کے دوران دست بستہ کھڑا تھا۔ وزیر کو اس کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اس نے داروغہ کو دیکھا اور غصے سے بولا:

"کم بخت تو اب تک یہاں کھڑا ہے۔ تو کیا کر رہا ہے۔ جا دفع ہو جا"۔

داروغہ گھبرا کر دروازے کی طرف بڑھا تو وزیرِ سلطنت کو ایک دم خیال آیا۔ اس نے داروغہ کو آواز دی:

"سن، ادھر آ"۔

داروغہ جہاں تک گیا تھا، وہیں سے واپس آ گیا۔

"دیکھو۔ تیری سرائے میں معزز مہمان خانم مقیم ہیں"۔ وزیر نے اسے سمجھانے کے انداز میں تاکید کی:

"خانزادہ نام کی کوئی خاتون تیری سرائے میں کبھی نہیں آئیں۔ خبردار جو یہ نام کسی کے سامنے لیا۔ زبان کھینچ لی جائے گی تیری۔ سمجھ گیا کہ نہیں"۔

"بالکل سمجھ گیا حضور۔ اگر کبھی خانزادہ خانم کا نام میری زبان سے سنیں تو پھانسی پر چڑھوا دیجیے گا"۔

"دیکھا وزیرِ سلطنت آپ نے"۔ خانزادہ ہنس پڑی:

"اس کو سمجھائیے کہ میرا نام اس طرح بھول جائے جیسے کبھی سنا ہی نہ ہو"۔

"ایسا ہی ہو گا معزز مہمان خانم"۔ وزیرِ سلطنت کے بجائے داروغہ بول پڑا کیونکہ اس نے غلطی سے ابھی نام لے لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ تیزی سے باہر چلا گیا۔

"اب ٹھیک ہے"۔ خانزادہ نے کہا:

"دوسری بات یہ ہے کہ میں اب سرائے میں نہیں رہنا چاہتی۔ آپ میرے لیے شہر میں کسی اچھے سے مکان کا انتظام کر دیجیے"۔

"خانزا۔۔۔۔ مہمان خانم"۔ وزیرِ سلطنت فوراً سنبھل گیا:

"بھلا یہ کس طرح ممکن ہے۔ سلطانِ معظم تک خبر پہنچی کہ ایک مہمان شاہی سرائے کے بجائے کرائے کے مکان میں رہ رہی ہے تو میرا کیا حشر ہو گا۔ میں یہاں۔۔۔۔"

"بال بچے دار اور غریب آدمی ہیں"۔ خانزادہ بات کاٹ کر بولی:

"مجھے آپ لوگوں کی غربت کا حال معلوم ہے لیکن میری بھی مجبوری ہے۔ میں ابھی لوگوں کی نظروں میں نہیں آنا چاہتی ورنہ ایک دن ضرور پہچان لی جاؤں گی"۔

"مگر خانم۔۔۔۔" وزیر فکرمند ہو گیا:

"آپ کے ارشاد کے مطابق تبریز آپ کے لیے اجنبی شہر ہے۔ پھر آپ کو یہاں کون پہچانے گا؟"

"تبریز میرے لیے اجنبی ہے لیکن میں لوگوں کے لیے اجنبی نہیں ہوں۔" خانزادہ سنجیدہ ہو گئی:

"مجھے خیال پڑتا ہے کہ جب شہزادہ میران شاہ کو خوارزم کی حکومت سونپی گئی تھی تو امیر تیمور نے بعض سواروں کو شہزادے کے ساتھ کر دیا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی فوراً پہچان لیں گے۔"

وزیرِ سلطنت نے اسے حیران نظروں سے دیکھا اور بولا:

"معاف خانم۔ آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ شاید آپ مجھ سے زیادہ عقل مند ہیں۔ یہ آپ کس کی بات کر رہی ہیں؟"

"عقل مند تو آپ ہی زیادہ ہیں۔" خانزادہ متانت سے بولی:

"لیکن میری باتیں آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ آپ اس کے لیے زیادہ پریشان نہ ہوں۔ زیادہ سے یہ ذہن نشین کر لیں کہ میں میران شاہ کی بہت قریبی رشتے دار ہوں۔"

"یعنی ..... یعنی آپ شاہی خاندان سے ہیں؟" وزیرِ سلطنت بوکھلا گیا۔

"صرف شاہی خاندان سے نہیں بلکہ خود بھی ایک ملک کی شہزادی ہوں۔"

"پھر ..... پھر میں آپ کے سامنے کیسے بیٹھ سکتا ہوں شہزادی عالیہ۔" اور وہ جلدی سے خانزادہ کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو گیا۔

"دیکھیے وزیرِ سلطنت۔ جو کچھ میں نے آپ کو بتایا ہے وہ اپنے تک محدود رکھیے گا۔" خانزادہ کا لہجہ پُر وقار ہو گیا:

"اور اس سے زیادہ معلوم کرنے کی کوشش بھی نہ کیجیے گا۔ آپ میرے لیے ایک حویلی کا انتظام کر دیں۔ وہاں میں آپ کے ذاتی مہمان کی حیثیت سے قیام کروں گی۔ پھر تو آپ پر کوئی الزام نہیں آئے گا نا؟"

"آپ بہت عقل مند ہیں شہزادی عالیہ!" وزیر نے دل سے اعتراف کیا۔

○

وزیرِ سلطنت نے خانزادہ کو ایک آراستہ و پیراستہ محل نما حویلی میں اتارا۔ خدمت کے لیے کنیزوں اور غلاموں کا بھی انتظام کر دیا۔ خانزادہ کو یہاں بڑا سکون ملا۔ اور اس نے اپنے منصوبے کو از سرِ نو ترتیب دے دیا۔

وزیرِ سلطنت خانزادہ سے کچھ ایسا مرعوب ہو گیا تھا کہ اس نے اپنے معمولات کو چھوڑ کر خود کو خانزادہ کے لیے وقف کر دیا۔ وہ دن میں کئی بار اس کی مزاج پرسی کے لیے آتا اور اس کے حکم کی تعمیل کو اپنا ... خانزادہ بھی اس سے بہت خوش تھی اور اس پر اعتماد کرنے لگی تھی۔

ایک شام جب وزیرِ سلطنت خانزادہ سے ملنے آیا تو خانزادہ نے مسکرا کر کہا:

"وزیرِ سلطنت آپ بہت غریب ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ کی کچھ غربت دور کر دوں۔"

"بے شک شہزادی عالیہ! میں بہت غریب ہوں۔" وزیر نے بے تکلف جواب دیا:

"میں کثیر الاولاد ہوں اور خاندان کے بعض افراد کی مجھے سرپرستی بھی کرنا پڑتی ہے۔ آپ اندازہ لگا سکتی ہیں کہ ان کے اخراجات پورے کرنا کس قدر مشکل ہے جبکہ میری طرح ان کی بھی ضروریات ہیں اور وہ بھی صاحبِ ... ہیں۔"

"مجھے پورا احساس ہے وزیرِ سلطنت۔" خانزادہ نے خوش دلی سے کہا:

"میرا خیال ہے، وہ بھی آپ ہی کی طرح ٹھاٹ باٹ سے رہتے ہوں گے۔"

"جی ..... جی ہاں بالکل۔" وزیر نے خانزادہ کا طنزیہ لہجہ سمجھتے ہوئے کہنا شروع کیا:

"غور فرمائیے۔ اگر میں انہیں اپنی طرح نہ رکھوں تو دنیا والے کیا کہیں گے۔ آخر رکھ رکھاؤ اور دنیا داری بھی ... ہے۔ میری حیثیت نہ سہی لیکن میں ان کی ہر خواہش پوری کرتا ہوں۔"

"اسی لیے تو میں آپ کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔"

"مدد ..... میری مدد ..... آپ؟"

وزیرِ سلطنت نے تعجب سے اسے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ غریب الوطن شہزادی اس کی کس طرح مدد ... گی۔ اس کے پاس کوئی سامان نہیں اور نہ ہی زر و جواہر کے صندوق ہیں۔ اپنے خرچ کے لیے تو اس کے پلّے کچھ ... اور مدد کرنا چاہتی ہے وزیرِ سلطنت کی، جس کے صرف تبریز میں دو محل، گیارہ حویلیاں اور درجنوں باغات ...

"ہاں وزیرِ سلطنت ..... میں آپ کی مدد کروں گی۔" خانزادہ نے بڑے استقلال سے کہا:

"آپ شاید مجھے خالی ہاتھ سمجھ رہے ہیں؟"

"نہیں نہیں ..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وزیر نے بات بنائی:

"آپ خالی ہاتھ کیسے ہو سکتی ہیں۔ زر و جواہر کے صندوق آپ نے کسی اور جگہ رکھوا دیے ہوں گے۔"

"وزیرِ سلطنت۔ بعض چیزیں ایسی نادر ہوتی ہیں۔ ان کے سامنے زر و جواہر کے صندوق اور چھوٹے موٹے شاہی خزانے بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔"

"بے شک ..... بے شک۔" وزیر کو اس کی باتوں کا یقین تو نہیں آ رہا تھا لیکن اس نے خانزادہ کا دل رکھنے کے لیے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

خانزادہ نے زانو کے نیچے دبی ہوئی ایک صندوقچی کو کھولا اور اس میں سے کوئی چیز نکال کر رومال میں لپیٹی پھر بولی:

"آپ کو شاید یاد نہ ہو کہ جب صاحبقران امیر تیمور کو ایران کے بادشاہ شاہ شجاع نے دوستی کا خط لکھا اپنے بیٹے زین العابدین کی سرپرستی کی سفارش کی تھی، تو اس خط کے ساتھ بہت سے نادر اور نایاب تحائف بھی بھیجے ان تحائف میں کچھ ایسے ہیرے بھی تھے جن کی قیمت کا آج بھی اندازہ لگانا مشکل ہے۔"

یہ کہتے ہوئے خانزادہ نے رومال میں دبی ہوئی چیز اس کی طرف بڑھا دی:

"اگر آپ ہیروں کے قدردان ہیں اور آپ کو ان کی شناخت بھی ہے تو اسے دیکھ کر ذرا اس کی قیمت کا اندازہ تو لگائیے۔"

وزیرِ سلطنت نے ہچکچاتے ہوئے رومال لے کر کھولا اور ساتھ ہی اس کا منہ بھی کھل گیا۔ وزیرِ خزانہ بلکہ سب کچھ وہی تھا۔ اسے ہیرے جواہرات کی پہچان بھی تھی لیکن جس حجم اور آب و تاب کا ہیرا نکلا، ایسا ہیرا پہلے کبھی اس کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ دیکھنا تو الگ رہا، اس نے کبھی یہ تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اتنا بڑا ہیرا بھی موجود ہے۔ وہ کبھی ہیرے کو دیکھتا اور کبھی خانزادہ کو دیکھنے لگتا۔

"مہمان خانم۔" وزیر شکست خوردہ لہجے میں بولا:

"میں اس نایاب ہیرے کے متعلق کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ میرا خیال تھا کہ تبریز کے خزانے میں جتنی قدر اتنی دولت دنیا کے اور کسی خزانے میں نہیں ہو گی لیکن یہ نادرِ روزگار ہیرا تو تبریز کے خزانے پر بھی بھاری ہے۔"

"تبریز کے خزانے میں کچھ ہو یا نہ ہو لیکن آپ کے خزانے میں یہ ہیرا ضرور موجود ہے۔" خانزادہ نے بے پروائی سے کہا۔

"جی خانم ..... کیا فرمایا آپ نے ..... میرے پاس ..... نہیں نہیں۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔" وزیر گھبرا گیا۔

"وزیرِ سلطنت۔ اب یہ ہیرا آپ کی ملکیت ہے۔" خانزادہ نے بغیر کسی جھجک کے کہا:

"اس قسم کے چار ہیرے شاہِ ایران نے ہمارے امیر کو تحفے میں بھیجے تھے۔ ان میں سے ایک یہ ہے

جو میرے حصے میں آیا اور اب آپ کی نذر ہے۔ میں نہ تو اس کی قیمت طلب کروں گی اور نہ ہی اس کے صلے میں آپ پہ کوئی ذمہ داری ڈالوں گی۔ یہ میری طرف سے دوستی کا ایک تحفہ ہے اور اس خدمت کا انعام ہے جو اس وقت تک آپ میرے لیے انجام دیتے رہے ہیں۔ مجھے آپ کے خلوص اور تعاون کے سوا اور کسی چیز کی خواہش نہیں۔"

یوں خانزادہ نے بڑی ہوشیاری سے وزیرِ سلطنت کے خلوص اور تعاون کا سودا کر لیا جس میں اب تک وہ ناکام رہی تھی۔ وزیرِ سلطنت نے اس کی خدمت میں تو کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی لیکن جب بھی خانزادہ اسے میران شاہ سے رابطے کے طور پر استعمال کرنے کی بات کرتی تھی، تو وہ کسی نہ کسی بہانے ٹال جاتا تھا۔

"مہمان خانم۔" وزیر انتہائی عاجزی سے بولا:

"میں آپ کے اس گراں قدر عطیے کا کس طرح شکریہ ادا کروں۔ یہ آپ کی کرم نوازی ہے کہ آپ نے اس ناچیز کو اس عزت افزائی کے قابل سمجھا۔"

خانزادہ نے اس وقت وزیرِ سلطنت سے کوئی سنجیدہ بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اسے کچھ وقت دینا چاہتی تھی تاکہ وزیر کو یہ اطمینان ہو جائے کہ ہیرا واقعی اسے بخش دیا گیا ہے۔ خانزادہ نے دراصل اس کی قیمت لگائی تھی اور وزیرِ سلطنت بغیر کچھ کہے اس کا غلام بن گیا تھا۔

خانزادہ کو بچپن ہی سے ہیرے جواہرات سے دلچسپی تھی۔ وہ والیِ خوارزم حسین صوفی کی بھتیجی تھی۔ حسین صوفی لاولد تھا اس لیے اس نے خانزادہ کو گود لے لیا تھا۔ خوارزم کے خزانے میں کئی بیش قیمت ہیرے تھے۔ خانزادہ انہیں اپنے گھر لے آئی تھی۔ پھر جب اس کی شادی امیر تیمور کے بڑے بیٹے جہانگیر سے ہوئی تب بھی اسے دونوں طرف سے ہیرے تحائف اور نذر میں ملے تھے۔ تیمور، خانزادہ سے بہت محبت کرتا تھا بلکہ اس کے بیوہ ہونے کے بعد تو اور زیادہ مہربان ہو گیا تھا۔ وہ جب بھی کسی مہم سے واپس آتا تو مالِ غنیمت میں سے خانزادہ کو حصہ دیتا۔ خانزادہ کے پاس اس طرح کے بہت سے ہیرے اکٹھے ہو گئے تھے جن میں سے وہ چند ہیرے اپنے ساتھ لے آئی تھی۔

ہیرا دینے کا یہ اثر ہوا کہ اب وزیرِ سلطنت ہر وقت اس کوشش میں رہنے لگا کہ خانزادہ اسے کوئی خدمت سونپے جسے پورا کر کے وہ کچھ تو اس بوجھ کو ہلکا کر سکے۔

خانزادہ اس کی بے چینی محسوس کرتی۔ دل میں خوش ہوتی لیکن زبان بند رکھتی۔ ایک دن وزیرِ سلطنت نے خود ہی کہا:

"مہمان خانم! میں کس قدر بدقسمت ہوں کہ آپ کی کوئی خدمت نہ کر سکا۔ حالانکہ آپ مجھ پر اس قدر مہربان ہیں کہ عمر بھر آپ کی خدمت کرنے کے بعد بھی میں حقِ نمک ادا نہیں کر سکتا۔"

"آپ ایک دوست اور وفادار انسان ہیں۔" خانزادہ نے بھی آج اپنا مطلب بیان کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا:

"میران شاہ نے آپ کو وزیرِ سلطنت منتخب کر کے دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی جگہ میں ہوتی تو یہی کرتی۔ میں یقین دلاتی ہوں کہ جب بھی کہیں کی ملکہ یا والیِ ریاست بنی تو آپ کو اپنا وزیر مقرر کروں گی"۔

خانزادہ اپنی گفتگو میں میران شاہ، تیمور اور امیروں اور وزیروں کا ذکر بڑی بے تکلفی سے کرتی تھی جس سے اس بات کی تصدیق تو ہو گئی تھی کہ وہ واقعی شہزادی اور میران شاہ کی رشتے دار ہے لیکن اس سے رشتے کے بارے میں اس نے اب تک زبان نہیں کھولی تھی۔ یہ بات وزیرِ سلطنت کو پریشان کرتی رہتی تھی کیونکہ جب تک اس کی شخصیت کی تحقیق نہ ہو جاتی، یہ پتہ چلنا مشکل تھا کہ وہ تبریز کس مقصد کے تحت آئی ہے اور شاہی خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ لوگوں پر خود کو ظاہر کیوں نہیں کرتی۔

"مہمان خانم!" وزیر آج جیسے خانزادہ کی خدمت کا بیڑا اٹھا کر ہی آیا تھا" افسردگی سے بولا:

"افسوس۔ آپ مجھے بہت کچھ سمجھتے ہوئے بھی کوئی خدمت کرنے کا موقع نہیں دیتیں۔ آپ نے اپنی نوازش کا تو اظہار کر دیا لیکن مجھے اپنی خدمات بجا لانے کا کوئی مناسب موقع ابھی تک نہیں ملا"۔

خانزادہ نے اب زیادہ انتظار بہتر نہ خیال کیا:

"اچھا۔ آپ صرف ایک معمولی سا کام کر دیجئے۔ مجھے تبریز میں کسی ایسے امیر کا پتہ معلوم کر دیجیے جو میران شاہ کے ساتھ اس وقت آیا تھا جب امیر نے میران شاہ کو خوارزم کی حکومت عطا کی تھی۔ امیر نے چھ امیر میران شاہ کے ساتھ بھیجے تھے ان میں سے ایک نہ ایک تبریز میں ضرور موجود ہوگا۔ یہ کام بھی میں اس لیے آپ کے سپرد کر رہی ہوں کہ آپ بضد ہیں ورنہ یہ کوئی ایسی اہم بات نہیں"۔

"آپ اطمینان رکھیے مہمان خانم"۔ وزیر نے اپنی بات پہ زور دیتے ہوئے کہا:

"میں اس امیر کا نام اور پتہ ضرور معلوم کر لوں گا۔ بشرطیکہ وہ تبریز میں رہتا ہو"۔

"مگر اس بات کا خیال رہے اسے میرے بارے میں کوئی علم نہ ہو سکے"۔ خانزادہ نے اسے تاکید کی:

"میں فی الحال اس پہ اپنی شخصیت ظاہر نہیں کرنا چاہتی"۔

وزیر سلام کر کے چل دیا لیکن دروازے پر پہنچ کر کچھ خیال آیا اور واپس آ کر خانزادہ کے سامنے چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

"آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں وزیرِ سلطنت"۔ خانزادہ نے پوچھا۔

"آپ ضرور کوئی بڑی شخصیت ہیں"۔ وزیر نے سادگی سے کہا:

"آپ بتا چکی ہیں کہ آپ سلطانِ معظم کی رشتے دار ہیں۔ میں آپ کے نام سے بھی آگاہ ہوں لیکن آپ کہاں ہیں؟ عالی مقام سے آپ کا کیا رشتہ اور کیا تعلق ہے یہ آپ نے اب تک نہیں بتایا۔ کیا آپ کو مجھ پہ اعتماد نہیں؟"

خانزادہ مذبذب میں گرفتار ہو گئی۔ انکار کی صورت میں وزیر کی ہمدردیوں سے محروم ہونے کا امکان تھا شاید اقرار ہی صحیح راستہ تھا۔ اس طرح وہ وزیر کا پورا اعتماد حاصل کر سکتی تھی۔

"وزیرِ سلطنت!" خانزادہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی:

"میں آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتی۔ میں بتاتی ہوں کہ میں کون ہوں اور میران شاہ کا نام اس قدر بے تکلفی سے کیوں لیتی ہوں لیکن میں آپ کو جو کچھ بتاؤں اس کا اظہار آپ کسی سے اس وقت تک نہ کریں جب تک میں اجازت نہ دوں"۔

"میں وعدہ کرتا ہوں، قسم کھاتا ہوں مہمان خانم!"

خانزادہ نے بتانا شروع کیا:

"اگر آپ کو تیموری خاندان کی تاریخ سے دلچسپی ہے تو آپ نے سنا ہوگا کہ ہمارے امیر کے چار بیٹے تخت و تاج کے وارث ہیں۔ سب سے بڑے بیٹے شہزادہ جہانگیر تھے جنہیں ولی عہد مقرر کر دیا گیا تھا لیکن وہ عنفوانِ شباب ہی میں انتقال کر گئے۔ دوسرے بیٹے عمر شیخ تھے جو ایک جنگ میں زخمی ہو کر مر گئے۔ تیسرا بیٹا یہی میران شاہ ہے جسے آپ سلطان ابنِ سلطان کہتے ہیں حالانکہ امیر نے اب تک خود سلطان کا لقب اپنے نام کے ساتھ لگایا ہی نہیں۔ چوتھا وارثِ سلطنت شہزادہ شاہ رخ ہے جو امیر کی دوسری بیوی سرائے خانم کے بطن سے ہے۔ شہزادے جہانگیر اور شہزادے عمر شیخ کی موت کے بعد اب میران شاہ ہی سلطنتِ تیمور کے ولی عہد اور وارث ہیں۔ سمجھ میں آیا آپ کی؟"

"بالکل سمجھ گیا مہمان خانم"۔ وزیر جلدی سے بولا:

"میں نے شاہی خاندان کی یہ تفصیل پہلے بھی سنی ہے لیکن آپ نے اپنے بارے میں کچھ ارشاد نہیں فرمایا آپ کا تعلق اس خاندان سے کس واسطے سے ہے۔ میں تو آپ کی ذاتِ گرامی کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں مہمان خانم!"

"آپ نے خوارزم کے والی حسین صوفی کا نام ضرور سنا ہوگا؟" خانزادہ نے سوالیہ نظروں سے وزیرِ سلطنت کو دیکھا۔

"کیوں نہیں خانم"۔ وزیر نے اثبات میں سر ہلایا:

"صوفی خاندان خوارزم کا پرانا حاکم تھا۔ پھر ہمارے سلطان کے والدِ محترم صاحبقران امیر تیمور نے خوارزم فتح کر کے سلطنتِ تیموری میں شامل کر لیا"۔

"آپ نے درست فرمایا"۔ خانزادہ اطمینان سے بولی:

"میں اسی حکمران خاندان کی شہزادی خانزادہ ہوں۔ میں نے خوبرو شہزادہ جہانگیر کو دیکھا تھا اور پھر جب جہانگیر کا رشتہ میرے لیے آیا تو میں انکار نہ کر سکی۔ اس طرح میں ولی عہد کی بیوی بن کر سمرقند چلی گئی لیکن تقدیر نے میرا ساتھ نہ دیا اور چند برسوں بعد ہی بیوہ ہو گئی۔"

"اوہ..... تو آپ ولی عہد بہادر کی بیوی ہیں۔" وزیر نے احترام کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بیوی نہیں بیوہ ہوں۔" خانزادہ نے ایک آہ بھری:

"کاش شہزادے جہانگیر زندہ رہتے تو میں بھی آج کسی ملک کی ملکہ ہوتی۔"

"محترمہ خانم..... آپ میرے لیے اب بھی ملکہ ہیں۔" وزیرِ سلطنت نے نہایت خلوص سے کہا:

"میرے لیے یہ کتنی بڑی سعادت ہے کہ آج میں صاحبقراں امیر تیمور کی بہو سے ہم کلام ہوں۔ میں اس اعتماد کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں اور آپ کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دینے کا عہد کرتا ہوں۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔ میں بہت جلد آپ کا کام انجام دے کر سرخرو ہوں گا۔"

وزیرِ سلطنت کے لیے یہ کوئی بڑا کام نہیں تھا۔ اس نے اپنے محل پہنچتے ہی کوتوالِ شہر کو بلوایا۔ شہ حکم پا کر گھبرا گیا۔ کسی ملک کے افسرانِ بالا، حکومتی مشین کے کل پرزے سمجھے جاتے ہیں اور جب وہ سب مل کر چلتے ہیں تو حکومت کی گاڑی چلتی ہے لیکن تبریز کی حکومت کے کسی ایک افسر کو دوسرے سے کسی قسم کا تعلق نہیں تھا۔ ان میں چھوٹے بڑے کا تو لحاظ تھا اور ہر چھوٹا اپنے بڑے افسر سے بے انتہا ڈرتا تھا کیونکہ ہر ایک کو اپنے ماتحت پر پورا اختیار تھا اور وہ اسے کسی وقت بھی برخاست کر سکتا تھا جس کی کوئی داد فریاد نہ تھی۔

وزیرِ سلطنت کے ہرکارے کو دیکھتے ہی کوتوالِ شہر کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے بڑی لجاجت سے پوچھا:

"کیوں جناب! ہمارے وزیرِ سلطنت بہادر کے مزاج تو بخیر ہیں؟"

"ہاں، سب ٹھیک ہے۔" ہرکارے نے کھردرے انداز میں کہا۔

"میرا مطلب ہے جس وقت میری طلبی کا حکم دیا گیا اس وقت ان کے چہرے پر جمال تھا یا جلال؟" کوتوال نے بڑی منت سے دوبارہ دریافت کیا۔

"مجھے کیا پتہ؟" ہرکارہ یوں بولا جیسے کہیں سے لڑ کر آ رہا ہو:

"مجھے تو وزیر کے غلام نے محل سے آ کر بتایا تھا کہ کوتوال سے کہو کہ وزارت میں فوراً طلبی ہے۔"

"طلبی....." کوتوال سہم گیا مگر اب مزید کچھ پوچھتے ہوئے بھی گھبرا رہا تھا۔

"جلدی کرو کوتوال..... مجھے اور بھی کام کرنا ہیں۔" ہرکارے نے یہ کہہ کر اس کی زبان بالکل ہی بند کر دی۔

کوتوال لرزاں و ترساں وزیرِ سلطنت کے محل پر پہنچا۔ وہاں سات کوتوال اور پہلے سے پہنچے ہوئے تھے۔ تبریز دس لاکھ کی آبادی کا شہر تھا۔ اسے آٹھ حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر حصے پر ایک کوتوال مقرر تھا۔ جس وقت وزیرِ سلطنت نے اپنے غلام کو حکم دیا تھا کہ کوتوالِ شہر کو بلا لائے تو غلام کی یہ ہمت نہ ہوئی تھی کہ وہ وزیر سے یہ پوچھ سکے کہ کس علاقے کے کوتوال کو بلایا جائے۔ وزیر کے تمام غلام اس سے خائف رہتے تھے۔ وزیر نے کئی غلاموں کو ذرا ذرا سی بات پر نکال باہر کیا تھا۔ ایک غلام کو تو اس بات پر نکال گیا تھا کہ اس غریب نے وزیر کو افسردہ دیکھ کر بڑے ادب سے ہاتھ باندھ کر پوچھ لیا تھا:

"آج حضور کے مزاجِ گرامی کچھ ناساز معلوم ہوتے ہیں۔"

وزیرِ سلطنت کو غلام کی یہ مؤدبانہ مزاج پرسی اتنی گراں گزری کہ اسے گستاخی تصور کرتے ہوئے غلام کی برخاستگی کا حکم صادر کر دیا۔ پھر بھلا غلام کیوں دریافت کرتا کہ حضور وزیرِ سلطنت کس علاقے کے کوتوال کو طلب کر رہے ہیں۔

اسی طرح جب غلام نے باہر جا کر پیادوں کے داروغہ کو کوتوالِ شہر کے بلانے کا حکم دیا تو اس کی ہمت نہ ہوئی کہ محل کے غلام سے پوچھ سکے کہ اے بندۂ خدا! یہ تو بتاتا جا کہ آٹھ کوتوالوں میں سے کس کو حاضرِ خدمت کیا جائے؟

غلام اپنی بلا داروغہ کے سر منڈھ کر واپس آ گیا اور داروغہ کے لیے یہی راستہ چھوڑ گیا کہ وہ بیک وقت تمام کوتوالوں کو طلب کرے اور سب کو وزیرِ سلطنت کی خدمت میں ایک ساتھ پیش کر دے۔

وزیرِ سلطنت کو اطلاع دی گئی کہ کوتوال آ گئے ہیں۔ وزیر کو معاً خیال آیا کہ اس نے کسی کوتوال کا نام نہ بتایا تھا اور نہ ہی علاقے کی نشاندہی کی تھی۔ پتہ نہیں یہ کس کوتوال کو بلا لایا ہے۔ اگر اس سے پتہ نہ چلا تو دوسرے کو بلانا پڑے گا۔ اس نے غلام سے پوچھا:

"تو کس کوتوال کو لایا ہے۔ میں نے کسی علاقے کا نام تو لیا نہیں تھا۔ تجھے پوچھنا چاہیے تھا کہ کس کوتوال کو حاضر کیا جائے؟"

غلام کی اس میں کوئی غلطی نہ تھی لیکن خوف کے مارے اسے پسینہ آ گیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ آج ملازمت کا

خاتمہ ہوگیا کیونکہ اس قسم کے معاملات میں وزیر بے سارا الزام غلام کے سر ڈال کر اسے نکال دیا کرتا تھا۔۔۔۔ پھر
نے حوصلہ کیا اور ڈرتے ڈرتے کہا:

"حضورِ والا نے نام تو کسی کا نہیں لیا تھا اس لیے میں نے تمام کوتوالوں کو بلا لیا ہے۔ حضور کو جو
کام ہو اسے حاضر کیا جائے۔"

"شاباش۔ تُو بہت عقلمند ہے۔" وزیر خوش ہوگیا:

"آج سے تجھے تمام غلاموں کا داروغہ بنایا جاتا ہے۔ جاؤ اور سب کو باری باری ہمارے سامنے
غلام خوشی خوشی باہر بھاگا۔ ایک تو اس کی ملازمت بچی۔ دوسرے مفت میں اس کی ترقی ہوگئی
سب کوتوال بھیگی بلی بنے اپنی جان کی خیر منا رہے تھے۔ غلام کو خوش خوش آتے دیکھ کر انہیں ذرا اطمینان
نے کوتوالوں پر ایک فاتحانہ نظر ڈالی اور ایک کوتوال کو اشارے سے قریب بلایا۔ کوتوال سہما ہوا اس
پاس آگیا۔

"اطمینان سے اندر جاؤ۔ وزیرِ سلطنت بہت خوش ہیں۔ آج ترقی کا دن ہے۔" غلام نے اسے ذرا
کوتوال اسے متشکر نظروں سے دیکھتا ہوا وزیر کے کمرے میں چلا گیا۔

وزیر کچھ سوچ رہا تھا۔ اسے کوتوال کے داخل ہونے کی مطلق خبر نہ ہوئی۔ حالانکہ کوتوال بالکل اس
سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔

ذرا دیر بعد خود ہی وزیر نے چونک کر کوتوال کو دیکھا اور سختی سے بولا:

"کون ہو تم؟ ۔۔۔۔۔ اندر کیوں آئے ہو۔ کس نے آنے دیا تمہیں؟"

کوتوال حواس باختہ ہوگیا:

"وہ حضور نے ۔۔۔۔ نہیں غلام نے ۔۔۔ میں کوتوالِ شہر ۔۔۔۔ شمال مشرقی علاقہ!" کوتوال
سے اٹک اٹک کر چند بے ربط الفاظ کہہ سکا۔

"شہر کوتوال ۔۔۔ ہاں ٹھیک ہے۔" وزیر کو یاد آگیا:

"میری بات غور سے سنو اور ٹھیک ٹھیک جواب دو۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے علاقے میں کوئی ایسا تیموری
موجود ہے جو سلطانِ معظم کے ساتھ یہاں آیا ہو؟"

کوتوال نے اطمینان کا سانس لیا پھر فخر سے بولا:

"وزیرِ سلطنت کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرے علاقے میں صرف ایک پرانا تیموری امیر رہتا ہے
نام قلات خان ہے۔ قلات خان ان امیروں میں سے ایک ہے جو صاحبقراں امیر تیمور نے شہر سبز سے ملا

عالی مقام حضرت میراں شاہ ابنِ سلطان کے ساتھ بھیجے تھے تاکہ وہ ملکی معاملات میں انہیں مشورہ دیں۔ یہ امیر
حضرت سلطان کے ساتھ خوارزم کے دارالسلطنت اور گاؤں میں کافی عرصہ تک رہ چکا ہے۔ پھر جب حضور سلطان
کو تبریز کی ولایت عطا ہوئی تو قلات خان ان کے ساتھ تبریز آگیا۔ قلات خان جلائری قبیلے کا تاتاری سردار
ہے۔ اس کے باپ کا نام ۔۔۔۔؟

"چپ رہو۔ اس کا شجرہ نہیں چاہیے۔" وزیر بگڑ کر بولا:

"وہ کس محلے میں رہتا ہے۔ صحیح پتہ کیا ہے؟"

کوتوال نے قلات خان کے محلے کا نام اور اس کے گھر کا جائے وقوع کا تفصیل سے نقشہ کھینچا۔ پھر
ہنس کے کہا:

"وزیرِ سلطنت کا حکم ہو تو اسے ابھی گردن سے پکڑ کر حاضر کروں یا پھر گردن اتار کر لے آؤں!"

"نہیں۔ ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جاؤ اور دوسرے کوتوالوں کو بھی لے جاؤ۔ لیکن خبردار کسی
کو یہ نہ بتانا کہ تم سے کسی کا پتہ پوچھا گیا ہے۔ اگر تم نے رازداری نہ برتی تو پھر ۔۔۔۔" وزیر نے جملہ ادھورا چھوڑ
کر معاملے کی اہمیت اور بڑھا دی۔

کوتوال اپنی خیر مناتا ہوا واپس آیا اور باہر آکر اس نے حکم کے مطابق سب کوتوالوں کو واپس بھیج دیا۔

امیر قلات خان کی حویلی بھی کسی چھوٹے بادشاہ سے کم شاندار نہ تھی۔ جانزادہ آج تبریز کے بڑے بازار
سے گزر کر آئی تھی۔ بازار میں بھیڑ بھاڑ اور سجی ہوئی دکانیں دیکھ کر اسے بڑی حیرت ہوئی۔ سمرقند کو امیر نے اس قدر سجایا
بنایا تھا کہ وہاں ہر قسم کے سامان سے دکانیں بھری تھیں لیکن تبریز کے بازاروں کی شان ہی عجیب تھی۔ ایک بازار
الگ الگ بازار تھے۔ پارچہ جات کا بازار، سونے چاندی کا بازار، جواہرات کا بازار دیکھ کر تو اس کی آنکھیں
کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ ایک بازار اسے مینا بازار کے طرز کا دکھائی دیا۔ اس میں خواتین کے سنگار کا سامان
فروخت ہوتا تھا۔ وہاں عورتوں کا بے پناہ ہجوم تھا اور ہر عورت سامان خریدنے پر بے تحاشا رقم خرچ کر رہی تھی۔
جانزادہ کو تمام راستے کوئی عورت یا مرد بھیک مانگتا نظر نہ آیا۔ وہاں تو سب ہی امیر کبیر نظر آتے تھے۔ مکانات عام طور
پر دو منزلہ اور سہ منزلہ تھے۔ سامنے کی دیواروں پر نقش و نگار بنے تھے۔ اوپر سنگی برجیاں اور جھروکے تھے۔

امیر قلات خان کی حویلی کا صدر دروازہ ایک جھلملاتے کپڑوں والے دربان نے کھولا۔ اس نے خانزادہ کا گھوڑا ایک طرف باندھ دیا اور اسے مہمان خانے میں بٹھا کر قلات خان کو اطلاع دینے اندر چلا گیا۔

خانزادہ مہمان خانے کی ہر چیز کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ وہ خوارزم کی شہزادی اور ولی عہد تاتار کی بیوہ تھی۔ شہر سبز اور سمرقند کے محلات اس کے دیکھے ہوئے تھے۔ امیر قلات کا یہ مہمان خانہ ان محلات سے کسی طرح کم نہ تھا۔ ہر چیز سے امارت کا اظہار ہوتا تھا۔

امیر قلات خان قہوہ کی پیالی لیے مہمان خانے میں داخل ہوا۔ خانزادہ اس کے استقبال کے لیے کھڑی نہیں ہوئی اور بیٹھے بیٹھے پُروقار لہجے میں کہا:

"میں تاتاری امیر قلات خان کو سلام پیش کرتی ہوں۔"

"مرحبا.... خوش آمدید خانم...." قلات خان کو شاید خانزادہ کا اٹھ کر سلام نہ کرنا گوارا نہ ہوا۔ اس نے خشک لہجے میں کہا:

"میں خانم کی کیا خدمت کر سکتا ہوں.... اگر خانم یہ امید لے کر آئی ہیں کہ میں سلطان ابن سلطان سے ان کی کسی معاملے میں سفارش کروں تو مجھے معذور سمجھا جائے۔ میں نے دربارِ سلطانی سے تقریباً اپنا تعلق ختم کر لیا ہے۔"

"قلات خان!" خانزادہ کا لہجہ سخت تھا:

"میں نے تمہیں تاتاری امیر کے معزز الفاظ سے مخاطب کیا لیکن معلوم ہوتا ہے تم نے تاتاری شمشیر اور شہ سواری چھوڑ کر ایرانی عشرت پسندی اختیار کر لی ہے۔ تمہیں تاتاری امیر کہتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔"

قلات خان نے بڑی حیرت سے خانزادہ کو دیکھا۔ خانزادہ کا نصف چہرہ نقاب میں پوشیدہ تھا اس لیے وہ اس کے صحیح تاثرات کا اندازہ نہ کر سکا لیکن خانزادہ کی گفتگو اور اس سے زیادہ تیز لہجے نے اسے یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ اس کی مخاطب کوئی معمولی خاتون نہیں ہو سکتی۔

قلات خان دھیمے لہجے میں بولا:

"خانم.... آپ مہمان کی حیثیت سے تشریف لائی ہیں۔ آپ کا تلخ و ترش لہجہ اگرچہ قابلِ برداشت نہیں لیکن اس سے درگزر کرتے ہوئے کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ میں نے خانم کو خوش آمدید کہنے کے علاوہ اور کون سی گستاخی کی ہے جس کی بنا پر آپ مجھے تاتاری امیروں کے دائرے سے خارج کرنے پر آمادہ ہو گئی ہیں۔"

"قلات خان۔ اس سے بڑھ کر اور کیا گستاخی ہو گی کہ تم ولایتِ تبریز کے گورنر اور رعایا کو سلطان ابن سلطان کہہ رہے ہو۔" خانزادہ کو جلال آ گیا:

میران شاہ، صاحبقران امیر تیمور کا بیٹا ہے۔ تم اسے سلطان کہہ کر نہ صرف لفظ سلطان کی توہین کر رہے ہو بلکہ [میران] شاہ کو ابنِ سلطان کہنا خود صاحبقران امیر تیمور کی توہین ہے۔ امیر نے اب تک سلطان کا لقب اختیار نہیں [کیا]۔ میران شاہ کا دماغ تم جیسے خوشامدیوں اور ابن الوقت امیروں نے خراب کیا ہے۔"

قلات خان کو اپنے مخاطب کی جرأت اور دلیری پر بڑا تعجب ہوا۔ اس نے جو باتیں کیں اور الزام لگائے [ان میں] ذرا بھی شبہ نہ تھا لیکن ان کا برملا اظہار ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس نے سہمی سہمی آواز میں [اس] سے پوچھا:

"محترمہ خانم! آپ نے جو کچھ فرمایا اس کی تائید یا تردید میں بعد میں کروں گا لیکن یہ تو فرمایئے کہ آپ نے [نقاب] کیوں باندھا ہے۔ کیا آپ کو اپنی زندگی عزیز نہیں۔ موت کو خواہ مخواہ دعوت دینا نہ تو بہادری ہے اور [نہ عق]لمندی.... تبریز کی ولایت میں سلطان کے خلاف زبان کھولنے والے کی زبان تراشی اور گردن جدا [کی ج]اتی ہے۔"

"تمہیں اپنی بہادری پر بڑا ناز ہے قلات خان۔"

خانزادہ نے اپنے نقاب پر ہاتھ ڈالا اور اسے نوچ کر دور پھینک دیا:

"جرأت ہے تو تلوار اٹھاؤ۔ تمہیں ابن الوقت کہنے والی میں ہوں، خانزادہ۔ صاحبقران امیر تیمور کے [ولی] عہد شہزادے جہانگیر کی بیوہ.... خوارزم کی شہزادی خانزادہ!"

قلات خان کے ہاتھ سے قہوہ کی پیالی چھوٹ گئی۔ اس نے سر جھکا کر فوراً ہاتھ باندھ لیے:

"محترمہ شہزادی مجھے معاف کر دیجیے۔ مجھ سے بہت گستاخی ہوئی۔ میں آپ کو بالکل نہیں پہچان سکا۔"

"اب تو پہچان لیا کہ ہم کون ہیں؟" خانزادہ نے فوراً شاہانہ تکلم اختیار کیا۔

"[خوارزم کے حکمران حسین صوفی] کے اور گنج کے ترکمان بادشاہ کی بیٹی۔ آپ کو کون نہیں پہچانے گا۔" بوڑھے قلات خان نے کھڑے [کھڑے] ہوئے کہا:

"آپ کے ورودِ سمرقند کی تقریب کو کون بھول سکتا ہے۔ وہ کتنا مبارک دن تھا جب آپ دلہن بنی ہوئی [تخت] پر محمل میں بیٹھی سمرقند کے مغربی دروازے سے داخل ہوئی تھیں۔ دروازے کا خیابان خالیچوں [سے ڈھک]ا تھا۔ امیر محترم کی لشکر گاہ میں اطلس و کمخواب کا فرش بچھایا گیا تھا۔ امیر و وزیر، تواچی اور علمبردار [ب]ولے نئے ساز سے سجے ہوئے گھڑسوار آپ کے استقبال کو نکلے تھے۔ آپ کے چہرۂ مبارک پر [...] دائیں بائیں شہسوار کس شان سے چل رہے تھے۔ پیچھے گھوڑوں اور اونٹوں کی بے شمار قطاریں [...]پ کا جہیز رکھا ہوا تھا۔"

قلات خان سانس لینے کے لیے رکا تو خانزادہ ایک آہ بھر کر بولی:

"خان! تمہیں سب کچھ یاد ہے؟"

"خوارزم کی شہزادی! وہ دن اور وہ رات بھلا بھولنے کی چیز ہے؟" قلات خان نے جواب میں بڑے خلوص سے کہا:

"ایک ایک منظر میری آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ رات ہوتے ہی درختوں میں لٹکی ہوئی قندیلیں ایک دم جگمگا اٹھی تھیں۔ اس رات تو ہوا بھی خرامِ ناز کا مظاہرہ کر رہی تھی اور قندیلوں میں تھرتھراتی ہوئی روشنی رنگ برنگی پھولوں کی طرح جھوم رہی تھی۔ تمام خیمے صندل کی چوبوں پر استادہ تھے اور صندل کی بھینی بھینی خوشبو سے پوری فضا مہک اٹھی تھی۔"

"بس بس خان..... خدا کے لیے ان شب و روز کی یاد نہ دلاؤ۔" خانزادہ کی آواز شدتِ جذبات سے بھرا گئی:

"وقت واپس نہیں آیا کرتا۔ ایک وہ دن تھا کہ ہماری آواز سے محلسرا تھرتھرا اٹھتی تھی اور سمرقند کے در و دیوار لرز جاتے تھے اور اب یہ حال ہے کہ ہماری باتوں پر کوئی دھیان نہیں دھرتا۔ ہمیں اطلاع دی گئی تھی کہ میراں شاہ نے غلط راستہ اختیار کر لیا ہے۔ وہ ولی عہدِ سلطنت ہے لیکن امورِ سلطنت میں دلچسپی لینے کے بجائے اس نے خود کو عیش و عشرت کے سمندر میں غرق کر دیا ہے۔ ہمارا دل کڑھنے لگا اور ہم یہاں دریافتِ حال کے لیے آئے ہیں۔ افسوس کہ جو سنا تھا حالات اس سے زیادہ بدتر دیکھے۔ امیر محترم نے تم جیسے وفاداروں کو شہزادے کے ساتھ اس لیے روانہ کیا تھا کہ وہ راستے سے بھٹکنے نہ پائے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ رہبر اور راہنما خود بھی اسی رنگ میں رنگ گئے۔"

"شہزادی عالیہ آپ درست فرما رہی ہیں۔" قلات خان نے اعتراف کیا۔

"ہم چند امیر شہزادے کے ساتھ آئے تھے۔ شہزادے بہادر جب تک اور گنج میں رہے انہوں نے اعتدال سے قدم نہیں بڑھایا لیکن برا ہو ان نااہل ندیموں اور نالائق مصاحبوں کا جنہیں امیرِ عالی مقام نے شہزادے کی دل بستگی کے لیے تبریز بھیج دیا ہے۔ ان میں زیادہ تعداد شاعروں کی ہے۔ کچھ اپنے آپ کو انشا پرداز کہتے ہیں۔ بعض رقص و موسیقی میں باکمال ہونے کے دعوے دار ہیں۔ انہوں نے شاہی دربار کا رنگ بگاڑ دیا ہے۔ شہزادے نے پرانے ملازموں کو برخاست کر کے ان مسخروں کو اپنے گرد اکٹھا کر لیا ہے۔ باورچی رقاص ہے تو چوبدار انشا پرداز۔ شاعروں کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں۔ صفائی والا بھی شعر کہنے لگا ہے۔ اندر رقص و سرود کی محفل تو باہر شعر و شاعری کے اکھاڑے جمتے ہیں۔ جب تا

تاب نہ پڑے مورچھل جھلنے والے کے ہاتھ کو جنبش نہیں ہوتی۔"

"امیروں کا بھی تو کوئی فرض تھا۔ انہوں نے کیا کیا؟" خانزادہ نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"ہم نے کوشش کی شہزادی عالیہ۔" قلات خان بڑے دکھ سے بولا:

"مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ مجبور ہو کر ہم نے دربار میں جانا چھوڑ دیا اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔"

"امیروں کو تو اس لیے بھیجا گیا تھا کہ اگر شہزادہ غلط راہ پر چلے تو اسے سختی سے منع کیا جائے۔" خانزادہ نے بات پر زور دے کر کہا:

"سختی کرنے سے امیر ناراض تو نہ ہوتے۔"

"شہزادی عالیہ۔ شہزادے، صاحبقران امیر تیمور کے بیٹے ہیں۔" قلات خان نے بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ کہا:

"امیر کے فرزند کا حکم ہم تاتاریوں کے لیے اٹل قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ پھر بھلا ہم انہیں کس طرح ٹوک سکتے ہیں۔"

"قلات خان! یہ بات تو تیموری حکومت کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔" خانزادہ نے متانت سے کہا:

"شہزادے کو ٹوکنا ہی پڑے گا۔ تاتاری لشکر اور عوام کسی نااہل کو اپنا ولی عہد تسلیم کرنے پر کس طرح آمادہ ہو سکتے ہیں؟"

"شہزادی عالیہ!" قلات خان نے تعجب سے خانزادہ کو دیکھا:

"آپ امیر کے بیٹے کو نااہل کہہ رہی ہیں۔ کس میں ہمت ہے کہ ان کے معاملات میں دخل دے سکے؟"

"اہل اور نااہل تو انسان اپنے اعمال سے ہوتا ہے قلات خان۔" خانزادہ استقلال سے بولی:

"اگر صاحبقران کے امیر عقیدت کا نقاب ڈال کر بزدلی کا مظاہرہ کرنے لگے تو یہ فرض ہمیں ادا کرنا ہوگا۔ ہم بھرے دربار میں میراں شاہ کو نااہل ثابت کر سکتے ہیں لیکن اس کے لیے ہمیں ثبوت کی ضرورت ہوگی اور اس کا ثبوت تبریز والے ہی پیش کر سکتے ہیں۔"

قلات خان کی سمجھ میں خانزادہ کی بات آ تو گئی لیکن وہ جواب دیتے ہچکچا رہا تھا۔ خانزادہ کی نظریں قلات خان کے چہرے پر لگی تھیں اور وہ جواب کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ جب قلات خان کی خاموشی طویل ہو گئی تو اس نے بات کا رخ بدل کر کہا:

"اگر تبریز کے امیر یہ سمجھتے ہیں کہ میراں شاہ کے معاملات میں خاموشی اختیار کی جائے تو پھر ہمیں بھی کوئی

ضرورت نہیں کہ خواہ مخواہ کسی کی مخالفت مول لیں۔ تاتاری حکومت تباہ ہوتی ہے تو ہو جائے۔ صاحبقران فتوحات
تاتاری خون بہاتے رہیں اور کم عقل ولی عہد ان کا ساتھ دینے کے بجائے نبیذ کے چشموں میں ڈوبا رہے، کسی کا
نقصان ہے۔ جب تبریز کے امیر اپنی اپنی حویلیوں کے سائے میں پناہ گزیں ہو جائیں تو ایک بیوہ شہزادی کو
ضرورت پڑی ہے کہ وہ میران شاہ کی عیاشیوں کا ڈھنڈورا پیٹتی پھرے۔ کاش آج شہزادے جہانگیر زندہ
تو .....“

اور اس کے ساتھ ہی خانزادہ کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ یہ آنسو حقیقی تھے یا مکاری کے .....
تو پتہ نہیں لیکن قلات خان ان آنسوؤں اور خانزادہ کی دبی دبی سسکیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

قلات خان نے ادب سے کہا:

”مت روئیے شہزادی! شہزادے جہانگیر ہم میں موجود نہیں لیکن یقین کیجیے کہ میں اور صاحبقر
امیر تیمور کے تمام امیر و سردار آپ کا بالکل اسی طرح احترام کرتے ہیں جیسے ہم شہزادے کی زندگی میں ا
عزت و تکریم کرتے تھے۔ آپ نے ٹھیک کہا کہ ہم بزدل اور بے خبر ہیں لیکن اگر ہم سے امیر نے دریافت کیا
تبریز کے پورے حالات بغیر خوف و خطر کے بیان کر دیں گے۔“

”تمہاری بات سے ہمارا دل خوش ہو گیا قلات خان۔“ خانزادہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

”ہمارا خیال غلط تھا کہ امیر کے وقار اور جہانگیر کی بیوہ کا احترام کرنے والے امیر اب باقی نہیں ر
ہم اپنا فرض ادا کریں گے ..... امید ہے ہمیں تبریز کے امیروں کا تعاون حاصل رہے گا۔“

”مگر شہزادی عالیہ۔“ قلات خان نے تشویش سے کہا:

”آپ شہزادے میران شاہ کی بڑی بھاوج ہیں۔ شہزادے کے حالات امیر کے کانوں تک پہنچانے
پہلے اگر آپ انہیں سمجھائیں تو شاید زیادہ بہتر ہو۔ وہ آپ کی تنبیہ کا برا نہ مانیں گے۔ ممکن ہے آپ کو دیکھ کر ا
صاحبقران کا غیظ و غضب اور عتاب کا ڈر پیدا ہو جائے اور وہ خود اپنی اصلاح شروع کر دیں۔“

”ہاں قلات خان۔ ہمارا بھی یہی ارادہ ہے۔“ خانزادہ کو قلات خان کا جو فوری تعاون حاصل ہوا
وہ کھونا نہیں چاہتی تھی لہٰذا اس کی ہاں میں ہاں ملاتی ہوئی بولی:

”تمہارا مشورہ نہایت دانشمندانہ ہے۔ ہم خود نہیں چاہتے کہ شہزادے کی شکایات کا ناگوار فرض ہم
پڑے۔ یہ تو سب سے آخری قدم ہو گا۔ ہم تمہارے کہنے کے مطابق میران شاہ سے ملاقات کریں گے اور اپنے طو
کوشش کریں گے کہ یہ معاملہ یہیں ختم ہو جائے تو اچھا ہے۔ ورنہ جب یہ ذکر تیموری دربار تک پہنچے گا
قیامت برپا ہو جائے گی۔“

”میں شکر گزار ہوں شہزادی عالیہ۔“ قلات خان خوش ہو گیا:

”قلات خان کے لیے یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ شہزادی نے اس کی بات پر توجہ فرمائی۔ میں تبریز کے پرانے
یروں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کروں گا تاکہ اگر گواہی شہادت کی ضرورت پڑے تو وہ سب بھی شہزادی
ساتھ دیں۔“

”ہم بھی تمہارے شکر گزار ہیں قلات خان۔“ خانزادہ نے اس کی عزت افزائی کے لیے کہا:

”ہمارے لیے یہ بات بہت اطمینان کا باعث ہے کہ پرانے امیر اب بھی شہزادے کی بیوہ کی عزت کرتے
یں اور اس سے تعاون کے خواہش مند ہیں۔“

قلات خان سے کامیاب ملاقات کے بعد خانزادہ اپنی حویلی واپس ہوئی تو وہ دل میں بہت خوش تھی۔
زادہ جب اوکادمک سے تبریز کی طرف چلی تھی تو اس کے ذہن میں صرف یہ خیال تھا کہ کسی طرح میران شاہ کو راستے سے
کر اپنے بیٹوں شہزادہ پیر محمد اور شہزادہ سلطان محمد کے لیے فضا ہموار کی جائے کیونکہ میران شاہ کی موجودگی میں یہ
طرح ممکن نہیں تھا۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس کے پاس کوئی واضح منصوبہ نہ تھا اور اس نے فیصلہ
ا تھا کہ اس سلسلے میں میران شاہ سے ملنے کے بعد ہی کوئی تدبیر کرے گی۔

میران شاہ کسی زمانے میں خانزادہ کے لیے بہت بے چین تھا لیکن اس بات کو کئی سال گزر چکے تھے۔ میران شاہ
ولایت تبریز سے بے پناہ دولت اور خزانہ ہاتھ آ گیا تھا اور وہ اپنی رنگ رلیوں میں مصروف ہو گیا تھا۔ خانزادہ
بھی ایک خود دار شہزادی تھی۔ اس نے میران شاہ کو ذرا سی ڈھیل دی تھی تاکہ وقت ضرورت اس سے کام لے سکے لیکن
ب میران شاہ کی طرف سے سلسلہ جنبانی نہ ہوئی تو خانزادہ بھی اکڑ گئی ..... پھر جب اسے اپنی مانگ میں چاندی
تار نظر آیا تو وہ گھبرا اٹھی۔ اس نے سوچا کہ اگر اس نے فوری طور پر کوئی قدم نہ اٹھایا تو اس کا بیٹوں کو ولی عہد
نے کا خواب کبھی پورا نہ ہو گا۔ اسی لیے وہ بن بلائے ایک دم تبریز پہنچی تھی لیکن جب اس نے محسوس کیا کہ میران شاہ
ام کرنا تو الگ رہا، اس سے ملاقات بھی ناممکن ہے تو اس نے دوسرا منصوبہ بنایا۔ اس سلسلے میں اس نے وزیر کا
ن حاصل کیا۔ پھر اس کی مدد سے قلات خان تک پہنچی۔

قلات خان سے ملاقات کے دوران ہی اس کے ذہن میں ایک نیا خیال ابھرا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ

ایک تیر سے دو شکار کرے گی۔ اگر اس نے میراں شاہ کو رام کر لیا تو وہ میراں شاہ سے شادی کر کے ایک بار پھر ولی عہد کی بیوی بن کر تاتاریوں میں اپنا پرانا وقار حاصل کر لے گی۔ اور اگر میراں شاہ نے اسے ٹھکرا دیا تو وہ اس کی تمام حرکتوں سے امیر تیمور کو باخبر کر کے اسے امیر کی نظروں سے گرانے کی کوشش کرے گی۔ اس کی امید اسے اس لیے تھی کہ اسے قتلات خان اور دوسرے امیروں کا تعاون حاصل ہو گیا تھا جو اس کے بیان کی تصدیق کر سکتے تھے۔

خانزادہ اپنے خیالات میں ڈوبی ہوئی حویلی پہنچی تو اس نے وزیرِ سلطنت کو اپنا منتظر پایا۔ وزیر نے اسے سلام کیا اور ادب سے پوچھا:

"مہمانِ خانم شاید آج تبریز کی سیر کو تشریف لے گئی تھیں؟"

"میرے ہی سمجھیے وزیرِ سلطنت!" خانزادہ خوش دلی سے بولی:

"جس امیر کا مجھے پتہ دیا گیا تھا، میں نے آج اس سے ملاقات کی ہے اور یہ ملاقات میری امید سے زیادہ کامیاب رہی"۔

"کامیاب رہی، قتلات خان سے آپ کی ملاقات ...." وزیر کو گھبراہٹ پیدا ہوئی:

"آپ نے اس سے میرا ذکر تو نہیں کیا۔ میں غریب آدمی ہوں مہمانِ خانم۔ بال بچے دار ہوں"۔

"آپ خوامخواہ پریشان ہو رہے ہیں"۔ خانزادہ نرمی سے بولی:

"آپ کا ذکر قطعی نہیں ہوا۔ دراصل میں قتلات خان سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ یہ امیر میری شادی کے وقت سمرقند میں موجود تھا۔ اس نے میرے شاندار استقبال کا نقشہ کچھ ایسے انداز سے کھینچا کہ تمام پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ مجھے تبریز میں ایسے ہی آدمیوں کے تعاون کی ضرورت ہے"۔

"آپ کو اس کے تعاون کی کیا ضرورت ہے خانم؟" وزیرِ سلطنت کو تشویش پیدا ہوئی:

"میرے سامنے اس گوشہ نشین امیر کی کیا حیثیت ہے۔ اسے تو دربار میں بھی جانے کی اجازت نہیں ہے۔ میں نے ایسے تمام امیروں کا وظیفہ مقرر کر دیا ہے۔ وہ آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکے گا"۔

خانزادہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ کامیابی کی خوشی میں خود پر قابو نہ رکھ سکی تھی اور کئی ایسی باتیں اس کے منہ سے نکل گئی تھیں جن کا اظہار اس وقت کسی طرح مناسب نہ تھا۔ اگر وزیرِ سلطنت کو ذرا بھی شبہ ہو جاتا کہ خانزادہ میراں شاہ سے شادی کا ارادہ رکھتی ہے یا اس کی اصلاح کے لیے کوشاں ہے تو اس کی راہ میں روڑے اٹکائے جا سکتے تھے۔ تبریز کے تمام عمائدین اور امراء ایرانی تھے اور ان کی بھلائی اسی میں تھی کہ میراں شاہ خوابِ غفلت سے کبھی بیدار نہ ہو اور وہ اپنی من مانی کرتے رہیں۔

خانزادہ نے وزیر کا شبہ دور کرنے کے لیے کہا: "وزیرِ سلطنت! آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ آپ کو

[...]ہی کہ تیموری سلطنت کے تمام پرانے امیر یا تو مر گئے ہیں یا جنگ میں مارے جا چکے ہیں۔ میں قتلات خان سے [...]اس لیے خوش ہوئی کہ واپسی پر میں قتلات خان کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ امیر ایک پرانے وفادار کو دیکھ کر [...]بہت خوش ہوں گے"۔

"کیا آپ واپس تشریف لے جا رہی ہیں؟" اس نے فوراً پوچھا۔

وہ خانزادہ کے تبریز میں قیام سے کچھ زیادہ ہی پریشان تھا کیونکہ اس کے قیام کا مقصد واضح نہیں تھا اور [...]سے اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ خانزادہ، امیر تیمور کی بہو اور جہانگیر کی بیوہ ہے، اس وقت سے وہ خانزادہ [...]خائف رہنے لگا تھا اور چاہتا تھا کہ یہ بلا جس قدر جلد واپس چلی جائے اتنا ہی اچھا ہے۔

خانزادہ اس کی بے چینی محسوس کر رہی تھی لیکن وہ وزیرِ سلطنت سے زیادہ چالاک تھی۔ . . . . وہ فوراً [...]رائی اور بولی:

"وزیرِ سلطنت کو علم ہے کہ میں میراں شاہ سے ملاقات کے لیے آئی تھی لیکن شہزادے کا جو عالم ہے اس سے [...]ظاہر ہے کہ اگر میں نے میراں شاہ سے ملاقات کی اور اس نے حکومت کے زعم میں کوئی سخت بات کہہ دی تو میرا [...]بڑھاپا ہو گا۔ میرے لیے بہتر یہی ہے کہ میں میراں شاہ کو اس کے حال پر چھوڑ کر واپس چلی جاؤں"۔

"مہمان خانم۔ آپ نے بڑی عقل مندی کی بات سوچی ہے"۔ وہ اس کی واپسی کی خبر سے دل میں خوش ہوا تھا۔ [...]لیے دامن بچانا ہی بہتر ہے"۔

"میرا ارادہ ہے کہ تبریز کی ایک دو دن اور سیر کر لوں۔ پھر واپس چلی جاؤں"۔ خانزادہ نے یہ کہہ کر شک و شبے [...]کا ہی خاتمہ کر دیا۔

"نہیں نہیں.... اتنی بھی جلدی کیا ہے؟" وزیر نے رسماً کہا:

"آپ ہماری مہمان ہیں۔ جب تک چاہیں قیام فرمائیں۔ آپ جیسی اعلیٰ خاندان کی ہستیوں کی خدمت کرنے کا [...]بار بار نہیں ملتا"۔

خانزادہ نے اپنی ہنسی کو روکا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ یہ سب دکھاوے کی باتیں ہیں۔ وزیر اب اس کے قیام [...]دن بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اسے خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر خانزادہ زیادہ دن ٹھہری تو ضرور [...]کوئی فتنہ اٹھ کھڑا ہو گا۔

"وزیرِ سلطنت"۔ خانزادہ نرمی سے بولی:

"آپ کے خلوص اور محبت کا شکریہ۔ لیکن اب ہمیں جانا ہی ہو گا۔ اور گنج میں ہمارا انتظار ہو رہا ہو گا"۔

"خیر.... یہ آپ کی مرضی خانم!" وزیرِ سلطنت کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

"آپ کس دن تشریف لے جانا چاہتی ہیں۔ میں آپ کی واپسی کا انتظام کروں۔"

خانزادہ اس کی مکارانہ گفتگو سے جھلا اٹھی۔ بولی:

"کوئی زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ خانزادہ جس خاموشی سے تبریز آئی تھی اسی خاموشی سے واپس جائے گی۔"

وزیرِ سلطنت کو بھی شاید اپنی احمقانہ گفتگو کا احساس ہو گیا۔ وہ شرمندہ شرمندہ سا اٹھا اور سلام کر کے نکل گیا۔ خانزادہ کو قلات خان سے مل کر جو خوشی ہوئی تھی اس سے زیادہ کوفت اسے وزیرِ سلطنت سے مل کر ہوئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ بغیر وقت ضائع کیے میران شاہ سے ملاقات کرے گی اور پھر جو صورت پیدا ہو گی اس کے مطابق کوئی قدم اٹھائے گی۔

خانزادہ کو معلوم ہو گیا تھا کہ میران شاہ نے رات اور دن کی تفریق ختم کر دی ہے اور وہ ہر وقت عیش کی محفل سجائے رہتا ہے۔

خانزادہ بڑے حوصلے والی عورت تھی لیکن اس نے رات کے وقت میران شاہ سے ملنا مناسب نہ سمجھا۔ دن صبح ہی سے اس نے سلطانی محل جانے کی تیاری شروع کر دی لیکن یہ احتیاط کی کہ اپنے خاص کمرے کا اندر سے بند کر لیا اور کنیز سے کہہ دیا کہ اس کی طبیعت ناساز ہے اس لیے اسے پریشان نہ کیا جائے۔

وزیرِ سلطنت حسبِ معمول صبح کو اسے سلام کرنے آیا تو اسے حویلی میں داخل ہوتے ہی خانزادہ کی ناسازیِ طبیعت کی اطلاع ملی۔ بتایا گیا مہمان خانم آرام فرما رہی ہیں اور انہوں نے حکم دے رکھا ہے کہ انہیں شام تک پریشان نہ کیا جائے۔

وزیرِ سلطنت کو محض سلام کی رسم ہی ادا کرنا تھی۔ اسے اب خانزادہ سے مزید کسی انعام کی امید نہ تھی اس لیے واپس چلا گیا اور کہتا گیا کہ وہ شام کو بھی نہیں آئے گا۔ اس طرح وہ شام کے سلام کی زحمت سے بچ گیا۔ ادھر خانزادہ کو اطمینان ہوا کہ وزیرِ سلطنت اب اس کی تیاری میں مخل نہ ہو گا۔

خانزادہ کو میران شاہ کے پاس جانے کے لیے کوئی خاص تیاری تو کرنی نہیں تھی۔ دراصل وہ خالی الذہن ہو کر سوچنا چاہتی تھی کہ میران شاہ کے دربار میں وہ کس طرح گفتگو کرے گی اور میران شاہ کی نرمی یا سختی کی صورت میں اس کا رویہ کیا ہو گا؟

صبح سے دوپہر تک وہ انہی خیالات میں الجھی اور خود کو اس اہم ملاقات کے لیے ذہنی طور پر تیار کرتی رہی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی دیر آرام کیا۔ اس آرام سے اس کا ذہن و دماغ بالکل تر و تازہ ہو گیا اور اب عملی طور سے اس نے جانے کی تیاری شروع کی۔

اب تک وہ کمرہ بند کیے تنہا پڑی تھی لیکن اب اس نے دو کنیزوں کو اندر بلا لیا تاکہ وہ تیاری میں اس کی مدد کریں۔

خانزادہ کے پاس پہننے کے لیے کوئی ڈھنگ کا جوڑا نہیں تھا۔ وہ تو ادرگاؤں سے خالی ہاتھ آئی تھی۔ خیال تھا کہ میران شاہ کے پاس جا رہی ہے، وہاں لباس کی کیا کمی ہو گی۔ لیکن یہاں پہنچ کر کچھ ایسی افتاد پڑی کہ میران شاہ سے ملاقات تو الگ رہی اس کے محل میں داخلہ تک ناممکن ہو گیا۔ یہ تو وزیرِ سلطنت کی مہربانی تھی کہ اس نے خانزادہ کے لیے دس بارہ جوڑے بھجوا دیے تھے ورنہ اب تک اس کا اکلوتا لباس تو چیتھڑے ہو گیا ہوتا۔

خانزادہ نے وزیرِ سلطنت کا بھیجا ہوا ایک جوڑا نکلوایا۔ زیورات میں دو جڑاؤ ہار اس کی صندوقچی میں موجود تھے۔ ہیرے کے آویزے بھی وہ ساتھ لائی تھی۔ لباس اور زیورات کی کمی کو اس نے سنگار سے پورا کیا۔ جب بن ٹھن کر تیار ہوئی تو اس عمر میں بھی اس کے چہرے پر دلہنوں جیسا نکھار تھا۔ کنیزیں اسے دیسے پیار سے ایک ٹک دیکھے جا رہی تھیں۔

یہاں تک تو خیر غنیمت تھا لیکن جب خانزادہ نے چرمی پیٹی میں لگا ہوا خنجر کمر میں لگایا اور تلوار ہاتھ میں پکڑی تو کنیزیں حیران رہ گئیں۔

ایک شوخ کنیز بولی:

"مہمان خانم! آپ کا لباس اور سنگار تو دلہنوں جیسا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ خنجر اور تلوار کا پیوند سمجھ میں نہیں آیا۔ دلہن تو محفل کی رونق ہوتی ہے۔ سپاہیانہ انداز سے اس کا اسلحہ لے جانا بے جوڑ سا لگ رہا ہے۔"

"تم نے بھی ٹھیک کہا۔" خانزادہ مسکرائی اور دل کی بات چھپاتے ہوئے بولی:

"اس لباس کے ساتھ خنجر و تلوار واقعی بے جوڑ ہیں لیکن یاد رکھو کہ گھر کی چار دیواری عورت کی محفوظ ترین پناہ گاہ ہے اور جب باہر نکلو تو پھر خود کو عورت کے بجائے مرد بنا کر مردانہ وار نکلو۔ کل ہم اپنے ملک واپس جا رہے ہیں۔ چاہا کہ تبریز کی آخری بار سیر کر لیں۔ باہر کی فضا اور ہوا کسی وقت بدل سکتی ہے۔ یہ خنجر اور تلوار اسی کی پیش بندی کے لیے ہیں۔"

"خانم سیر کو تشریف لے جا رہی ہیں تو پھر اس کنیز کو بھی ہمرکابی کی اجازت دیجیے۔" وہ شوخ کنیز بولی۔

خانزادہ کے جواب دینے سے پہلے ہی دوسری کنیز نے دخل دیا:

"ہاں خانم! ہم آپ کے گیسو سنواریں گے، جوتیاں اٹھائیں گے اور ..... اور ....."

خانزادہ ہنس پڑی۔ وہ انہیں کیسے بتاتی کہ وہ جہاں جا رہی ہے وہاں نہ گیسو سنوارنے کی ضرورت ہوگی اور نہ جوتیاں اٹھانے کا موقع ہوگا۔ وہ تو ایک ایسے معرکے پر جا رہی ہے جس کے انجام سے وہ خود واقف نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ معرکہ بہت سخت ہوگا اور وہاں جو کچھ بھی نہ ہو جائے وہ کم ہی ہوگا۔ بہرحال خانزادہ نے دونوں کنیزوں کو اپنے ساتھ چلنے کی اجازت دیدی۔ ممکن ہے خانزادہ نے کنیزوں کو اپنے ساتھ چلنے کی اس لیے پسند کیا ہو کہ ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں اور اگر کبھی گواہی شہادت کی ضرورت پڑی تو شاید یہ کنیزیں اس کی معاونت کر سکیں۔

کنیزیں بھی بھاگ کر اپنا لباس تبدیل کر آئیں۔ ایرانی خواتین ہمیشہ سے خوبصورت ہوتی ہیں۔ کنیزوں نے ذرا بھڑکیلا لباس پہنا تو اور زیادہ اچھی معلوم ہونے لگیں۔

باہر تین گھوڑے تیار تھے۔ کنیزیں پردہ نہ کرتی تھیں لیکن خانزادہ نے چہرے پر دوہرا نقاب ڈالا اور جسم ایک سفید چادر میں سمیٹ کر گھوڑے پر سوار ہوئی۔

جب ان کے گھوڑے تبریز کے بڑے بازار میں پہنچے تو وہاں اس قدر بھیڑ تھی کہ انہیں گزرنا مشکل ہو گیا۔ اس بازار میں ایرانیوں کے علاوہ ارمنی، نسطوری، یعقوبی اور دیگر عیسائی باشندے بھی بے خطر گھوم پھر رہے تھے۔ تبریز کی دلکشی اس وجہ سے اور بڑھ گئی تھی کہ اس کے اندر ایک دریا بھی بہتا تھا۔ یہ دریا دائیں جانب کی پہاڑیوں سے نکلتا تھا۔ اس کا پانی نہروں اور نالیوں کے ذریعے شہر کے مختلف حصوں میں پہنچایا جاتا تھا۔ حدِ نظر تک صاف ستھری گلیاں نظر آ رہی تھیں جن کے دونوں طرف اونچی اونچی عمارتیں تھیں۔ ہر عمارت کے کئی کئی دروازے تھے اور دروازوں کے اندر دکانیں تھیں جن میں کپڑا، ریشم، روئی اور ضروریاتِ زندگی کی دیگر چیزیں بڑے قرینے سے رکھی تھیں۔ عورتوں کا زیادہ ہجوم غازہ اور عطریات کی دکانوں پر تھا۔ جواہرات کی دکانوں پر بھی بہت بھیڑ تھی، جہاں خوش پوش غلام خواتین کو ہیرے جواہرات دکھا رہے تھے۔ خانزادہ کو یہاں کی خوبصورت مسجدیں اور نفیس حمام دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ ایسے حمام اور مسجدیں تو سمرقند میں بھی نہیں تھے۔

یہ محض خواتین کا لحاظ تھا کہ وہ بغیر کسی حادثے کے اس بازار سے بخیر و خوبی نکل گئیں ورنہ اتنی بھیڑ میں تین گھوڑوں کا ایک ساتھ گزرنا بظاہر ناممکن معلوم ہوتا تھا۔

بازار سے نکل کر جب خانزادہ نے قصرِ سلطان کا رخ کیا تو دونوں کنیزیں چونکیں۔ یہ صاف ستھری سڑک جس قدر ویران تھی اتنی ہی زیادہ مشہور تھی۔ اس پر آمد و رفت بہت کم تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس پر عام لوگوں کا چلنا پھرنا ممنوع تھا۔ کنیزوں نے اس سڑک کا نام سن رکھا تھا اور جب کبھی وہ اس کے قریب سے گزرتیں تو ان پہ سلطان ک

ن طاری ہو جاتا۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ اس راستے سے صرف سلطانی امیر و وزیر ہی گزرتے ہیں اور اگر کوئی بھولا بھٹکا ادھر پہنچ گیا تو اسے بغاوت کے شبہ میں گرفتار کر لیا جاتا ہے اور اسے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔

"خانم! آپ کدھر جا رہی ہیں؟" ایک کنیز نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"قصرِ سلطانی۔" خانزادہ جواب دے کر مسکرانے لگی۔

دونوں کنیزوں نے فوراً اپنے گھوڑوں کی لگامیں کھینچ لیں:

"نہ بابا۔ ہم ادھر نہیں جائیں گے۔ خوامخواہ خواری ہوگی۔ کسی نے پکڑ لیا تو کیا جواب دیا کریں گے؟"

"میں تمہارے ساتھ ہوں۔ گھبراتی کیوں ہو؟" خانزادہ نے بھی اپنا گھوڑا روکا:

"تم نے آج تک سلطان کا محل نہ دیکھا ہوگا۔ میں تمہیں پورے محل کی سیر کراؤں گی۔"

"خانم ..... کیا ..... کیا آپ سلطانِ محترم کو جانتی ہیں؟" دوسری کنیز نے خانزادہ کو شبہ اور حیرت سے دیکھا۔

"تم جاننے کو کہہ رہی ہو۔ سلطان نے مجھے خود بلایا ہے۔" خانزادہ نے شوخی سے کہا:

"تم دیکھنا محل میں میری کیسی آؤ بھگت ہوتی ہے۔"

"خانم آپ نے تو بازار کی سیر کو کہا تھا۔"

"وہ تو بس یونہی کہہ دیا تھا..... اگر تم ڈر رہی ہو تو واپس چلی جاؤ۔" خانزادہ نے گھوڑا آگے بڑھایا۔

کنیزیں خوفزدہ تو تھیں لیکن قصرِ سلطانی دیکھنے کا شوق انہیں ستانے لگا۔ خانزادہ آگے بڑھ گئی تھی۔ کنیزیں دیر تک آپس میں باتیں کرتی رہیں پھر گھوڑے بڑھا کر خانزادہ کے قریب پہنچ گئیں۔

"خانم۔ اگر کچھ الٹی سیدھی پڑ گئی تو آپ سنبھال لیجے گا؟" ایک کنیز نے کہا۔

"ہم تو محض کنیزیں ہیں۔ ہم صاف کہہ دیں گی کہ ہمیں خانم اپنے ساتھ لائی ہیں۔" دوسری کنیز نے اپنا بچاؤ کیا۔

"کیوں ڈری جا رہی ہو؟" خانزادہ نے انہیں حوصلہ دیا:

"میں پہلے بھی ایک بار یہاں آ چکی ہوں۔ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔"

"آپ کو کسی نے روکا نہیں تھا؟"

"ہاں روکا تھا۔" خانزادہ نے جواب دیا۔

"کس نے ..... سپاہیوں نے یا فوج نے؟"

"ایک کتے نے روکا تھا۔" خانزادہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"کتے نے..... کیا محل کی حفاظت کتے کرتے ہیں؟"

سامنے میران شاہ کے محل کا صدر دروازہ نظر آ رہا تھا۔ خانزادہ نے ادھر اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"وہ دیکھو کتا آ رہا ہے۔"

کنیزیں حیران نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگیں۔ کھلے ہوئے دروازے سے ایک سوار نکل کر ان کی طرف آ رہا تھا۔ سوار کا لباس نہایت زرق برق تھا۔

"یہی وہ کتا ہے جو راستہ روکتا ہے" خانزادہ نے قریب آتے ہوئے سوار کو دیکھ کر کہا۔

"مگر یہ پالتو جانور ہے۔ کاٹتا نہیں صرف بھونکتا ہے۔ ہے تو دربان..... مگر خود کو پتہ نہیں کیا بتاتا ہے۔ دیکھو وہ قریب آ گیا ہے۔ تم دونوں اس کو سنبھالو۔ بس ایک منٹ کے لیے باتوں میں لگا لینا۔ جیسے ہی دروازے میں داخل ہو جاؤں تو تم بھی پیچھا چھڑا کر آ جانا..... بڑھو بڑھو..... آگے بڑھو۔"

کنیزوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، کچھ اشارے ہوئے، کچھ مسکرائیں۔ پھر انہوں نے جھرجھری سی لی اور اپنے گھوڑے آگے بڑھا دیے۔ طرحدار سوار بالکل ان کے مقابل آ گیا۔ خانزادہ نے اپنا گھوڑا کنیزوں کے پیچھے کر لیا تھا۔

"خوش آمدید..... خوش آمدید اے نازنینانِ بہار..... اے چمنستانِ نور و نکہت کے گلہائے نودمیدہ..... اے حورانِ ارضی کی نوخیز پیامبرو!"

شاہی دربان نے حسبِ عادت کنیزوں پہ گلہائے عقیدت بکھیرنے شروع کر دیے۔ یہ وہی دربان تھا جس نے پہلے دن خانزادہ کو محل میں داخل ہونے سے روکا تھا۔

"سنا ہے آپ شاعر بھی ہیں؟" ایک کنیز نے ذرا شوخی سے پوچھا۔

"اگر آپ واقعی شاعر ہیں تو کوئی ایسا شعر سنائیے کہ بس طبیعت پھڑک اٹھے۔" دوسری نے ٹکڑا لگایا۔

"ماشاءاللہ..... سبحان اللہ..... زہے نصیب! آپ نظر شناس اور باذوق خواتین ہیں۔" دربان نے دونوں کو دلچسپی سے دیکھا:

"خوش نصیب ہے وہ شاعر جسے پری پیکران اور حسینانِ تبریز دعوتِ شعرگوئی عطا فرمائیں۔ براہِ کرم یہ تو فرمائیے کہ شعر، شعرائے قدیم، شعرائے جدید کا ہو یا پھر اس حقیر، فقیر، دلگیر، سنان و تیر، برہنہ شمشیر، جوانِ دلیر، ضمیرِ بے نظیر....."

"بس بس..... اب مزید قافیہ پیمائی کی ضرورت نہیں۔" کنیز نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

کنیز کے ہاتھ میں تازہ مہندی لگی تھی۔ دربان شاعر نے کنیز کا حنائی ہاتھ دیکھا تو فوراً بولا:

"سبحان اللہ یہ دستِ حنائی کا اشارہ!"

"شعر سنائیے!" کنیز چڑ کر بولی۔

"شعر..... ہاں شعر..... سنیے، عرض کیا ہے۔" دربان شاعر آنکھیں بند کر کے یا تو فکرِ شعر میں کھو گیا یا پھر کسی موزوں اور شوخ شعر کی تلاش میں ذہن دوڑانے لگا۔

خانزادہ کے لیے یہ لمحہ غنیمت تھا۔ اسے آج محل میں بہرصورت داخل ہونا تھا لیکن وہ دروازے پر اس دل انسان کی بکواس نہیں سننا چاہتی تھی۔ اس نے چپکے سے اپنا گھوڑا ایک کاوی دے کر آگے کیا اور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھایا۔

دربان اب تک فکرِ شعر میں غرق تھا۔ اور خانزادہ صدر دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ دربان نے آنکھیں کھولیں اور جھوم کر کہا:

"نازنینانِ تبریز ملاحظہ فرمائیے، عرض کیا ہے، اگر آں ترکِ شیرازی بدست....."

ابھی مصرعہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ اس کی نظر خانزادہ پر پڑی جو دروازے سے گزر کر قصرِ سلطانی کی سیڑھیوں سے پہنچ چکی تھی۔ مصرعہ اس کے حلق میں اٹک گیا۔ اس نے سر کو جھٹکا دیا۔ آنکھیں پٹپٹائیں اور گھوڑا بھگا دیا۔ اس کا گھوڑا اندر کی طرف بھاگ رہا تھا اور وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا:

"دوڑو..... دوڑو..... پکڑو..... محل میں کون گھسا جا رہا ہے۔ پکڑو پکڑو....."

مگر خانزادہ کو کون روکتا۔ کون پکڑتا۔ محل کے دوسرے دربان بھی اسی قبیل کے لوگ تھے۔ وہ اپنے اپنے کمروں میں بیٹھے شطرنج و گنجفہ کھیل رہے تھے یا پھر بے ڈھنگی آواز میں شعر پڑھ رہے تھے۔ جب تک وہ کمروں سے باہر خانزادہ کو دیکھتے، وہ قصر کی سیڑھیاں طے کر کے راہداری میں پہنچ چکی تھی۔

خانزادہ بڑی تیزی سے گھوڑے سے کود گئی تھی اس لیے تلوار تو اس کے ہاتھ نہ آ سکی لیکن چمڑے کا ایک [illegible] اس کے ہاتھ لگ گیا جو زین کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ خانزادہ نے اس کوڑے ہی کو غنیمت جانا اور کوڑے کو لہراتی راہداری میں بڑھنے لگی۔ اس نے چادر پھینک دی تھی اور نقاب اتار دیا تھا۔

قصرِ شاہی کے اندر اور باہر قیامت برپا ہو گئی تھی۔

محل کے تمام بیرونی محافظ اور دربان سیڑھیوں کے پاس جمع ہو گئے تھے اور وہیں سے چلا چلا کر محل کی کنیزوں اور خواجہ سراؤں کو خبردار کر رہے تھے۔ وہ اوپر نہیں جا سکتے تھے کیونکہ بیرونی محافظوں کو سیڑھیوں پر بھی چڑھنے کا حکم نہیں تھا۔ اس سے خانزادہ کے ساتھ آنے والی کنیزوں نے بھی فائدہ اٹھایا اور وہ بھی سیڑھیاں

چڑھ کر اوپر پہنچ گئیں لیکن انہیں خواجہ سراؤں نے فوراً قابو کر لیا کیونکہ وہ نہ تو مسلح تھیں اور نہ اُن کے پاس خانزادہ کی طرح کا کوڑا ہی تھا۔

خانزادہ کو میران شاہ کے بارے میں پوچھنے کی ضرورت نہ پڑی۔ محل کے ایک حصے سے تیز موسیقی کی آواز آ رہی تھی جس نے خانزادہ کی رہنمائی کی۔ کیونکہ ظاہر تھا کہ موسیقی کی محفل جس جگہ برپا ہے میران شاہ کی وہاں موجودگی یقینی تھی۔

خانزادہ کوڑا گھماتی بڑی بے خوفی سے موسیقی کی آواز کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جو کنیز یا خواجہ سرا سامنے آ کر اسے روکنے کی کوشش کرتا، خانزادہ اس پہ کوڑوں کی بارش کر دیتی۔ لہٰذا ہر طرف بھگدڑ اور چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ بہت سے خواجہ سرا اور کنیزیں اس دروازے پر جمع ہو گئے تھے جس کے اندر سے موسیقی کی آواز آ رہی تھی۔ یہ محل کا بڑا ہال تھا اور اسے دربار کے لیے استعمال کیا جاتا تھا لیکن جب سے میران شاہ نے اس ولایت کی گورنری سنبھالی تھی اس میں ایک دن بھی دربار نہ لگا لیکن موسیقی کی محفلیں روز بلکہ دن میں کئی کئی بار لگتی تھیں۔ دربار محفل نشاط میں بدل گیا تھا جہاں سے ہر وقت ساز و آواز کی دل خوش کن صدا آتی رہتی تھی۔ اس محفل نشاط کے باہر اتنا کچھ اودھم ہو رہا تھا لیکن کسی بھی کنیز یا خواجہ سرا میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اندر جا کر اس کی اطلاع کرتا۔

خانزادہ خود کو کنیزوں سے بچاتی اور کوڑا گھماتی آخر اس دروازے تک پہنچ گئی جہاں کنیزیں اور خواجہ سرا سمٹ کر جمع ہو گئے تھے۔ اتنا مجمع دیکھ کر خانزادہ ایک لمحے کے لیے پریشان ہوئی لیکن اس نے سوچا کہ یہ آخری مرحلہ ہے۔ ۔ ۔ ۔ اگر اس نے ذرا بھی کوتاہی کی اور کنیزوں کے ہاتھوں میں پڑ گئی تو نہ معلوم وہ اس کا کیا حشر کریں۔ اس نے پہلے انہیں چیخ کر دروازے سے ہٹ جانے کا حکم دیا لیکن انھوں نے ذرا بھی جنبش نہ کی تو خانزادہ نے کوڑا ہوا میں لہرایا اور بائیں ہاتھ میں کمر سے خنجر نکال کر پکڑ لیا پھر شمشیر گھمائی اور کوڑا لہراتی وہ دروازے پر اس طرح حملہ آور ہوئی جس طرح قلعے کے دروازے پر دشمن فوج یلغار کرتی ہے۔ کنیزیں اور خواجہ سرا خانزادہ سے مرعوب اور خوفزدہ ہو گئے۔ وہ خانزادہ کے آگے بڑھتے ہی کائی کی طرح پھٹ گئے۔

خانزادہ نے لات مار کر دروازہ کھول دیا اور بھوکی شیرنی کی طرح ایک ہاتھ میں خنجر اور دوسرے میں کوڑا لیے ہال میں داخل ہوئی!

خانزادہ کے اچانک آ جانے سے میران شاہ کی بزمِ عشرت درہم برہم ہو گئی۔ میران شاہ نہ بادشاہ تھا اور نہ ہی امیر تھا لیکن اس کا محل اور اس محل کے شب و روز شہنشاہِ قسطنطنیہ اور شاہانِ ایران کے قدیم دل سے کچھ کم نہ تھے۔ تبریز کا شاہی محل، ایوانِ کسریٰ کی طرح آراستہ رہتا تھا۔ میران شاہ دراصل مرا اور وزیروں کے زیرِ اثر آ گیا تھا اور اس نے تاتاریوں کی آزاد زندگی چھوڑ کر ایرانی شہنشاہوں کے طریقے اختیار کر لیے تھے۔ دولت کی اس قدر فراوانی تھی کہ ایک مؤرخ کے مطابق ولایتِ تبریز کی آمدنی فرانس کی آمدنی سے زیادہ تھی۔

غضب یہ ہوا کہ امیر تیمور، ایران کی فتح کے وقت بہت سے کاریگروں اور اپنے خیال میں روشن دماغوں کو اپنے ساتھ سمرقند لے آیا تھا۔ ایرانی کاریگروں نے تو واقعی سمرقند کی تعمیرات میں اپنے بہترین فن کا مظاہرہ کیا لیکن دانشور بہت سے شاعر ثابت ہوئے۔ اگر تیمور اچھے شاعروں کو ساتھ لاتا تو غنیمت بھی تھا لیکن ایران کے دوسرے اور تیسرے درجے کے شاعر، موسیقار اور رقاص اس کے ساتھ آ گئے۔ تیمور اپنی مصروفیات میں خود تو ان کے فن کا مظاہرہ نہ دیکھ سکا۔ اس نے انہیں اہلِ فن اور اچھے ندیم سمجھتے ہوئے میران شاہ کے حوالے کر دیا۔ ان لوگوں نے بھولے میران شاہ کو بالکل اپنے ہی رنگ میں رنگ لیا۔ دربار میں ناچنے گانے والوں کو اونچے عہدے دیے گئے اور میران شاہ نے دربار لگانے کے بجائے رقص و سرود کی محفلیں برپا کرنا شروع کر دیں اور ابھی ایسی ہی ایک محفل میں خانزادہ نے پہنچ کر رنگِ محفل بگاڑ کر رکھ دیا۔

خانزادہ بزمِ نشاط میں یوں داخل ہوئی جیسے کوئی سخت گیر استاد شریر بچوں کی کلاس میں ایک دم آ جائے

ادستے پیچھے اپنی تمام شرارتیں بھول کر رہ جائیں۔

ناز آفریں مغنیوں اور رقاصاؤں کے جسم سمٹ گئے۔ آوازیں ہونٹوں میں دب گئیں، نغمے دم توڑ گئے اور ساز تھرتھرا کر خاموش ہو گئے۔

خانزادہ کے ہاتھ کا کوڑا مسلسل ہوا میں مست ناگن کی طرح لہرا رہا تھا۔ مغنی، رقاص اور سازندے خوف و دہشت کے مارے حریری پردوں میں چھپے جا رہے تھے۔ میراں شاہ کے حواری اور مصاحبین اکڑوں بیٹھے بھاگ لیے راستہ تلاش کر رہے تھے۔ ہال کے باہر سے کنیزیں اور خواجہ سرا خوفزدہ نظروں سے اندر جھانک رہے تھ

میراں شاہ کو اب بھی کوئی خبر نہ ہوئی۔ وہ مسند کے سہارے تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھ بند تھیں۔ وہ اس صاحبقران امیر تیمور کا ولی عہد تھا جس کی فتوحات اور یلغار سے پورا ایشیا لرز رہا تھا۔ وہی تیمور، لوگ "لرزندہ جہان" کے نام سے پکارتے تھے۔ تیمور ظالم اور سفاک بھی تھا لیکن اسے مذہب کا کم از کم اتنا پاس تو تھا ہر حملے اور یلغار میں ایک چوبی مسجد ساتھ رکھتا تھا۔ جہاں نماز کا وقت ہوا وہیں اس نے اپنا گھوڑا روک دیا۔ تما اس کے ساتھ رک جاتا۔ پھر لکڑی کے ٹکڑوں میں بٹی ہوئی یہ مسجد چھکڑوں پر سے اتاری جاتی۔ مختلف ٹکڑے جوڑ مسجد کھڑی کی جاتی۔ اذان ہوتی۔ پھر نماز ادا کی جاتی اور پھر لشکر کا یہ چلتا پھرتا شہر اپنی منزل کی طرف رواں نظر آتا

اسی امیر کا فرزند ایرانی شہنشاہوں کی طرح محفلِ نشاط میں بیٹھا مغنیوں کے رس بھرے نغمات سن رہا تھا۔ محفل کی خاموشی نے طول کھینچا اور اسے گہرے سکوت کا احساس ہوا تو میراں شاہ نے سر کو جھٹکا دے کر آنکھ مست و مخمور آنکھیں۔

اس نے محفل پر نظر ڈالی۔ سب ہی بت بنے خاموش بیٹھے تھے۔ میراں شاہ کی نظریں خانزادہ اور اس کے ہاتھ کے کوڑے پر بھی پڑیں۔ شاید وہ دروازے کے پاس کھڑی خانزادہ کو نہیں پہچان سکا تھا۔ شاید وہ کسی کو نہیں سکا۔ اس کی بصارت پر نشے کا دبیز پردہ پڑا ہوا تھا۔

خانزادہ کا خیال تھا کہ میراں شاہ اسے دیکھ کر کسی ردعمل کا اظہار کرے گا لیکن جب اسے احساس ہوا کہ نے اسے بالکل ہی نظرانداز کر دیا ہے تو اس کے شاہانہ وقار کو ٹھیس لگی۔ یہ اس کی بہت بڑی توہین تھی۔... غیظ و غضب سے تھرا اٹھی اور پھر اس کا چرمی کوڑا حاضرین محفل پر بے تحاشہ برسنے لگا۔ خانزادہ نے گانے اور ساقی گری کرنے والیوں کو اندھا دھند مارنا شروع کر دیا۔ اس نے سازوں کو الٹ دیا۔ سازندے ادھر بھاگ کر چھپ گئے۔ شور و غل، چیخ پکار، واویلا اور دہائیاں دی گئیں مگر خانزادہ کا ہاتھ تیزی سے چل رہا تھا سامنے پڑا اسے خانزادہ نے پیٹ کر رکھ دیا۔ وہ پورے ہال میں بھاگ بھاگ کر لوگوں کی پٹائی کر ر لوگ چیخ چلا رہے تھے لیکن خانزادہ کو روکنے اور اس کا ہاتھ پکڑنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔

اس قیامت خیز ہنگامے سے میراں شاہ کا نشہ آہستہ آہستہ اترنے لگا۔ اس نے کئی بار آنکھیں کھولیں اور یں۔ کئی بار سر کو جھٹکے دیے۔ پھر اس کا نشہ اترا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر خانزادہ کو دیکھا جو بھاگ بھاگ ردوں اور عورتوں پر کوڑے برسا رہی تھی۔ آخر اس نے خانزادہ کو پہچان لیا۔

"خانزادہ" اس نے زیرِ لب کہا۔

"خانزادہ" آواز ہونٹوں سے باہر آئی۔

"خانزادہ" اس بار میراں شاہ اتنے زور سے چیخا کہ پورا ہال گونج اٹھا۔ ہر شخص اپنی جگہ ساکت ہو گیا.... ادہ کا ہاتھ بھی رک گیا۔

"میراں شاہ" خانزادہ نے ہانپتے ہوئے مگر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

"اے صاحبقران کے بیٹے! شہزادی کو تمہاری حالت پر رحم آنے کے باوجود اس بات کی خوشی ضرور ہے کہ تمہاری آج بھی تیموری طنطنہ موجود ہے۔ وہی گھن گرج اور دھمک ہے جسے سن کر شاہوں اور شہنشاہوں کا پتا پانی ہو جاتا ر وہ تیمور کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ کاش یہ طنطنہ اور گھن گرج تمہارے کردار میں بھی ہوتی۔"

میراں شاہ اپنی مسند پر کھڑا ہو گیا تھا۔ خانزادہ کے تلخ و ترش جملوں نے اسے بہت متاثر کیا۔ اس کا سر ندامت سے چند لمحوں بعد اس نے سر جھکائے تخلیے کا اشارہ کیا اور دوسرے ہی لمحے حاضرین ایک دوسرے کو دھکیلتے ہال سے طرح بھاگے جیسے ان کے تعاقب میں کوئی شیر آ رہا ہو۔

ہال خالی ہو گیا تو میراں شاہ نے سر اٹھا کر خانزادہ کی طرف دیکھا۔

"بیٹھو خانزادہ! تم کب آئیں؟"

"شہزادے! تم پہلے ہوش میں آ لو۔ پھر بات کرنا۔"

خانزادہ مسند کے کونے پر بیٹھ گئی۔ میراں شاہ نے بھی تکیوں سے ٹیک لگا لی۔

"ہم ہوش میں ہیں۔ ہم تمہیں پہچان رہے ہیں۔ کیا تم خانزادہ نہیں ہو؟" میراں شاہ نے اکھڑی اکھڑی آواز میں کی آنکھیں اب بھی مشکل ہی سے کھل رہی تھیں۔

"نہیں، تم ہوش میں نہیں ہو شہزادے۔" خانزادہ نرمی سے بولی:

"تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ تھوڑی دیر آرام کر لو تاکہ طبیعت بحال ہو جائے۔"

"نہیں خانزادہ۔ اب تم نہیں جا سکتیں۔ ہم بالکل اکیلے ہیں۔ یہاں ہمارا اپنا کوئی نہیں۔" میراں شاہ کی آواز میں آ گیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بڑے کرب میں مبتلا ہے۔

"یہ تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے میراں شاہ۔" خانزادہ کی آواز میں محبت کی چاشنی پیدا ہو گئی۔

"ہمیں کچھ پتہ نہیں۔ کچھ پتہ نہیں۔ تم ہمیں اکیلا نہ چھوڑو۔ ورنہ۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔"

"گھبراؤ نہیں۔ خانزادہ تمہیں چھوڑ کر نہیں جائے گی"۔ خانزادہ نے بڑے پیار سے کہا:

"لیکن تمہیں اپنی حالت بدلنا ہو گی۔ عیش و عشرت شہزادوں کا حق ہے لیکن یہ حرکتیں تو شاہانہ وقار کے

ہیں۔ اگر صاحبقراں کو علم ہو گیا تو جانتے ہو کیا ہو گا؟"

"صاحبقراں۔۔۔۔۔" میراں شاہ نے دہرایا:

"کیا ہو گا پھر؟"

"تم ولی عہدی سے معزول کر دیے جاؤ گے۔ ممکن ہے کہ امیر تم سے تبریز کی ولایت بھی چھین لیں"۔

"نہیں نہیں۔ ایسا نہ کہو خانزادہ"۔ میراں شاہ نے ادھر ادھر دیکھا:

"مجھے ان سے بچاؤ خانزادہ۔ یہ مجھے۔۔۔۔۔ یہ مجھے۔۔۔۔"

"میں جانتی ہوں میراں"۔

معاً خانزادہ کو اپنی کنیزوں کا خیال آیا۔ اس نے کہا:

"شہزادے! میرے ساتھ دو کنیزیں بھی آئی تھیں معلوم نہیں ان پر کیا گزری۔ کسی کو بلا کر پوچھو۔ اگر وہ

ہیں تو انہیں آرام سے رکھا جائے۔ وہ ساتھ نہ ہوتیں تو شاید ہم آج بھی تم سے نہ مل سکتے"۔

میراں شاہ نے تالی بجائی۔ ایک خواجہ سرا کسی طرف سے داخل ہو کر ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"شہزادی کے ساتھ دو کنیزیں آئی تھیں"۔ میراں شاہ نے کہا:

"انہیں عزت کے ساتھ حاضر کیا جائے"۔

خواجہ سرا الٹے پاؤں واپس چلا گیا۔

"تم تبریز کب آئیں خانزادہ؟ کہاں ٹھہری ہو؟" میراں شاہ نے پوچھا۔

"ہمیں آئے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا ہے"۔ خانزادہ نے بتایا:

"لیکن یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ ہمیں بتاؤ کہ تمہیں یہ ماحول اور دربار کا یہ رنگ ڈھنگ پسند ہے۔ اگر

ماحول میں رہنا چاہتے ہو تو ہمیں اجازت دو ہم اور گاؤں واپس چلے جائیں گے"۔

"ہم کیا کریں خانزادہ؟" میراں شاہ دکھ سے بولا:

"کوئی صلاح دینے والا نہیں۔ ہم کس سے مشورہ کریں۔۔۔۔۔ صاحبقراں نے جو امیر ہمارے ساتھ

وہ سب ہم سے کنارہ کر گئے ہیں۔ کوئی سلام کرنے کو بھی نہیں آتا۔ تاتاری فوج چھاؤنی میں رہتی ہے اس کا

سے ملنے نہیں آتا۔ پھر ہم کیا کرتے۔ دل بہلانے کے لیے کوئی صورت تو نکالنا تھی۔ امیر نے جو ندیم بھیجے ہیں

دہم پیالہ ہیں"۔

"شہزادے! کبھی تم نے دربار لگایا؟"

"دربار کی کیا ضرورت ہے خانزادہ"۔ میراں شاہ بولا:

"تبریز میں نہ تو کوئی فتنہ ہے نہ فریادی۔ پھر دربار کس لیے لگایا جائے۔ سب آرام سے زندگی گزار رہے

۔۔۔"

"مگر حکمرانی کا یہ طریقہ تو نہیں کہ حاکم دنیا و مافیہا سے غافل ہو کر چنگ و رباب میں گم ہو جائے"۔ خانزادہ ترش

لہجے میں بولی:

"اگر تم نے کبھی کسی امیر یا فوجی سردار کو بلا کر پوچھا ہوتا کہ اس نے دربار میں آ کر تمہیں سلام کرنا کیوں چھوڑ دیا

ہیں یہاں کے حالات معلوم ہوتے۔ تمہارے گرد خوشامدیوں نے گھیرا ڈال رکھا ہے۔ ہمیں پورے محل میں ایک

ری مرد یا عورت نظر نہیں آئی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

"ہمیں کچھ پتہ نہیں"۔ میراں شاہ نے بچوں جیسی معصومیت سے جواب دیا۔

"میراں شاہ یہ ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ تبریز میں کیا ہو رہا ہے؟" خانزادہ بڑے وقار سے بولی:

"تمہاری آنکھیں رنگ و نور کی چمک سے خیرہ کر دی گئی ہیں اور کانوں میں حرف طربیہ نغمے ہی ٹھونسے جاتے ہیں۔

دن نے تمہیں گورنر کے بجائے تبریز کا سلطان ابن سلطان مشہور کر رکھا ہے۔ تم اس سونے کے پنجرے میں

تمہارے امیر و وزیر تمہارے نام پر حکومت کر رہے ہیں۔ تاتاری امیروں نے اس لیے گوشہ نشینی اختیار

ہے کہ وہ تمہارا لحاظ کرتے ہیں۔ تم امیر تیمور کے بیٹے ہو۔ وہ امیر تیمور کے بیٹے کا ہر حکم بے چون و چرا مانتے

نہ تم کو مشورہ دے سکتے ہیں اور نہ تمہارے کاموں میں دخل دینے کی ان میں ہمت ہے۔ یہی حال یہاں

فوج کا ہے۔ اسے بھی عیش و عشرت کا چسکا پڑ گیا ہے اور ان کی جنگی صلاحیتیں روز بروز زنگ آلود ہوتی

ہیں"۔

"مگر ہم کیا کریں۔ تم بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

میراں شاہ ان حالات کو سن کر کچھ پریشان سا ہو گیا۔ اسی وقت خواجہ سرا ان کنیزوں کو لے کر داخل ہوا جو

کے ساتھ آئی تھیں۔

خواجہ سرا نے اندر آتے ہی کہا:

"تعظیم پیش کرو۔ تم سلطان ابن سلطان شاہ تبریز کے حضور میں ہو"۔

کنیزوں نے اپنے سلطان کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ خواجہ سرا کی آواز سنتے ہی رکوع کی حالت میں جھک گئیں اور

سلام پیش کیا۔

"ہماری طرف دیکھو"۔ خانزادہ نے مسکرا کر کہا۔

کنیزوں نے سر اٹھائے اور ان کی نظریں خانزادہ پہ جم گئیں۔ خانزادہ سلطان کے ساتھ بیٹھی بڑی بے تکلف مسکرا رہی تھی۔

میراں شاہ نے خواجہ سرا کو مخاطب کیا:

"گلفام! شہزادی خانزادہ کے لیے قصرِ زفاف فوراً خالی کرا کے آراستہ کیا جائے اور وزیرِ سلطنت کو ذرا [illegible] کیا جائے"۔

گلفام سلام کر کے فوراً چلا گیا۔

خانزادہ ابھی تک حیرت میں ڈوبی ہوئی کنیزوں کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا:

"تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"آپ تکلیف کا کہہ رہی ہیں خانم . . . . . نہیں شہزادی عالیہ!" کنیز نے رک کر اصلاح کی، پھر بولی:

"ان بدبخت خواجہ سراؤں نے مار مار کر ہمارا بھرکس نکال دیا ہے"۔

خانزادہ ہنسنے لگی۔ اس نے پوچھا:

"اچھا یہ بتاؤ۔ تم ہمارے ساتھ رہنا پسند کرو گی یا وزیرِ سلطنت کے گھر واپس جاؤ گی؟"

"شہزادی عالیہ! اگر آپ ہمیں اپنی خدمت کا موقع عنایت کریں تو یہ ہماری خوش نصیبی ہوگی"۔ ایک فوراً بولی۔

"کیا یہ ہمارے وزیرِ سلطنت کی کنیزیں ہیں؟" میراں شاہ نے دخل دیا۔

"ہاں شہزادے! ہم ابھی تک انہی کی عطا کردہ حویلی میں مقیم ہیں"۔ خانزادہ نے بتایا۔

"اب یہ دونوں کنیزیں ہماری طرف سے شہزادے کی خدمت پہ مامور کی جاتی ہیں، بشرطیکہ شہزادے پسند فرمائیں"۔

"ضرور ضرور"۔ میراں شاہ نے اطمینان کا سانس لیا:

"ہم انہیں محل کی تمام کنیزوں کی سرداری عطا کرتے ہیں۔ محل کے تمام اختیارات انہی کے سپرد کیے جا[illegible]"

کنیزوں نے اس اعزاز پر فوراً جھک کر مجرا پیش کیا۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھیں۔ میراں شاہ [illegible] کو باہر بھیج دیا اور پھر دیر تک خانزادہ سے گفتگو کرتا رہا۔ کچھ شکوے کچھ شکایتیں اور مستقبل کے منصو[illegible] مطبخ کے خواجہ سرا داروغہ نے اطلاع دی کہ کھانا لگا دیا گیا ہے۔ میراں شاہ اور خانزادہ اٹھ کر کھانے کے کم[illegible]

گئے۔

خانزادہ کی دونوں کنیزوں نے باہر جاتے ہی عہدے اور تقرر کا اعلان کر دیا تھا اور اب وہ کھانے کے انتظام [illegible]ہی پیش پیش نظر آ رہی تھیں۔

آج شب کھانے کے کمرے کا رنگ ہی بدل گیا تھا۔ روز تو یہ ہوتا تھا کہ میراں شاہ کے اہالی موالی اور خوشامد[illegible]ے اس کے ساتھ کھانے میں شریک ہوتے تھے لیکن اس وقت صرف میراں شاہ اور خانزادہ کھانے پہ [illegible]تھے۔ نہ لطیفوں کی پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں نہ حافظ شیرازی کے شعروں کا گلا گھونٹا جا رہا تھا۔ میراں شاہ اور [illegible]ہ کھانے کے دوران بڑی سنجیدگی سے گفتگو کرتے رہے۔

کھانے کے بعد وزیرِ سلطنت کو پیش کیا گیا۔ وہ بہت دیر سے باہر بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ وزیرِ سلطنت اس [illegible]رقت طلبی سے کچھ پریشان تھا۔ اگر اس نے پیغام پہنچانے والے سے پوچھا ہوتا تو اسے بہت کچھ معلوم ہو جاتا۔ [illegible]وزیرِ سلطنت اپنی شان میں تھا۔ وہ محل کے ایک غلام پہ یہ کیوں ظاہر ہونے دیتا کہ وہ پریشان ہے . . . [illegible]لام کا سوال تو اس کا تعلق قصرِ سلطانی سے تھا اور قصر کا ادنیٰ سے ادنیٰ غلام اپنے آپ کو وزیرِ سلطنت سے کمتر [illegible]ماتھا۔

جب وزیرِ سلطنت میراں شاہ کے سامنے حاضر ہوا تو اس کی آنکھیں حیرت سے ابل پڑیں۔ میراں شاہ شاہی چھپر[illegible]ہ ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور خانزادہ اس کی پائنتی بیٹھی بڑی بے تکلفی سے گفتگو کر رہی تھی۔ اسے سب [illegible]یادہ حیرت اس بات پر تھی کہ خانزادہ نے اس سے میراں شاہ کی سینکڑوں برائیاں کی تھیں اور اسے یقین دلایا [illegible]ہ وہ میراں شاہ کی حرکتوں سے بد دل ہو کر اور گنج واپس جا رہی ہے مگر وہی خانزادہ اس وقت کتنی لگاوٹ اور [illegible]لاسے میراں شاہ سے باتیں کر رہی تھی۔ وزیرِ سلطنت ان دونوں کو یکجا دیکھ کر ایسا گھبرایا کہ تعظیم کے آداب [illegible]بول گیا۔

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم نے شہزادی کی مہمانی کے فرائض انجام دیے ہیں"۔ میراں شاہ نے خود ہی اسے [illegible]ب کیا:

"اب شہزادی ہمارے ساتھ رہیں گی۔ ہم نے قصرِ زفاف کو آراستہ کرنے کا حکم دیا ہے"۔

"سلطانِ معظم کا حکم سر آنکھوں پر"۔

"سلطانِ معظم نہیں، والیِ تبریز"۔ خانزادہ نے غصے سے وزیرِ سلطنت کو ٹوکا:

"آج سے شہزادے میراں شاہ کو والیِ تبریز یا حاکمِ ولایتِ تبریز سے مخاطب کیا جائے۔ صاحبقراں امیر تیمور [illegible]لا نے شاہ یا سلطان کا لقب اب تک اپنے مبارک نام کے ساتھ نہیں لگایا۔ ولایت کے حاکم کو سلطان کہنا

صاحبقران کے وقار و جلال کی توہین ہے۔ منادی کرادی جائے کہ جو شخص والیِ تبریز کے نام کے ساتھ "سلطان" کا استعمال کرے گا اس کی زبان تراش دی جائے گی۔"

وزیرِ سلطنت تھرا اٹھا۔ وہ خانزادہ کی خاندانی عظمت کا تو قائل تھا لیکن اسے یہ علم نہ تھا کہ خانزادہ اس قد دبدبے اور جلال والی شہزادی ہے۔ پھر اس نے انہیں ایک ساتھ بیٹھے دیکھ کر یہ بھی اندازہ لگایا تھا کہ خانز کی بددلی اور ناامیدی اب امید میں بدل چکی ہے اور کوئی نہ کوئی نئی بات ہونے والی ہے۔

"حکم کی تعمیل ہوگی شہزادی عالیہ"۔ وزیرِ سلطنت نے انکساری اور عاجزی سے سر جھکایا۔

"ایک اور حکم پر بھی عمل کیا جائے"۔ شہزادی اسی وقار سے بولی:

"کل شہزادے میران شاہ ابنِ صاحبقران امیر تیمور گورگان دربار میں جلوس فرمائیں گے۔ یہ دربارِ خاص تمام عمائدینِ سلطنت کو حاضری کا حکم ہے۔ شہزادے عالی مقام کے ان تیموری امیروں کو خصوصیت سے دربار میں کیا جائے جو صاحبقران کے حکم سے شہزادے بہادر کے ساتھ آئے تھے۔ تاتاری فوج کے بڑے بڑے سردارو بھی دربار میں حاضری کا حکم دیا جائے"۔

"تعمیل ہوگی شہزادی عالیہ"۔ وزیرِ سلطنت نے لرزتے ہوئے کہا۔ وہ سمجھ گیا کہ عنانِ حکومت میران شا ہاتھ سے نکل کر اس مہمان شہزادی کے ہاتھ میں آ گئی ہے۔

"ایک اور بات ہے وزیرِ سلطنت"۔ خانزادہ نے لہجہ بدل کر نرمی سے کہا۔

"ارشاد فرمایئے شہزادی عالیہ"۔

"ہم آج رات آپ کی دی ہوئی حویلی میں ہی قیام کریں گے۔ کل ہم اپنے نئے محل میں منتقل ہوں گے"۔

وزیرِ سلطنت نے تو اس پہ ذرا بھی حیرت کا اظہار نہ کیا لیکن میران شاہ چپ نہ رہ سکا۔ اس نے کہا:

"خانزادہ، تمہارا محل آراستہ ہو چکا ہوگا۔ کہیں اور جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"نہیں شہزادے۔ تمہاری مہمان نوازی کل سے شروع ہوگی"۔ خانزادہ نے مسکرا کر کہا۔ میران شاہ کو ا کی ہمت نہ ہوئی اور وہ خانزادہ کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

○

تبریز میں دربارِ تیموری آراستہ کیا گیا، گو کہ اس میں صاحبقرانِ تیمور کے دربار جیسی شان و شوکت او

کوہ نہ تھا لیکن میران شاہ ولی عہدِ سلطنت تھا۔ مرحوم شہزادے جہانگیر کی طرح اسے بھی طبل و علم رکھنے اور دربار لگانے کی اجازت تھی۔

صبح ہوتے ہی طبل پر چوٹ پڑی اور تبریز کے قلعے پر تیموری علم لہرا دیے گئے۔ بڑا جھنڈا دربار ہال کے باہر نصب کیا گیا۔ پانچ سال سے چھاؤنی میں پڑا ہوا دس ہزار کا تاتاری لشکر محض روٹیاں توڑ رہا تھا۔ فوجی سرداروں کو رات ہی احکامات پہنچ چکے تھے۔ وہ تمام رات سلامی کی تیاریاں کرتے رہے تھے۔ صبح ہوتے ہی تاتاری گھڑسوار لشکر گاہ سے قطار اندر قطار محلِ شاہی کے سامنے جمع ہونا شروع ہو گئے۔ امرا اور وزرا اپنے روایتی لباس میں دربار پہنچ گئے۔

میران شاہ نے تبریز آنے کے بعد صرف ایک بار دربار لگایا تھا جس میں عہدے داروں کی نشستیں مخصوص کی گئی تھیں۔ اب ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ وزرا اور امرا اپنی نشستیں تک بھول چکے تھے۔ انہوں نے ایکدوسرے سے پوچھ پوچھ کر اپنی نشستوں کا تعین کیا۔ چوبدار، پہرے دار اور محافظ اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو گئے اور تاتاری فوجی فضاؤں میں بکھر گئے۔

پہلے کوتوالِ شہر ایک ہوا کرتا تھا لیکن وزیرِ سلطنت نے اپنی آسانی کے لیے یا پھر اپنے حواریوں کو عہدے دینے کے لیے کئی کوتوال مقرر کر دیے تھے۔ کوتوال کا پہرہ دربار کے صدر دروازے پر ہوتا تھا۔ تمام کوتوال دربار کے صدر دروازے پر آ گئے۔

تبریز والوں کے لیے یہ نئی بات تھی۔ جب تاتاری سوار بازاروں سے گزرے تو انہوں نے ان سواروں کو حیرت سے دیکھا۔ انہیں خیال ہوا کہ شاید کہیں بغاوت ہوئی ہے اور یہ لشکر باغیوں کی سرکوبی کے لیے تیار ہو رہا ہے عوام تماشہ دیکھنے کے لیے ان سواروں کے ساتھ ہو لیے لیکن انہیں دربار سے دور ہی روک دیا گیا کہ حاکمِ ولایت شہزادہ میران شاہ دربارِ خاص میں جلوس فرما رہے ہیں۔ اس لیے عوام کو وہاں جانے کی اجازت نہیں۔ عوام کے لیے حاکمِ ولایت اور شہزادہ میران شاہ، یہ دونوں ہی لقب اور نام اجنبی تھے۔ وہ تو تبریز کے سلطان ابنِ سلطان یا سلطانِ معظم کو جانتے تھے۔

کچھ دن چڑھے دربار میں میران شاہ کی آمد کا اعلان ہوا۔ تمام پرانے امیر دربار میں حاضر تھے اور اس اچانک تبدیلی کو تعجب کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر چوبداروں اور نقیبوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ چوبدار شاہی محل کی راہداریوں میں کھڑے "خبردار۔ ہوشیار" کی آوازیں لگا رہے تھے اور شاہی نقیب شہزادہ میران شاہ ولی عہدِ سلطنت صاحبقران امیر تیمور گورگان کا نعرہ بلند کر رہا تھا۔ حالانکہ امیر تیمور نے اس وقت تک میران شاہ کی باقاعدہ ولی عہدی کا اعلان نہیں کیا تھا۔

میراں شاہ پورے تیموری دبدبے کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا راہداریوں سے گزر رہا تھا۔ سب سے آگے نقیب، اس کے پیچھے شاہی علمبردار، پھر میراں شاہ تھا۔ اس کے دائیں بائیں مسلح خواجہ سرا اور میراں شاہ کے محافظ دستوں کے چیدہ چیدہ حبشی غلام تلواریں سر سے بلند کیے چل رہے تھے۔ راہداریوں میں کنیزیں کھڑی راستے میں گل پاشی کر رہی تھیں۔

میراں شاہ واقعی آج تیموری شہزادہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے وہ درباری جو چوبیس گھنٹے اسے گھیرے رہتے تھے، ان میں سے کوئی بھی دربار میں موجود نہ تھا۔

دربار ہال میں سب سے پہلے نقیب پھر علمبردار داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے میراں شاہ پورے جاہ و جلال کے ساتھ نپے تلے قدم اٹھاتا داخل ہوا۔ درباریوں کی گردنیں پہلے ہی جھکی ہوئی تھیں۔ ان میں کچھ اور خم پیدا ہو گیا۔ شمال کی طرف تختِ شاہی پر زرنگار مسند بچھی تھی۔ تخت کے پایوں پر گنگا جمنی کام تھا۔ تین طرف باریک پردے تھے جن میں جواہر ریزے ٹکے ہوئے تھے۔

میراں شاہ بڑی بے نیازی سے چلتا ہوا تخت کے پاس پہنچا۔ تخت پر جانے کے لیے چاندی کی تین سیڑھیاں طے کیں اور مسندِ شاہی پر پورے طمطراق سے بیٹھ گیا۔ شاہی علم اس کے تخت کے سامنے استادہ کیا گیا جس کے لیے چاندی کا ایک ٹھوس چوکور چبوترا پہلے سے موجود تھا۔ اس کے درمیان میں ایک سوراخ تھا جس میں علم کا چاندی کا ڈنڈا پھنسا دیا گیا۔ وزیرِ سلطنت تخت سے دس قدم دور دائیں جانب کھڑا تھا۔ وہ نظریں نیچی کیے ہوئے میراں شاہ کے سامنے پہنچا اور سرگوشیوں میں کچھ کہا۔ جواب میں میراں شاہ نے صرف سر کو اثبات میں ہلایا۔

"نذریں گزاری جائیں۔" وزیرِ سلطنت نے دو قدم پیچھے ہٹ کر کہا۔

سب سے پہلے وزیرِ سلطنت کو نذر پیش کرنی تھی۔ اس نے دور کھڑے ہوئے اپنے غلام کو اشارہ کیا۔ غلام سونے کی صندوقچی، جس پر زربفت کا کپڑا پڑا ہوا تھا، لیے ہوئے وزیر کے پاس آیا۔ وزیر نے صندوقچی اس کے ہاتھ سے لے لی۔ کھول کر اندر سے کوئی چیز نکالی اور اسے ریشمی رومال میں لپیٹ کر صندوقچی پر رکھا۔ پھر وہ صندوقچی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے تخت کے قریب پہنچا۔

میراں شاہ نے دایاں ہاتھ اٹھا کر نذر قبول کی۔ وزیرِ سلطنت نے صندوقچی تختِ شاہی پر رکھ دی۔ درباریوں کا تجسس بڑھا۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ رومال میں لپٹی ہوئی کیا چیز نذر کی گئی ہے۔ میراں شاہ نے بڑی بے پروائی سے نذر قبول تو کر لی تھی لیکن اس کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ اس چھوٹے سے رومال میں وہ کیا عجیب چیز ہے جسے وزیرِ سلطنت نے نذرانے کے طور پر پیش کیا ہے۔

وزیرِ سلطنت چونکہ سب سے بڑا عہدے دار تھا اس لیے سب کو توقع تھی کہ اس کا نذرانہ سب سے زیادہ بیش قیمت

[...]یں رومال کا راز نہ کھل رہا تھا۔ میراں شاہ کا خاص ملازم پشت پر کھڑا انتظار کر رہا تھا کہ اس کا آقا نذر اٹھانے کا [...]ہے تو وہ بڑھ کر نذرانہ اٹھا کے دوسرے غلاموں کے حوالے کر دے۔ دوسری طرف درباری پس و پیش میں تھے کیونکہ [...]ے کے مطابق جب تک پہلا نذرانہ تختِ شاہی سے نہ اٹھایا جائے دوسرا نذرانہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔

آخر میراں شاہ نے خود ہی یہ مشکل آسان کر دی۔ اس نے بارعب لہجے میں کہا:

"آیندہ سے ہر نذرانہ کھلا ہوا پیش ہونا چاہیے۔ وزیرِ سلطنت کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنا نذرانہ درباریوں [...] دکھائیں۔"

وزیرِ سلطنت پر دربار کا کچھ ایسا رعب طاری ہوا تھا کہ وہ اپنے ہوش ٹھکانے نہ رکھ سکا۔ تیموری دربار کا اسے [...]تجربہ نہ تھا۔ اس نے دربار کو آراستہ کرنے کے لیے میراں شاہ کے پرانے تیموری امیروں کی خوشامدیں کی تھیں اور [...]دربار کی آرائش و زیبائش کے لیے پوری آزادی تھی۔ دربار اگرچہ اس کی موجودگی ہی میں آراستہ ہوا تھا لیکن میراں شاہ [...]ماہانہ آمد اور نئے پرانے امیروں کی موجودگی نے اس کے ہاتھ پیر پھلا دیے تھے۔

میراں شاہ کے حکم سے اس کی جان میں جان آئی۔ وہ بڑھ کر تخت کے پاس پہنچا، لپٹا ہوا رومال اٹھایا۔۔۔ اور [...]ال الگ کر کے اس میں سے چمکدار سی چیز نکال کر ہتھیلی پر رکھی اور ہاتھ سر سے اونچا کر دیا۔ یہ ایک غیر معمولی جسامت [...]ہیرا تھا جو روشن چراغ کی طرح دمک رہا تھا۔ اس سے پھوٹنے والی روشنی سے درباریوں کی آنکھیں خیرہ ہوئی جا رہی تھیں [...]اری حیرت کے ساتھ ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں ہیرے پر تبصرہ کرنے لگے۔

"واقعی لاجواب ہیرا ہے۔"

"وزیرِ سلطنت نے شایانِ شان ہیرا پیش کیا ہے۔"

"آخر وزیرِ سلطنت ہے۔ اس نے وزارت کی آن رکھ لی۔"

ہیرے کی رنگت ہر لحظہ تبدیل ہو رہی تھی۔ ابھی سرخ، ابھی زرد اور ابھی نیلا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے قوسِ [...]ح اس ہیرے میں سمٹ آئی ہے اور اپنے مختلف رنگ دکھا رہی ہے۔

میراں شاہ کی حیران نظریں ہیرے پر جمی تھیں لیکن ذہن کہیں اور الجھا ہوا تھا۔ درباری چہ میگوئیوں میں معروف [...]یم اور ہیرے کی قیمت پر قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔

یکایک میراں شاہ کی بھاری آواز دربار میں گونجی:

"وزیرِ سلطنت کا نذرانہ بے شک نایاب اور بے نظیر ہے لیکن یہ نذرانہ اس وقت تک قبول نہیں کیا جا سکتا [...]جب تک وزیرِ سلطنت یہ وضاحت نہیں کرتے کہ انہیں یہ ہیرا کہاں سے دستیاب ہوا ہے۔ وزیرِ سلطنت کے کردار [...]ت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا لیکن انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس قسم اور قبیلے کے تمام ہیرے یا تو تیموری خزانے میں

موجود ہیں یا پھر تیموری شہزادوں اور شہزادیوں کی ملکیت ہیں۔ وزیرِ سلطنت کو صفائی کا موقع دیا جاتا ہے۔"

وزیرِ سلطنت کو میراں شاہ کے اس حکم سے کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ وہ بے خوفی سے کہہ سکتا تھا کہ اسے یہ ہیرا خانزادہ نے دیا ہے۔ صفائی پیش کرنے کے لیے اس کا یہ اظہار ہی کافی تھا لیکن اصل فکر اسے یہ لاحق ہوئی کہ خانزادہ کا نام سرِ دربار کیسے زبان پہ لائے اور اس نے خانزادہ کا نام لے بھی لیا تو وہ اس کا کیا جواز پیش کرے گا۔ و خانزادہ سے اپنا کیا تعلق بتائے گا اور ان باتوں کو کیسے بیان کرے گا جو خانزادہ نے میراں شاہ کے بارے میں کہی تھیں۔

"جواب دیا جائے۔" میراں شاہ کی کرخت آواز گونجی۔

وزیرِ سلطنت سہم گیا:

"سلطانِ معظم....." پھر رک کر بولا:

"ولی عہدِ معظم! یہ نایاب، ہیرا واقعی شاہی خزانے کی زینت ہونا چاہیے۔ میرے پاس بھی یہ ہیرا ایک شاہی تو[سط] سے آیا ہے لیکن میں خاندانِ تیموریہ کی اس ہستی کا نام دربار میں نہیں لے سکتا کیونکہ ایسا کرنے سے سلطنتِ تیموریہ کی توہین کا امکان ہے۔"

"ہوں۔" میراں شاہ کا غصہ شاید اس وجہ سے کچھ کم ہوا کہ وزیرِ سلطنت نے "شاہی توسط" کا حوالہ دیا تھا۔ پھر اس نے اپنے اطمینان کے لیے پوچھا:

"اس کا مطلب ہے کہ خاندانِ تیموریہ کے کسی فرد نے تمہیں یہ ہیرا انعام یا تحفے کے طور پر دیا ہے۔"

"عالی جاہ شہزادہ عالی مقام کا ارشاد بالکل درست ہے۔" وزیرِ سلطنت نے فوراً تائید کی۔

میراں شاہ کی تسلی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے حکم پر مزید زور نہیں دیا اور اپنے خاص غلام کو اشارہ کیا کہ نذرانہ وصول کیا جائے۔ وزیرِ سلطنت نے ہیرا اس کے حوالے کر دیا۔

دوسرا نذرانہ سالارِ لشکر کی طرف سے گزارا گیا۔ پھر باری باری تمام عمائدینِ سلطنت اور روساء نے نذرانے پیش کیے۔ نذرانے کی رسم پوری ہوئی تو وزیرِ سلطنت نے بڑھ کر نہایت مؤدب انداز میں کہا:

"تاتاری لشکر صف آرا ہے۔ شہزادے بہادر معائنے کی زحمت فرمائیے۔"

"لشکر کا معائنہ؟" میراں شاہ کچھ سوچنے لگا پھر بولا:

"لشکر کے معائنے کو ہم اکیلے نہیں جائیں گے۔ پہلے قاضیِ شہر کو پیش کیا جائے۔"

"قاضیِ شہر؟" وزیرِ سلطنت نے حیرت سے میراں شاہ کو دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ آج کونسا مقدمہ پیش ہونا ہے جس کی اسے خبر نہیں۔ قاضیِ شہر مقدمات کا فیصلہ کرتا تھا مگر یہ ذمہ داری وزیرِ سلطنت نے اپنے ذمے لے رکھی تھی اور

یہ تمام مقدمات اس کے سامنے پیش ہوتے تھے اور وہ اپنی صوابدید پر جو چاہتا تھا فیصلہ کر دیا کرتا تھا۔

"حکم کی تعمیل ہو۔" میراں شاہ نے گرج کر کہا:

"قاضیِ شہر کو فوراً طلب کیا جائے۔"

دربار پہ سناٹا چھایا ہوا تھا اور درباری ایک دوسرے کا منہ حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ لشکر کے معائنے [سے ا]نکار۔ قاضی کا طلب کیا جانا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اور میراں شاہ کیا کرنا چاہتا ہے؟ [...] بعد قاضیِ شہر تشریف لائے۔ انہوں نے تعظیم پیش کی۔ میراں شاہ نے انہیں تخت پہ آنے کا اشارہ کیا۔ قاضی کے پیر کانپنے لگے۔ انہوں نے پھٹی پھٹی نظروں سے میراں شاہ کو دیکھا۔

"گھبرائیے نہیں۔ ہمارے پاس تشریف لائیے۔" میراں شاہ نے نرمی سے کہا۔

"معظم..... شہزادے..... میں..... میں تختِ شاہی!" قاضی کے حلق میں آواز اٹکنے لگی۔

"ہاں تخت پر..... ہماری مسند پر....."

"شاہی مسند؟" قاضی صاحب بوکھلا گئے۔

قاضی نے جوتے سیڑھیوں کے نیچے اتارے اور لرزتے پیروں سے تخت پر چڑھے اور شاہی مسند کے قریب [جا ک]ر رک گئے۔

"تشریف رکھیے ہمارے ساتھ۔" میراں شاہ نے انہیں شاہی مسند پہ ایک طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

قاضیِ شہر ڈرتے ڈرتے مسند کے کونے پر بیٹھ گئے۔ دل تھا کہ سینے سے نکلا پڑتا تھا۔ تمام بدن پر رعشہ [طار]ی تھا۔ دعائیں مانگ رہے تھے۔ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کر رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ پتہ نہیں [...] کیا غلطی سرزد ہوئی ہے کہ انہیں دربار میں طلب کیا گیا۔ کیا سزا ملے گی انہیں؟ مگر..... مگر یہ التفات، یہ شاہی مسند! اے اللہ تو ہی عالم الغیب ہے۔ قاضی کے دل میں ہزاروں خیال آئے اور گزر گئے۔ وہ [و]ہم کی کشمکش میں مبتلا تھے۔

اس وقت دربار میں امیر قلات خان آیا اور جھک کر تعظیم پیش کی:

"کیا سواری آ گئی ہے؟" میراں شاہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"جی ہاں شہزادے بہادر!" قلات خان بولا:

"حکم کی پوری پوری تعمیل کی گئی ہے۔"

میراں شاہ نے دربار پہ طائرانہ نظر ڈالی۔ بولا:

"دربار کے تمام معززین ہمارے ساتھ دلہن کی پیشوائی کے لیے چلیں۔"

میراں شاہ مسند سے اترا اور باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھا۔ تمام درباری اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے لیکن خاموش بت بنے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان پر سحر کر دیا گیا ہے اور وہ کسی معمول کی طرح حرکت کر رہے تھے۔ سب کے ذہن لفظ "دلہن" میں الجھے ہوئے تھے۔ قاضیٔ شہر کی موجودگی اور لفظ دلہن کی آمد میں کوئی تعلق تو سمجھ میں آ رہا تھا لیکن دلہن کون ہے اور اگر دلہن ہے تو پھر قاضیٔ شہر کی کیا ضرورت ہے۔ اسی ادھیڑ بن میں وہ محل کے دروازے پر پہنچ گئے۔

صدر دروازے کے سامنے ایک آراستہ پیراستہ بند گاڑی کھڑی تھی۔ گاڑی کے چاروں طرف تاتاری اپنے روایتی انداز میں چوکس، تیر و ترکش پشت پر ڈالے تلواریں زین سے لٹکائے محافظ کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔

میراں شاہ کو آتے دیکھ کر سب گھوڑوں سے اتر پڑے۔ امیر قلات خان میراں شاہ کے ساتھ چلتا ہوا میراں سواریوں کے پاس جا کر رکا۔

امیر قلات خان چند قدم آگے بڑھا اور گاڑی پر پڑے ہوئے زرنگار پردوں کی طرف جھک کر بولا:
"شہزادہ میراں شاہ بن صاحبقراں امیر تیمور گورگان استقبال کے منتظر ہیں۔ شہزادی عالیہ سواری سے باہر قدم رنجہ فرمائیں۔"

پردوں میں حرکت ہوئی۔ چھما چھم کرتی چار کنیزیں گاڑی سے اتریں۔ انہوں نے میراں شاہ کو تعظیم پیش کی۔ دوسرے ہی لمحے گاڑی کے پردے الٹ دیے گئے اور خانزادہ پورے عروسی جوڑے اور بیش قیمت زیورات سے لدی پھندی دو کنیزوں کے سہارے گاڑی سے اتری۔ یہ دونوں کنیزیں وہی تھیں جو وزیرِ سلطنت نے خانزادہ کی خدمت پر لگائی تھیں اور پھر خانزادہ نے انہیں میراں شاہ کی نگہداشت یا جاسوسی پر مقرر کیا تھا۔

خانزادہ اور میراں شاہ کے درمیان شادی کے تمام معاملات گزشتہ رات ہی طے پا گئے تھے۔ میراں شاہ نے دونوں کنیزوں اور اپنے غلام کو خانزادہ کے ساتھ کر دیا تھا۔

خانزادہ نے اپنی حویلی پہنچ کر امیر قلات خان کو بلوا لیا تھا۔ امیر قلات اور شاہی غلام نے باہر کے تمام انتظامات کیے اور کنیزوں نے حویلی کا انتظام سنبھال لیا تھا۔ رات بھر خانزادہ کی حویلی کے اندر اور باہر شادی کی تیاریاں ہوتی رہیں۔

خانزادہ کے لیے عروسی جوڑا اور زیورات محل سے منگوائے گئے تھے۔ دلہن کو دربار تک لے جانے کے لیے شاہی سواریوں کا بھی انتظام کر لیا گیا تھا لیکن تمام باتیں بڑی خاموشی اور رازداری سے کی گئی تھیں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی تھی۔

میراں شاہ نے خانزادہ کا استقبال کیا۔ امیروں اور وزیروں نے جھک کر سلامی دی۔ پھر دونوں جلوس کی صورت میں دربار میں داخل ہوئے۔ اس وقت محل کی کنیزوں اور خواجہ سراؤں کو خبر ہو چکی تھی سو ان کا پورا ہجوم دربار میں آ گیا۔ اس وقت چھوٹے بڑے کی تمیز مٹ گئی تھی اور ہر ایک ہنس بول رہا تھا۔ کنیزیں خانزادہ پر نثار ہوئی جا رہی تھیں اور خواجہ سرا دولہا دلہن کے گرد حلقہ بنا کر چل رہے تھے۔
جلوس تخت کے پاس جا کر ٹھہر گیا۔

میراں شاہ اور خانزادہ مسندِ شاہی پر بیٹھ گئے۔ قاضیٔ شہر نے اپنی نشست سنبھال لی۔ اب انہیں بھی حقیقت کا علم ہو گیا تھا۔ وہی کیا سب کو علم ہو گیا تھا کہ قاضی صاحب میراں شاہ اور خانزادہ کا عقد پڑھانے کے لیے بلوائے گئے ہیں۔ وزیرِ سلطنت ضرور کچھ پریشان تھا۔ وہ تمام رات دربارِ شاہی کے انعقاد کے لیے بھاگ دوڑ کرتا رہا۔ اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ اس کی حویلی میں ایک نیا گل کھلنے والا ہے اور خوارزم کی شہزادی کو دلہن بنایا جا رہا تھا۔

میراں شاہ کے اشارے پر قاضیٔ شہر نکاح کے لیے تیار ہوا۔ وزیرِ سلطنت نے میراں شاہ کی طرف سے وکالت کی اور خانزادہ کی طرف سے یہ فرض امیر قلات نے ادا کیا۔ اس طرح میراں شاہ بن تیمور اور خانزادہ بنت آق صوفی کا عقد ہو گیا۔

یہ دونوں کا دوسرا عقد تھا۔ میراں شاہ کی بھی دوسری شادی تھی۔ خانزادہ بیوہ تھی۔ اس کی پہلی شادی میراں شاہ کے بڑے بھائی شہزادہ جہانگیر سے ہوئی لیکن جہانگیر کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا تھا۔ خانزادہ کے جہانگیر سے دو لڑکے پیر محمد اور سلطان محمد تھے۔ یہ دونوں جوان ہو گئے تھے اور امیر تیمور کے ساتھ فتوحات میں اپنی بہادری کے جوہر دکھا رہے تھے۔

خانزادہ کی شروع ہی سے یہ کوشش تھی کہ کسی طرح اپنے بیٹے کو امیر تیمور کا جانشین بنائے مگر میراں شاہ راستہ کا سب سے بڑا روڑا تھا۔ خانزادہ اپنے بیٹوں کے لیے تو راستہ نہ صاف کر سکی لیکن میراں شاہ سے عقدِ ثانی کر کے اس نے پہلا مقام ضرور حاصل کر لیا تھا اور وہ ایک بار پھر ولی عہدِ سلطنت کی بیوی بن کر سامنے آئی۔

خانزادہ اور میراں شاہ کی شادی کی اطلاع امیر تیمور کو نہ دی جا سکی۔ وہ اس وقت بغداد کی طرف کوچ کر رہا تھا۔ سمرقند میں جب اس کی اطلاع پہنچی تو ملکہ سرائے خانم نے اطمینان کا سانس لیا۔ سرائے خانم، خانزادہ کی سوتیلی ساس تھی اور دونوں میں چشمک رہا کرتی تھی۔ جب تک خانزادہ سمرقند میں رہی، خوب خوب ہنگامے ہوئے۔ پھر خانزادہ اپنے میکے اورگنج چلی گئی۔ اس وقت بھی سرائے خانم نے اطمینان کا سانس لیا تھا لیکن اب وہ بالکل ہی مطمئن ہو گئی تھی۔

خانزادہ نے میراں شاہ کی بیوی بنتے ہی تبریز کے دربار کا رنگ بدلنا شروع کر دیا۔ وہ صاحبقراں کے دربار کو دیکھ چکی تھی۔ وہ خود بھی خوارزم کی شہزادی تھی اور اس نے اپنے چچا حسین صوفی کا دربار بھی دیکھا تھا۔ اس دربار میں وہی تیموری قوانین رائج کیے جو سمرقند میں برتے جاتے تھے۔

میراں شاہ روز دربار لگانے لگا اور باش قسم کے درباریوں کو وظیفہ دے کر گھر میں بٹھا دیا گیا۔ اس نے کسی کی نوکری چھینی نہ کسی کو برخاست کیا لیکن دربار سے سب کو دور ہی رکھا۔ وزیر سلطنت سے وہ مطمئن نہ تھی پھر بھی اسے اس کے عہدے پر برقرار رکھا گیا۔ وزیر سلطنت نے بھی خود کو حالات کے سانچے میں ڈھال لیا تاکہ خانزادہ کو شکایت کا موقع نہ ملے۔

خانزادہ نے امیر قلات خان کو امیر الامراء کا عہدہ دیا اور مشیر سلطنت کے فرائض اسے سونپے۔ ایک ہی ماہ میں تبریز کی کایا پلٹ ہو گئی۔ یہ انقلاب بڑی خاموشی سے آیا۔ خانزادہ نے کسی پر سختی نہیں کی۔ اب بھی شعراء حضرات دربار میں حاضری دیتے اور قصیدے پڑھتے۔ گاہے گاہے عیش و عشرت کی محفلیں بھی جمتیں جن میں ہمیشہ خانزادہ میراں شاہ کے پہلو میں بیٹھتی۔ اور مغنیوں، رقاصاؤں اور سازندوں کو انعام و اکرام سے نوازتی۔ دربار کے اوقات میں خانزادہ کے لیے تختِ شاہی کے پیچھے ایک دوسرا تخت بچھایا گیا۔ درمیان میں ایک ہی پردہ ڈالا گیا۔ میراں شاہ کا کام مسائل کو صرف سننا تھا۔ احکامات خانزادہ جاری کرتی تھی۔

مگر بُرا ہو فطری خباثت، تعصب اور اسلام دشمنی کا کہ اہل قلم اور مؤرخ جو مسلمانوں کو بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ انہوں نے میراں شاہ اور خانزادہ کے جھگڑے کو ایک بالکل ہی نئے روپ میں پیش کیا ہے وہ تو اس بات کا اقرار ہی نہیں کرتے کہ خانزادہ اور میراں شاہ کی شادی ہوئی تھی۔ ان بے خبر مؤرخوں نے لکھا ہے کہ اسی زمانے میں ایک یورپین جس کا نام "روٹے دے گونزالز دیو" ہے، میراں شاہ کی ولایت میں سلطانیہ گیا۔ سلطانیہ کو ہلاکو خان کے پڑپوتے سلطان خدابندہ نے آباد کیا تھا۔ یہ پہلا مغل سلطان تھا جس نے اسلام قبول کیا اور اس نے سلطانیہ کو دارالسلطنت بنایا تھا۔

گونزالز نے سلطانیہ سے واپس آ کر لوگوں سے بیان کیا کہ "میراں شاہ کے پاس ایک عورت گان زادہ رہتی تھی جو اسے چھوڑ کر چلی گئی۔"

ایسے غیر محتاط اور بے خبر راوی کو کیسے اہمیت دی جا سکتی ہے جو گانزادہ (خانزادہ) کا ذکر اس طرح کرتا ہے
[زا]دہ کوئی عام سی عورت تھی۔ حالانکہ خانزادہ ولی عہد شہزادے جہانگیر کی بیوہ تھی اور اس کو تقریباً وہی اختیارات
[حاصل] تھے جو امیر تیمور کی بڑی بیگم سرائے خانم کو حاصل تھے۔ ظفر نامہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ خانزادہ اور میراں
[شاہ کا] عقد ہوا تھا۔

خانزادہ نے ملکی انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لیے اور کئی سال تک بڑی خوبی سے حکومت کرتی رہی۔ ایک دن
[اس نے] میراں شاہ سے کہا:

"شہزادے بہادر، کبھی آپ نے ایک دانشور کے اس قول پر غور کیا ہے کہ جس فرد، قوم یا سلطنت پر جمود طاری
[ہو جا]ئے اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے؟"

میراں شاہ موٹے دماغ کا انسان تھا۔ خانزادہ کی بات اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آئی۔ بولا:

"خانزادہ! بعض اوقات تم فلسفیوں جیسی باتیں کرنے لگتی ہو۔ تم اپنی بات کی وضاحت کرو۔ ہماری سمجھ میں کچھ
[نہی]ں آیا۔ جہاں تک زوال کا سوال ہے تو ہر کمال کو زوال لازم ہے لیکن ہم ابھی دنیا کے مالک نہیں بنے۔ ابھی ہم کمال
[تک] نہیں پہنچے اس لیے زوال کا مسئلہ غیر ضروری ہے۔"

"شہزادے! نہ میں فلسفی ہوں اور [نہ] دانشور"۔ خانزادہ نے کہنا شروع کیا:

"میں اس قدر تعلیم یافتہ بھی نہیں ہوں کہ کوئی نئی بات کہوں۔ میں تو وہی باتیں کہتی ہوں جو میں نے بزرگوں سے
[سنی] یا آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ کیا تم نے صاحبقراں کی زبان سے کسی کا یہ قول نہیں سنا کہ حرکت میں برکت ہے
[جمود] نام موت ہے۔ امیر اس قول پر عمل کرتے ہیں۔ ان کی کامیابی کا راز بھی یہی ہے کہ وہ اپنے لشکر کو ہمیشہ حرکت میں
[رکھتے ہیں] اور نئی فتوحات کے لیے آگے ہی آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ اگر لشکر کو جنگ و جدل میں مصروف نہ رکھا جائے تو
[وہ سُ]ست و کاہل ہو جاتا ہے۔ امیر کا یہ بھی طریقہ ہے کہ امن کے زمانے میں بھی وہ لشکر کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتے اور
[شکار] کے بہانے نکل جاتے ہیں۔"

"سیر و شکار" میراں شاہ درمیان میں بولا:

"تم نے خوب یاد دلایا خانزادہ۔ ہمیں شکار کھیلے ایک زمانہ ہو گیا۔ کیوں نہ ہم کچھ دن شکار سے بھی
[دل بہلائی]ں۔"

"شہزادے نے میرے منہ کی بات چھین لی ہے۔" خانزادہ خوش ہو کر بولی:

"میں خود یہ تجویز پیش کرنے والی تھی۔ شکار سے ایک تو تفریح کا سامان مہیا ہو گا۔ دوسری طرف بیرکوں
[میں پڑ]ی فوج کی سستی اور کاہلی دور ہو جائے گی۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔ ہم شکار پر چلیں گے۔"

میراں شاہ نے فیصلہ کر دیا اور خانزادہ کی طویل فلسفیانہ اور عالمانہ تمہید کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ کسی طرح میراں شاہ کو محل کی رنگین فضا سے نکال کر تاتاریوں کی حقیقی زندگی کی طرف مائل کرے اور اس میں وہ کامیاب ہو گئی تھی۔

خانزادہ نے نہ تو وزیر سلطنت کو معزول کیا تھا اور نہ اس کے اختیارات میں کمی آنے دی تھی لیکن امیر قلات خان کے ابھر کر سامنے آ جانے سے وزیر سلطنت کی شخصیت دب کر رہ گئی تھی لیکن اس میں شکوہ شکایت کرنے کی ہمت نہ تھی۔ وہ شکایت کرتا تو کس سے۔ میراں شاہ تو برائے نام حکمران رہ گیا تھا۔ اصل طاقت تو خانزادہ کے ہاتھ میں اور خانزادہ کی مہربانیوں اور نوازشوں کا مرکز امیر الامراء قلات خان کی ذات تھی۔ خانزادہ نے قلات خان کو بلا کر شکار کا مژدہ سنایا اور انتظامات کی ذمہ داری اس کے سپرد کی۔

قلات خان ضعیف ہو چکا تھا۔ اس کے اعضاء میں اب پہلے جیسی طاقت اور پھرتی نہ رہی تھی۔ اس نے خانزادہ کے حکم پر سر جھکا دیا اور اپنے طور پر انتظامات شروع کر دیے لیکن ضعیفی جو بذات خود ایک مرض ہے وہ اس بار کو نہ اٹھا سکی اور قلات خان بیمار پڑ گیا۔

شکار کے سلسلے میں قلات خان کو خانزادہ کے پاس دن میں کئی کئی بار آنا پڑتا تھا۔ ایک دن قلات خان نہ پہنچا تو وہ پریشان ہو گئی۔ اس نے قلات خان کے گھر غلام بھیجا۔ غلام نے واپس آ کر قلات خان کی علالت کی خبر دی۔ اس بے وقت علالت نے خانزادہ کو اور پریشان کر دیا۔ شکار پر روانگی کا وقت مقرر ہو چکا تھا اور انتظامات اپنے آخری مراحل میں تھے۔ ایسے وقت یہ انتظام کسی اور کو سونپنا کچھ مناسب معلوم نہ ہوتا تھا۔ خانزادہ تمام دن اس مسئلے پر غور کرتی رہی اور پریشان ہوتی رہی۔

شام ہوئی تو اطلاع دی گئی کہ امیر الامراء قلات خان ڈیوڑھی پر حاضر ہیں۔ خانزادہ کی تمام فکر دور ہو گئی۔ اس نے فوراً قلات خان کو ملاقات کے لیے بلوا لیا۔

قلات خان نے سامنے پہنچ کر خانزادہ کو سلام کیا۔ خانزادہ کی نظریں قلات خان کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اسے فوراً محسوس ہو گیا کہ قلات خان کی حالت ٹھیک نہیں اور اسے محل تک پہنچنے میں بھی نامعلوم کتنی تکلیف ہو گی۔ خانزادہ نے اس کی بات سننے سے پہلے ہی کہا:

"خان! تمہیں اس حالت میں ہمارے پاس نہیں آنا چاہیے تھا۔ تم فوراً واپس چلے جاؤ۔ اور مکمل آرام کرو۔ ہم کوئی اور انتظام کر لیں گے۔"

"شہزادی عالیہ!" قلات خان نحیف آواز میں بولا:

"میں واقعی چلنے پھرنے سے معذور ہوں لیکن جو ذمہ داری آپ نے میرے سپرد کی تھی اسے ادھورا بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ گو کہ انتظامات مکمل نہ کر سکا لیکن میں ایک ایسے شخص کو اس خدمت پر مامور کرنے کی سفارش کر دوں گا جو میرا ثانی ہی نہیں بلکہ مجھ سے بھی زیادہ اچھا انتظام کر سکتا ہے۔"

خانزادہ کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے بڑی امید سے پوچھا:

"خان! کیا تبریز میں تم جیسا انتظام کرنے والا کوئی اور بھی موجود ہو سکتا ہے؟"

"جی شہزادی عالیہ۔ بلاقو خان مجھ سے بہتر کام کر سکتا ہے۔" قلات خان نے نقاہت سے جواب دیا:

"شکار کے سلسلے میں اب تک جو انتظام ہوا ہے اس میں وہ میرا شریک کار رہا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سب اسی کا کیا ہوا ہے۔ میں تو پہلے روز ہی سے بیمار ہو گیا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح شہزادی کے سلام کے لیے حاضری دیتا رہتا تھا۔"

"خان! تمہاری سفارش ہے تو ہم اس پر ضرور اعتماد کریں گے۔" خانزادہ نرمی سے بولی:

"بلاقو خان کہاں ہے؟ اسے پیش کیا جائے۔"

"وہ میرے ساتھ آیا ہے شہزادی عالیہ۔" قلات خان نے کہا:

"بلاقو خان میرا بیٹا ہے۔ آپ کا غلام ہے وہ۔"

"اوہ۔" خانزادہ مسکرائی:

"ہمیں سن کے بڑی خوشی ہوئی۔ تمہارا بیٹا تمہارے مشورے سے اس کام کو ضرور مکمل کر سکے گا۔ ہم بھی اس کا خیال رکھیں گے اور پوری مدد کریں گی اس کی۔"

قلات خان نے ایک غلام سے کہہ کر اپنے بیٹے کو اندر بلایا۔ بلاقو خان کا خانزادہ کے حضور میں آنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ وہ ڈرا ڈرا سا سر جھکائے اندر آیا اور حسب دستور خانزادہ کو سلام کیا۔

"اچھا تو تم ہو قلات خان کے بیٹے۔" خانزادہ نے محسوس کیا کہ بلاقو خان کچھ زیادہ ہی ڈر رہا ہے تو اس نے کہا:

"بلاقو خان! ہم سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں۔ اس کام کے سلسلے میں تمہیں ہمارے پاس دن میں کئی بار آنا پڑے گا۔ مطلق خوف نہ کھاؤ۔ سر اٹھا کر بات کرو ہم سے۔"

بلاقو خان ڈر ضرور رہا تھا لیکن اس کے کان خانزادہ کی باتوں پر لگے ہوئے تھے۔ جب خانزادہ نے سر اٹھا کر بات کرنے کا حکم دیا تو اس نے جھجکتے ہوئے سر اٹھایا اور خانزادہ سے آنکھیں چار کیں۔ بلاقو خان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی خانزادہ کو جیسے سکتہ ہو گیا۔ وہ بڑی حیرت سے بلاقو خان کو ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔

تغلات خان اپنی بیماری کی وجہ سے خانزادہ کی آنکھوں اور دل میں نہ جھانک سکا۔ ورنہ وہ کم از کم یہ تو اندازہ ضرور لگا لیتا کہ بلاقو خان کو دیکھ کر خانزادہ اپنے ماضی میں کھو گئی ہے۔ بلاقو خان پر اس قدر رعب طاری ہوا کہ وہ چند لمحوں سے زیادہ خانزادہ سے نظریں چار نہ کر سکا اور اس کا سر جھک گیا۔

آخر خانزادہ نے ایک طویل سانس لی۔ بولی:

"بلاقو خان! ہمیں امید ہے کہ تم اس ادھورے کام کو اپنی محنت اور فراست سے تکمیل تک پہنچاؤ گے مشورے کے لیے ہمارے محل کے دروازے تمہارے لیے ہر دم کھلے رہیں گے تم جس وقت چاہو آ سکتے ہو۔"

"شہزادی عالیہ کی خوشنودی کے لیے غلام اپنی جان لڑا دے گا۔" بلاقو خان نے بڑے ادب سے کہا: "خان بابا کی بیماری سے میں کچھ پریشان ضرور ہوں لیکن انشاء اللہ کام میں کوئی کوتاہی نہ ہوگی۔"

"کیا تمہیں امید ہے کہ ہم مقررہ دن پر شکار کے لیے روانہ ہو سکیں گے؟"

"انشاء اللہ شہزادی عالیہ۔"

"ایک بار پھر سوچ لو بلاقو خان۔ تم کہو تو روانگی ایک ہفتے کے لیے روک دی جائے۔"

"شہزادی عالیہ آپ بالکل فکر نہ کیجیے۔ انتظامات مقررہ دن سے پہلے ہی مکمل ہو جائیں گے۔"

"کیا تمہیں پوری امید ہے؟"

"میں دعویٰ نہیں کرتا لیکن مجھے یقین ہے کہ میں شہزادی عالیہ کا اعتماد اور خوشنودی حاصل کر لوں گا۔"

"ہم تمہاری خود اعتمادی سے خوش ہوئے۔"

پھر وہ تغلات خان سے مخاطب ہوئی:

"خان! تمہارے بیٹے میں ہم نے بہت کچھ دیکھا ہے۔ اس میں ترقی کی امنگ ہے اور یہ ترقی کرے گا بھی۔"

O

شکار کی روانگی کو تین چار دن باقی تھے۔ خانزادہ نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شہر کی سیر کا پروگرام بنایا۔ میران شاہ نے خود کو شاہی محل میں قید کر رکھا تھا۔ کئی کئی ہفتے بعد وہ محل سے نکلتا۔ اس زمانے میں حکمرانوں اور بادشاہوں میں یہ دستور تھا کہ وہ عوام کو "دیدار" کراتے تھے۔ اس سے دو طرفہ فائدہ تھا۔ جب حاکم محل کے جھروکے میں بیٹھ کر یا کوچہ و بازار میں جلوس کی شکل میں جا کر عوام کو دیدار سے نوازتا تو عوام کے دل میں اس کی عظمت بڑھ

دوسری طرف حاکمِ وقت کو بھی یہ خیال رہتا کہ وہ لشکر اور امراء کا ہی حاکم نہیں بلکہ عوام بھی اس سے کچھ توقعات [illegible]تے ہیں۔ خانزادہ نے اس خیال کے پیشِ نظر کہ عوام میں میران شاہ روشناس ہو جائے، سیرِ شہر کا اعلان [illegible]یا۔

اس سیر کا انتظام بھی جواں عمر بلاقو خان کے سپرد ہوا۔

بلاقو خان بڑا خوبصورت تاتاری جوان تھا۔ اس کی ماں ترکمان قبیلے سے تعلق رکھتی تھی اس لیے بلاقو خان میں [illegible]ی اور ترکمانی خون نے مل کر ایک عجیب وجاہت پیدا کر دی تھی جس کا عکس بلاقو خان کے چہرے پر ہر وقت پڑتا [illegible]ا۔

خانزادہ بھی ترکمان باپ کی بیٹی تھی۔ ممکن ہے کہ اس کا بلاقو خان کی طرف زیادہ جھکاؤ اسی وجہ سے ہو۔ ایک خیال [illegible]ہے کہ خانزادہ کی بلاقو خان میں دلچسپی اس وجہ سے تھی کہ اس کا چہرہ مرحوم شہزادے جہانگیر سے ملتا جلتا تھا۔ [illegible]بھی کہتے ہیں کہ بلاقو خان اور خانزادہ کے بڑے بیٹے پیر محمد میں بہت زیادہ مشابہت تھی۔ اس سلسلے میں [illegible]ت وثوق سے نہیں کہی جا سکتی اور اس بات کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں کہ خانزادہ کا کردار کسی طور پر داغدار [illegible]۔ ایک اعلیٰ دماغ اور بڑے رکھ رکھاؤ والی عورت تھی۔ تبریز پہنچنے کے بعد بھی اس کے قدم نہیں ڈگمگائے۔ [illegible]تک اس کا میران شاہ کے ساتھ عقد نہیں ہو گیا اس نے اس کے شاہی محل میں ایک رات بھی بسر [illegible]

[illegible]شکار کے انتظامات کے سلسلے میں بلاقو خان کی محل میں آمد و رفت بڑھ گئی۔ دن میں اسے کئی کئی بار خانزادہ [illegible]پڑتا۔ اس طرح بلاقو خان کو خانزادہ کے مزاج کو سمجھنے کا بہت موقع ملا۔ اور اسے بڑی حد تک اس کے [illegible]دخل حاصل ہو گیا۔

[illegible]خانزادہ نے بھی اس جوان کی صلاحیتوں کی پوری پوری پذیرائی کی اور جب اس نے شکار کے مقررہ دن سے [illegible]لے تمام انتظامات مکمل کرنے کی اطلاع دی تو خانزادہ اس قدر خوش ہوئی کہ میران شاہ سے کہہ کر اس نے [illegible]داروغۂ اصطبل کے اعلیٰ عہدے پر فائز کرا دیا۔ کہنے کو تو بلاقو خان لشکر اور شاہی گھوڑوں کی دیکھ بھال [illegible]م کا ناظم تھا لیکن اس کے عہدے میں تمام شاہی تفریحات کی نظامت بھی شامل تھی اور بلاقو خان نے اپنے [illegible]لک سے اس قدر خوش کیا کہ وہ اب اپنے ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے بلاقو خان ہی کو طلب [illegible]

[illegible]ار پر روانگی کے وقت پانچ ہزار سوار میدان میں صف بستہ ہو گئے۔ ان میں تاتاری سواروں کی تعداد [illegible]ان کے علاوہ مفتوحہ علاقوں کے نبرد آزما بھی شامل تھے جو شکست کھانے کے بعد تیموری لشکر میں شامل

ہو گئے تھے۔ اور مختلف مذاہب کے پابند تھے۔

تیمور نے میران شاہ کے ساتھ کثیر تعداد میں ان نیم وحشی سواروں کا ایک دستہ بھی روانہ کیا تھا جنہوں نے تیموری حملوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔ خیمے، ڈیرے، کھانے پینے کا سامان اور تمام ضروری چیزیں ایک روز پیشتر پہلی منزل پر بھیج دی گئی تھیں۔

جلوس روانہ ہوا۔ میران شاہ اور خانزادہ گھوڑوں پر سوار آگے آگے چل رہے تھے۔ محافظ دستے ان کے دائیں بائیں اور پشت پر تھے۔ یہ جلوس جب شہر کی سڑکوں سے گزرا تو تبریز کے تمام مرد و زن اسے دیکھنے کے لیے سڑکوں اور کوٹھوں پر امڈ آئے۔ ایران کی عورتیں عام طور پر نقاب ڈالتی تھیں جبکہ تاتاری خواتین میں پردہ کا کوئی خاص رواج نہ تھا۔ خانزادہ خود بھی پردہ نہ کرتی تھی لیکن جب عوام میں جاتی تو ہلکا سا اک نقاب چہرے پر ڈال لیتی۔ اس وقت بھی وہ چہرے پر اکہرا نقاب ڈالے ہوئے تھی۔

شاہی سواری تبریز سے دوپہر کے وقت روانہ ہوئی اور بغیر رکے شام تک سفر کرتی رہی۔ کھانے کا انتظام بھی پہلی منزل پر کیا گیا تھا۔ منزل پر پہنچ کر لشکر نے پڑاؤ کیا۔ رات گزارنے کے لیے خیمے لگے ہوئے تھے۔ آج کا سفر مختصر تھا۔

کھانے کے بعد میران شاہ نے محفلِ نشاط کی خواہش کی۔ خانزادہ کو اس بات کا پہلے سے خیال تھا۔ اس نے بلاقو خان سے کہہ کر رقاصاؤں اور مغنی عورتوں کے کئی طائفے ساتھ لے لیے تھے۔ میران شاہ کثرت سے شراب پیتا تھا لیکن خانزادہ نے اس میں کافی حد تک کمی کرا دی تھی۔

میران شاہ نے جب شراب حاضر کرنے کا حکم دیا تو خانزادہ نے اسے اس بات پر رضامند کر لیا کہ وہ محفل میں بیٹھ کے شراب پینے کے بجائے شراب پی کر محفل میں جائے تاکہ دوسروں کو محفل میں شراب پینے کی جرأت نہ ہو۔ خانزادہ نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی کہ میران شاہ کی شراب خوری میں کمی ہو جائے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ میران شاہ شراب کے علاوہ دوسری منشیات کا بھی عادی تھا اور یہ منشیات اسے اپنے خاص خادموں کے ذریعے ملتی رہتی تھیں جس کا علم خانزادہ کو نہ ہو پاتا تھا۔

محفلِ نشاط کا آغاز ہوا۔ ناچ و گانا شروع ہی ہوا تھا کہ میران شاہ پر مدہوشی طاری ہونے لگی۔ خانزادہ حیران تھی کہ اس قدر کم شراب پینے کے باوجود میران شاہ پر غشی کیوں طاری ہو رہی ہے؟ میران شاہ نے سرِ محفل کچھ ایسی ناشائستہ باتیں کیں کہ خانزادہ کو محفل برخاست کرنا پڑی اور وہ میران شاہ کو لے کر خیمے میں چلی گئی۔

میران شاہ خیمے میں پہنچتے ہی بے ہوش سا ہو گیا اور بے خبر ہو کر ایک طرف پڑ گیا۔ خانزادہ نے

اکے سرہانے بیٹھ کر گزاری۔

صبح کو شکار کا آغاز ہونا تھا لیکن میران شاہ کے پوری طرح حواس درست نہیں ہوئے تھے۔ خانزادہ نے کو بلوا کر حکم دیا کہ لشکر کو شکار کھیلنے کی اجازت ہے اور وہ گروہوں میں بٹ کے شکار سے دل بہلا سکتے ان شاہ کی حالت اس نے بلاقو خان سے بھی چھپائی۔ اور یہ کہہ کر اسے مطمئن کر دیا کہ شہزادے ابھی آرام کچھ دن چڑھے ہم لوگ شکار پر روانہ ہوں گے۔

بلاقو خان مطمئن ہو کر چلا گیا اور اس نے باہر خانزادہ کا حکم سنا دیا۔ تاتاری سوار شکار کی اجازت ملتے ہی ل صورت میں شکار کھیلنے چلے گئے۔

دوپہر کے وقت میران شاہ کے حواس درست ہوئے تو خانزادہ کو اطمینان ہوا۔ خانزادہ چاہتی تھی کہ میران شاہ روز مکمل آرام کر لے تاکہ شکار کا صحیح لطف حاصل ہو سکے لیکن میران شاہ ضد پکڑ گیا۔ اس نے اسی وقت ے کا فیصلہ کیا۔ خانزادہ نے بھی بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور شاہی محافظوں کو لے کر شکار کے لیے چل پڑی۔ خانزادہ اور میران شاہ تھے۔ ان کے پیچھے بلاقو خان بھی ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ زمین ہموار مگر پتھریلی تھی۔ ایسی ڑے دوڑانا کچھ ایسا مشکل نہ تھا۔ یہ لوگ معمولی رفتار سے گھوڑے دوڑاتے جنگل کے قریب پہنچے۔ پتہ نہیں کیا ہوا کہ میران شاہ کا گھوڑا اک دم بدکا اور پچھلے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ ممکن ہے میران شاہ نشے میں ہو لیکن وہ تاتاری باپ کا بیٹا تھا اس نے خود کو گھوڑے کی پیٹھ پر سنبھالے رکھا اور اس پر ی کوشش کی گھوڑے کی راسیں کھینچیں تو وہ اور زیادہ الف ہو گیا اور اس نے پچھلے پیر زمین پر ر چار پانچ جھٹکے دیے۔ پھر پچھلے پیروں سے دولتیاں جھاڑنا شروع کر دیں۔

انزادہ فوراً گھوڑا بڑھا کر اس کے قریب پہنچی۔ دوسری طرف سے بلاقو خان بھی آ گیا۔ دونوں نے گھوڑے لنے کی کوشش کی لیکن گھوڑا منہ زور اور بے قابو ہو گیا۔ وہ اگلے پچھلے پیر اچھالتا ہوا ایک طرف کا۔ خانزادہ نے محافظوں کو حکم دیا کہ میران شاہ کے گھوڑے کو گھیرے میں لے لیں اور کسی طرح سے گھوڑے سے اتار دیں۔

سوار اس کوشش میں لگ گئے۔ انہوں نے میران شاہ کے گھوڑے کو آگے نہ بڑھنے دیا۔ لیکن میران شاہ یں کامیاب نہ ہو سکے۔ بے قابو گھوڑا اتنی تیزی سے دائرے میں گھوم رہا تھا اور پورے جسم کو کچھ ٹ دے رہا تھا کہ اس پر ہاتھ ڈالنا مشکل ہو گیا۔ اس کشمکش میں گھوڑے کی دم خانزادہ کے منہ پر ہرکی اور مکھیریں ڈال گئی۔

ران شاہ کو کبھی ایسے منہ زور گھوڑے پر بیٹھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ جب گھوڑا کسی طرح قابو میں نہ آیا تو

اس نے یہی بہتر خیال کیا کہ گھوڑے سے کود پڑے اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دے۔ شاید اس خیال سے نے اپنا ایک پیر رکاب سے نکالا لیکن اس کی بدقسمتی کہ گھوڑے نے اسی وقت ایک اونچی جست لگائی۔ میرا کے ہاتھوں سے رکابیں چھوٹ گئیں۔ دوسرا پیر بھی رکاب سے نکل کر گھوڑے کی پیٹھ سے تقریباً پانچ فٹ میں بلند ہو گیا اور وہ قلابازی کھاتے ہوئے پتھریلی زمین پر الٹ کر گرا۔ پہلے اس کا سر زمین سے ٹکرایا، دھڑ کسی تختے کی مانند گر پڑا۔ گھوڑا سوار سے آزاد ہو کر تیزی سے ایک طرف بھاگ نکلا۔

خانزادہ، بلاقو خان اور دوسرے تمام لوگ گھوڑوں سے کود کود کر میراں شاہ کے گرد جمع ہو گئے۔ خا نے میراں شاہ کا سر اپنے زانوؤں پر رکھ لیا۔ اس کے سر میں سخت چوٹ آئی تھی اور خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا۔ ضرب پڑنے سے وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کے زخم میں ریشم جلا کر بھرا گیا پھر پٹی باندھ دی گئی۔ خانزادہ نے تبریز واپس ہونے کا حکم دیا اور اس طرح یہ لوگ شکار چھوڑ کر افسردہ افسردہ اور پریشان واپس تبریز آ گئے۔

تبریز میں ایک سے ایک بڑا جراح اور حکیم موجود تھا لیکن تین دن تک مسلسل کوشش کرنے کے وہ میراں شاہ کو ہوش میں نہ لا سکے۔ پھر کسی نے بتایا کہ سلطانیہ میں کچھ جراح اور طبیب ایسے ہیں جو زخم ٹھیک کرنے بے ہوشی دور کرنے میں کمال رکھتے ہیں۔ خانزادہ نے انہیں فوراً طلب کر لیا۔ پھر تمام طبیب اور جراح صلاح مشو کرنے لگے۔ انہوں نے میراں شاہ کے زخم کا پھر سے معائنہ کیا۔ آخر کار وہ ایک نتیجے پر پہنچے۔ پھر وہ سب ہاتھ خانزادہ کے سامنے حاضر ہوئے اور ایک طبیب نے بڑی افسردگی سے کہا:

"شہزادی عالیہ! خداوند تعالیٰ نے ہر مرض کی دوا اور ہر تکلیف کا مداوا پیدا کیا ہے۔ وہ مردے میں ڈال سکتا ہے۔ ہم سب شہزادے کا معائنہ کرنے کے بعد اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ اگر شہزادے بہادر مز تک بے ہوش رہے تو خاکم بدہن پتہ نہیں کیا ہو جائے۔ زخم تو گہرا نہیں لیکن شہزادے کے دماغ میں چوٹ آ اور بے ہوشی اسی وجہ سے ہے۔ ہم سوائے دعا کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔"

شہزادی خانزادہ گیارہ دن اور گیارہ راتوں سے اک مسلسل کرب میں مبتلا تھی۔ نہ کھانے کا ہوش تھا نہ دھیان۔ وہ لباس جسے پہن کر وہ میراں شاہ کے ساتھ شکار پہ چلی تھی اب تک اس کے جسم پہ چپکا ہوا تھا۔ بال بکھ تھے اور آنکھیں بے خوابی کی وجہ سے بے نور دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ وہ بڑ سے تبریز آئی تھی لیکن اس حادثے نے اس کی تمام امیدوں پہ پانی پھیر دیا تھا۔

شہزادی نے بڑے صبر و تحمل سے کہا:

"بزرگ اور باکمال طبیبو! جب آپ یہ کہتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے ہر مرض کی دوا پیدا کی ہے تو پھر آ بے ہوشی کی دوا کیوں نہیں حاصل کی جاتی۔ کیا ہمارے مذہب میں خدا کی ذات سے ناامید ہونا گناہ نہیں۔ اگر شہز

زندگی ان کے ہوش میں آنے پر موقوف ہے تو پھر انہیں ہوش میں لانے کے لیے کوئی اکسیر کیوں نہیں تیار کرتے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر آپ لوگ مل کر کوشش کریں تو خدا ضرور آپ کی مدد کرے گا اور آپ کو کامیاب کرے گا۔ جہاں تک دعا کا تعلق ہے، شہزادے کے لیے دعائیں کی جا رہی ہیں۔ قرآن کی تلاوت جاری ہے۔ ہم ایک عام اعلان کے ذریعے رعایا سے درخواست کریں گے کہ وہ ہماری دعاؤں میں شریک ہوں لیکن اس کے ساتھ آپ بھی کوششیں جاری رکھیں۔ نہ ہم ناامید ہیں نہ آپ کو ہونا چاہیے۔"

شہزادی کی باتوں کا اطبا پر بڑا اثر ہوا اور وہ ایک بار پھر کوششیں کرنے لگ گئے۔ دوسری طرف شہزادی نے شہزادے کی صحت یابی کے لیے ایک اعلان کے ذریعے درخواست کی۔ گھر گھر قرآن خوانی ہونے لگی۔ مسجدیں قرآن حکیم کی روح افزا اور ایمان افروز قرأت سے گونج اٹھیں۔ اطبا نے چوبیس گھنٹے کی لگاتار کوشش سے ایک عرق تیار کیا اور پھر شہزادی کی موجودگی میں شہزادے کے بند جبڑے کھول کر عرق کے دو چمچے اس کے حلق سے اتار دیے۔

یہ عرق واقعی اکسیر ثابت ہوا۔ دوا اور دعا نے ایک ساتھ کام کیا اور شہزادے کے حلق سے عرق اترتے ہی اس کی ڈوبتی نبضوں میں حرارت پیدا ہوئی۔ اور جسم میں حرکت آ گئی۔

سب کی نظریں شہزادے پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر ذرا دیر بعد شہزادے کے پپوٹے ہلے اور اس نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔

"مسجدوں میں نمازِ شکرانہ ادا کی جائے۔" خانزادہ کی پُر رعب آواز کمرے میں گونجی۔

بلاقو خان آواز سنتے ہی باہر کی طرف لپکا۔ خانزادہ بھی اٹھنے لگی تو میراں شاہ بولا:

"کہاں جا رہی ہو شہزادی؟"

پھر اس نے سر گھما کر کمرے میں دیکھتے ہوئے پوچھا:

"یہ کون لوگ ہیں؟ انہیں کیوں بلایا گیا ہے؟"

"شہزادے!" خانزادہ نے محبت سے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا:

"اللہ نے آپ کو شفا دی۔ ہم اس کے حضور شکرانہ پیش کرنے جا رہے ہیں اور یہ لوگ وہ ہیں۔" خانزادہ بیبوں کی طرف دیکھ کے کہا:

"جن کی دوا نے تریاق کا کام کیا اور آپ نے فوراً آنکھ کھول دی۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟" میراں شاہ کی تیوریاں چڑھ گئیں:

"کیا ہم بیمار تھے؟ کیا ہماری آنکھیں بند تھیں؟"

"ولی عہد بہادر۔" ایک طبیب ادب سے بولا۔ "میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ زیادہ گفتگو سے گریز کیجیے

ابھی آپ میں نقاہت باقی ہے۔"

"گستاخ! تو کون ہے؟" میراں شاہ زور سے چیخا پھر خانزادہ کو دیکھا:

"شہزادی اس شخص کو ہماری گفتگو میں دخل دینے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

شہزادی کو کچھ گھبراہٹ پیدا ہوئی مگر جلد ہی اس نے خود کو سنبھالا اور بولی:

"شہزادے بلند۔ ہم اور آپ شکار پہ گئے تھے۔ وہاں ایک منہ زور گھوڑے نے ٹھوکر مار کر آپ کو زمین پہ گرا دیا تھا۔ سر پر شدید چوٹ آنے کی وجہ سے آپ بے ہوش ہو گئے تھے۔ اس کا اثر اب تک آپ پہ ہے۔"

میراں شاہ نے آنکھیں بند کر لیں اور کچھ سوچنے لگا۔ پھر سر پہ ہاتھ پھیرا۔ بولا:

"ہاں شہزادی! ہم بھول گئے تھے۔ ہم گھوڑے سے گر گئے تھے۔ وہ گھوڑا کہاں ہے؟ اس منحوس گھوڑے کے ہمارے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کیے جائیں۔ یہ...... یہ...... طبیب ہیں۔ ان لوگوں نے ہمارا علاج کیا ہے۔ انہیں دس دس ہزار دینار سرخ اور پچاس پچاس گھوڑے انعام دیے جائیں۔"

میراں شاہ کی الٹی سیدھی باتیں سن کے طبیب پہلے تو گھبرا گئے تھے لیکن اب ان سب کو اطمینان ہوا کہ چوٹ کا اثر جلد ہی زائل ہو گیا۔

"اچھا شہزادے ہم نماز پڑھ کے ابھی آتے ہیں۔" خانزادہ نے نرمی سے کہا۔

"نماز ۔۔۔! کہاں جا رہی ہو تم؟"

"شکرانے کی نماز پڑھنے۔"

"ہم پوچھتے ہیں تم کہاں جا رہی ہو؟"

شہزادی نے حیرت سے میراں شاہ کو دیکھا۔ پھر فوراً ہی سنبھل گئی اور اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی:

"ہم آپ کو چھوڑ کر کہاں جا سکتے ہیں۔ ہم یہیں بیٹھے ہیں۔ آپ آرام فرمائیے۔"

میراں شاہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ بولا:

"وہ منحوس گھوڑا کہاں ہے؟"

"کون گھوڑا؟" خانزادہ نے چونک کے پوچھا۔ اسے پریشانی میں یاد نہ رہا کہ میراں شاہ نے گھوڑے کے ٹکڑے کرنے کو کہا تھا۔

"تم ہمیں بے وقوف سمجھتی ہو خانزادہ؟" شہزادہ وحشیوں کی طرح اچھل کر بستر پر بیٹھ گیا:

"کیا یہ جھوٹ ہے کہ ہم اس صاحبقراں امیر تیمور کی اولاد ہیں جو پوری دنیا کا بادشاہ ہے۔"

"شہزادے!" خانزادہ نے بات سنبھالنے کے لیے کہا:

"اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ آپ صاحبقراں امیر تیمور کے ولی عہد ہیں اور آپ ہی تیموری
ت و تاج کے وارث ہیں۔"

"تم بہت عقلمند ہو خانزادہ۔" میراں شاہ نے بے تکا سا قہقہہ لگایا اور پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر بولا:

"وہ منحوس گھوڑا کہاں ہے؟ اس میں بد روح گھسی ہوئی ہے۔ اس کا مارا جانا ضروری ہے۔"

"ابھی حاضر کیا جاتا ہے شہزادے۔ آپ آرام فرمائیے۔"

خانزادہ سخت پریشان تھی۔ اسے علم تھا کہ وہ گھوڑا میراں شاہ کو گرا کر کسی طرف بھاگ گیا تھا اور گڑبڑ کی وجہ
ے اسے کسی نے تلاش بھی نہیں کیا تھا۔ اسے ڈھونڈ کے لانے میں وقت لگتا تھا لیکن میراں شاہ اسے فوراً ختم کرانا
اہتا تھا۔ اس نے پریشان نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

باقو خان شکرانے کی نماز کا اعلان کر کے واپس آ گیا تھا اور دور ایک کونے میں سہما ہوا کھڑا تھا۔ خانزادہ
نے اسے اشارے سے قریب بلایا:

"دیکھو باقو خان!" خانزادہ نے ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا:

"شہزادے جس منحوس گھوڑے پر سوار ہو کر شکار کھیلنے تشریف لے گئے تھے اس گھوڑے کو فوراً حاضر کرو۔
الکل وہی ساز چڑھا کے...... دیکھو باقو خان...... وہی ساز...... وہی گھوڑا...... وہی گھوڑا فوراً یہاں
اضر کیا جائے۔"

باقو خان بڑا ذہین نوجوان تھا۔ وہ شہزادی کا مطلب فوراً سمجھ گیا۔ سر جھکا کے بولا:

"شہزادی عالیہ! ابھی حکم کی تعمیل ہوتی ہے۔ بس ابھی ابھی۔"

باقو خان جلدی سے باہر نکل گیا۔

"خانزادہ! یہ ہمارے سر میں درد کیوں ہو رہا ہے؟" میراں شاہ پھر بہکنے لگا۔

"شہزادے آپ لیٹ جائیے۔ سر میں زخم ہونے کی وجہ سے درد ہو رہا ہے۔"

خانزادہ شکار پر جا کے پھنس گئی تھی۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے شکار کا حکم ہی کیوں دیا۔

"ہاں۔ ہمارے سر میں چوٹ لگی ہے۔" میراں شاہ نے سر پہ ہاتھ پھیرا:

"مگر وہ گھوڑا...... گھوڑا اب تک کیوں نہیں آیا؟"

خانزادہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ باقو خان اندر داخل ہوا۔ خانزادہ نے اسے بڑی پُر امید
ظروں سے دیکھا۔ وہ پریشان تھی کہ اس نے باقو خان کو اشاروں کنایوں میں جو بات سمجھائی تھی، خدا جانے وہ سمجھ
کا تھا یا نہیں!

بلاقوخان فوراً سلام کے لیے جھکا اور ادب سے بولا:

"شہزادی صاحبہ! وہ بدسرشت گھوڑا حاضر ہے۔ شہزادے حضور جھروکے سے ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔"

"ہاں ہاں ہم اسے دیکھیں گے۔" میراں شاہ بستر سے اتر کر جھروکے کی طرف بڑھا۔

عقل مند بلاقوخان نے خانزادہ کی گفتگو کو بڑے غور سے سنا تھا۔ وہ داروغۂ اصطبل تھا۔ اس نے فوراً ہی اصطبل پہنچ کے اسی نسل اور قد و قامت کا ایک گھوڑا نکلوایا اور گھوڑے کو ویسا ہی مرصع ساز سے آراستہ کر کے میدان میں لے آیا۔ اس نے جان بوجھ کے گھوڑے کو جھروکے سے دور کھڑا کیا تاکہ میراں شاہ کی نظریں دھوکہ کھا جائیں اور وہ اس مقصد میں پوری طرح کامیاب ہوا۔

میراں شاہ نے گھوڑے کو دیکھتے ہی ایک بھیانک قہقہہ لگایا:

"یہی ہے وہ منحوس گھوڑا جس نے صاحبقراں کے ولی عہد کو اپنی پشت سے گرایا تھا۔"

پھر اس نے جھروکے سے گردن نیچے لٹکائی اور چیخ کر بولا:

"او ذلیل گھوڑے تو نے ہمارے ساتھ گستاخی کی۔ تجھے ہمارا ذرا بھی خوف نہ آیا۔ تو نے ہمارے عتاب کو آواز دی ہے۔ دیکھ تیرا کتنا خوف ناک انجام ہوتا ہے۔"

میراں شاہ نے حکم دیا کہ گھوڑے کے تمام اعضاء ایک ایک کر کے کاٹے جائیں۔

بلاقوخان نے یہ ناگوار فرض بھی خود ادا کیا۔ اس نے تلوار نکال کر ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ گھوڑے کی گردن اس کے جسم سے الگ ہو گئی۔ اور اس کا مردہ بدن زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

میراں شاہ جھروکے میں بیٹھا برابر قہقہے لگا رہا تھا۔ شاید اسے اس منظر سے فرحت محسوس ہو رہی تھی اور اس کے پاگل پن کو سکون مل رہا تھا۔

بلاقوخان نے چند آدمیوں کی مدد سے بے قصور گھوڑے کے تمام اعضا الگ الگ کرائے۔ پھر انہیں اوپر تلے رکھ کر ایک مینار سا بنا دیا۔

میراں شاہ بالکل پُرسکون ہو گیا۔ وہ جھروکے سے واپس آ کر بستر پر لیٹ گیا اور جلد ہی گہری نیند میں ڈوب گیا۔

خانزادہ طبیبوں کو لے کر دوسرے کمرے میں آ گئی اور ان سے دیر تک میراں شاہ کی جنونی کیفیت کے بارے میں گفتگو کرتی رہی۔ طبیبوں نے اسے مشورہ دیا کہ میراں شاہ کے ہر حکم کی بے چون و چرا تعمیل کی جائے تاکہ اس میں ضد اور چڑچڑاپن نہ پیدا ہو ورنہ یہ مرض جس کا ابھی آغاز ہوا ہے اور زیادہ بڑھ جائے گا۔

میراں شاہ کئی گھنٹے تک گہری نیند سوتا رہا۔ پھر جب وہ بیدار ہوا تو بالکل ہوش و حواس میں تھا اور کوئی اندازہ

ر سکتا تھا کہ کچھ دیر پہلے یہی شہزادہ پاگلوں جیسی باتیں کر رہا تھا۔

خانزادہ کی تمام کلفت دور ہو گئی۔ اسے میراں شاہ سے واقعی محبت ہو گئی تھی۔ اس نے کئی راتیں میراں شاہ کے ہانے جاگ کر گزاری تھیں۔

اب میراں شاہ کی طبیعت میں ایک عجیب انقلاب پیدا ہو گیا تھا۔ وہ تمام وقت خاموش خاموش رہتا۔ اس نے بار کے تمام لوگوں سے قطع تعلق کر لیا اور محل ہی میں گوشہ نشین ہو گیا لیکن یہ گوشہ نشینی پہلے جیسی نہ تھی۔ اسے نہ ناط کی خواہش تھی اور نہ شراب و کباب کی۔ سوائے خانزادہ کے وہ کسی اور سے بالکل گفتگو نہ کرتا۔ جو کھانے کو تا وہ چپ چاپ قبول کر لیتا۔ کسی کسی وقت اس کی طبیعت میں گھبراہٹ پیدا ہوتی تو اٹھ کر ٹہلنے لگتا۔ خانزادہ اسے ی سیر کو لے جاتی یا شاہی سواری میں بٹھا کر دور باغات میں نکل جاتی۔ باغات کی تازہ ہوا سے اس کی طبیعت پر اچھا پڑتا اور اس کی وحشت دور ہو جاتی۔

شہزادی کے لیے یہی غنیمت تھا کہ وہ رات دن اس کی خدمت میں لگی رہتی۔ اسے امید تھی کہ میراں شاہ بہت جلد اصلی حالت میں آ جائے گا۔ طبیبوں نے بھی اسے ایسی ہی تسلیاں دی تھیں۔

دربار کی رونقیں ختم ہو گئی تھیں۔ محل اور باغات پر اداسی طاری ہو گئی تھی۔ کنیزیں سرگوشیوں میں گفتگو یں۔ چلتیں تو جیسے پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہی ہوں۔

خانزادہ کی بھاگ دوڑ میراں شاہ کے کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ وزیر سلطنت اور قلات خان اس سے ملنے آتے۔ خانزادہ ان سے بہت مختصر گفتگو کرتی۔ اسے ڈر لگا رہتا کہ کہیں میراں شاہ کی طبیعت نہ بگڑ جائے۔ خان کو شاہی محل کے مہمان خانے میں قیام کرنے کا حکم دیا تھا۔ خانزادہ کو صرف اسی پر اعتماد تھا اور وہ بھی خانزادہ کام دیانت داری سے کرتا تھا۔ طبیبوں اور خانزادہ کے درمیان وہی رابطے کا کام کرتا تھا۔ طبیبوں کا خیال تھا کہ ں شاہ کی یہ خاموشی اور طبیعت کا سکون صحت کی نشانی ہرگز نہیں بلکہ کسی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ سمندر وفان سے پہلے پُرسکون ہو جایا کرتا ہے لیکن انہوں نے یہ بات خانزادہ کو نہیں بتائی تھی۔ وہ شہزادی کے ال سے واقف تھے۔ اسے یہ خبر دے کر اور پریشان ہی کرنا تھا۔ وہ اپنی طرف سے علاج جاری رکھے ہوئے تھے۔ ترسے بہتر شربت اور عرقیات تیار کرتے اور میراں شاہ کو استعمال کراتے۔

پھر ایک سال اسی کشمکش میں گزر گیا۔ شہزادے کی حالت میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ بجز اس کی خاموشی کے سوا اور کوئی بات ایسی نظر نہ آئی جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ شہزادے کی دماغی کیفیت ٹھیک نہیں لیکن طبیبوں کے خیال کے مطابق یہ خاموشی بھی ایک مرض تھا جو کسی وقت بھی خطرناک صورت اختیار کر سکتا تھا۔ خانزادہ کو مشورہ دیا کہ شہزادے کو ہنسنے بولنے پہ مجبور کیا جائے تاکہ اس کے دماغ کو فرحت حاصل ہو اور وہ اپنی اصلی حالت کی طرف مائل ہو۔

خانزادہ نے شہزادے کے تمام نااہل اور بیہودہ ندیموں کو برخاست کر دیا تھا۔ رقص و سرود کی محفلیں بھی تقریباً ختم ہو گئی تھیں۔ طبیبوں کے کہنے پہ اس نے چند مسخرے قسم کے ندیموں کو طلب کیا اور انہیں ضروری ہدایات دے کر میران شاہ کے حضور پیش کیا۔

یہ لوگ تو کسی ایسے موقع کے منتظر ہی تھے۔ وہ میران شاہ کے سامنے پہنچ کر کھل کھیلے۔ انہوں نے ایسی شگفتہ گفتگو کی اور ایسے ایسے چٹکلے چھوڑے کہ میران شاہ کے سنجیدہ اور سپاٹ چہرے پر رونق سی آ گئی۔ اور دن بھر وہ ان کی پرلطف باتوں پر صرف مسکراتا رہا۔ پھر اس نے ہنسنا شروع کر دیا۔ خانزادہ کو اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ اس نے ندیموں کو بہت انعام دیا اور حکم دیا کہ شہزادے کو ہر وقت مسرور رکھیں اور طبیعت پہ گرانی نہ آنے دیں۔

محلات کی رونقیں دھیرے دھیرے واپس آ رہی تھیں۔ کبھی کبھی رقص و سرود کی محفلیں بھی جمتیں لیکن محلات سے باہر تاتاری لشکرگاہ میں کچھ اور ہی طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں اور عجیب عجیب سی افواہیں اڑ رہی تھیں۔ تاتاری لشکر میں بہت سے ایسے مغل بھی تھے جو شکست کھا کر تیمور کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے۔ تیمور کسی لشکری کے مذہب میں دخل نہ دیتا تھا۔ مغل اب تک بے دین تھے اور آسمانی روحوں پر اعتقاد رکھتے تھے۔ ان کے خیال میں آسمانی روحیں ہی دنیا کی حاکم تھیں۔ ان کی پسند اور ناپسند سے دنیا میں انقلاب آتے تھے۔

ایک دن ایک مغل سردار نے ایک تاتاری سے کہا:

"سردار۔ ہمارے حاکم کے جسم میں بد روح حلول کر گئی ہے۔ جبھی تو وہ اب تک اچھے نہیں ہوئے۔ اگر تم پسند کرو تو میں شمال سے کسی اچھے جادوگر کو لے آؤں۔ وہ اس بد روح کو حاکم کے جسم سے نکال کے جلا ڈالے گا۔ پھر حاکم فوراً ہی اچھے ہو جائیں گے۔"

تاتاری بھی مغلوں کی طرح وہمی تھے۔ میدان جنگ میں جب وہ موت کے سامنے ہوتے تو پہاڑوں سے بھی ٹکرا جاتے لیکن اگر ان کا گھوڑا گھبرا کر مر جاتا تو وہ خوف زدہ ہو جاتے۔ پھر وہ خواہ کتنی ہی اہم مہم پر کیوں نہ ہوں "اسے فوراً" منحوس سمجھ کر چھوڑ دیتے تھے اور اس کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھتے تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد ان میں تغیر پیدا ہوا تھا اور ان کے توہمات بھی کم ہو گئے تھے۔

یہ سردار بھی مسلمان تھا۔ اس نے مغل سردار کی بات غور سے سنی۔ پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا:

"یہ بات نہیں ہے مغل خان۔ دراصل امیر صاحبقراں ہمارے حاکم سے ناراض ہیں اسی لیے خدا شہزادے کو سزا دے رہا ہے۔"

ایک دوسرے تاتاری نے اس بات میں اور قوت پیدا کرنے کے لیے کہا:

"بالکل یہی بات ہے۔ شہزادے کو خدا کی طرف سے سزا مل رہی ہے۔ تم نے دیکھا نہیں جب شہزادہ گھوڑے سے گرا تھا تو پہلے اس کا سر زمین سے ٹکرایا تھا۔ یہ سزا کی نشانی ہے۔ اسی وجہ سے تو وہ پاگل ہو گیا ہے۔"

"کیا ہمارے امیر کو اس بات کی خبر ہو گئی ہے؟" مغل نے دخل دیا۔

"ہمارے امیر دنیا کے بادشاہ ہیں۔ وہ اس وقت عراق کو فتح کرنے گئے ہیں۔" تاتاری نے لاپروائی سے کہا۔ گویا یہ کوئی ایسی اہم بات نہیں جس کی خبر تیمور کو ہونا ضروری تھی۔

مغل کو اطمینان نہ ہوا۔ اس نے کہا:

"شہزادے بہادر ولی عہد ہیں۔ ہمیں ان کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا چاہیے۔ اگر آپ حکم دیں تو میں عراق جا کر امیر کو خبر کر دوں۔"

"ہمیں ان باتوں سے کوئی مطلب نہیں۔" تاتاری نے کہا:

"ہمارا تو فرض یہ ہے کہ شہزادے کے ہر حکم کو مانتے رہیں اور بس۔ آخر وہ ہمارے امیر کے بیٹے ہیں۔"

مغل اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ تاتاری امیر تیمور کے بیٹوں کی بھی اسی طرح عزت کرتے ہیں جو عزت و تکریم ان کی نظر میں امیر تیمور کی تھی۔ شہزادے کے لیے وہ جان بھی دے سکتے تھے لیکن اس کے صحیح یا غلط حکم سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ تبریز کے حالات کی تیمور کو کئی سال تک کوئی صحیح خبر نہ مل سکی۔

دوسرے سال خانزادہ کے بطن سے میران شاہ کا ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام امیرزادہ خلیل سلطان رکھا گیا۔ امیرزادے کی پیدائش پر خوب جشن منایا گیا۔

اس وقت میران شاہ پہ پاگل پن کا دوسرا دورہ پڑا تھا۔ ہر بات کچھ زیادہ خراب ہوئی۔ خانزادہ نے بچے کی پیدائش کی اطلاع امیر تیمور کے پاس سمرقند بھیجی۔ تیمور کسی اہم مہم پہ جانے کی تیاری کر رہا تھا اس لیے اس خبر پر زیادہ زور نہ دے سکا لیکن اس نے وعدہ کیا کہ وہ بہت جلد تبریز کا دورہ کرے گا اور امراء و وزراء کو انعام و اکرام سے نوازے گا۔

خانزادہ کے لیے اس نے بیش قیمت جواہرات بھیج دیے اور میران شاہ کے منصب میں دو ہزار سواروں کا اضافہ کر دیا یعنی اب میران شاہ اپنے لشکر میں دو ہزار سوار اور بھرتی کر سکتا تھا۔

ایک شب اچانک میراں شاہ کا دماغ پھر گھوم گیا۔ خانزادہ ننھے امیرزادے خلیل سلطان کو گود میں لیے اس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ میراں شاہ پہلے تو امیرزادے کو دلچسپی سے دیکھتا اور مسکراتا رہا۔ پھر معلوم نہیں اسے کیا سوجھی کہ امیرزادے کو خانزادہ کی گود سے لے لیا۔ خانزادہ نے کوئی اعتراض نہ کیا اس لیے کہ میراں شاہ اب بالکل صحیح الدماغ ہو گیا تھا۔ پھر امیرزادہ اس کا اپنا بیٹا تھا۔ وہ منع بھی نہیں کر سکتی تھی۔ میراں شاہ بچے کو دونوں ہاتھوں میں لیے مسہری سے اترا۔ خانزادہ بھی خوشی خوشی اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ وہ سمجھی کہ شاید آج باپ کی فطری شفقت ایک دم جاگ گئی ہے اور میراں شاہ بچے کو کھلانا چاہتا ہے۔

میراں شاہ کچھ دیر بچے کو لیے ٹہلتا رہا پھر رک کر بولا:

"خانزادہ۔ لوگ کہتے ہیں کہ جو لوگ سر کے بل گرتے ہیں وہ منحوس ہوتے ہیں۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

"یہ سب بے دینی کی باتیں ہیں شہزادے۔" خانزادہ نے اس کے خیال کی فوراً تردید کی:

"شہزادے! اس قسم کے وہم اپنے دل میں نہ لایا کیجیے۔ خدا جس کو جو چاہتا ہے بنا دیتا ہے اس میں کسی وہم یا شگون کو دخل نہیں۔"

"نہیں خانزادہ"۔ میراں شاہ کی آواز ایک دم تیز ہو گئی:

"ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے بیٹے کو کوئی منحوس کہے۔ ہمیں لوگوں پر ثابت کرنا ہوگا کہ امیرزادے پر کوئی منحوس سایہ نہیں۔"

"شہزادے۔ کس کی مجال ہے کہ امیرزادے کو منحوس کہے۔" خانزادہ غصے سے بولی:

"ہم ایسے لوگوں کی زبانیں کاٹ دیں گے۔"

"تم بے وقوف ہو خانزادہ۔" میراں شاہ زور سے دھاڑا:

"ہم امیرزادے کا امتحان لیں گے۔ ہم امیرزادے کو ہوا میں اچھالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ سر کے بل تو نہیں گرتا۔"

"نہیں نہیں۔"

خانزادہ چیخ مار کر میراں شاہ کی طرف دوڑی لیکن میراں شاہ نے بچے کو ہوا میں چھت کی طرف اچھال چکا تھا۔ بچے کی بھی چیخیں نکل گئی تھیں۔ وہ قلابازیاں کھاتا چھت تک پہنچا پھر اسی طرح نیچے کی طرف گرنے لگا۔ خانزادہ نے بھوکی شیرنی کی طرح میراں شاہ پر جھپٹ کر اسے دھکا دیا اور زمین پر آتے ہوئے امیرزادے کو اپنے ہاتھوں پہ روک لیا۔

امیرزادے کے ہاتھوں میں آتے ہی خانزادہ نے اسے سینے میں بھینچ لیا اور بے تحاشہ بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

میراں شاہ پر نہ تو خانزادہ کے دھکا دینے کا کوئی اثر ہوا اور نہ اس کے چیخنے چلانے کا۔ وہ بڑے اطمینان سے مسہری پر جا کے بیٹھ گیا۔ پھر اس نے پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔

خانزادہ امیرزادے کو سینے سے لگائے راہداریوں میں بھاگ رہی تھی اور زور زور سے چلا رہی تھی:

"امیرزادے کو بچاؤ۔ میراں شاہ پاگل ہو گیا ہے۔ وہ امیرزادے کو مار ڈالے گا۔"

اور پتہ نہیں وہ غصے، جوش اور خوف میں کیا کیا بک رہی تھی اور شاہی محل کے صدر دروازے کی طرف دوڑ رہی تھی۔ خواجہ سراؤں اور کنیزوں نے اسے گھیر لیا۔ وہ حیران نظروں سے خانزادہ کو دیکھ رہی تھیں مگر کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔ دروازے پر پہنچ کر خانزادہ نے بلاقو خان کو بلایا۔ وہ باہر موجود تھا۔ حکم پاتے ہی گھبرایا ہوا محل کے اندر آیا۔

خانزادہ نے جلدی سے امیرزادہ اس کے ہاتھوں میں دے دیا اور پیچھے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی:

"بلاقو خان۔ یہ ہماری امانت ہے۔ اسے کہیں لے جاؤ۔ ورنہ وہ...... وہ اسے مار ڈالے گا۔"

"کون ہے وہ؟" بلاقو خان کا ہاتھ شمشیر پر پہنچ گیا:

"مجھے بتلائیے شہزادی عالیہ۔ کس نے امیرزادے کی طرف نظر اٹھائی ہے۔ میں اس کا سر قلم کر دوں گا۔"

"بلاقو خان۔ ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔ ہم اپنے محل میں جائیں گے۔ تم ہمارے محل پر پہرہ لگا دو۔ ہمارے کوئی نہ آنے پائے۔"

خانزادہ اپنی ہی کہتی رہی۔ اس کے کانوں میں جیسے بلاقو خان کی آواز ہی نہیں پہنچی۔ بلاقو خان ہکا بکا رہ گیا تھا۔ کنیزوں اور خواجہ سراؤں کو بھی یہ ہمت نہ تھی کہ شہزادی سے کچھ پوچھیں کیونکہ انہوں نے سن لیا تھا کہ شہزادی نے میراں شاہ کو پاگل کہا ہے۔ اور یہ بات ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔

بلاقو خان نے آہستہ سے کہا:

"شہزادی عالیہ۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں امیرزادے پر قربان ہو جاؤں گا لیکن انہیں کوئی گزند نہ پہنچنے دوں گا۔ میں آپ کو آپ کے محل میں پہنچا دوں گا لیکن یہ سب کیا ہے؟ کس نے آپ کو تکلیف پہنچائی ہے۔"

خانزادہ اب بھی سخت پریشان تھی۔ وہ خوف زدہ سی محل سے باہر نکل آئی۔ محل کا دروازہ باہر سے بند پا کے اسے کچھ اطمینان ہوا تو بولی:

"تم نہیں جانتے بلاقو خان۔ شہزادہ میراں شاہ پاگل ہو گیا ہے۔ اس نے امیرزادے کو چھت تک اچھال

دیا تھا۔ اگر ہم موجود نہ ہوتے تو یہ ۔۔۔۔۔۔ یہ !!"

اور خانزادہ رونے لگی۔ منتاگی تاری ایک عام عورت کی مانند اسے روتا دیکھ کر کنیزیں اور خواجہ سرا بھی رونے لگے۔ ان کی سمجھ میں پوری بات آ گئی تھی۔ سب کو علم تھا کہ دماغ میں چوٹ آنے کی وجہ سے میران شاہ کا دماغ خراب ہو گیا ہے لیکن ان کے منہ پر مہر لگی تھی۔ خانزادہ کی حالت پر انہیں رحم تو آیا لیکن وہ اس کی مدد کرنے سے قاصر تھے۔ میران شاہ امیر تیمور کا بیٹا تھا اور تیمور کا بیٹا ان کے لیے تیمور ہی کی طرح قابل احترام تھا۔

بلاقو خان نے شہزادی کو دوسرے محل میں پہنچا دیا اور محل کے گرد تاتاری سواروں کا سخت پہرہ لگا دیا۔ مزید حفاظت کے لیے اس نے محل کے بیرونی حصے میں خود بھی رہائش اختیار کی۔

صبح کو جب میران شاہ کے حواس درست ہوئے تو وہ رات کے واقعات کو بالکل بھول چکا تھا۔ میران شاہ نے خانزادہ کے بارے میں دریافت کیا تو کنیزوں نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ شہزادی دوسرے محل میں منتقل ہو گئی ہیں اور ساتھ ہی انہوں نے رات کو پیش آنے والے واقعات بھی اس کے گوش گزار کیے۔ میران شاہ چپ چاپ بیٹھا سنتا رہا۔ اس پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے اظہار شرمندگی کے بجائے خانزادہ کا اپنے محل میں داخلہ بند کر دیا۔

خانزادہ نے اسے اپنے حق میں مفید ہی سمجھا۔ وہ خود چاہتی تھی کہ میران شاہ سے دور رہے تاکہ وہ خود اور امیرزادہ سلطان اس کی وحشی حرکتوں سے محفوظ رہیں۔

خانزادہ کا محل میں داخلہ بند ہونے سے میران شاہ کے پرانے ندیموں اور حواریوں کی بن آئی۔ انہوں نے پھر میران شاہ کو گھیر لیا اور پہلے کی طرح محل کو راجہ اندر کا اکھاڑا بنا دیا۔ مسخرے سازندے اور مفاد پرست ان پڑھ شاعر درباری عہدوں پر فائز ہو گئے۔ میران شاہ کی مے نوشی میں اضافہ ہو گیا۔ طبیبوں کی دوائیں پہلے ہی بہت کم اثر کر رہی تھیں۔ میران شاہ نے انہیں بالکل موقوف کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے پاگل پن میں دن دونا رات چوگنا اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔

ایک دن ترنگ میں آ کے میران شاہ نے تبریز کی تمام رعیت کو محل کے نیچے جمع کر لیا اور خود جھروکے میں آ کے بیٹھ گیا۔ پھر اس نے حکم دیا کہ درہم و دینار حاضر کیے جائیں۔ خزانہ کھول دیا گیا۔ درہم و دینار کے خوان بھر بھر کے میران شاہ کے پاس بھیجے گئے۔

میران شاہ خوانوں کو عوام پر الٹواتا رہا۔ رعیت خوش ہو کر بخششیں لوٹتی رہی۔ کہتے ہیں کہ دن بھر میں میران شاہ نے ایک کروڑ دینار عوام پر نچھاور کر دیے۔

امیر قلات خان اور وزیر سلطنت اس بے جا سخاوت پر گھبرا گئے۔ خزانہ تقریباً خالی ہو گیا تھا۔ وزیر

نے ادب سے عرض کیا کہ :

"حضور خزانہ خالی ہو گیا ہے۔"

جواب میں میران شاہ نے جواہرات کی بارش کرنے کا حکم دیا۔ کس میں مجال تھی کہ مخالفت کرتا۔ رات گئے تک جواہرات کا مینہ برستا رہا اور لوٹنے والے میران شاہ کے حق میں نعرے لگاتے رہے۔

قلات خان نے دیکھا کہ میران شاہ کسی طرح نہیں مانتا تو اس نے سازندوں کو حکم دیا کہ وہ موسیقی کی محفل جمائیں۔ ساز و آواز کی محفل نے میران شاہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور وہ جھروکے سے ہٹ کر محفل میں آ گیا ورنہ خزانہ بالکل ہی خالی ہو جاتا۔

خانزادہ کو خبر ملی تو وہ دل پکڑ کے رہ گئی۔ ایک تو اس کے داخلے پر پابندی تھی۔ پھر وہ خود بھی میران شاہ سے ملنا نہ چاہتی تھی۔ وہ خاموش ہو رہی۔ اسے یہ بھی سنایا گیا کہ میران شاہ کے پرانے ندیم اس کے خلاف میران شاہ کے کان بھرتے رہتے ہیں اور وہ اختلاف کی خلیج کو اور وسیع کرنے کی فکر میں ہیں تاکہ خانزادہ کبھی محل میں نہ آ سکے اور وہ گل چھرے اڑاتے رہیں۔

میران شاہ کے جنون نے ایک اور کروٹ لی۔

اس نے حکم دیا کہ تبریز اور سلطانیہ کی تمام عمارات کو منہدم کر دیا جائے۔ ان عمارات میں شفاخانوں کی عمارتیں بھی شامل تھیں۔ ایک امیر نے درخواست کی کہ شفاخانوں کو نہ توڑا جائے۔ میران شاہ نے اس وزیر کو ہی نکال دیا۔

تمام عمارتیں مٹی کا ڈھیر ہو گئیں۔ تبریز اور سلطانیہ کے محلے قبرستان نظر آنے لگے۔ اس کے ندیم ہر حکم کی تعمیل کرتے اور ہر بات میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتے۔ حد تو یہ کہ میران شاہ نے ایک ایرانی فلسفی کی قبر کھدوا کر ہڈیاں نکلوائیں اور انہیں یہودیوں کے قبرستان میں دفن کرا دیا۔

میران شاہ کی ان حرکتوں سے پوری ولایت تبریز میں تہلکہ مچ گیا۔ میران شاہ کے پرانے تاتاری امیر ان باتوں سے عاجز آ گئے تھے۔ قلات خان ان کا قائد تھا۔ انہوں نے باہم مشورہ کیا اور طے ہوا کہ تبریز کے حالات سے امیر تیمور کو فوراً مطلع کیا جائے ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ امیر کو کسی اور ذریعے سے ان باتوں کا علم ہو جائے اور ان لوگوں سے باز پرس ہو۔ انہوں نے کچھ امیروں کو خفیہ طریقے سے سمرقند بھیج دیا۔

مثل مشہور ہے کہ سیانا کوا گو کھاتا ہے۔

درباری ندیموں نے خانزادہ کا ہمیشہ کے لیے پتا کاٹنے کا فیصلہ کیا اور ایک رات میران شاہ کے کا
میں یہ بات ڈال دی کہ بلاقو خان، شہزادی کے محل میں رہتا ہے۔

میران شاہ نشے میں دھت تھا۔ یہ سنتے ہی وہ بھڑک اٹھا اور اسی وقت سواری منگا کر خانزادہ کے محل
پہنچ گیا۔ وہاں سخت پہرہ تھا لیکن میران شاہ کو روکنے کی کسی میں ہمت نہ ہوئی۔ وہ دندناتا ہوا شہزادی کی طرف
چلا۔ چار خواجہ سرا اس کے ساتھ تھے۔

خانزادہ کی کنیزوں نے بھاگ کر اسے خبر کی۔ خانزادہ اور بلاقو خان اسی کے بارے میں گفتگو کر رہے
تھے۔ میران شاہ کے آنے کی خبر پا کر ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ مگر خانزادہ نے فوراً حواس درست
کیے اور امیرزادے کو بلاقو خان کے حوالے کر کے حکم دیا کہ فوراً اسے لے کر نکل جائیے۔

بلاقو خان نے بھی پھرتی دکھائی اور امیرزادے کو سنبھالے ہوئے پشت کے دروازے سے نکل گیا۔ ا
کے جاتے ہی میران شاہ کمرے میں داخل ہوا۔

میران شاہ نے تیز نظروں سے خانزادہ کو دیکھا۔ خانزادہ بھی شاید آج بغاوت پر آمادہ تھی۔ اس نے میران
کی تیز نظروں کا جواب اس سے زیادہ تیز نظروں سے دیا۔ کچھ لمحے دونوں ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ پھر
میران شاہ گرج کر بولا:

"تو گلی گلی بھیک مانگنے والی فقیرنی تھی۔ میں نے تجھے عزت دی۔ اپنی بیوی بنایا مگر تو نے مجھے اس کا
کیا صلہ دیا ہے؟"

"میران شاہ۔ ہوش میں آؤ" خانزادہ کڑک کر بولی:

"تم ایک امیر کے بیٹے ہو تو میں خوارزم کی شہزادی ہوں۔ عزت تم نے نہیں، میں نے تمہیں دی۔ تمہیں
نااہل ندیموں سے بچا کر انسان بنایا۔ . . . ."

"تو بدکار ہے خانزادہ" میران شاہ بات کاٹ کر بولا:

"تو نے میری عزت . . . . ."

"میران شاہ . . . ." خانزادہ شیرنی کی طرح میران شاہ پر جھپٹی اور اس کا گریبان پکڑ لیا:

"تم نے خانزادہ پر تہمت دھری۔ خوارزم کی شہزادی پر الزام لگایا۔ میں. . . . . میں. . . . ."

میران شاہ کے ساتھ آنے والے خواجہ سرا دوڑ کر درمیان میں آگئے۔ خانزادہ برابر میران شاہ کے گریبان
کو پکڑ کر اسے جھٹکے دے رہی تھی۔ میران شاہ نشے میں تو پہلے ہی تھا۔ ان مسلسل جھٹکوں سے اس پر بے ہوشی

طاری ہوگئی۔ خانزادہ نے جب اسے چھوڑا تو وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ خواجہ سراؤں نے اسے ہاتھوں پر سنبھالا۔

"لے جاؤ اس پاگل کو اپنے محل میں"۔ خانزادہ نے غصے سے کہا:

"خبردار جو اب اس نے یہاں آنے کی کوشش کی . . . . جاؤ . . . . . لے جاؤ"۔

خواجہ سرا میران شاہ کو سنبھالتے ہوئے باہر نکل گئے۔

خانزادہ کے لیے اب اس محل اور شہر میں رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس نے اپنی پرانی دو کنیزوں کو
لیا اور محل سے نکل کر بلاقو خان کی حویلی میں آگئی۔

بلاقو خان اس کے لیے بہت پریشان تھا۔ خانزادہ نے اسے مختصر طور پر محل کے حالات بتائے اور اسی
شہر چھوڑنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

بلاقو خان نے اس کے ساتھ چلنے کی پیش کش کی لیکن خانزادہ نے مناسب نہ خیال کیا اور چار محافظوں کے
میرزادے خلیل سلطان کو لے کر سمرقند روانہ ہوگئی۔

○

صاحبقراں امیر تیمور ہندو پاک کی فتح کے بعد واپس سمرقند آگیا تھا۔ سمرقند میں اس کا پرتپاک خیر مقدم ہوا
ہندستان سے ہاتھی بھی ساتھ لایا تھا۔ سمرقند والوں نے ان قوی الجثہ جانوروں کو بڑے تعجب سے دیکھا۔ امیر
فتح کی خوشی میں اپنے امیروں اور سرداروں میں انعامات تقسیم کیے اور جشن منانے کا اعلان کیا۔ سمرقند میں
شادیانے بجنے اور آتش بازیاں شروع ہوگئیں۔ دور دراز کے تمام امیروں اور صوبے داروں کو جشن میں شرکت کے لیے
بلا لیا گیا۔

اسی دوران تبریز سے قلات خان کا بھیجا ہوا وفد بھی سمرقند پہنچ گیا۔ وفد نے فوراً باریابی کی درخواست کی
تبریز میں اس کا بیٹا میران شاہ حاکم تھا اور تیمور کو ہر وقت اس کی فکر لگی رہتی تھی اس لیے فوراً وفد کو طلب کر لیا
تبریز کے چھ امیروں کا وفد حاضر ہوا۔ ان میں سے ہر ایک برہنہ سر اور برہنہ پا تھا۔ صدریوں کے چاک
سینے تک کھلے تھے اور بالوں میں خاک پڑی تھی۔

امیر تیمور انہیں اس حال میں دیکھ کر گھبرا گیا۔ یہ ہیئت اس وقت بنائی جاتی تھی جب کسی کی موت کی خبر
لائی جاتی ہو۔ تیمور کا پتھر دل بھی دھڑک اٹھا۔

وفد تیمور کے سامنے پہنچ کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ اس سے تیمور کے شک کو تقویت ملی مگر وہ اپنے کم تر امیر کے سامنے اپنی کمزوری ظاہر نہیں کرتا تھا۔

اس نے ایک لمحہ انتظار کیا۔ جب وفد میں سے کوئی نہ بولا تو اس نے بڑے تحمل سے کہا،

"خاموشی کا سحر توڑا جائے۔ ہم ہر خبر سننے کے لیے تیار ہیں۔ دو شہزادوں کا غم ہم پہلے ہی برداشت کر چکے ہیں۔ اگر میراں شاہ......"

"خدا شہزادے بہادر کو سلامت رکھے۔ وہ بقیدِ حیات ہیں۔" ایک امیر نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

تیمور کو اطمینان ہوا۔ بولا:

"پھر تم لوگوں نے یہ صورت کیوں بنائی ہے۔ کون مر گیا ہے؟"

"ولایت تبریز کو موت آ گئی ہے امیرِ محترم۔" دوسرے نے بے خوف ہو کر کہا۔

"کیا کہہ رہے ہو؟" تیمور کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

"کس نے تبریز پر حملہ کرنے کی ہمت کی؟"

"امیرِ محترم! تبریز کا سہاگ خود ولی عہد بہادر نے لوٹ لیا۔" ایک اور نے بتایا:

"خوب صورت عمارتیں زمیں بوس کر دی گئیں۔ شفا خانوں تک کو گرا دیا گیا ہے۔"

"کس کے حکم سے...... میراں شاہ...... کیا میراں شاہ......؟" غصے کی وجہ سے تیمور کی زبان سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ وہ تھرتھراتا ہوا کھڑا ہو گیا:

"ایسا کب ہوا؟" تیمور کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

"امیرِ عالی مقام! یہ کئی سال سے ہو رہا ہے۔" سردار نے کہنا شروع کیا:

"شہزادے بہادر کا حکم ہمارے لیے قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ ہم حکم عدولی نہ کر سکے۔ شہر برباد ہو گیا، خزانہ لٹا دیا گیا، گلی کوچے ویران ہو گئے۔ نااہل ندیموں نے شہزادے کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔"

"کیا اسے ہمارا خوف نہیں۔ کہیں وہ پاگل تو نہیں ہو گیا؟" تیمور کا غصہ دم بدم بڑھ رہا تھا۔

"امیرِ معظم! کچھ لوگ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔" تاتاری سردار نے سہمے لہجے میں کہا:

"وہ قبریں کھدوا کر ہڈیاں باہر نکلوا لیتے ہیں، پاک مقامات کی بے حرمتی کرتے ہیں۔ شہزادی عالیہ نے بہت کوشش کی لیکن وہ کسی کی نہیں سنتے۔"

دربارِ خاص میں تبریز کے وفد کی باتیں سن کر تیمور پیچ و تاب کھا رہا تھا اور اُدھر محل کے دروازے پر نقاب اور سیاہ لباس پہنے ایک عورت پہنچی۔ محافظوں نے بڑھ کر اس کا راستہ روکا مگر عورت نے نہ جانے کیا

کہا کہ وہ اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ دروازہ فوراً کھول دیا گیا۔ محافظ آگے آگے اور عورت اس کے پیچھے پیچھے محل میں داخل ہوئی۔

محل کے اندر تمام راہداریوں اور روشوں پر جو جہاں تھا وہیں ٹھٹک کے کھڑا ہو گیا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا کہ یہ پھٹے حال عورت کون ہے جس کے آگے آگے محافظوں کا داروغہ بڑے ادب سے چل رہا ہے جس کے اشارے پر سامنے کے تمام دروازے ایک ایک کر کے کھلتے چلے جا رہے ہیں۔

داروغہ ایک لمحے کے لیے بھی کہیں نہیں ٹھہرا اور عورت کی رہنمائی کرتا ہوا دربارِ خاص کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اس دروازے پر ایک باریک مگر مرصع پردہ پڑا ہوا تھا۔ محافظ نے ہاتھ بڑھا کر پردہ ہٹایا اور وہ دربارِ خاص میں داخل ہو گئی۔

امیر تیمور نے کمالِ حیرت سے نقاب پوش عورت کو دیکھا لیکن عورت نے تیمور کو زیادہ دیر حیرت میں نہ رکھا اور چہرے سے نقاب الٹ دیا۔

"شہزادی خانزادہ......" تیمور کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

خانزادہ کی عمر تیس سال سے اوپر ہو چکی تھی۔ وہ اس وقت مصائب میں گرفتار تھی لیکن اب بھی اس کا چہرہ چاند کی طرح روشن تھا۔ وہ ملک تاتار کی سب سے خوبصورت عورت تھی۔ وہ ولی عہد جہانگیر کی بیوہ اور تیمور کے تیسرے بیٹے میراں شاہ کی بیوی تھی۔ اسے اس حال میں دیکھ کر شاید تیمور کا دل بھی رو دیا تھا۔

"اے امیر!" خانزادہ نے بغیر کسی القاب و تمہید کے بڑی بے خوفی سے صاحبقراں امیر تیمور کو مخاطب کیا:

"آپ کے بیٹے کے خلاف فریادی اور دادطلب بن کر آئی ہوں۔ مجھے اپنی پناہ میں لیجیے۔ میں آپ سے جان کی بھیک مانگتی ہوں۔"

امیر تیمور بت بنا کھڑا تھا اور اس کی وہ بہو جسے وہ مرحوم شہزادے جہانگیر کے لیے بیاہ کر لایا تھا۔ اس کے سامنے میراں شاہ کے کرتوت بیان کر رہی تھی۔ پھر خانزادہ نے تیمور سے نظریں ملائیں اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غصے اور غم سے کانپتے ہوئے کہا،

"آپ کے ذلیل فرزند نے مجھ پر ذلیل تہمت لگائی ہے۔"

تیمور کو خانزادہ کے لگائے ہوئے الزامات کی تحقیق اور تصدیق کی کوئی ضرورت نہ پڑی۔ تبریز کا وفد اس کے سامنے کھڑا تھا اور وہ یہی باتیں پہلے بیان کر چکا تھا۔

تیمور ایک طویل سفر سے واپس آیا تھا لیکن وہ خانزادہ کی خستہ حالت برداشت نہ کر سکا۔ اس نے فوراً گھوڑا

طلب کیا اور چند سرداروں کو لے کر تبریز کی طرف روانہ ہو گیا۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے خانزادہ کے تمام اعزازات اور مراعات بحال کیں اور ان میں کچھ اضافہ بھی کر دیا۔

تیمور آندھی اور طوفان کی طرح ہزاروں میل کا سفر کر کے تبریز پہنچا۔ تبریز کی ویرانی دیکھ کر اس کے چہرے پر بھی ویرانی پھیل گئی۔ تبریز اور سلطانیہ کے ہزاروں فریادیوں نے تیمور کو گھیر لیا۔ تیمور نے لوگوں کے نقصانات کی تلافی کا حکم دیا۔ اور پھر ایک ایسا اعلان کیا جسے سن کر امیر اور سردار بدحواس ہو گئے۔ تیمور نے عوام اور خواص کو بالکل سپاٹ لہجے میں مخاطب کیا:

"عوام اور خواص کا نقصان ناقابلِ تلافی ہے اور میران شاہ کی حرکتیں تیموری وقار پر بدنما داغ ہیں۔ شہزادے میران شاہ کو اسی وقت سولی پر چڑھا دیا جائے۔"

لوگوں نے سر پیٹ لیے۔ بڑے بڑے سردار تیمور کی رکابوں سے لپٹ کر رونے لگے۔ عوام تیمور کے اس حکم سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنے نقصانات سے ہاتھ کھینچ لیے اور شہزادے کی زندگی کی بھیک مانگنے لگے۔

تیمور کا جلال کسی طرح کم نہ ہو رہا تھا۔ عوام دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ انہوں نے گریبان پھاڑ لیے تھے اور سر اور پیر سے ننگے ہو گئے تھے۔

شہزادہ میران شاہ پاگل مشہور ہو گیا تھا۔ اس نے حرکتیں ہی ایسی کی تھیں لیکن یہ تیموری جلال تھا کہ تبریز میں تیمور کے داخل ہوتے ہی اس کا دماغ بالکل ٹھکانے آ گیا۔ وہ محل کے ایک کونے میں چھپ گیا اور چیخیں مار مار کر رونے لگا۔

تیمور کے حکم سے میران شاہ کے گلے میں رسی باندھ کر اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ تیمور اب تک گھوڑے پر سوار تھا۔ میران شاہ نے خود کو تیمور کے گھوڑے کے سامنے گرا دیا اور معافی مانگنے لگا۔

عوام اور خواص کی بے انتہا سفارش پر میران شاہ کی جاں بخشی ہو گئی لیکن اس کے تمام اعزازات چھین لیے گئے اور اسے شاہی مراعات سے محروم کر دیا گیا۔ اس کی جگہ امیر قلات خان کو ولایتِ تبریز کی گورنری عطا ہوئی۔ اس جلتے، سلگتے اور گرم ماحول میں ایک ایسا واقعہ بھی پیش آیا جسے دیکھ اور سن کر لوگوں کے لبوں پر بے ساختہ تبسم آ گیا۔

تیمور نے میران شاہ کے تمام ندیموں اور اس کے خاص مسخرے کو سولی پر چڑھانے کا حکم دیا۔ میدان میں سولی گاڑ دی گئی۔ ندیم اور مسخرے پابہ زنجیر پیش کیے گئے۔ تیمور نے ان کی زنجیریں کھلوا دیں اور انہیں قطار میں کھڑا کر کے حکم دیا کہ ایک ایک کو باری باری سولی پر چڑھایا جائے۔

جلاد ان کے پاس جا کر کھڑا ہوا اور ایک سے کہا:

"سولی کی طرف چلو۔"

وہ ہاتھ جوڑ کر پیچھے ہٹ گیا اور دوسرے کی طرف اشارہ کر کے کہا:

"پہلے اسے سولی پر چڑھایا جائے۔"

جلاد جس کی طرف بڑھتا وہی عذر کر کے دوسرے کی طرف اشارہ کر دیتا۔ جلاد نے پریشان ہو کر امیر کی طرف دیکھا لیکن امیر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میران شاہ کا خاص مسخرہ بڑی شان سے اکڑتا ہوا سولی کے پاس آ گیا۔ لوگ اسے تعجب سے دیکھنے لگے۔

مسخرہ سولی کے پاس پہنچ کر رکا اور پلٹ کر تیمور سے بولا:

"اے صاحبقران! مجھے سولی پر چڑھنے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن یہ تو کوئی انصاف نہیں کہ یہ سب ندیم ہمیشہ انعامات میں آگے آگے رہتے تھے اور مجھے دھکے مار کر پیچھے ہٹاتے تھے لیکن اس وقت یہ سب پیچھے ہٹ گئے ہیں اور مجھے آگے کر دیا ہے۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ ان ندیموں کو مرتبے کے مطابق نمبر لگا کر سولی پر چڑھایا جائے اور مجھے آخری نمبر دیا جائے۔"

کہتے ہیں کہ تیمور مسخرے کی اس بات پر مسکرا دیا

اور ——

مسخرے کو معاف کر دیا گیا!

شادی ملک

صبح ہی سے ریگستان میں ہجوم ہونا شروع ہو گیا۔
ریگستان میں داخل ہونے والا ہر تاتاری دوسرے سے سرگوشیوں میں پوچھتا:
"آج ریگستان میں اتنا مجمع کیوں ہے۔ فتح کی خبر آئی ہے کیا؟"
جواب دینے والا بھی اسی رازداری سے کہتا:
"فتح تو ہمارے امیر کے قدم چومنے کے لیے تیار رہتی ہے۔ ایک قاصد برصغیر سے ضرور آیا ہے لیکن کچھ پتہ نہیں چلتا، کیا خبر ہے، کیا حکم ہے؟"
"سرداروں کو تو علم ہو گیا ہوگا؟"
"وہ کہتے ہیں کہ پیغام ہمارے امیر نے بھیجا ہے۔"
"پھر پردہ داری کیسی؟ خدانخواستہ کوئی حادثہ تو پیش نہیں آیا۔ کوئی ناگہانی بات تو نہیں ہوئی۔ امیر کے برصغیر سے آنے والے پیغامات تو فوراً سنا دیے جاتے ہیں۔ اسے راز میں کیوں رکھا جا رہا ہے؟"
ریگستان میں جوں جوں مجمع بڑھتا جا رہا تھا اسی اعتبار سے چہ میگوئیاں، شبہات اور وسوسے بھی بڑھتے رہے تھے۔ تاتاریوں کے ذہن میں یہ چیز بیٹھ گئی تھی کہ صاحبقراں امیر تیمور ناقابلِ شکست ہے۔ اس کی یلغار پہاڑ بھی نہیں روک سکتے لیکن جس وقت امیر تیمور نے برصغیر پر حملہ کرنے کے لیے اپنے امیروں سے رائے طلب کی تھی تو سرداروں نے دبے الفاظ میں اس کی مخالفت کی تھی۔
خانزادہ کے بیٹے اور امیر تیمور کے پوتے سلطان محمد نے ادب سے کہا تھا:

"اے امیر بابا! ہم برصغیر کو ضرور فتح کر لیں گے لیکن ہمارے لشکر کو بڑی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بڑے بڑے دریا، جنگل بیابان، ہندوکش کی ترائی کے زرہ پوش سپاہی اور پھر وہ دیوقامت ہاتھی جو انسانوں کو اپنے پیروں تلے روند ڈالتے ہیں۔"
"برصغیر بڑا گرم ملک ہے صاحبقراں۔" ایک اور امیر نے کہا تھا جو کئی بار برصغیر گھوم آیا تھا:
"وہاں ایک موسم اس قدر گرمی پڑنے لگتی ہے کہ زمین لوہے کی طرح تپنے لگتی ہے۔ اس گرمی سے انسان پگھل جاتا ہے اور اس کی طاقت سلب ہو جاتی ہے۔ وہاں پانی بھی کھارا اور خراب ہے۔ ان کی بولی ہماری زبان سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری فوج وہاں شاید زیادہ عرصہ نہ رہ سکے۔"
مگر تیمور نے نہ پوتے کی بات مانی اور نہ سردار کی باتوں پر کان دھرے۔ وہ بانوے ہزار سواروں کا لشکر لے کر برصغیر پہنچ گیا۔
برصغیر میں اس پر کیا گزری، اب تک کوئی ایسی واضح خبر نہ آئی تھی۔ اسی وجہ سے تاتاری سردار اور عوام پریشان تھے۔ قاصد کے آنے سے وہ اور زیادہ پریشان ہو گئے تھے کیونکہ قاصد جو پیغام لایا تھا اسے راز میں رکھا جا رہا تھا۔
قاصد کے آنے کی خبرِ وحشت اثر نے دوپہر تک ایک خطرناک افواہ کی صورت اختیار کر لی اور تمام چھوٹے بڑے تاتاری سردار اور دانشور، ریگستان میں صلاح اور مشورے کے لیے اکٹھے ہو گئے۔
"ریگستان" حقیقت میں کوئی صحرا یا ریگزار نہ تھا جہاں ریت کے تودے اڑتے ہیں اور انسان کو اسے دیکھ کر ہی وحشت ہونے لگتی ہے۔ یہ ریگستان سمرقند کا ایک پُرفضا مقام تھا۔ یہ ایک نیچی پہاڑی کے پورے پھیلاؤ پر محیط تھا۔ کہا جاتا ہے کہ امیر تیمور صحرانشینوں کی طرح گل و گلزار اور آبِ رواں کا بھی دلدادہ تھا۔ چنانچہ جب اس نے سمرقند کے نشیب میں اس میدان کو ایک عوامی تفریح گاہ میں تبدیل کیا تو اس میں مصنوعی چشمے بنوائے۔ جن میں ہر وقت پانی ابلتا رہتا۔ اس کے گرد مسجدوں اور دارالعلوم کی عمارتیں تعمیر کی گئی تھیں۔ یہاں پنج وقتہ اور عیدین کی نمازیں پڑھی جاتی تھیں۔ لوگ خوش گپیوں میں مصروف رہتے اور دنیا بھر کی خبروں اور سیاسی امور پر بڑی بے باکی سے تبصرے کرتے تھے۔ امرا اور سردار ایک دوسرے سے اسی جگہ ملاقات کرتے اور تاجر اپنے سودے بھی اسی جگہ چکاتے تھے۔
مگر آج صرف ایک موضوع ہے: "قاصد کیا خبر لایا؟"
ایک طرف سمرقند کے دانشوروں کا ایک گروہ بیٹھا ہے۔ اس میں بوڑھے امیر سیف الدین اور موید ارلات جیسے تجربہ کار اور جہاندیدہ امیر بھی ہیں جو ضعیفی کی وجہ سے فوجی خدمات سے سبکدوش کیے جا چکے ہیں لیکن یہ امیر تیمور

کے زیرِ کمان جہانگیری اور جہاں بانی کے جوہر دکھا چکے ہیں۔ انہی لوگوں کے گرد عوام کا زیادہ ہجوم ہے، یہ لوگ بھی قاصد کے پیغام سے ناواقف ہیں لیکن اپنے طور پر اندازے لگا رہے ہیں۔

امیر مویدارلات نے بھاری پپوٹے اٹھاتے ہوئے کہا:

"تاتاری فوج ہمارے امیر کی برکت سے درہ خیبر پار کر کے دریائے سندھ پر پل باندھ رہی ہوگی۔"

امیر سیف الدین نے پوپلے منہ سے قہقہہ لگایا جو اس کے منہ میں ہی گونج کر رہ گیا، بولا:

"تم سندھ کے پل کی بات کر رہے ہو۔ میں کہتا ہوں کہ اب تو ملتان فتح ہو چکا ہوگا اور ہمارے امیر اب سلطانِ دہلی پر چڑھائی کرنے کے لیے آگے بڑھ رہے ہوں گے۔"

"مگر وہ چلتے پھرتے پہاڑ۔ . . . ." سمرقند کا ایک بوڑھا آنکھیں پھاڑ کر بولا:

"بھلا امیر نے ان پر کیسے قابو پایا ہوگا؟"

ہاتھی کی طرف سے سب ہی پریشان تھے۔ یہ جانور تاتاریوں نے اب تک نہیں دیکھا تھا۔

"ہاتھی ہمارے امیر کا راستہ نہیں روک سکتے۔" ایک اور امیر بولا:

"ہمارے امیر برِصغیر سے اتنی دولت لائیں گے جس کے بل پر ہم ساری دنیا فتح کر سکیں گے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" دوسرے نے تائید کی:

"دنیا میں چھ عالی مرتبہ بادشاہ ہیں جن میں سے ابھی صرف ایک ہمارے امیر سے شکست کھا کر بھاگا ہے۔"

"بھلا یہ چھ عالی مرتبہ بادشاہ کون ہیں۔ کیا وہ ہمارے امیر سے بڑے ہیں؟" مویدارلات نے اعتراض کیا۔

"ہمارے خیال میں تو دنیا میں صرف ایک بادشاہ ہے اور وہ ہمارے امیر ہیں۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" پہلے نے تائید کرتے ہوئے کہا:

"مگر مشہور چھ بادشاہ ہیں۔ ایک شہنشاہِ قسطنطنیہ، دوسرا سلطانِ مصر، تیسرا شاہِ بغداد، چوتھا مہاراجہ بھارت، پانچواں فغفورِ چین اور چھٹے ہمارے امیر ہیں۔"

"محترم بزرگو۔" ایک سمرقندی نوجوان جو کسی وجہ سے تیمور کے ساتھ نہ جا سکا تھا، بڑے ادب سے بولا:

"یہ سب باتیں اپنی جگہ ٹھیک ہیں لیکن اصل مسئلہ پر تو تبصرہ کیجیے۔ یہ قاصد کیا پیغام لایا ہے؟"

بزرگ تاتاریوں نے ایک نوجوان کے بگڑتے ہوئے تیور دیکھے تو وہ جھلائے۔ اس نے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔ یہ لوگ واقعی غیر متعلق باتیں کر رہے تھے۔ ان کی باتوں میں عقل و تجربے کی بڑی خوبیاں موجود تھیں لیکن اس وقت تو تاتاری عوام اس پیغام کے لیے بے چین تھے جو ان کے امیر نے برِصغیر کے محاذ سے بھیجا تھا اور جس کی کسی کو ہوا تک نہ لگی تھی۔ قاصد سیدھا سرائے خانم کے پاس پہنچا تھا۔ سرائے خانم امیر کی غیر موجودگی میں باقاعدہ دربا

ں کی تھی اسے طبل و علم کی مراعات بھی حاصل تھیں۔

تیمور کا پیغام زبانی نہیں تحریری تھا۔ قاصد نے بند خط سرائے خانم کے حوالے کیا۔ سرائے خانم نے خط
پڑھا اور اس کا پہلا ردِ عمل یہ ہوا کہ قاصد کو شاہی مہمان خانے میں نظر بند کر دیا گیا اور پہرے داروں کو سخت تاکید کی
گئی کہ کوئی امیر یا سردار قاصد سے نہ مل سکے۔ اسی وجہ سے یہ عقدہ نہیں کھل رہا تھا کہ پیغام کس کے متعلق ہے اور
سے راز کیوں رکھا گیا ہے؟

امیر مویدارلات نے جوان کو مطمئن کرنے کے لیے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ہمارے امیر نے کچھ دن پہلے منگلی خان کی بیٹی سے شادی کی ہے، اس کی کوئی بات ہو
گی یا پھر چین کا شہنشاہ مر گیا ہے اس کے بارے میں کوئی پیغام ہوگا۔"

"تمہارا خیال درست معلوم ہوتا ہے امیر ارلات۔" امیر سیف الدین نے سر ہلاتے ہوئے کہا:

"ہمارے امیر ایک نئی شاہراہ چین تک کھولنا چاہتے ہیں۔ کشمیر میں بھی راستے تلاش کیے جا رہے ہیں۔"

"یا تو میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکتا یا پھر آپ لوگوں کی عقل عمر کے ساتھ ساتھ بوڑھی ہو گئی ہے۔" وہ جوان تاتاری
بگڑ کر بولا:

"بھلا ان باتوں کا ہمارے امیر کے پیغام سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ انہیں کسی مشورے کی ضرورت نہیں۔
ہر بات کا وہ خود فیصلہ کرتے ہیں اور ان کا ہر فیصلہ درست ہوتا ہے۔"

بوڑھے امیر اس نوجوان کا منہ دیکھ کے رہ گئے۔ جوان کا کہنا ٹھیک تھا۔ یہ تو تمام فوجی راز تھے۔ ان کے
بارے میں پیغام بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔

پورا دن اور پوری رات اسی ادھیڑ بن میں گزر گئی۔ قاصد اور پیغام سوالیہ نشان بن کر ہر ایک کی نظروں کے
سامنے گھومتے رہے۔

دوسری صبح حسبِ معمول پھر ریگستان میں چہل پہل شروع ہوئی لیکن سوال اسوال ہی بنا رہا۔ سوائے اس کے
کہ بعض لوگوں نے بتایا کہ رات کو شہر کوتوال نے کئی گھروں کی تلاشی لی ہے۔ لیکن کیوں؟ اس کا کسی کو علم نہ ہو سکا۔

آج امیر ارلات اور امیر سیف الدین کچھ چپ چپ سے تھے۔ ان کے تمام اندازے غلط ثابت ہوئے۔ قاصد
کے آنے کا مقصد اب تک پردۂ راز میں تھا۔ جہاں تک رات کی تلاشی کی خبر تھی، اس کی اطلاع انہیں بھی مل چکی تھی لیکن یہ
ایک انتظامی معاملہ تھا۔ ہو سکتا تھا کہ شہر کوتوال کو کسی مجرم کی تلاش ہو اور مجرم کی موجودگی سمرقند میں بتائی گئی ہو۔ یہ
دونوں بوڑھے امیر اب ان باتوں سے بالا تھے۔ انہیں خدمات کے صلے میں شاندار حویلیاں ملی تھیں۔ امیر سیف الدین
نے تو خود ایک عالی شان محل تعمیر کرا لیا تھا جس کے تمام اخراجات امیر تیمور کے خزانے سے ادا کیے گئے تھے۔ دونوں

امیر آہستہ آہستہ گفتگو کر رہے تھے لیکن ان کی گفتگو قاصد کے بجائے امیر کے برِ صغیر کے حملے کے گرد گھوم رہی تھی۔

ان امیروں کے بڑے ٹھاٹ باٹ تھے۔ ایک دو ملازم ہر وقت ان کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ امیر سیف الدین نے دوپہر کا کھانا ریگستان میں ہی منگا لیا۔ دونوں امیر وہیں بیٹھ کے کھانا کھانے لگے۔ ابھی کھانا ختم نہ ہوا تھا کہ امیر سیف الدین کے محل سے ایک غلام دوڑتا ہوا آیا اور اس نے جھک کر سیف الدین کے کان میں کچھ کہا۔

امیر سیف الدین نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور غصے سے کانپتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"کیا بات ہے سیف الدین؟" امیر ارلات نے اس کے تیور بگڑتے دیکھ کر پوچھا۔

"یہ۔۔۔۔ یہ توہین ہے امیر ارلات سراسر توہین۔" سیف الدین کا چہرہ سرخ ہو گیا:

"اس کی اتنی جرأت۔ نہیں نہیں۔ یہ ناقابلِ برداشت ہے۔"

"کچھ بتاؤ تو سہی۔" امیر ارلات نے بھی کھانا چھوڑ دیا:

"کس نے توہین کی تمہاری؟"

"غضب خدا کا۔ شہر کوتوال اور میرے گھر کی تلاشی لے۔" سیف الدین کا ہاتھ فوراً خنجر پر پہنچ گیا:

"میں اس کی انتڑیاں باہر نکال دوں گا۔"

"اچھا تو اب یہ سلوک ہوگا ہمارے ساتھ۔" امیر ارلات نے حیرت سے کہا:

"صاحبقران نہیں ہیں تو اس طرح توہین کی جائے گی ہماری۔"

"میں جا رہا ہوں۔ دیکھتا ہوں کیسے تلاشی لی جاتی ہے۔" سیف الدین تیز قدموں سے گھر کی طرف چلا۔

"ٹھہرو سیف الدین۔" ارلات نے اس کے پیچھے لپکتے ہوئے کہا:

"یہ ہم سب کا معاملہ ہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ آج تمہارے گھر کوتوال آیا ہے تو کل میرے گھر بھی پہنچ سکتا ہے۔"

دونوں امیر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

شہر کوتوال، امیر سیف الدین کے محل کو گھیرے کھڑا تھا۔ صدر دروازے پر سیف الدین کے پانچ پہریدار تلواریں کھینچے کھڑے تھے۔ انہوں نے تلاشی دینے سے انکار کر دیا تھا اور صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جب تک امیر سیف الدین نہیں آتے کوئی شخص محل میں داخل نہیں ہو سکتا۔ شہر کوتوال نے غلام بھیج کر سیف الدین کو بلوایا تھا، کیونکہ سیف الدین کے پہرے دار مزاحمت پر آمادہ تھے۔

امیر سیف الدین اور امیر ارلات کو آتا دیکھ کر شہر کوتوال گھوڑے سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ جب یہ لوگ قریب

نچ تو کوتوال ادب سے بولا:

"میں امیرانِ گرامی کو سلام پیش کرتا ہوں۔"

"تم مسلح سپاہیوں کو لے کر میرے گھر پر کیوں آئے ہو؟" سیف الدین نے سلام کا جواب دینے کے بجائے
ژال سے سوال کیا۔ اس کا پورا بدن غصے سے کانپ رہا تھا۔

"امیر محترم۔۔۔۔"

"تمہیں میرے احترام کا خیال تھا تو آنے سے پہلے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی؟" سیف الدین نے اس کی
کاٹ دی:

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے مجرم کو میں نے اپنے گھر میں چھپا رکھا ہے یا میرے گھر سے چوری کا مال برآمد
ا چاہتے ہو؟"

"میں مجبور ہوں امیرِ محترم۔" کوتوال سنجیدگی سے بولا:

"میں حکم کی تعمیل پر مجبور ہوں۔"

"کس کا حکم ہے؟" امیر سیف الدین نے چیخ کر کہا:

"ہم وفادار امیروں پر صرف صاحبقران امیر تیمور کا حکم چلتا ہے۔ ہم اور کسی کا حکم ماننے کے لیے تیار نہیں۔"

"حکم بڑی بیگم ملکہ سرائے خانم کا ہے۔" کوتوال نے اب بھی ادب کو ملحوظ رکھا۔

"ملکہ سرائے خانم نے حکم دیا ہے؟" سیف الدین کا منہ حیرت سے کھل گیا:

"ملکۂ عالم نے ہم پر شک کیا ہے؟"

"حکم ملکۂ عالم اور پیغام صاحبقران امیر تیمور گورگان کا ہے۔" کوتوال نے وضاحت کی:

"شاہی قاصد کوہ ہندوکش کے اس پار سے صاحبقران کا پیغام لایا ہے کہ 'شادی ملک' کو فی الفور
لا کر دیا جائے۔"

"شادی ملک!" امیر سیف الدین کی آنکھیں پھیل گئیں اور پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اس نے
با خود پر قابو پا لیا۔ پھر مردہ سی آواز میں بولا:

"کوتوال۔ مجھے اپنی سخت کلامی پر افسوس ہے۔ تم تلاشی لے سکتے ہو۔ ہم اندر پردہ کرائے دیتے ہیں۔"

"پردے کی ضرورت نہیں امیرِ محترم۔" کوتوال مسکرایا:

"ہمارے ساتھ تلاشی لینے والی عورتیں بھی ہیں۔"

سیف الدین اور ارلات نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ کوتوال شہر کے سپاہیوں کے ساتھ چار عورتیں بھی تھیں۔

سیف الدین نے اپنے پہرے داروں کو اشارہ کیا۔ وہ دروازہ چھوڑ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے اور تلواریں نیام میں کر لیں۔ شہر کوتوال کچھ سپاہیوں کو لے کر محل کے احاطے میں چلا گیا اور اس کے ساتھ کی عورتیں زنان خانے میں داخل ہو گئیں۔

امیر ارلات جو اب تک آنکھیں پھاڑے ایک ایک کا منہ تک رہا تھا، شہر کوتوال کے اندر جانے کے بعد اس نے پوچھا:

"سیف الدین! یہ کیا قصہ ہے۔ صاحبقران نے کس کے قتل کا حکم دیا ہے۔ شادی ملک کون ہے۔ تم پر شبہ کیوں کیا گیا ہے؟"

امیر سیف الدین بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس نے شاید امیر ارلات کی بات نہیں سنی۔ اس نے سر اٹھا کر امیر ارلات کو دیکھا ضرور لیکن جب بولا تو اس انداز سے جیسے خود اپنے آپ سے گفتگو کر رہا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا:

"سیف الدین! یہ تمہاری غلطی ہے۔ تم نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ شہزادے تو اپنی مرضی کے مالک ہوتے ہیں۔ انہیں تو کوئی نہ کوئی بچا لے گا۔ تم صاحبقران کو کیا جواب دو گے۔ عمر بھر کی وفاداریاں خاک میں مل جائیں گی۔"

امیر ارلات پہلے تو سیف الدین کی بڑبڑاہٹ سنتا رہا کہ شاید کوئی مطلب کی بات معلوم ہو جائے۔ جب اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو اس نے سیف الدین کا شانہ پکڑ کر ہلایا:

"کہاں ہو سیف الدین۔ کیا غلطی ہوئی تم سے۔ کچھ مجھے بھی بتاؤ۔ میں تمہارا دوست ہوں۔ کوئی مشورہ ہی دے سکتا ہوں۔ صاحبقران میری بات بہت مانتے ہیں۔"

"نہیں ارلات۔ تم اس معاملے میں ہاتھ نہ ڈالنا۔" سیف الدین نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا:

"اس میں کسی کی سفارش کام نہیں کرے گی۔ اس آگ میں جو ہاتھ ڈالے گا جل جائے گا۔"

"سیف الدین"۔ امیر ارلات نے اس کی پیٹھ پہ ہاتھ رکھ کر کہا:

"ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ضرورت کے وقت انسان دیوانوں سے بھی مشورہ کرتا ہے۔ میں تو تمہارا پرانا ساتھی ہوں۔ کم از کم یہ تو بتاؤ کہ شادی ملک کون ہے۔ اس کے قتل کا حکم صاحبقران نے کیوں دیا ہے؟"

"شادی ملک"۔ سیف الدین نے منہ بنایا:

"یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔ ایران کی جادوگرنی۔ شہزادہ خلیل سلطان کو اس نے اپنے جال میں پھانس

لیا ہے۔"

"تو شادی ملک کوئی عورت ہے؟"

"عورت نہیں ایک بھڑکتا شعلہ ہے۔ جو دیکھتا ہے اس کا دیوانہ ہو جاتا ہے۔"

شہر کوتوال تلاشی لے کر واپس آ رہا تھا۔ دونوں امیر خاموش ہو گئے۔

"میں معذرت چاہتا ہوں امیر محترم"۔ کوتوال نے قریب پہنچ کر کہا۔

"چھوٹی بیگم شہزادی خانزادہ کے محل کی تلاشی ہو گئی!" سیف الدین نے کوتوال کی بات سنی ان سنی کر دی۔

"جی ہاں۔ شادی ملک وہاں نہیں ہے۔" شہر کوتوال جواب دے کے اپنے گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس کے سپاہی اور عورتیں بھی گھوڑے پر سوار ہو کر اس کے پیچھے چلی گئیں۔

"ہاں سیف الدین"۔ امیر ارلات نے اطمینان کا سانس لیا:

"اب بتاؤ یہ شادی ملک اور شہزادہ خلیل سلطان کا کیا قصہ ہے؟"

"اس وقت نہیں ارلات"۔ سیف الدین نے نرمی سے کہا:

"میں بڑی بیگم کے پاس جا رہا ہوں۔ شام کو ملاقات ہوگی تو پوری تفصیل بتاؤں گا۔"

○

امیر تیمور کے بڑے بیٹے جہانگیر کی وفات کے بعد اس کی بیوہ شہزادی خانزادہ نے تیمور کے دوسرے بیٹے میران شاہ سے شادی کر لی تھی لیکن یہ بیل منڈھے نہیں چڑھی اور دونوں میں شدید اختلاف پیدا ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خانزادہ نے اپنے شوہر کی شکایت امیر تیمور سے کی اور میران شاہ کو نہ صرف تبریز کی گورنری سے معزول کیا گیا بلکہ اسے حق وراثت سے بھی محروم کر دیا گیا۔ اس وقت تک میران شاہ کا ایک بیٹا شہزادی خانزادہ کے بطن سے پیدا ہو چکا تھا۔ اس کا نام شہزادہ کرا خلیل رکھا گیا۔

تیمور کا یہ پوتا اب چودہ سال کا ہو چکا تھا اور شہزادہ خلیل سلطان کے نام سے مشہور تھا۔ شہزادہ خلیل سلطان اپنی ماں خانزادہ کے ساتھ سمرقند میں رہتا تھا۔ اس کی پرورش بھی شہزادوں کی طرح ہوئی تھی لیکن اس کے بچپن ہی سے بگڑے ہوئے تھے۔ خانزادہ کا پہلا شوہر مر چکا تھا اور دوسرا شوہر اس نے چھوڑ دیا تھا۔ ان باتوں نے اس کے دل و دماغ پر برا اثر ڈالا۔ اس لیے شہزادہ خلیل کا کردار عمر کے ساتھ ساتھ بگڑتا چلا گیا۔ خلیل سلطان

کے دو سوتیلے بھائی شہزادہ پیر محمد اور شہزادہ سلطان محمد اپنے دادا کے ساتھ میدانِ جنگ میں شجاعت کے جوہر دکھا رہے تھے اور یہ محل میں پڑا دادِ عیش دیا کرتا تھا۔

خلیل سلطان چونکہ سب سے کم عمر شہزادہ تھا اس لیے شاہی محل کی تمام بیگمات اس سے محبت کرتی تھیں۔ اس بے جا لاڈ پیار نے خلیل سلطان کو اور زیادہ بگاڑ دیا تھا۔ امیر تیمور کا قیام سمرقند میں کم رہتا تھا تاہم اس کے جاسوس تمام شہزادوں کے حالات سے اسے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ برِصغیر پر حملے سے پہلے اسے علم ہو گیا تھا کہ شہزادہ خلیل کے اطوار اچھے نہیں اور یہ کسی وقت بھی کوئی گل کھلا سکتا ہے۔

تیمور اپنے ساتھ شہزادہ خلیل کو لے جانا چاہتا تھا لیکن بعض بیگمات خصوصاً خانزادہ کے اس عذر پر کہ خلیل ابھی بچہ ہے اسے اتنے طویل سفر پر نہ لے جایا جائے۔ تیمور خاموش ہو گیا۔ حالانکہ شہزادہ خلیل کے دونوں بھائی پیر محمد اور سلطان محمد تو صرف بارہ برس کی عمر سے تیموری رکاب سے رکاب ملا کر چلنے لگے تھے۔ تیمور کی عدم موجودگی میں شہزادے نے اور زیادہ ہاتھ پیر نکالے۔ محلات کی کنیزیں ہر وقت اسے گھیرے رہتیں اور وہ علی الاعلان کنیزوں کو ساتھ لیے سمرقند اور دوسرے شہروں میں سیر کرتا پھرتا۔

ادھر کچھ دنوں سے شہزادہ خلیل کا ایک کنیز سے زبردست معاشقہ چل رہا تھا۔ سیاہ بالوں والی یہ ایرانی کنیز اپنے حسن کا آپ ہی جواب تھی۔

مرمریں رخساروں والی اس کنیز کا نام شادی ملک تھا۔

بزرگ ترین امیر سیف الدین ایران گیا تھا۔ وہاں کسی رئیس نے یہ کنیز اس کی خدمت میں پیش کی تھی۔ شادی ملک کے حسب و نسب کا تو پتہ نہیں تھا لیکن اس کی پرورش محل میں ہوئی تھی اور وہ شاہی تکلفات نشست و برخاست، طریق و آداب اور مزاج شناسی کا ملکہ رکھتی تھی۔ شکل و صورت کے علاوہ شادی ملک حسنِ کلام کی بھی ماہر تھی اور اپنی گفتگو سے بہت جلد اپنے مخاطب کو متاثر کر لیتی تھی۔

امیر سیف الدین اسے سمرقند لے کر آیا تو شہزادے کی نظر اس پر اچانک پڑ گئی۔ شہزادہ امیر سے ملنے آیا تھا۔ امیر نے شہزادے کے لیے مشروب منگوایا۔ امیر کے محل میں اور بھی کنیزیں تھیں لیکن شادی ملک نے سب کو روک دیا اور شہزادے کے لیے خود مشروب لے کر گئی۔

شہزادہ خلیل اسے دیکھتے ہی ریشہ خطمی ہو گیا۔ پھر جس غمزے اور سلیقے سے شادی ملک نے شہزادے کو مشروب پیش کیا اسے دیکھ کر امیر سیف الدین بھی دنگ رہ گیا۔

شادی ملک نے بالکل وہی انداز اختیار کیا جو کسی شہنشاہ کے سامنے ایک تربیت یافتہ کنیز اختیار کرتی ہے۔ شہزادہ اس کے حسن اور سلیقہ مندی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے چلتے وقت امیر سے شادی ملک

اپنے لیے مانگا۔

امیر سیف الدین کے لیے یہ ایک مسئلہ اور امتحان بن گیا۔ ایک کنیز دے دینا اس کے لیے کوئی اہم بات نہ تھی لیکن اسے یہ خیال پریشان کرنے لگا کہ کہیں صاحبقراں امیر تیمور کو یہ شبہ نہ ہو کہ سیف الدین نے شہزادے کو کنیز کا تحفہ دے کر اسے اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات اس کے لیے ن کا باعث تھی۔

سیف الدین نے اس وقت تو شہزادے کو ٹال دیا۔ دوسرے دن شہزادی خانزادہ سے ملا۔ زادہ خلیل اپنی ماں سے شادی ملک کا ذکر پہلے ہی کر چکا تھا۔ جب سیف الدین اس سے ملنے پہنچا تو اد نے خود ہی شہزادے کی سفارش کی۔ اس طرح شادی ملک شہزادے کے حوالے کر دی گئی۔

اور اب برِصغیر کے محاذ سے صاحبقراں کا پیغام آیا تھا کہ شادی ملک کو قتل کر دیا جائے۔

جس وقت امیر تیمور کا قاصد ملکہ سرائے خانم کے محل کی طرف گھوڑا دوڑاتا جا رہا تھا اس وقت نوعمر وہ خلیل سلطان اور ایرانی ماہ پارہ شادی ملک گوشۂ خلوت میں ایک سنگِ مرمر کے چبوترے پر مال اور مستقبل کے سنہری مگر خیالی قلعے تعمیر کر رہے تھے۔

شہزادے نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا:

"شادی ملک۔ تمہیں معلوم نہیں کہ امیر دادا مجھ سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔ وہ میرا کہا ٹال ہی نہیں شادی کی اجازت ضرور مل جائے گی۔"

"شہزادے۔ آپ شاہوں کے مزاج سے واقف نہیں۔" شادی ملک بڑی بڑی پلکیں جھپکاتے ہوئے لہجے سے بولی:

"امیر، آپ سے اس لیے محبت کرتے ہوں گے کہ آپ سب سے چھوٹے شہزادے ہیں۔ ان کے لیے ابھی "بچہ" ہیں اور بچوں کو تو کھلونے دے کر بھی بہلایا جا سکتا ہے۔"

"امیر دادا کو میں تم سے زیادہ جانتا ہوں شادی ملک۔" شہزادہ مصنوعی غصے سے بولا:

"ایک بار میں نے ان سے ضد کی تھی کہ مجھے تبریز کا گورنر بنا دیا جائے۔ امیر دادا نے فوراً فرمان جاری ... وہ تو امی حضور نے مجھے اپنے سے جدا نہیں کیا ورنہ میں اس وقت تبریز کا گورنر ہوتا۔"

"تبریز کی گورنری اور میرے ساتھ آپ کی شادی دو مختلف باتیں ہیں شہزادے۔" شادی ملک اسے ... ہوئے بولی:

گورنری تھا کرنے میں صاحبقراں کے پاس سے کچھ نہیں جاتا تھا لیکن ایک مغل شہزادے کو ایک کنیز

کے حوالے کرتے ہوئے انہیں سو بار سوچنا پڑے گا شہزادے! میں ایرانی ہوں۔ اگر تاتاری ہوتی تو بھی شاید کچھ غور کیا جا سکتا تھا۔ پھر یہ بھی سوچیے کہ اگر انہوں نے آج آپ کو ایک کنیز کے ساتھ شادی کی اجازت دے دی تو پھر یہ رسم پڑ جائے گی اور ہر مغل تاتاری شہزادہ کنیزوں سے شادی کرنے کی اجازت حاصل کرے گا۔"

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔" شہزادہ بے دلی سے بولا:

"میں نے طے کر لیا ہے کہ میں تم سے شادی کروں گا۔ اب یہ شادی ہو کے رہے گی۔"

"اور اگر صاحبقراں کا جواب انکار میں آیا تو؟"

"تو بھی یہ شادی ہوگی۔ میں نے امی حضور سے کہہ دیا ہے۔"

"مگر میں آپ سے شادی نہیں کروں گی۔" شادی ملک بڑے وقار سے بولی:

"میں نے آپ سے پہلے ہی دن کہہ دیا تھا کہ میں آپ کے پاس صرف اس صورت میں رہ سکتی ہوں کہ آپ مجھ سے باقاعدہ شادی کر لیں اور اس شادی میں دربار کے تمام امراء اور شاہی خاندان کے تمام افراد شریک ہوں۔"

شادی ملک نے یہ بات شہزادے سے خود نہیں کہی تھی بلکہ امیر سیف الدین نے کہلوائی تھی جس وقت شہزادے نے شادی ملک کو سیف الدین سے مانگا تھا تو سیف الدین نے شادی ملک کی رائے معلوم کی تھی۔ شادی ملک نے اس وقت یہ بات واضح کر دی تھی کہ وہ شہزادے کی عام کنیزوں میں شامل ہونا نہیں چاہتی اور وہ کنیز کی حیثیت سے سیف الدین کی خدمت گزاری کو فوقیت دیتی ہے۔ ہاں اگر شہزادہ اسے حاصل کرنا چاہے تو اسے باقاعدہ شادی کرنا ہوگی اور اس شادی میں تمام امراء اور شاہی خاندان کے افراد کی شرکت ضروری ہوگی۔

دراصل شادی ملک بڑی عقل مند لڑکی تھی۔ وہ اپنے خداداد حسن اور دانائی کا صحیح مصرف کرنا چاہتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ شہزادے سے ڈنکے کی چوٹ پر شادی کر کے شاہی خاندان میں شامل ہو جائے۔ ایک بیان یہ بھی ہے کہ شہزادہ خلیل نے امیر تیمور کے برصغیر پر حملے سے پہلے شادی ملک سے شادی کی اجازت مانگی تھی لیکن ابھی کوئی فیصلہ نہ ہوا تھا کہ تیمور محاذ پر چلا گیا۔

شادی ملک خانزادہ کے ساتھ رہتی تھی۔ اس نے خانزادہ پر واضح کر دیا تھا کہ اسے شہزادے سے محبت ہے۔ وہ شہزادے سے شادی کر کے ہی اس کے ساتھ رہ سکتی ہے۔ اگر اسے عام کنیزوں کی طرح شہزادے کے حوالے کیا گیا تو وہ زہر کھا کر مر جائے گی۔

خانزادہ کو بھی یہ لڑکی پسند تھی لیکن شہزادہ خلیل، صاحبقراں کا پوتا تھا۔ اسے اطلاع دیے بغیر یہ ...ی نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی لیے تیمور کے سامنے ان دونوں کی شادی کی تجویز رکھی گئی تھی جو تیمور کے جانے سے ...میں پڑ گئی تھی۔ یوں شادی ملک اور شہزادہ خلیل روز ملتے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ شہزادہ پروانے کی ...ن شمع حسن کے گرد منڈلاتا رہتا تھا لیکن شادی ملک کی دھمکی کی وجہ سے وہ حد سے آگے نہ بڑھتا تھا۔

شہزادہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر افسردگی سے بولا:

"شادی ملک۔ آج تمہیں میری ایک بات کا صاف صاف جواب دینا ہوگا۔"

شادی ملک مسکرائی۔ بولی:

"آپ کی کس بات کا جواب میں نے نہیں دیا۔ اگر آپ کا سوال پھر شادی کے بارے میں ہے تو میرا ...ہے کہ اس سلسلے میں آپ کے ہر ممکن سوال کا جواب دے چکی ہوں۔"

"تم مجھ سے بحث نہ کیا کرو شادی ملک۔" شہزادہ چڑ سا گیا:

"تمہیں نہیں معلوم کہ میں کس قدر افسردہ ہوں۔ میرا دل کسی کام میں نہیں لگتا۔"

"چلیے سیر کرتے ہیں۔" شادی ملک کھڑے ہوتے ہوئے بولی:

"گوشۂ عزلت کی ہر چیز صناعی کا بہترین نمونہ ہے۔ ان نادر چیزوں کو دیکھ کر مجھے بڑی فرحت حاصل ہے۔"

پھر وہ دونوں قدم ملا کر اس طرح چلنے لگے جیسے فوجی پریڈ کرتے ہیں۔

شادی ملک جس پودے یا پرندے کے پاس سے گزرتی اس کی جی کھول کر تعریف کرتی لیکن شہزادہ واقعی ...تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے شہزادہ واقعی اس کی محبت اور عشق میں گرفتار ہو گیا ہے۔ حالانکہ شاہی ...ہی جہاں شہزادے کے گرد حسین کنیزوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا وہاں عشق و محبت جیسی باتوں کا تصور ...ل تھا۔

"گوشۂ عزلت" سمرقند کی حسین عمارتوں میں سے ایک تھی۔ خالص سنگِ مرمر کی یہ عمارت شاہی خزانے ...طے میں واقع تھی۔ شاہی خزانے کے اندر جانے کی کسی کو اجازت نہ تھی لیکن گوشۂ عزلت کی سیر کو شاہی ...کے افراد جا سکتے تھے سوائے ان دنوں کے جب صاحبقراں امیر تیمور سمرقند میں موجود ہوتے۔ سمرقند میں ...دوران تیمور اکثر اس خوبصورت عمارت میں آرام کرنے آتا۔ گوشۂ عزلت کے صحن میں ایک ایسا درخت لگایا ...ا کا تنا خالص سونے کا تھا۔ اس کے تمام پتے اور شاخیں چاندی کی تھیں۔ پھلوں کی جگہ بڑے بڑے سچے ...بہترین قسم کے جواہرات لگائے گئے تھے۔ جس وقت اس درخت پر سورج کی شعاعیں پڑتیں تو یہ عجیب

دل بہار چمک دکھاتا اور آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ دیکھنے والے کو یوں معلوم ہوتا جیسے درخت میں ہیرا اور موتی لٹکے ہوئے ہیں۔ کمال تو یہ تھا کہ ان پھلوں کے گرد پرندے بھی لٹکائے گئے تھے۔ یہ پرندے چاندی کے بنائے گئے تھے اور ان پر سبز اور سرخ رنگ کی میناکاری کی گئی تھی۔ یہ پرندے اپنے پَر پھیلائے اس طرح بیٹھے تھے جیسے وہ پھلوں پر چونچ مار رہے ہوں۔

"تم میرے سوال کا جواب نہیں دینا چاہتیں؟" شہزادے نے رک کر شادی ملک کو دیکھا۔

"کنیز کی کیا مجال ہے کہ شہزادے کے سوال پر خاموشی اختیار کرے۔" شادی ملک مسکرائی۔

"پھر یہ بتاؤ کہ اگر امیر زادانے انکار کر دیا تو کیا تم مجھے چھوڑ دوگی؟" شہزادے کی نظریں شادی ملک کے چہرے پر رک گئیں:

"جھوٹ مت بولنا شادی ملک۔ مجھے صاف جواب چاہیے۔"

"شہزادے!" شادی ملک گمبھیر آواز میں بولی:

"خدا نے پانچوں انگلیاں ایک طرح کی نہیں بنائیں۔ سب کنیزیں بھی ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ میں کہہ چکی کہ اگر مجھے کنیز ہی رہنا تھا تو میں بابا امیر سیف الدین کو چھوڑ کر کبھی نہیں آتی، چاہے آپ مجھے قتل کرا دیتے۔ میں اپنی خوشی سے آپ کے پاس آئی ہوں اور یہ سوچ کے آئی ہوں کہ جب تک زندہ رہوں گی آپ ہی کا نام لے کر جیوں گی اور خدانخواستہ وہ وقت آیا تو میرا جنازہ بھی آپ کے ساتھ ہی اٹھے گا۔"

شہزادے کا پژمردہ چہرہ چمک اٹھا۔ اس نے بڑے پیار سے شادی ملک کو دیکھا:

"شادی ملک! تم کتنی اچھی ہو۔ تم ہی میری بیوی بننے کے قابل ہو۔"

"بس تو پھر صاحبقراں کے جواب کا انتظار کیجیے۔ میری فکر کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کی ہوں اور آپ کی رہوں گی۔"

شادی ملک کا جملہ پورا ہوا تھا کہ صاحبقراں امیر تیمور کا جواب برصغیر کے محاذ سے آ گیا۔ شہزادہ خلیل کا ایک غلام گھبرایا ہوا گوشۂ عزلت میں داخل ہوا۔ حالانکہ جس وقت شہزادہ اور شادی ملک اس عمارت میں آتے باہر پہرہ لگا دیا جاتا تھا تاکہ ان کی گفتگو میں کوئی مخل نہ ہو سکے لیکن غلام بے خوف گوشۂ عزلت میں آ گیا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اور شہزادے کو دیکھتے ہی دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔

شہزادے کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ شادی ملک نے اس کا ہاتھ دبایا اور بولی:

"خیر تو ہے۔ تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو۔ کوئی خاص خبر ہے؟"

"خانم..... خانم.....؟" پھر اس نے شہزادے کی طرف دیکھ کے کہا:

"شہزادے بہادر جلدی کیجیے۔ شادی ملک کو کہیں چھپا دیجیے..... وہ..... وہ صاحبقراں کا قاصد آیا ہے۔"

غلام جلدی سے شادی ملک کی طرف گھوما:

"خانم..... خانم..... آپ کے قتل.....؟" غلام آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے سر جھکا لیا۔

"سنا آپ نے شہزادے!" شادی ملک بڑے تحمل سے بولی:

"صاحبقراں نے ہمارے قتل کا حکم دیا ہے۔"

شہزادے خلیل سلطان کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے کبھی غلام کو دیکھتا اور کبھی شادی ملک کو۔

شادی ملک نے اپنے قتل کا حکم بڑے سکون سے سنا لیکن جلد ہی اس پر موت کا خوف طاری ہو گیا۔ اس کا رنگ سفید پڑ گیا اور جسم کانپنے لگا۔

"اب کیا ہو گا شہزادے؟" شادی ملک گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی۔

شہزادہ خلیل اپنے خیالات سے چونک پڑا۔ اس نے کچھ عجیب سی نظروں سے شادی ملک کو دیکھا۔ شادی ملک نے شہزادے کی ایسی نظریں پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں۔ شہزادے کی آنکھوں سے بغاوت جھانک رہی تھی۔

"شہزادے ہوش میں آئیے۔ آپ کی آنکھوں سے مجھے خوف آ رہا ہے۔" اور شادی ملک کی اپنی آنکھیں ڈبڈبا گئیں پھر سسکیوں کے ساتھ اس کے آنسو رواں ہو گئے۔

"شادی ملک تمہیں کوئی قتل نہیں کر سکتا۔" شہزادے نے کمر میں لگا ہوا خنجر نکال لیا:

"تمہاری طرف بڑھنے والے ہاتھ کو میں کاٹ دوں گا۔"

"بچوں جیسی باتیں مت کرو خلیل"۔ شادی ملک شاہی القاب و آداب کو توڑتی ہوئی بولی:

"تمہارا یہ خنجر کیا۔ اگر تمام دنیا کی تلواریں بھی مجھے بچانے کے لیے بلند ہو جائیں تو بھی میں قتل ہو جاؤں گی"۔

"میں تمہاری حفاظت کروں گا شادی ملک۔" شہزادے کے انداز میں اب بھی بچپنا تھا:

"میں ڈھال بن کے تمہارے سامنے کھڑا ہو جاؤں گا۔ صاحبقراں اگر اپنا حکم واپس نہ لیں گے تو میں ان سے بغاوت کر دوں گا۔"

"شہزادہ عالم.....؟" غلام نے دخل دیا:

"آپ کی والدہ محترمہ شہزادی خانزادہ نے مشورہ دیا ہے کہ آپ خانم شادی ملک کو کہیں پوشیدہ کر دیں۔"

"کیا ہم امی حضور کے پاس نہیں جا سکتے۔ ان کے محل سے زیادہ محفوظ اور کون سی جگہ ہو سکتی ہے؟" شہزادے

نے غلام سے جرح کے انداز میں سوال کیا۔

"شہزادۂ عالم۔ میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں" غلام بے بسی سے بولا:

"شہزادی خانزادہ نے فرمایا ہے کہ آپ شادی ملک کو ان کے محل میں ہرگز نہ آنے دیں کیونکہ خانم کے سب سے پہلے ان کے ہی محل میں تلاش کیا جائے گا۔"

شہزادے نے مایوس ہو کر شادی ملک کو دیکھا۔ شادی ملک کو اپنی موت یقینی نظر آ رہی تھی۔ ایسے حالات میں انسان میں عام طور پر حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس نے سنبھل کے کہا:

"شہزادے۔ اگر تم مجھے اپنے کسی دوست کے گھر نہیں چھپا سکتے تو پھر آخری صورت یہی ہے کہ تم مجھے اس خنجر سے ختم کر دو۔ میرے لیے فوج کے ہاتھوں مارے جانے سے زیادہ بہتر ہو گا۔"

"میں تمہیں اپنے ہاتھ سے قتل کر دوں۔" شہزادے نے حیران نظروں سے شادی ملک کو دیکھا:

"اس سے زیادہ مناسب ہے کہ میں اس خنجر سے اپنا ہی خاتمہ کر لوں۔"

"اس سے کچھ فائدہ نہ ہو گا شہزادے۔" شادی ملک غم ناک لہجے میں بولی:

"میرے قتل کا حکم تو پھر بھی قائم رہے گا اور میں قتل کر دی جاؤں گی۔"

"شہزادۂ عالم۔" غلام نے پھر دخل دیا:

"جلدی کوئی فیصلہ کیجیے۔ فوراً یہاں سے نکل جائیے۔"

شہزادے کو بھی جیسے ہوش آ گیا۔ اس نے شادی ملک کا ہاتھ پکڑا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

"دروازے سے نہیں شہزادے۔" غلام نے ٹوکا:

"ممکن ہے کوئی آپ کی تلاش میں ادھر آ رہا ہو۔ آپ پچھلی دیوار پھاند کے نکل جائیے۔ اندھیرا ہو تا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھائیے۔"

شہزادے نے ایک لمحے کو رک کر سوچا اور اپنا رخ موڑ کر دروازے سے دیوار کی طرف کر لیا۔ وہ اور شادی ملک تقریباً بھاگتے ہوئے دیوار کے پاس پہنچے۔ دیوار کی اونچائی صرف پانچ فٹ تھی۔ شہزادہ دیوار پر چڑھ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر شادی ملک کو بھی اوپر چڑھا لیا۔ پھر دونوں دیوار پھاند کر دوسری طرف گئے۔ غلام ابھی تک اپنی جگہ کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان کے دیوار پار کر جانے کے بعد وہ بھی اطمینان کا سانس لیتا ہوا واپس ہوا۔

غلام گوشۂ عزلت سے نکل کر تھوڑی دور پہنچا تھا کہ اسے شہر کوتوال سپاہیوں کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔ وہ ایک طرف دبک کر کھڑا ہو گیا۔ کوتوال بڑی تیزی سے گوشۂ عزلت کے دروازے پر پہنچا اور گھوڑا باہر چھوڑ کر سپاہیوں کے ساتھ اندر چلا گیا۔ گوشۂ عزلت میں سوائے صاحبقران امیر تیمور کے کسی اور کا گھوڑا داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

○

ملکہ سرائے خانم اور شہزادی خانزادہ میں ہمیشہ کا بیر تھا۔ یہ بڑی بیگم اور چھوٹی بیگم کے نام سے پورے ملک تاتار میں مشہور تھیں۔ خانزادہ جب سے اپنے شوہر میران شاہ خبطی شہزادے کو چھوڑ کے آئی تھی، سمرقند ہی میں رہائش پذیر تھی۔ امیر تیمور نے اسے الگ محل اور دوسری مراعات دے رکھی تھیں۔ شہزادہ خلیل چونکہ جوان ہو گیا تھا اس لیے اسے تیمور نے رہنے کے لیے الگ محل دے دیا تھا۔

جس وقت شادی ملک کو شہزادے نے سیف الدین سے مانگا تو اس نے اس شرط پر اپنی رضامندی ظاہر کی کہ اسے شہزادے خلیل کے محل کے بجائے اس کی ماں، شہزادی خانزادہ کے محل میں بھیجا جائے۔ چنانچہ شادی ملک کو خانزادہ کے محل میں پہنچا دیا گیا اور شادی ملک وہیں رہنے لگی۔

شہزادہ خلیل اور شادی ملک کے عشق کی داستان امیر تیمور تک کسی نہ کسی طرح پہنچ گئی۔ اس دوران تیمور برصغیر پر حملے کے لیے چلا گیا۔

تیمور اپنے مرکز سمرقند سے خواہ کتنی ہی دور کیوں نہ چلا جائے اس کا رابطہ سمرقند سے قائم رہتا تھا اور ہر ہفتے ایک قاصد ملک کی خبریں لے کر سمرقند سے محاذ کی طرف روانہ ہوتا تھا۔

تیمور نے ابھی دریائے سندھ پار بھی نہیں کیا تھا کہ سمرقند کے داخلی منتظمین نے تیمور کو لکھ بھیجا کہ شہزادہ خلیل اور شادی ملک بے محابہ باغوں اور بازاروں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ تیمور کچھ پہلے ہی چڑا ہوا تھا اس قسم کی خبروں سے اس کا غصہ کچھ اور بڑھ گیا۔ پھر شہزادہ خلیل نے ایک زبردست حماقت کی جس نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔

شہزادہ خلیل سب سے چھوٹا شہزادہ ہونے کی وجہ سے خود فریبی کا شکار تھا۔ اس کے ذہن میں یہ چیز بیٹھ گئی تھی کہ امیر تیمور کو اس سے سب شہزادوں سے زیادہ محبت ہے اور وہ اس کی کوئی بات نہیں ٹال سکتا۔ اسی خود فریبی کے تحت اس نے قاصد کے ہاتھ ایک خط امیر تیمور کو روانہ کر دیا جس میں اس نے درخواست کی کہ اسے شادی ملک سے شادی کی اجازت دی جائے۔ نیز یہ شادی روایتی شاہی انداز میں منعقد ہو جس میں

امراء، وزراء اور تمام بیگمات شرکت کریں۔

ستم یہ ہوا کہ جس قاصد کے ہاتھ یہ خط بھیجا گیا اس قاصد کے پاس سمرقند کے گورنر کا بھی ایک خط تیمور کے نام تھا جس میں اس نے شہزادہ خلیل کے خلاف بڑا زہر اگلا تھا۔

امیر تیمور کو دونوں خطوط ایک وقت موصول ہوئے۔ امیر تیمور کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا کہ شہزادہ شادی ملک کو اپنی کنیزوں میں شامل کر لے لیکن شہزادہ خلیل نے شادی ملک کے کہنے پر شادی کی درخواست کی تھی۔ اسے یہ کسی طرح گوارا نہ تھا کہ ایک کنیز کی شادی تیموری شہزادے کے ساتھ دھوم دھام اور شاہانہ انداز سے ہو۔ اس کی اس درخواست پر تیمور کو اس قدر غصہ آیا کہ اس نے فوراً شادی ملک کے قتل کا فرمان جاری کر دیا۔

ایک ہفتے تک شہزادہ خلیل، شادی ملک کو اپنے دوستوں کے یہاں چھپاتا رہا۔ بعض تیموری امراء نے بھی اس سلسلے میں شہزادہ خلیل سے تعاون کیا۔ کیونکہ یہ امکان پیدا ہو رہا تھا کہ تیمور کے بعد ممکن ہے کہ شہزادہ خلیل ہی تیموری تخت و تاج کا وارث بنے۔

تیمور کے دو بیٹے پہلے ہی مر چکے تھے۔ تیسرا میران شاہ تھا جو خبطی اور پاگل مشہور ہو کر معزول کر دیا گیا تھا۔ شہزادہ خلیل اسی میران شاہ کا بیٹا تھا اور اس کی ماں خانزادہ تھی۔ خانزادہ کے دو اور بیٹے پیر محمد اور سلطان محمد بھی تھے لیکن خانزادہ کی تمام ہمدردیاں شہزادہ خلیل سلطان کے ساتھ تھیں۔

تیمور کا ایک بیٹا شاہ رخ مرزا جو سرائے خانم کے بطن سے تھا، وہ بھی تخت کا حقدار تھا لیکن یہ شہزادہ جنگ و جدل کے بجائے شعر و شاعری اور علمی مشاغل میں دلچسپی رکھتا تھا۔ ان حالات میں شہزادہ خلیل کے وارث ہونے کے امکانات زیادہ تھے۔

ملکہ عالم سرائے خانم کو شادی ملک کے قتل کا فرمان مل چکا تھا اس نے شہر کوتوال کو تمام محلات کی تلاشی کا حکم دیا۔ سب سے پہلے شہزادہ خلیل کے محل پر چھاپہ مارا گیا۔ پھر شادی ملک کو خانزادہ کے محل میں تلاش کیا گیا۔ یہاں تک کہ منگلی خان کی بیٹی جس سے تیمور نے حال ہی میں شادی کی تھی، اس کے محل کا بھی چپہ چپہ چھانا گیا۔ محلاتِ شاہی کے بعد امیروں کے محلوں پر چھاپے پڑے۔ امیر سیف الدین اس کنیز کو ایران

سے لایا تھا۔ سب سے پہلے اس کے یہاں تلاشی ہوئی۔ پھر امیر موید ارلات اور تمام چھوٹے بڑے امیروں کی تلاشی ہوئی لیکن شادی ملک کہیں سے برآمد نہ ہوئی۔ شہزادہ خلیل بھی شادی ملک کے ساتھ روپوش ہو گیا تھا۔

شادی ملک کی گرفتاری میں ناکامی ملکہ سرائے خانم کے لیے ایک مسئلہ بن گئی۔ اب یہ اس کے عزت اور وقار کا سوال بن گیا۔ اس نے دربار کے تمام امیروں اور سرداروں کو شادی ملک کی تلاش پر لگا دیا اور اعلان کرا دیا کہ اگر شادی ملک گرفتار نہ ہوئی تو اس کی تمامتر ذمہ داری تمام امراء پر ہو گی۔ وہ سب امیر تیمور کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔

اس اعلان سے امیروں میں کھلبلی پڑ گئی۔ ان سب نے متحد ہو کر شادی ملک کی تلاش شروع کر دی۔ شہزادہ خلیل کے لیے یہ بات انتہائی پریشان کن تھی۔ اس کے یار دوست اسے اور شادی ملک کو ایک دن سے زیادہ اپنے گھر میں پناہ نہ دیتے اور شہزادہ کو ہر روز ایک نئی پناہ گاہ ڈھونڈنا پڑتی۔

اور پھر ایک رات جب گھڑیال نے بارہ کا گھنٹہ بجا کر نصف شب گزرنے کا اعلان کیا تو خانزادہ کے محل کے صدر دروازے کا پہرے دار اندر داخل ہوا اور راہداری میں پہرہ دینے والے ایک خواجہ سرا سے سرگوشیوں میں کچھ کہا۔ خواجہ سرا بھاگتا ہوا شہزادی خانزادہ کی خواب گاہ میں پہنچا اور وہاں مسلح کنیزوں میں سے ایک کو باہر کے پہرے دار کا پیغام پہنچایا۔ کنیز گھبرا گئی۔ پیغام کچھ ایسا تھا کہ وہ شہزادی کو بیدار کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اس نے خواجہ سرا کو باہر ہی چھوڑا اور خود دروازہ کھول کر اندر گئی۔

شہزادی خانزادہ اپنے بیٹے شہزادہ خلیل کی طرف سے بہت پریشان تھی۔ وہ عام طور سے راتیں جاگ کر گزارتی تھی۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ شادی ملک کی تلاش بڑی سختی سے کی جا رہی ہے۔ ایک ایک گھر کی تلاشی لی جا رہی ہے۔ اگر رات کے وقت شادی ملک کے کسی گھر میں موجود ہونے کا اطلاع ملتی تو فوراً وہ گھر گھیر لیا جاتا خواہ وہ کسی کا گھر ہو یا محل۔ سرائے خانم نے سرحدیں بھی بند کرا دی تھیں تاکہ شہزادہ خلیل، شادی ملک کو سمرقند سے باہر نہ لے جا سکے۔ اس سے خانزادہ نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ یا تو شہزادہ خلیل، شادی ملک کو سمرقند سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا ہے یا پھر وہ کسی ایسی محفوظ جگہ پناہ حاصل کیے ہوئے ہیں جہاں تک تلاش کرنے والے اب تک نہیں پہنچ سکے مگر خطرہ اب بھی باقی تھا اور شہزادہ خلیل کی یہ حرکت تیمور کے حکم سے کھلی بغاوت تھی

اس لیے خانزادہ ہر وقت ڈری رہتی تھی۔

کنیز دروازہ کھول کر اندر گئی تو کھٹکے سے خانزادہ کی آنکھ کھل گئی اور وہ چونک کر بیٹھ گئی۔

"شہزادی عالم... وہ... وہ شہزادے تشریف لائے ہیں"۔ کنیز نے آہستہ سے کہا۔

"ہمارا بیٹا خلیل ہے۔ شہزادہ خلیل"۔ خانزادہ نے جلدی سے پوچھا۔

"جی شہزادی عالم۔ خواجہ سرا یہی پیغام لایا ہے"۔

"اے خدا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے"۔ خانزادہ نے سر اٹھا کر بڑی حسرت سے کہا۔

وہ اس وقت بہت خوش تھی۔ اسے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ شہزادہ خلیل اور شادی ملک کہیں ایک ساتھ چھپے ہیں۔ اگر دونوں کو تلاش کر لیا گیا تو تیموری شہزادہ یہ برداشت نہ کر سکے گا کہ اس کے سامنے اس کی محبوبہ کو گرفتار کر لیا جائے۔ وہ ضرور مزاحمت کرے گا اور ہو سکتا ہے کہ دونوں ہی قتل ہو جائیں۔

خانزادہ، بیٹے کو اندر طلب کرنے کے بجائے خود ہی چل پڑی۔ خانزادہ کو اس شہزادے سے سب سے زیادہ محبت تھی۔ خوشی کے مارے اس کے قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے۔ دوسری راہداری میں پہنچ کر خانزادہ کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ وہ رک گئی۔ اس کی تمام مسرت ختم ہو گئی اور چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ اس کے آگے آگے خواجہ سرا چل رہا تھا۔ شہزادی کو رکتا دیکھ کر وہ بھی کھڑا ہو گیا اور واپس آ کے اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

خانزادہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا:

"شہزادہ اکیلا ہے یا اس کے ساتھ...."

"غلام کو تو پہرے دار نے شہزادے کے آنے کی اطلاع دی تھی"۔ خواجہ سرا نے ادب سے جواب دیا:

"اگر حکم ہو تو صدر دروازے پر جا کر معلوم کروں"۔

"ہاں۔ یہ بہتر ہے۔ ہم یہیں ٹھہریں گے۔ معلوم کرو کہ شہزادہ اکیلا ہے یا اس کے ساتھ شادی ملک بھی ہے"۔

خانزادہ کا حکم پا کر خواجہ سرا واپس ہوا۔ خانزادہ نے اسے روک کر کہا:

"شہزادے بہادر تنہا ہوں تو انہیں اپنے ساتھ لے آنا"۔

خواجہ سرا نے دروازے پر پہنچ کر شہزادے کو سلام کیا اور نرمی سے پوچھا:

"شہزادے بہادر۔ آپ تنہا تشریف لائے ہیں؟"

"ہاں"۔ شہزادے نے مختصر سا جواب دیا پھر فوراً ہی سوال کیا:

"کیا امی حضور مجھ سے ملاقات نہیں کرنا چاہتیں؟"

"جی نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے"۔ خواجہ سرا نے فوراً کہا:

"تشریف لایئے۔ وہ آپ کی منتظر ہیں"۔

شہزادہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

خانزادہ راہداری میں کھڑی تھی۔ شہزادے کو خواجہ سرا کے ساتھ آتے دیکھا تو فوراً آگے بڑھی اور شہزادے کو گلے سے لگا لیا۔ پھر اسے ساتھ لیے ہوئے خواب گاہ میں آئی۔ اس نے خواب گاہ میں آتے ہی مسنح کنیز کو حکم دیا:

"جب تک ہم گفتگو کر رہے ہیں، کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے۔ خواہ وہ سرائے خانم ہی کے آدمی کیوں نہ ہوں"۔

کنیز نے حیرت اور خوف سے خانزادہ کو دیکھا۔ پھر باہر چلی گئی۔ خانزادہ نے خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بند کر لیا:

"اب بتاؤ شہزادے! تم کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟" خانزادہ نے محبت سے پوچھا۔

"کیا بتاؤں امی حضور"۔ شہزادہ پریشان لہجے میں بولا:

"میرا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ جس کے یہاں ٹھہرتا ہوں فوراً مخبری ہو جاتی ہے اور مجھے جگہ بدلنی پڑتی ہے"۔

"بچپن کی بعض نادانیاں بڑی خطرناک صورت پیدا کر دیتی ہیں شہزادے"۔ خانزادہ نے محبت سے سرزنش کی:

"ہمارا خیال تھا تم اس وقت تک سمرقند سے نکل چکے ہو گے"۔

"نہیں امی حضور"۔ شہزادے نے مایوسی سے کہا:

"ہر طرف جاسوس لگے ہوئے ہیں۔ بڑی مشکل سے آپ تک پہنچا ہوں"۔

"یہ بھی تم نے غلط قدم اٹھایا ہے خلیل"۔ خانزادہ نے کہا:

"تم اکیلے تھے اس لیے یہاں تک پہنچ گئے۔ واپسی پر تمہارا تعاقب بھی کیا جا سکتا ہے اور جاسوس تمہاری پناہ گاہ تک پہنچ سکتے ہیں"۔

"پھر میں کیا کروں امی حضور"۔ شہزادہ خلیل دل گرفتگی سے بولا:

"کیا میں اپنی ماں سے بھی نہیں مل سکتا؟"

"تم پر کوئی پابندی نہیں۔ تمہارے پیٹا جھتراں نے کوئی حکم نہیں دیا لیکن....." خانزادہ نے بات ادھوری چھوڑ کر شہزادے کی طرف دیکھا۔

"آپ کیا کہنا چاہتی ہیں امی حضور"۔ شہزادے نے ماں کو تیز نظروں سے دیکھا:

"مجھ پر پابندی نہیں لیکن شادی ملک کے خون کے سب پیاسے ہو رہے ہیں۔"

"تم اسے بچا نہیں سکتے خلیل"۔ خانزادہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"میں اسے بچاؤں گا امی حضور"۔ شہزادے نے بھی اپنا فیصلہ سنا دیا:

"شادی ملک اب خلیل سے الگ نہیں۔ وہ میری بیوی ہے۔ میں نے اس سے نکاح کر لیا ہے۔"

خانزادہ نے گھبرا کر شہزادے کو دیکھا:

"یہ . . . . . یہ کیا کیا شہزادے تم نے۔ صاحبقران کی اجازت کے بغیر تم شادی نہیں کر سکتے۔"

"یہ میرا شرعی حق ہے امی حضور"۔ شہزادہ استقلال سے بولا:

"دادا امیر دنیا کے حاکم ہیں۔ وہ دین کے معاملات میں دخل نہیں دے سکتے۔"

"میرے بیٹے۔ میرے بچے"۔ خانزادہ نے ٹھنڈی سانس لی:

"تم ابھی نادان ہو۔ یہ راج نیتی ہے۔ سلطنت کا اصول ہے۔ شہزادوں کی شادیاں شاہِ وقت کے حکم سے ہوتی ہیں۔ ہم سب اس کے پابند ہیں۔"

"امی حضور۔ میں تو آپ کے پاس بڑی امیدیں لے کر آیا تھا۔ کیا آپ بھی مجھے نا امید کر دیں گی؟"

"شہزادے۔ ہماری مجبوریوں کو سمجھو"۔ خانزادہ غمگین لہجے میں بولی:

"صاحبقران کی مہربانی سے ہمیں یہ محل اور مراعات ملی ہوئی ہیں۔ کیا تم ہمیں اس سے محروم کرنا چاہتے ہو؟"

"ٹھیک ہے امی حضور"۔ شہزادہ جھلا کر کھڑا ہو گیا:

"آپ اس محل اور شاہی ٹھاٹ باٹ کو گلے سے لگائے رکھیے۔ میں شادی ملک کو قتل نہیں ہونے دوں گا۔ میں صاحبقران سے بغاوت کروں گا۔ وہ میرے حاکم ہیں میرے دل کے مالک ہرگز نہیں۔"

"ٹھہرو شہزادے"۔ خانزادہ کا دل لرز گیا، آنکھیں بھر آئیں:

"ہم یہ تمام چیزیں تم پر قربان کرنے کو تیار ہیں۔ بتاؤ ہم تمہارے لیے کیا کر سکتے ہیں؟"

شہزادہ پھر بیٹھ گیا۔ بولا:

"امی حضور۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ صاحبقران سے میری سفارش کریں۔ ان سے کہیں کہ خلیل نے شادی کر لی ہے۔ اب شادی ملک کو معاف کر دیا جائے۔"

"خلیل۔ ذرا سوچو تو بیٹے!" خانزادہ تحمل سے بولی:

"صاحبقران یہاں سے ہزاروں میل دور ہیں۔ شادی ملک کے قتل کا حکم ملکہ سرائے خانم کو مل چکا ہے۔ شادی ملک کو تلاش کیا جا رہا ہے۔ ہم اپنی درخواست صاحبقران کو بھیجیں گے۔ وہاں سے کب اور کیا جواب آئے گا اس کے

بارے میں کوئی بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی۔ کیا اتنے طویل عرصے تک تم شادی ملک کو جاسوسوں کی نظروں سے چھپائے رکھ سکتے ہو؟"

یہ بات شاید شہزادے نے سوچی ہی نہ تھی۔ خانزادہ نے بڑے قاعدے کی بات کی تھی۔ اگر صاحبقران یہاں موجود ہوتے تو پھر بھی یہ امید کی جا سکتی تھی کہ خانزادہ کی درخواست شاید تسلیم کر لی جاتی۔

شہزادہ مایوسی کے عالم میں بولا:

"امی حضور۔ کیا اب کچھ نہیں ہو سکتا ملکہ سرائے خانم سے آپ سفارش نہیں کر سکتیں؟"

"خلیل! تم بالکل عقل سے کام نہیں لے رہے"۔ خانزادہ نے سمجھاتے ہوئے کہا:

"سرائے خانم اور ہمارے درمیان اختلافات کی جو خلیج حائل ہے اسے کیسے ختم کیا جا سکتا ہے۔ فرض کرو کہ ہم بے غیرت بن کے ان کے پاس جاتے ہیں تو سب سے پہلے ہم اور تم حکومت کے مجرم قرار دیے جائیں گے۔ کیونکہ ہماری سفارش کا صاف مطلب ہو گا کہ شادی ملک کو ہم نے کہیں چھپا رکھا ہے۔ ایسی صورت میں ہماری سفارش کا فیصلہ تو بعد میں ہو گا، سرائے خانم ہمیں اعانتِ جرم میں فوراً گرفتار کرا سکتی ہیں اور پھر ہمیں شادی ملک کو بھی ان کے حوالے کرنا پڑے گا۔"

شہزادہ خلیل سخت پریشان تھا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شادی ملک کو کس طرح بچائے۔ اس نے اب شادی ملک سے نکاح بھی کر لیا تھا۔ نکاح کے لیے تو وہ پہلے ہی سے آمادہ تھا۔ شادی ملک بھی اس سے شادی کے لیے تیار تھی لیکن اس نے دھوم دھام سے شادی کی شرط لگا رکھی تھی۔ اب جو اس کے قتل کا حکم ہوا تو بہت ممکن ہے اس نے اپنا مقدمہ مضبوط کرنے کے لیے شہزادے سے فوراً نکاح کر لیا ہو۔

اولاد کو پریشان دیکھ کر ماں کا دل یونہی کڑھتا ہے۔ خلیل تو خانزادہ کا چہیتا بیٹا تھا۔ اس کا یہ حال دیکھ کر خانزادہ کا کلیجہ کٹا جا رہا تھا۔ آخر اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے کہا:

"خلیل! صرف ایک صورت ہے جس سے شادی ملک کی جان بچ سکتی ہے۔"

شہزادے نے چونک کر ماں کو دیکھا اور بے تابی سے پوچھا:

"وہ کیا امی حضور۔ کیا صورت ہے؟"

"شہزادے۔ یہ بات توجہ سے سنو"۔ خانزادہ بڑے وقار سے بولی:

"اس وقت ملک تاتار میں امیر تیمور کے بعد سب سے زیادہ صاحبِ اقتدار ہستی ملکۂ عالم سرائے خانم کی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے امی حضور"۔ شہزادے خلیل نے دخل دیا۔

"بات پوری ہونے دو شہزادے"۔ خانزادہ نے اسے تنبیہ کی:

"صاحبقراں امیر تیمور کے حکم کو اگر کوئی روک سکتا ہے تو وہ صرف سرائے خانم ہے۔ اگر تم سرائے خانم.....!"

"امی حضور۔ آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟" شہزادے نے پھر بے صبری دکھائی:

"سرائے خانم اور آپ کے درمیان اختلاف کی خلیج موجود ہے۔ میں آپ کا بیٹا ہوں۔ سرائے خانم کو جس قدر آپ سے نفرت ہے اتنا ہی وہ مجھے بھی ناپسند کرتی ہیں۔ انہوں نے شادی ملک کی گرفتاری کا حکم دیا ہے۔ اب آپ ان سے کیا امید باندھ سکتی ہیں؟"

خانزادہ کو شہزادے کے بار بار دخل دینے پر غصہ آ رہا تھا۔ پھر بھی اس نے تحمل سے کام لیا۔ نرمی سے بولی:

"شہزادے۔ ہماری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ صرف سرائے خانم ہی تمہاری بیوی کو قتل ہونے سے بچا سکتی ہے۔"

"وہ کس طرح امی حضور؟"

"تم ہمت سے کام لو اور شادی ملک کو سرائے خانم کے حوالے کر دو۔"

"امی حضور!" شہزادہ غصے سے کھڑا ہو گیا۔

"میں آپ کے پاس اپنے غم کا علاج ڈھونڈنے آیا تھا اور آپ مجھے مشورہ دے رہی ہیں کہ بھیڑ کو بھیڑیے کے حوالے کر دوں۔ آپ کی منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"شہزادے۔ تم سرائے خانم کی فطرت سے واقف نہیں۔" خانزادہ نے پھر سمجھانا شروع کیا:

"سرائے خانم ملک تاتار کی ملکہ ہونے کے باوجود عورت بھی ہے۔ وہ صاحب اولاد ہے اور کوئی صاحب اولاد عورت کسی کو قتل کرنے کا حکم نہیں دے سکتی۔ خواہ وہ تمہاری ماں خانزادہ ہی کیوں نہ ہو۔ میں جانتی ہوں کہ شادی ملک تم سے زیادہ سمجھ دار ہے۔ اس کو گفتگو کرنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ تم سے نکاح کرنے کے بعد اس میں شاہانہ تمکنت اور رکھ رکھاؤ پیدا ہو گیا ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ سرائے خانم کو ضرور قائل کر لے گی۔ بشرطیکہ تم اسے سرائے خانم کا سامنا کرنے کی اجازت دو۔"

"مگر امی حضور..... یہ کیسے..... یہ کیسے....." شہزادے کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"شہزادے۔ تمہیں یہ خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔ یہ کڑوا گھونٹ پینا ہی پڑے گا۔" خانزادہ نے زور دے کر کہا:

"شادی ملک کو آج نہیں تو کل گرفتار ہو کر قتل ہو جانا ہے۔ گرفتاری کے بعد اس کی داد فریاد کوئی نہیں سنے گا۔ ہاں اگر وہ خود سرائے خانم کے حضور پیش ہو جائے تو کیا عجب کہ اس کے قتل کا حکم رک جائے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے خلیل۔ تم شادی ملک سے بات کر کے دیکھو۔"

شہزادے کو ماں کی کوئی اور بات تو اچھی نہ لگی لیکن خانزادہ کا آخری جملہ اس پر اثر کر گیا۔ "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے۔" شہزادہ اس پر غور کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ذرا دیر سوچنے کے بعد بولا:

"امی حضور۔ فرض کیجیے کہ شادی ملک وہاں جانے کے لیے آمادہ ہو گئی تو اسے جاسوسوں سے کیسے بچایا جائے گا۔ وہ تو راستے ہی میں گرفتار کر لی جائے گی۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ شادی ملک کو ملکہ کے محل تک پہنچانے کی ذمہ داری ہم لیتے ہیں۔" خانزادہ نے اطمینان کا سانس لیا۔

"ٹھیک ہے امی حضور۔ میں شادی ملک کو آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا۔" شہزادے نے بڑے کرب سے کہا۔

خانزادہ مسکرائی۔ شہزادہ کو اس کی مسکراہٹ ناگوار گزری۔ اس نے ماں کو تیز نظروں سے دیکھا:

خانزادہ نے کہا:

"شہزادے۔ تمہیں ہماری مسکراہٹ بری لگی لیکن یہ مسکراہٹ دراصل ہماری کامیابی ہے۔ ہم تو صرف یہ چاہتے تھے کہ تم کسی طرح شادی ملک کو سرائے خانم کے سامنے پیش کرنے پر آمادہ ہو جاؤ۔ تم نے اپنی رضامندی کا اظہار کر کے ہمارا کام آسان کر دیا۔ خوش ہو جاؤ کہ شادی ملک کی جان بخشی ہو جائے گی۔"

شہزادے نے حیرت سے خانزادہ کو دیکھا:

"امی حضور۔ کیا یہ ممکن ہے؟"

"ممکن نہیں بلکہ یقینی ہے۔" خانزادہ نے صاف لہجے میں کہا۔

پھر وہ دیر تک شہزادہ خلیل سے سرگوشیوں میں باتیں کرتی رہی اور جب شہزادہ واپس ہوا تو بہت مطمئن نظر آ رہا تھا۔

○

با وقار اور صاحب اقتدار ملکہ سرائے خانم اپنے محل میں کچھ افسردہ بیٹھی تھی۔ شادی ملک کے گرفتار نہ ہونے سے وہ پریشان تھی۔ حالانکہ سمرقند کا کوئی ایسا گھر نہ تھا جہاں اسے تلاش نہ کیا گیا ہو۔ شہزادے خلیل کے غائب ہو جانے سے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ شادی ملک اور شہزادہ دونوں سمرقند میں کسی جگہ پوشیدہ ہیں یا پھر وہ فرار

ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

ملکہ کو خانزادہ پر بھی شبہ تھا لیکن اس کے محل کی جس طرح مکمل طور پہ تلاشی ہو چکی تھی۔ دربانوں سے لے کر امیر تلعرا کے محلات تک جاسوسوں اور کوتوال کے چھاپہ مار دستوں کی زد میں آ چکے تھے۔ اس سلسلے میں کئی جگہ کچھ ناخوش گوار صورت بھی پیدا ہوئی اور امرا نے زنان خانے کی تلاشی کی مخالفت کی تھی لیکن صاحبقراں کے حکم کی بجا آوری بہر صورت ضروری تھی۔ بظاہر کوئی ایسی جگہ نظر نہ آتی تھی جہاں ان دونوں کے چھپنے کا امکان ہو۔

سرائے خانم اسی فکر میں غلطاں و پیچاں تھی کہ اس کی کنیز خاص نے حاضر ہو کر اطلاع دی:

"ایک خاتون قدم بوسی کی متمنی ہے"۔

"خاتون ۔ ۔ ۔ !" ملکہ چونکی: "لباس اور بشرے سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟"

"خاتون سر تا پا خود کو چادر اور نقاب میں پوشیدہ کیے ہوئے ہے" کنیز نے کہا:

"پیر میں نگینے دار جوتیاں ہیں اور نگینے شاید سچے ہیں۔ ایک ہاتھ پر سفید ریشمی دستانہ چڑھا ہے جس سے وہ نقاب کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہے"۔

"دوسرا ہاتھ تو کھلا ہوگا۔ کوئی زیور نظر آیا؟" ملکہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"دوسرا ہاتھ ۔ ۔ ۔" کنیز سوچنے لگی۔ چند لمحوں بعد اس نے کہا:

"دوسرے ہاتھ کی تو میں صرف ایک جھلک ہی دیکھ سکی۔ ایک پہرے دار قریب سے گزرا تو اس نے گھبرا کر دوسرے ہاتھ سے بھی نقاب پکڑ لیا۔ شاید جڑاؤ کنگن تھا ہاتھ میں"۔

"آواز سے کیا اندازہ لگایا تم نے؟"

"نرم۔ سریلی مگر خوف میں ڈوبی ہوئی"۔

"جاؤ۔ اسے عزت سے لاؤ"۔ سرائے خانم نے مسند پر پہلو بدلا:

"وہ شہزادی خانزادہ کے بد قسمت بیٹے شہزادہ خلیل کی خوبصورت محبوبہ شادی ملک ہے"۔

"شادی ملک!" کنیز کا منہ کھل گیا۔

"وہی شادی ملک جس کے قتل کا حکم صاحبقراں نے دیا ہے؟"

"ہاں ہاں وہی۔ وہ اپنے پیروں سے آئی ہے اس لیے اسے عزت سے پیش کیا جائے"۔

کنیز باہر گئی اور شادی ملک کو ساتھ لے کر آ گئی۔ شادی ملک اب تک خود کو پوشیدہ کیے ہوئے تھی۔

"شادی ملک! نقاب اٹھا دو"۔ سرائے خانم نے لہجے کو نرم کرتے ہوئے حکم دیا۔

شادی ملک کا پورا جسم کانپ گیا اور وہ جس ہاتھ سے نقاب پکڑے ہوئے تھی وہ لرز کر نیچے آ گیا۔

"نقاب الٹ دو شادی ملک"۔ ملکہ کی آواز میں ذرا سختی پیدا ہوئی۔

شادی ملک اپنی حیرت پر قابو پا چکی تھی۔ اس نے نقاب الٹ دیا۔ جسم سے چادر علیحدہ کی اور ملکۂ عالم سرائے خانم کے سامنے سر بسجدہ ہو گئی۔

"شادی ملک! حاکم وقت کی تکریم لازم ہے سجدہ ہرگز نہیں"۔ سرائے خانم کا لہجہ پھر نرم ہو گیا۔ شادی ملک اٹھ کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔

"ہماری طرف دیکھو"۔ ملکہ نے کہا۔

شادی ملک نے نظریں اٹھائیں۔ غزالی آنکھوں سے سرمے میں غلطیدہ آنسو، رخساروں پر ہلکی سیاہ لکیریں بنا رہے تھے۔ سنبلی انگلیوں پہ مہندی کی گہری سرخی لرزاں تھی۔ شادی ملک کا مرمریں پیکر اپسراؤں کو مات کر رہا تھا، وہ ایرانی حسن کا بہترین نمونہ تھی۔

ملکہ سرائے خانم پورے شاہانہ وقار کے ساتھ مسند پر بیٹھی تھی۔ شادی ملک نے آنکھیں چار کیں۔

"کیا نظر آ رہا ہے تمہیں؟" ملکہ نے پُر رعب لہجے میں پوچھا۔

"ملکۂ عالم کے چہرے سے تیموری جلال ٹپک رہا ہے"۔

"کیا ہمارے ہونٹوں پر تمہیں اپنی موت منڈلاتی نظر نہیں آتی؟"

"تیموری جلال کے پس منظر میں ملکۂ عالم کا پچاس سالہ جمال بھی جھلکتا دکھائی دے رہا ہے"۔ شادی ملک نے دوسرا سوال نظر انداز کر دیا۔

"چالاک بننے کی کوشش مت کرو لڑکی"۔ ملکہ کا لہجہ تلخ ہو گیا:

"جوانی اندھی ہوتی ہے۔ تم نے دیکھ کے قدم کیوں نہیں اٹھایا؟"

"ملکۂ عالم۔ جوانی کے اندھا ہونے میں ممکن ہے کہ شبہ کیا جا سکے لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" شادی ملک نے رک کر ادھر دیکھا۔

سرائے خانم نے تمام کنیزوں کو باہر جانے کا حکم دیا۔ پھر بولی:

"اپنی صفائی میں جو کہنا چاہتی ہو کہہ ڈالو۔ جب تک تم اپنے دل کی بھڑاس نہ نکال لو گی ہم تمہارے قتل کا حکم نہ دیں گے"۔

شادی ملک سنبھل کے بولی:

"ملکۂ عالم! جوانی آنی جانی اور محبت ازلی اور ابدی ہے۔ اگر جذبات کا تعلق صرف جوانی سے ہوتا تو آج جس مسند پہ آپ تشریف فرما ہیں اس پر کوئی چودہ سالہ نوخیز لڑکی کا قبضہ ہوتا۔ صاحبقراں کو کیا ضرورت تھی کہ وہ آپ

یہ مرتبہ عطا کرتے۔ یہ تو محبت کی کرشمہ سازی ہے ملکۂ عالم! اگر مجھے جوانی کے تقاضے پورے کرتے ہوتے تو میں
شہزادے کے محل میں دوسری کنیزوں کی طرح عیش و عشرت سے یہ مختصر زمانہ گزار سکتی تھی۔ مجھے کیا ضرورت تھی
میں صاحبقراں کے عتاب کو للکارتی اور آج آپ کی پناہ میں آنے کی درخواست کرتی۔"

سرائے خانم پر شادی ملک کی باتوں کا بہت اثر ہوا۔ اس نے کہا:

"شادی ملک! تم حسنِ صورت کے ساتھ ساتھ حسنِ سیرت سے بھی آراستہ ہو۔ کاش ہم تمہیں پیار دے سکتے
لیکن ہمیں افسوس ہے کہ صاحبقراں نے ہمارے ہاتھ میں حکم کی تلوار دی ہے اور حکم ہے تمہارے قتل کا۔"

"ملکۂ عالم! آپ ذی وقار اور صاحبِ اقتدار ہیں۔" شادی ملک بڑے استقلال سے بول رہی تھی۔

"جو ہستی جلاد کو تلوار اٹھانے کا حکم دے سکتی ہے کیا اس میں یہ طاقت نہیں کہ وہ جلاد کو حکم دے
کہ تلوار نیام میں کر لے۔"

شادی ملک نے ٹھہر کر بڑی امید سے سرائے خانم کو دیکھا۔

"شادی ملک!" ملکہ سر اٹھا کر بولی:

"زخم طلبی کا یہ انداز بڑا اچھا ہے مستحسن ہے لیکن تلوار کا کام زخم لگانا ہے زخم مندمل کرنا نہیں۔"

"ٹھیک ہے ملکۂ عالم۔" شادی ملک لاپروائی سے بولی:

"آپ مجھے قتل کرا دیجیے لیکن تاریخ آپ کو معاف نہ کر سکے گی۔ کل کا مؤرخ یہی کہے گا ملکہ سرائے خانم نے
شادی ملک کو محض اس وجہ سے تہ تیغ کرا دیا کیونکہ وہ شہزادی خانزادہ کی بہو تھی۔ آپ اور خانزادہ کے اختلاف
کو پورا ملک تاتار جانتا ہے۔"

"خاموش لڑکی۔ تو ہم پر الزام لگا رہی ہے۔" سرائے خانم بگڑ گئی:

"یہ صاحبقراں کا حکم ہے۔ اس میں کسی کی دشمنی یا محبت کا کوئی دخل نہیں۔"

"ملکۂ عالم!" شادی ملک نے پوری جرأت سے کہا:

"اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہیے اگر صاحبقراں یہ فرمان بھیجیں کہ آپ کے بیٹے شاہ رخ کی بیوی کا سر قلم کر
دیا جائے تو کیا آپ اس حکم کی تعمیل بھی اسی طرح کریں؟"

"لیکن..... لیکن....." سرائے خانم پریشان ہو گئی:

"لیکن بیوی اور کنیز میں بڑا فرق ہے لڑکی۔ تو محض ایک کنیز ہے اور ایک تیموری شہزادے سے شادی کر
کے مراعات حاصل کرنا چاہتی ہے۔"

"معاف کیجیے ملکۂ عالم۔" شادی ملک مستقل مزاجی سے بولی:

"میں آپ کو صاحبِ اقتدار سمجھ کر آپ کی پناہ میں آنا چاہتی تھی تاکہ آپ انصاف کریں اور میرا حق مجھے دلائیں
پ تو مجھ غریب سے وہ بھی چھین لینا چاہتی ہیں جو مجھے حاصل ہو چکا ہے۔"

"لڑکی زبان روک کر بات کر۔" ملکہ کو غصہ آ گیا:

"ہم نے نہ تجھے کچھ دیا ہے اور نہ چھین رہے ہیں۔ ہم صاحبقراں کے حکم کی تعمیل پر مجبور ہیں۔ اگر شاہ رخ
ی غلطی کرتا تو اسے بھی معاف نہ کیا جاتا۔ تجھے اگر کسی رعایت کی خواہش تھی تو ہمارے محل میں آنے کے بجائے
کے پاس جانا چاہیے تھا۔"

"میں اسی در کی دھتکاری ہوئی آپ کے پاس آئی ہوں۔" شادی ملک بے خوفی سے بولی۔

"تو..... تو کیا تو خانزادہ کے پاس گئی تھی؟" سرائے خانم نے حیران ہو کے پوچھا۔

"جی ہاں ملکۂ عالم۔ مجھے پہلے انہی سے فریاد کرنا تھی۔"

"کیا جواب دیا شہزادی نے؟" سرائے خانم نے دلچسپی سے پوچھا۔

"شہزادی خانزادہ نے فرمایا کہ اے شادی ملک!" شادی ملک نے ملکہ سے آنکھیں ملا کے کہا:

"انہوں نے کہا کہ میں تجھے اپنی بہو تسلیم کرتی ہوں لیکن تیری فریاد نہیں سن سکتی۔ تو ملکۂ عالم کے پاس جا کر اپنا
پیش کر۔ وہ چاہیں تو صاحبقراں کا حکم تعطل میں ڈال جا سکتا ہے۔"

سرائے خانم کو خانزادہ پر جو غصہ آیا تھا وہ کم ہونے لگا۔ ذرا سوچنے کے بعد بولی:

"شادی ملک تیرا کوئی مقدمہ نہیں۔ صاحبقراں کی نظروں میں تو مجرم ہے اور تیرا قتل ضروری ہے۔ ہم اس حکم کو
نہیں کر سکتے۔"

"ملکۂ عالم! صاحبقراں نے ایرانی کنیز شادی ملک کے قتل کا حکم دیا ہے۔" شادی ملک با جھجک بولی:

"صاحبقراں نے یہ حکم کب دیا ہے کہ شہزادے خلیل کی بیوی کو قتل کر دیا جائے۔ میں ایرانی کنیز نہیں بلکہ
خلیل کی منکوحہ ہوں۔ میں شرعی حیثیت سے ان کی بیوی ہوں اور مجھے وہی مراعات حاصل ہیں جو دوسرے
دوں کی بیگمات کو حاصل ہیں۔ میرا قتل ایک کنیز کا قتل نہیں بلکہ تیموری خاندان کے شہزادے خلیل سلطان کی
کا قتل ہو گا۔"

سرائے خانم اس کا منہ دیکھ کر رہ گئی:

"شادی ملک۔ کیا تو نے شہزادے سے عقد کر لیا ہے؟"

"جی ہاں ملکۂ عالم۔ ہم دونوں نے اپنی رضامندی سے نکاح پڑھوایا ہے۔"

"یہ سب کچھ کب ہوا؟"

"ملکۂ عالم جس وقت قاصد میرے قتل کا پیغام لے کر سمرقند میں داخل ہوا اس وقت میرا نکاح پڑھایا جا رہا تھا" شادی ملک نے بتایا۔

"لیکن تم نے یہ نکاح صاحبقراں کی اجازت کے بغیر کیا ہے۔ اسے تسلیم نہیں کیا جا سکتا" سرائے خانم غصے سے بولی:

"تم نے اپنا مقدمہ مضبوط کرنے کے لیے ایسا کیا ہے"۔

"ٹھیک ہے ملکۂ عالم۔ میں مجرم ہوں" شادی ملک لاپروائی سے بولی:

"میں ایک ایرانی کنیز تھی اس لیے شہزادہ خلیل سے شادی کرنے کے بعد بھی آپ کے خیال میں کنیز ہی رہی۔ صاحبقراں نے صرف ایک قتل کا حکم دیا ہے آپ دوسرا قتل....."

"کیا..... کیا یہ ٹھیک ہے؟" سرائے عالم گھبرا کے کھڑی ہو گئی۔

"اگر آپ حکم دیں تو ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے"۔

شادی ملک کا تیر نشانے پر بیٹھا۔ سرائے خانم کو شادی ملک کے قتل کا حکم دیا گیا تھا لیکن شادی ملک اب ایرانی کنیز نہیں بلکہ تیموری خون کی وقار کی امانت دار بن گئی تھی۔

"شادی ملک، اگر یہ سچ ہے تو ہم کیا اب تمہیں شاید صاحبقراں بھی قتل نہ کرا سکیں"۔ ملکہ سرائے خانم نے تالی بجا کر کنیز کو بلایا۔

"داروغۂ محلات کو فرمان پہنچایا جائے"۔ سرائے خانم نے کہنا شروع کیا:

"شادی ملک کے لیے ایک محل، ایک سو کنیزیں، پچیس خواجہ سرا، پہرے دار، محافظ غرضیکہ وہ تمام انتظامات کیے جائیں جو ایک شاہی خاندان کی بیگم کے لیے ہوتے ہیں۔ ہم شادی ملک کو شاہی خاندان میں شامل کیے جانے کا فرمان جاری کرتے ہیں۔ شادی ملک کو تمام مراعات حاصل ہوں گی لیکن شہزادے خلیل کو اس سے ملاقات یا گفتگو کی ہرگز اجازت نہ ہو گی۔ اگر اس میں کوتاہی برتی گئی تو خطاکار کو سخت سزا دی جائے گی یہ فرمان تمام متعلقہ لوگوں تک فوراً پہنچایا جائے"۔

شادی ملک کا جی چاہا کہ وہ اظہارِ تشکر کے لیے ملکہ کے قدموں پر گر پڑے۔ شاید وہ اسی خیال سے آگے بڑھی تھی لیکن سرائے خانم نے اسے اشارے سے روک دیا:

"شادی ملک! جب تک تمہارا محل آراستہ نہیں ہوتا تم ہمارے ساتھ ٹھہرو گی"۔ سرائے خانم کا لہجہ مشفقانہ ہو گیا تھا۔

"ملکۂ عالم۔ میں کن الفاظ سے آپ کا شکریہ ادا کروں"۔ شادی ملک بڑی لجاجت سے بولی۔

"شادی ملک" ملکہ مسکرائی:

"ہماری ہرگز یہ خواہش نہ تھی کہ تمہیں قتل کیا جائے لیکن صاحبقراں کے حکم کے تحت ہم اس ناخوشگوار فرض کو ادا کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ دنیا کا کوئی قبیلہ، خاندان یا شہنشاہ نہیں چاہتا کہ اس کے جوانوں کی شادیاں غیروں میں ہوں۔ اس وجہ سے صاحبقراں تمہاری شادی کے سلسلے میں متذبذب میں تھے لیکن اب صورتِ حال یکسر تبدیل ہو گئی ہے۔ تمہاری شادی تو غیر قانونی قرار دی جا سکتی تھی لیکن تیموری نسل کو ختم کرنے کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا صاحبقراں کی برِصغیر سے واپسی تک تم شاہی مہمان کی طرح رہو گی اور جب وہ تشریف لے آئیں گے ہم تمہارا مقدمہ ان کے سامنے پیش کریں گے۔ اطمینان رکھو ہماری تمام ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں"۔

سرائے خانم کا حکم صاحبقراں کے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ سرائے خانم کی کنیز نے داروغۂ محلات کو فرمان پہنچایا۔ اور اس پر فوری عملدرآمد شروع ہو گیا۔ ابھی شادی ملک، ملکہ کا شکریہ ہی ادا کر رہی تھی کہ ایک درجن سے زیادہ کنیزیں اسے لینے کے لیے ملکہ کے محل میں پہنچ گئیں۔

شادی ملک ایک فریادی کی حیثیت سے منہ چھپائے پا پیادہ شاہی محل تک آئی تھی لیکن جب وہ وہاں سے اپنے محل کو روانہ ہوئی تو کنیزوں اور خواجہ سراؤں کی ایک مختصر سی فوج اسے اپنے جلو میں لیے ہوئے تھی۔

شادی ملک کو بڑی عزت اور احترام کے ساتھ اس کے محل میں پہنچایا گیا۔ اسے وہاں دنیا کی ہر آسائش میسر تھی سوائے شہزادے خلیل کی رفاقت کے۔ مسلح پہرے داروں نے شادی ملک کے محل کو پوری طرح گھیر رکھا تھا اور شہزادے کو اطلاع دے دی گئی تھی کہ وہ شادی ملک کے محل کا رخ نہ کرے۔ شہزادے کو اس کا کوئی غم نہیں تھا۔ وہ تو مسرت سے پھولے نہ سماتا تھا۔ شادی ملک کی جان بچ گئی تھی اس کے لیے یہی سب کچھ تھا۔

شہزادے کی والدہ خانزادہ دن میں ایک بار شادی ملک کے پاس ضرور جاتی تھی۔ شادی ملک اس کی بھی بہت احسانمند تھی کیونکہ یہ ترکیب اسی کی ذہانت کا نتیجہ تھی۔

یہاں تک تو ٹھیک تھا کہ شہزادے اور شادی ملک نے ریگستان سے نکلتے ہی پہلا کام یہ کیا تھا کہ سمرقند کی ایک غیر معروف مسجد میں پہنچ کر نکاح پڑھوا لیا تھا۔ دوسری بات کے متعلق کوئی بات قطعی طور پر نہیں کہی جا سکتی تھی کیونکہ ایسا کوئی طریقہ اس وقت موجود نہ تھا جس سے شادی ملک کے دعوے کو غلط ثابت کیا جا سکے۔

○

سمرقند کا پورا شہر ایک مضبوط قلعہ تھا لیکن شہر کے اندر ایک پہاڑی پر ایک اور قلعہ تعمیر کیا گیا تھا۔ یہاں

تاتاری بیگمات کے محل تھے جہاں وہ اپنے اپنے دربار لگاتی تھیں۔ اس قلعے کو جانے والے تمام راستوں پر مسلح تاتاری سوار پہرہ دیتے تھے۔ ہر محل کے ساتھ ایک خانہ باغ تھا۔

ان محلات میں سب سے زیادہ آراستہ اور شاندار محل ملکہ سرائے خانم کا تھا۔ اس محل کا خانہ باغ بھی دوسروں کی بہ نسبت زیادہ وسیع، عریض اور دلکش تھا۔ اس میں لالہ و گلاب کی بے شمار کیاریاں تھیں جو دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اسی باغ میں ایک بارہ دری ہے جس کی چھت پگوڈا طرز کی ہے۔ یعنی نیچے سے گول اور اوپر سے نوک دار۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جانے کے لیے محرابی دروازے ہیں جن پر سرخ ریشم کے پردے پڑے ہیں۔ چھت اور دیواروں پر چاندی کے پتر چڑھے ہیں جن پر سونے کا ملمع ایسی صنعت کاری سے کیا گیا ہے کہ بالکل سونا نظر آتا ہے۔ ان پر موتیوں سے پھول بنائے گئے ہیں۔ موتیوں کی جھالریں جب ہوا سے ہلتی ہیں تو موتیوں کے یہ پھول عجب بہار دکھاتے ہیں۔

آج اس باغ اور بارہ دری میں بڑی رونق ہے۔ ملکہ سرائے خانم نے دربارِ خاص کا حکم دیا ہے۔ امیر و وزیر آنا شروع ہو گئے ہیں۔ شامیانوں کے اندر بخارا اور فرغانہ کے بیش قیمت قالینوں کا فرش ہے اور بیٹھنے کے لیے دیوان رکھے ہیں۔ ہر شامیانے میں ایک خالص سونے کی ڈھلی ہوئی ... رکھی ہے جس پر عطر کی شیشیاں قرینے سے سجائی گئی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بلوریں صراحیاں رکھی ہیں جن میں قسم قسم کے مشروب بھرے ہیں۔ ان صراحیوں پر لعل، زمرد اور فیروزے جڑے ہیں۔ دربار میں تمام بڑے بڑے سرداروں کو بلایا گیا ہے۔ . . . . مویدارلات اور سردار صلیقالتن بھی موجود ہیں اور ایک شامیانے میں بیٹھے نیچی آواز میں گفتگو کر رہے ہیں۔

یکایک چوبدار اعلان کرتا ہے کہ ملکۂ عالم سرائے خانم تشریف لانے والی ہیں اس لیے تمام مہمان بارہ دری میں اپنی اپنی جگہ پر آ کے بیٹھ جائیں۔

اعلان سن کر لوگ بارہ دری کی طرف بڑھتے ہیں۔ دھوپ روکنے کے لیے بارہ دری کے چاروں طرف قناتیں لگائی گئی ہیں۔ تمام لوگ بارہ دری میں پہنچ کر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اسی وقت ملکہ سرائے خانم کے آنے کا اعلان ہوتا ہے۔

ملکہ کی شان اور دبدبہ دیکھنے کے قابل ہے۔ آگے آگے حبشی کنیزیں، دائیں بائیں خواصیں چل رہی ہیں۔ سب کی نظریں پاسِ ادب سے نیچی ہیں۔ ملکہ کے سر پر خود کی طرز کا تاج ہے جس میں جواہرات ٹنکے ہیں اور کشیدہ کاری کی گئی ہے۔ پیشانی پر ایک سنہری حلقہ بنا ہے۔

ملکہ سرائے خانم پیرانہ سالی کے باوجود تن کر چل رہی ہے۔ جواہرات جڑے اس تاج کے کنگوروں پر سفید پر لگے ہیں جو ملکہ کے چہرے پر سایہ سا کیے ہوئے ہیں۔ پروں کے درمیان باریک باریک سونے کی زنجیریں ہیں،

ن میں سے شعاعیں پھوٹ رہی ہیں۔

سرائے خانم کی قبا کا رنگ قرمزی ہے۔ قرمز ریشم کے کیڑوں کی طرح ایک کیڑا ہوتا ہے۔ ترکستان میں اس ں کا کپڑا سب سے پہلے تیار کیا گیا تھا اور اس کا نام اس کپڑے کے نام پر قرمزی رکھا گیا۔ قبا کے حاشیوں پر طلائی تار ام کیا ہوا ہے۔ قبا کے دامن کو پندرہ کنیزیں سنبھالے ہوئے پیچھے پیچھے چل رہی ہیں۔ ملکہ کے بال کھلے اور شانوں ھرے ہیں۔ رخساروں پر غازہ ملا ہے اور چہرے پر باریک ریشم کی نقاب ہے۔

ملکہ کے داخلے پر تمام امیروں نے انہیں تعظیم پیش کی۔ ملکہ سرائے خانم نے ہاتھ کے اشارے سے ان کا سلام ل کیا اور پھر ایک زرنگار مسند پر بیٹھ گئی۔

چند ہی لمحوں کے بعد ایک اور ملکہ کنیزوں کے جلو میں داخل ہوئی۔ یہ عمر میں سرائے خانم سے کم ہے اور رعب و بہ بھی اس کا کم ہے لیکن چہرے سے متانت اور سنجیدگی ٹپکتی ہے۔ اس نے سرائے خانم کو ادب سے سلام کیا۔ ملکہ ے دوسری مسند کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئی۔ اس کا رنگ گندمی اور آنکھیں ترچھی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے ہ مغل نسل سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ دراصل تیمور کی نئی بیوی مغل سردار منگلی خان کی بیٹی ہیں اور سرائے خانم ے بعد ان کا درجہ ہے اور انہیں دوسری ملکہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔

مہمانوں کی خاطر مدارات کا سلسلہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے دونوں ملکاؤں کو سونے کی کشتیوں اور جڑاؤ ری گلاسوں میں مشروب پیش کیا گیا۔ مشروب پیش کرنے والی کنیزوں کے ہاتھوں میں سفید ریشم کے دستانے ھے ہیں تاکہ ننگے ہاتھ کشتیوں اور گلاسوں سے مس نہ ہوں۔ کنیزیں دو زانو ہو کر مشروب پیش کرتی ہیں۔ ملکائیں ٹھا کر دو چار گھونٹ بھرتی ہیں۔ پھر گلاس واپس رکھتی ہیں۔ کنیزیں الٹے پیروں واپس جاتی ہیں۔ پھر خدمت گار ڑھتے ہیں اور امیروں کو مشروب پیش کرتے ہیں۔ مشروب پینے کے بعد وہ اپنے اپنے گلاس کشتیوں میں الٹے کر ے اوندھا دیتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ مہمان ملکہ کی مہمان نوازی کے شکر گزار ہیں۔

اب ملکہ کے اشارے پر ایک کنیز حاضرین کو مطلع کرتی ہے کہ ملکۂ عالم کچھ ارشاد فرمانا چاہتی ہیں اس لیے ام مدعوئین متوجہ ہوں۔

سب لوگ گوش بر آواز ہوتے ہیں لیکن ان کی نظریں نیچی ہیں۔ سرائے خانم بڑی بارعب آواز میں ٹھہر ٹھہر کر ہتی ہے:

'اے تاتاری تخت و تاج کے جاں نثارو!

تمہیں علم ہے کہ صاحبقراں امیر تیمور گورگاں اس وقت برصغیر میں کفار سے جہاد میں معروف ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے صاحبقراں نے فرمان بھیجا تھا کہ ایرانی النسل شادی ملک کو قتل کر

دیا جائے۔ اس سلسلے میں ہم نے شادی ملک کی گرفتاری کا حکم دے دیا اور گھر گھر تلاشی ہوئی چونکہ شادی ملک کا تعلق ایک تیموری شہزادے سے تھا اس لیے ہمیں امیروں اور بیگمات کے محلوں کی تلاشی کا بھی حکم جاری کرنا پڑا جس سے ہمارے وفاداروں کی دل آزاری ہوئی اور بعض جگہ کچھ ناخوشگوار واقعات بھی پیش آئے۔ ہم اس سلسلے میں افسوس کا اظہار کرتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ شادی ملک نے خود اپنے آپ کو تاتاری قانون کے حوالے کر دیا ہے لیکن شادی ملک کے قتل کا صاحبقرانی حکم ہماری تاتاری روایات اور خود صاحبقران کے بنائے ہوئے ایک اصول سے متصادم ہو گیا ہے جس کا فیصلہ کرنے کے ہم مجاز نہیں کیونکہ اگر ہم صاحبقران کا یہ حکم تسلیم کرتے ہوئے شادی ملک کو قتل کراتے ہیں تو ان کے حکم کی تعمیل تو ضرور ہو جاتی ہے لیکن اس طرح ہم ایک تاتاری قانون کو توڑنے کے ذمہ دار ہو جاتے ہیں جس کی کم از کم سزا موت ہے۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہر دو باتوں پر صاحبقران کی رائے معلوم کی جائے۔ چنانچہ شادی ملک کو زیر حراست رکھا گیا ہے اور اس کی زندگی اور موت کا فیصلہ صاحبقران کی برصغیر سے واپسی پر ہوگا۔

شادی ملک کی گرفتاری کے موقع پر جو ناخوشگوار واقعات پیش آئے یا ہمارے امیروں کی دل شکنی ہوئی اس کے لیے ہم پھر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔"

ملکہ سرائے خانم کے اس اعلان یا تقریر کا یہ اثر ہوا کہ امیر سیف الدین اور امیر مویدارلات جیسے جلیل القدر امیروں کی جو توہین ہوئی تھی اس کا ازالہ ہو گیا۔ دوسری طرف بعض لوگوں کو یہ علم ہو گیا کہ شادی ملک کو ایک شاہی محل میں پوری شاہانہ مراعات کے ساتھ قید کیا گیا ہے تو ان کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہو رہے تھے طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں۔ ملکہ کی اس وضاحت نے ایسے لوگوں کا منہ بند کر دیا تھا۔

ملکہ سرائے خانم نے اپنی تقریر میں امیر تیمور کے برصغیر پر حملے کو "جہاد" کا نام دیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ تیمور نے جس وقت برصغیر پر حملہ کی تجویز اپنے سرداروں کے سامنے پیش کی تھی تو اس نے اس مجلس میں علماء کرام کو بلایا تھا اور یہ کہا تھا کہ وہ برصغیر پر اس وجہ سے حملہ کرنا چاہتا ہے کہ وہاں کفر و الحاد کی بیخ کنی کرے اور برصغیر کو مندروں اور بتوں سے پاک کرے۔ تاریخ یہی کہتی ہے کہ علما نے اس کی رائے سے اتفاق کیا تھا۔ بہرحال برصغیر میں جو واقعات پیش آئے وہ تو کم از کم جہاد کی نفی کرتے ہیں کیونکہ طوائف الملوکی کے اس دور میں بھی برصغیر کی سب سے بڑی حکومت، سلطنت دہلی ایک مسلمان بادشاہ محمود تغلق کے ہاتھ میں تھی اور اسی کا سکہ و خطبہ جاری تھا۔

تیمور کا پوتا پیر محمد جو خانزادہ کا بیٹا تھا وہ اس وقت کابل کا گورنر تھا۔ تیمور نے اسے برصغیر کے حملے میں بطور ہراول دستے کے استعمال کیا۔ پیر محمد نے دریائے سندھ عبور کر کے ملتان کا محاصرہ کر لیا اور تیمور کو لکھا کہ سلطنت دہلی ڈانواں ڈول ہے اور حملے کے لیے یہ وقت مناسب ہے۔

دہلی کے حالات واقعی بہت ابتر تھے۔ دہلی کی بادشاہت محمود شاہ تغلق کے ہاتھ میں تھی لیکن فیروز آباد میں فتح خان کا ایک بیٹا نصرت شاہ حکومت کر رہا تھا۔ اس طرح دہلی کی حکومت پر بیک وقت دو دو بادشاہ حکومت کر رہے تھے۔

تیمور رجب ۸۰۰ھ بمطابق مارچ ۱۳۹۸ء میں سمرقند سے روانہ ہوا اور آٹھ محرم کو کوہستانی چوٹیوں اور سنگلاخ سرحدوں کو عبور کرتا ہوا دریائے سندھ کے اس پار پہنچ گیا جس جگہ سے جلال الدین خوارزم شاہ معہ اپنے گھوڑے کے دریائے سندھ میں کود کر اس پار نکل گیا تھا اور چنگیز خان اس بہادر کی تعریف کرتے ہوئے واپس ہو گیا تھا لیکن تیمور خود کو چنگیز خان سے بڑا فاتح سمجھتا تھا۔ دریائے سندھ اس کا راستہ نہ روک سکا۔ اس نے کشتیوں کا پل بنانے کا حکم دیا اور دو دن بعد اس کا پورا لشکر اس پل سے گزر کر ملتان کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں اس کے پوتے پیر محمد کا قبضہ ہو چکا تھا۔

تیموری حملے کی خبر سے پنجاب میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ دیبل پور (دیپالپور) خالی ہو چکا تھا اور لوگ بھاگ کر بھٹنیر کے قلعے میں پناہ لے رہے تھے۔ تیمور نے بھٹنیر کے قلعے پر قبضہ کر کے لوگوں کو تہ تیغ کرا دیا۔ یہی حال فتح آباد کا ہوا۔ سرسوتی یا سرسہ کے لوگ شہر چھوڑ کر جنگلوں میں بھاگ گئے۔ غرض یہ کہ کوئی بھی تیمور کے مقابلے میں نہیں آیا اور تیمور فتح کا پرچم اڑاتا ہوا ۲۴ ربیع الاول ۸۰۱ھ کو پانی پت کے میدان میں خیمہ زن ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ پانی پت کے میدان میں برصغیر کی قسمت کا فیصلہ ہوگا لیکن میدان صاف تھا۔

تیمور ایک ہفتہ قیام کرنے کے بعد دہلی کی طرف بڑھا اور ۷ ربیع الثانی کو دہلی پہنچا جہاں تاجدار دہلی محمد شاہ تغلق اس کے مقابلے کے لیے تیار تھا۔

تیمور کے بانوے ہزار سواروں کے مقابلے پر محمود شاہ تغلق صرف بارہ ہزار سوار اور چالیس ہزار پیادے لا سکا۔ ان کے علاوہ دہلی کے لشکر میں ۱۲۰ آہن پوش ہاتھی بھی تھے جن کے اوپر ہودوں میں تیر انداز اور آگ برسانے والے آتش باز بیٹھے تھے۔

تیمور کے میمنہ پر پیر محمد اور امیر یادگار اور میسرہ سلطان حسین اور شاہ رخ مرزا کے سپرد تھا۔ تیمور خود قلب میں موجود رہا۔

سلطان دہلی کے ساتھ سوائے ملو اقبال خان کے اور کوئی نامور سردار نہ تھا۔ مقابلہ زیادہ دیر جاری نہ رہا اور

سلطان اور ملو اقبال کو شکست کھا کر پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی۔

دہلی ایک بار پھر تباہ ہوا۔ تین روز تک قتلِ عام ہوتا رہا۔ پھر دہلی کی مساجد میں امیر تیمور کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔

میرٹھ میں ایک اور معرکہ ہوا جس میں الیاس افغان اور مولانا احمد تھانیسری نے دادِ شجاعت دی لیکن شکست کھائی۔ پھر ہردوار، سرمور اور شوالک پر یہ قہر نازل ہوا اور اس طرح تیمور بے شمار دولت، لونڈی، غلام اور اہلِ حرفہ کو سمیٹ کر واپس چلا گیا۔

اس کے بعد ایک بار پھر سمرقند میں ایک قاصد گھوڑا دوڑاتا ہوا داخل ہوا۔ لوگوں نے اسے گھیر لیا۔ قاصد برصغیر سے خبر لے کر آیا تھا لیکن اس دفعہ اس نے خبر کو پوشیدہ رکھنے کے بجائے اپنے گھوڑے کو دائرے میں چکر دیتے ہوئے خوشی کا نعرہ لگاتے ہوئے کہا؛

"فتح۔ فتح۔ ہمارے امیر کو فتح ہوئی۔ برصغیر تسخیر ہوا!"

فتح کی نوید پورے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ لوگوں کی خوشی کا عالم دیدنی تھا۔ ادھر کچھ دنوں سے ملک تاتار کے کئی حصوں میں بری بری خبریں اڑ رہی تھیں۔ کوہ قاف میں بغاوت پھوٹ پڑی تھی۔ سلطانِ بغداد نے عراق پر دوبارہ قبضہ کر لیا تھا۔ امیر پریشان تھے کہ اگر تیمور کو برصغیر میں شکست ہو گئی تو کیا ہو گا۔ فتح کے اعلان سے ان کو اطمینان ہو گیا اور وہ امیر تیمور کے استقبال کی تیاریاں کرنے لگے۔

سمرقند میں ابھی سے جشن شروع ہو گیا۔ اب رات کو "ریگستان" میں چراغاں کیا جاتا اور برصغیر پر حملے اور فتح پر ہر زاویے سے بحث ہوتی۔ علماء سب سے زیادہ خوش تھے۔ ان کے ذہن میں ایک نئی خلافت کا نقشہ ابھرا۔ جس کی حدود بغداد سے لے کر کنارِ گنگا تک نظر آتی تھیں۔

ایک بیان یہ ہے کہ تیمور دہلی کا محاصرہ نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ محاصرے کی صورت میں دہلی کی تباہی کا اندیشہ تھا۔ اس خیال کے پیشِ نظر اس نے قلعے سے دور کھلے میدان میں اپنی فوج کو اتارا۔ پھر اس نے فوج کے چاروں طرف خندقیں کھدوا کر فوج کو محفوظ کیا۔

اس بیان میں کوئی حقیقت نظر نہیں آتی کیونکہ چنگیز یا تیمور کے نزدیک شہروں کی کوئی حیثیت نہیں تھی بلکہ وہ تو شہروں کو برباد کر کے دہشت پھیلاتے تھے تاکہ ان کے مدِمقابل کے حوصلے پست ہو جائیں۔ تیمور نے اپنی فوج کے گرد خندقیں ضرور کھدوائی تھیں لیکن یہ بھی اس کی ایک جنگی چال تھی۔ جب ان خندقوں کی خبر دہلی کے لشکر میں پہنچی تو وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ تاتاری خوف زدہ ہیں اور کھلے میدان میں لڑنے سے کترا رہے ہیں چنانچہ دہلی کے لشکر نے آگے بڑھ کر حملے کا فیصلہ کیا۔ تیمور یہی چاہتا تھا کہ دہلی کا لشکر قلعہ بند نہ ہو کیونکہ اس طرح محاصرہ طول

کھینچ سکتا تھا۔ اگر محمود شاہ تغلق عقلمندی سے کام لیتا اور قلعہ بند ہو جاتا تو شاید دہلی ایسی آسانی سے تاتاریوں کے ہاتھ نہ آتا۔ تیمور نے ہاتھیوں سے نمٹنے کے لیے نارِ رومی کا استعمال کیا اس طرح جب آگ کے شعلے ہاتھیوں سے لپٹے تو وہ بے قابو ہو گئے۔

تیمور کا فاتح لشکر برصغیر کی فتح سے واپس ہوا تو تیمور نے چند دن اپنے وطن یعنی شہرِ سبز میں قیام کیا پھر دارالحکومت قراچہ پہنچا۔ یہ ایک قلعہ تھا جو تیمور نے پہاڑی پر سیاہ پتھر سے تعمیر کرایا تھا۔

سمرقند میں لوگ اس کی آمد کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ فوج کو باب لاجورد سے شہر میں داخل ہونا تھا اس جگہ قالینوں کا فرش بچھایا گیا تھا۔ قلعہ کو جانے والی سڑک پر بانات کا فرش بچھا تھا۔ راستے کے دونوں طرف جتنے مکانات تھے، باغات اور دیواریں تھیں ان پر ریشمی کپڑا منڈھا گیا تھا جس پر زری اور کشیدہ کاری کا کام کیا ہوا تھا۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ دکانوں کو آراستہ کیا گیا تھا۔ لوگ نیا لباس پہنے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔

جس وقت تیمور کی سواری شہر کے قریب پہنچی تو امراء، وزراء، معززینِ شہر، مقامی اور باہر کے روساء نے باب لاجورد سے آگے بڑھ کر تیمور کا استقبال کیا۔ ملکہ سرائے خانم پورے جاہ و جلال اور اپنی کنیزوں اور غلاموں کے ساتھ استقبال کرنے والوں میں موجود تھی۔ اس سے ذرا ہٹ کر شہزادی خانزادہ کھڑی تھی۔ خانزادہ کے دو بیٹے پیر محمد اور سلطان محمد اس حملے میں تیمور کے ساتھ تھے۔ ملکہ سرائے خانم کا بیٹا شہزادہ شاہ رخ بھی برصغیر گیا ہوا تھا۔ سرائے خانم اور شاہزادہ کے دلوں کا حال اس وقت یکساں تھا۔ دونوں میں سے کسی کو علم نہ تھا کہ ان کے بیٹے زندہ سلامت واپس آ گئے ہیں یا ملک گیری کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔

آہن پوش سواروں میں پہلے خانزادہ کے بیٹے نظر آئے۔ خانزادہ کی کنیزوں نے ان پر سونے کا برادہ اور موتی نچھاور کیے۔ سرائے خانم کا بیٹا شاہ رخ مرزا بھی زندہ بچ آیا تھا۔ ملکہ نے خدا کا شکر ادا کیا اور اس پر موتی نچھاور کرائے۔ پھر صاحبقران امیر تیمور کا گھوڑا سامنے آیا۔ اس پر اس قدر زر و جواہر نچھاور کیا گیا کہ ڈھیر سا لگ گیا۔ تصور نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت سمرقند میں اور وہاں کے رہنے والوں کے پاس کس قدر دولت تھی۔

تاتاری لشکر شہر میں داخل ہو گیا لیکن لشکر کی آخری صفوں میں جو عجیب الخلقت فوج تھی اسے دیکھ کر سمرقند والے دنگ رہ گئے۔ یہ برصغیر کے کوہ پیکر ہاتھی تھے۔ اہلِ تاتار اس جانور سے قطعی ناواقف تھے۔ لوگ انہیں

حیرت سے دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ تیمور واقعی عظیم ہے جس نے ان متحرک پہاڑوں کو اپنے قابو میں کیا ہے۔

ہاتھیوں کے بدن پر مختلف قسم کے رنگوں سے پٹیاں بنائی گئی تھیں اور وہ اس طرح جھومتے جھامتے آ رہے تھے جیسے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اپنی جڑیں چھوڑ کر تیمور کے لشکر کے ساتھ چلنے لگی ہوں۔ ہاتھیوں کے چلنے سے گرد و غبار کا طوفان اٹھ رہا تھا اور اس میں ہاتھیوں کی مستکیں (سونڈیں) بڑے بڑے اژدہوں کی طرح لہرا رہی تھیں۔ تیمور کے ساتھ جو ہاتھی آئے تھے ان کی تعداد سینکڑوں سے اوپر تھی اور ان سب پر مالِ غنیمت لدا ہوا تھا۔ سونے چاندی اور جواہرات کے علاوہ وہ اپنے ساتھ کئی سو معمار اور کاریگر لایا تھا تاکہ وہ سمرقند میں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرائے۔

شام کو دربارِ خاص منعقد ہوا جس میں امراء اور بیگمات نے نذریں پیش کیں اور تیمور نے انہیں انعام و اکرام سے نوازا۔ سب سے آخر میں شہزادی خانزادہ قدم بوسی کے لیے حاضر ہوئی۔ وہ سخت پریشان نظر آ رہی تھی۔ اسے اب تک علم نہ ہو سکا تھا کہ اس کے بیٹے شہزادہ خلیل اور شادی ملک کے بارے میں کیا فیصلہ ہوا۔ کیونکہ شادی ملک اس وقت تک اپنے محل میں زیرِ حراست تھی اور اسے باریابی کی اجازت نہ ملی تھی۔

خانزادہ نے ادب سے سلام کر کے جواہرات سے بھرا ہوا ایک تھال تیمور کی نذر کیا اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ تمام درباری نظریں سمٹ کر خانزادہ پر آ گئی تھیں۔

"خانزادہ! تم اکیلی آئی ہو۔ شہزادہ خلیل کہاں ہے؟" تیمور نے بالکل سپاٹ لہجے میں کہا۔

خانزادہ کو پسینہ آ گیا۔ تیمور کے لہجے میں نہ نرمی تھی اور نہ سختی۔ وہ کچھ بھی اندازہ نہ کر سکی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا:

"اے صاحبقراں! خلیل اپنی غلطی پر نادم اور عتابِ تیموری سے خائف ہے۔"

"ہمیں سرائے خانم نے تمام حالات سے آگاہ کر دیا ہے۔" تیمور کا لہجہ اب بھی کسی تاثر سے خالی تھا: "شہزادے نے غلطی کی ہے لیکن شادی ملک اب شاہی خاندان میں شامل ہو چکی ہے۔ شہزادے اور شادی ملک کو کسی وقت ہمارے حضور پیش کرو۔"

"صاحبقراں!" شہزادی خانزادہ کا سر ادب سے کچھ اور جھک گیا۔

"فکر نہ کرو خانزادہ۔" تیمور کا لہجہ نرم پڑ گیا: "سرائے خانم کی سفارش پر ہم نے دونوں کو معاف کر دیا۔"

خانزادہ نے سر اٹھا کر سرائے خانم کو دیکھا جو تیمور کے تخت کے دائیں جانب پوری شاہی تمکنت سے بیٹھی تھی

ر کی دوسری جانب منگلی خان کی بیٹی بیٹھی تھی۔

خانزادہ کی آنکھوں میں شکر گزاری کے آنسو لرز رہے تھے لیکن اس کے دل میں یہ خیال ضرور ہوگا کہ آج ر اس کا شوہر جہانگیر زندہ ہوتا تو اس کا رتبہ اس دربار میں کچھ اور ہوتا۔ لوگوں کا عام تاثر یہی تھا کہ تیمور کے د خانزادہ کا بیٹا پیر محمد اس کا جانشین ہوگا لیکن اس کا حریف سرائے خانم کا بیٹا شاہ رخ تھا جس کی ماں ملکۂ عالم صاحبِ اقتدار تھی۔

صاحبقرانِ امیر تیمور گورگان بلاشبہ دنیا کا عظیم ترین فاتح تھا۔ اس کی تمام تر زندگی مہمات میں گزری۔ اس نے ی زندگی کے پہلے تینتیس سال جنگی مہارت کے حصول میں گزارے اور زندگی کے باقی ایام فتوحات میں صرف ہوئے رنے جب اور جہاں کبھی یلغار کی، فتح نے اس کے قدم چومے۔ اس کے لشکر کے طوفانی حملے کو پہاڑ تک نہ روک تے تھے۔ روس، افغانستان، ایران، خلیج فارس اور ترکی کے بیشتر علاقوں پر اس کا پرچم لہرایا۔ اس جنگجویانہ زندگی سے اپنی ایک ٹانگ سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ اسے دو بیٹوں شہزادہ جہانگیر اور شہزادہ عمر شیخ مرزا کی موت دمہ برداشت کرنا پڑا۔ تیسرے بیٹے میراں شاہ کے پاگل پن نے بھی اسے پریشان کیا لیکن اس نے اپنی فتوحات کا لہ جاری رکھا۔

آخر ۸۰۷ھ (۱۴۰۵ء) میں اس نے چین پر چڑھائی کی۔ ممکن ہے وہ چین اس لیے فتح کرنا چاہتا ہو کہ اس کے امجد چنگیز خان نے اس ملک کو فتح کیا تھا اور وہ چنگیز خان کی سفاکانہ فتوحات سے کسی طرح پیچھے نہیں رہنا چاہتا لین اس کی یہ آرزو اس کے دل ہی میں رہ گئی۔ اس نے شدید سردی کی پروا نہ کی اور دریائے سیحوں سے اتر کر ر کے مقام پر قیام کیا۔ وہاں وہ سخت بیمار پڑا اور اتنی بڑی سلطنت چھوڑ کر اس دنیا سے خالی ہاتھ رخصت ہو ہی نہیں بلکہ جب اس کی لاش سمرقند واپس لائی گئی تو شہر کے دروازے اس پر بند تھے۔

امیر تیمور نے آخری وقت میں خانزادہ کے بیٹے شہزادہ پیر محمد کو اپنا جانشین مقرر کیا لیکن اس کی شہادت وہی امیر دے سکتے تھے جو تیمور کی موت کے وقت موجود تھے۔ پیر محمد اس وقت کابل اور پنجاب کے انتظام میں ف تھا۔ سرائے خانم کا بیٹا شاہ رخ مرزا نے تیمور کے مرنے کی خبر پاتے ہی خراسان میں اپنی حکومت کا اعلان کر دیا مرقند کا تخت خالی تھا۔ تیمور کی دونوں بیگمات تیمور کے ساتھ گئی تھیں۔ سمرقند میں اگر کوئی موجود تھا تو وہ خانزا

کا بڑا نام بیٹا شہزادہ خلیل سلطان تھا۔ خانزادہ اب تک در پردہ اسی کے لیے کوشش کرتی رہی تھی چنانچہ اس نے سمرقند میں موجود تمام امیروں کو خلیل سلطان کے حق میں رام کر لیا اور اس طرح شادی ملک کا شوہر سمرقند کا تاجدار بن گیا۔

سمرقند کا ناظم شہر چونکہ شہزادہ خلیل سلطان کی وفاداری کا اعلان کر چکا تھا اس لیے اس نے شہر کے تمام دروازے بند کرا دیے اور تمام امراء اور دونوں بیگمات جو تیمور کے جنازے کے ساتھ تھیں، رات بھر سردی میں ٹھٹھرتے رہے۔ صبح اس وقت ان کو داخلے کی اجازت ملی جب انہوں نے شہزادہ خلیل سلطان کی اطاعت کا اعلان کر دیا۔

خلیل سلطان صرف پانچ سال تک حکومت کر سکا۔ پھر سرائے خانم کے بیٹے شاہ رخ مرزا نے ایک امیر برونداق کے تعاون سے خلیل سلطان کو معزول کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ شاہ رخ مرزا نیک دل انسان تھا۔ اس نے خلیل سلطان کے لیے معقول وظیفہ مقرر کیا لیکن خلیل سلطان یہ صدمہ برداشت نہ کر سکا اور چند ہی دن بعد وفات پا گیا۔

خلیل سلطان کی بیوی ایرانی کنیز شادی ملک نے اس کا آخری وقت تک ساتھ دیا اور وفاداری کی انتہا یہ کی کہ خلیل سلطان کی موت کے ساتھ خود بھی ختم ہو گئی۔ اس کی موت کے سلسلے میں عبداللہ رازی لکھتے ہیں،

"این خانم (شادی ملک) هم طریق وفادار از دست نداد۔ و چون خلیل سلطان رحلت کرد۔ بافرسہ خنجر خود را بگشت و ہر دو را در یک قبر دفن کردند"

یعنی:

"شادی ملک بھی ایک وفادار عورت تھی۔ اس نے خلیل سلطان کی موت پر خود کو خنجر مار کر ہلاک کر لیا اور دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا۔"

ختم شد